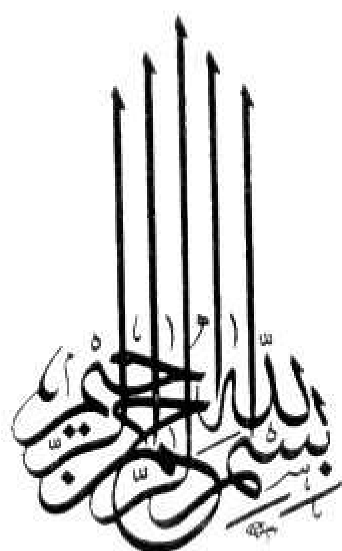
خُطَباتِ
حکیمُ الامّت

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان فون: 4540513-4519240


بسم الله الرحمن الرحيم

بسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد-۱۶

برکاتِ رمضان

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ

تصحیح وتزئین

صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ



تخریج احادیث

مولانا زاہد محمود قاسمی

عنوانات

قاری محمد ادریس ہوشیار پوری

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان

(061-4540513-4519240

برکاتِ رمضان

تاریخ اشاعت............... جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ
ناشر.......................... ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت..................... سلامت اقبال پریس ملتان

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ...... چوک فوارہ...... ملتان
مکتبہ رشیدیہ...... راجہ بازار...... راولپنڈی
ادارہ اسلامیات...... انارکلی...... لاہور
یونیورسٹی بک ایجنسی...... خیبر بازار...... پشاور
مکتبہ سید احمد شہید...... اردو بازار...... لاہور
ادارۃ الانور...... نیوٹاؤن...... کراچی نمبر 5
مکتبہ رحمانیہ...... اردو بازار...... لاہور
مکتبہ المنظور الاسلامیہ...... جامعہ حسینیہ...... علی پور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTERE
119-121- HALLIWELL ROAD
BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

فہرست کتب

اکمال الصوم والعید



وعظ

تطہیر رمضان

یعنی

ماہ رمضان کے آداب واحکام

مرادآباد ۲۱ شعبان ۱۳۱۹ھ

خطبہ ماثورہ

الحمد لله نحمدهٗ ونستعينه' ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل لهٗ ومن يضلله فلا هادی له ونشهد ان لاالٰه الا الله وحده لاشريک له ونشهد ان سيدنا ومولانا محمداً عبدهٗ و رسولهٗ

امابعد:۔ بوجہ قرب رمضان شریف مناسب ہے کچھ احکام اس کے بیان کر دیئے جائیں یہ تو معلوم ہے کہ روزہ فرض ہے اس کے بیان کی تو ضرورت نہیں اور ایسے ہی تراویح سنت مؤکدہ ہونے کی وجہ سے ضروری ہے اس کے بیان کی بھی ضرورت نہیں۔

منکرات روزہ

البتہ ضروری مضمون یہ ہے کہ بعض لوگوں نے اس مہینہ میں کچھ منکرات[1] بڑھا دیئے ہیں اور وجہ اس کی یا تو عدم علم ہے یا قصور علم یا جانتے بھی ہیں مگر احتیاط نہیں کرتے۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ اللہ میاں نے اس مہینہ میں ان چیزوں کو بھی حرام کر دیا جو پہلے حلال تھیں۔ کیا یہ اس بات پر دال نہیں کہ جو چیز ہمیشہ حرام ہے اس میں اور شدت زیادہ ہو جائے گی۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے تو علت بیان کی روزہ رکھنے کی لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ روزہ اس واسطے ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔ اب ہر شخص غور کر لے کہ قبل رمضان میں اور رمضان میں کچھ فرق اس کی حالت میں ظاہر ہوا اس نے نظر بد کو یا غیبت کو چھوڑ دیا یا نہیں، سو کچھ نہیں دونوں حالتیں یکساں ہیں کسی بات میں بھی کمی نہیں ہوئی۔ اب رہا کھانا سو اس کے بھی وقت بدل دیئے۔ مقدار میں کچھ تغیر نہیں کیا۔ غرض یہ کہ شارع علیہ السلام کا تو مقصود یہ تھا کہ منکرات میں کمی ہو۔ مگر لوگوں نے کچھ بھی نہ کیا۔ اہل تحقیق تو کھانے تک میں بھی کمی کر دیتے ہیں۔ اس مہینہ میں بہ نسبت شعبان کے مگر اس کی مقدار کچھ معین نہیں ہو سکتی ہے۔ جتنا شعبان میں کھاتے تھے اس سے کم کر دیا۔ بعض نے صرف بقدر لا یموت[2] کھا کر روزہ رکھا۔ جب ہی تو کچھ اثر پایا، ہمیشہ اچھی طرح کھایا ایک مہینہ عبادت ہی کے واسطے سہی۔ حاصل یہ کہ ان لوگوں نے اکل[3] میں بھی کمی کر دی۔ مگر یہ بات مندوب[4] خواص کے لئے ہے یہ ہر شخص سے نہیں ہو سکتا ہے مگر معاصی تو چھوڑو۔ خیر کھانے کے لئے جواز کا مرتبہ تو ہے معاصی کے واسطے جواز بھی نہیں۔ ہم برخلاف اس کے دن بھر معاصی میں مشغول رہتے ہیں بلکہ بعضے تو عصیان میں اور زیادہ ہو جاتے ہیں۔

اسی کو دیکھ لیجئے کہ صبح کی نماز اس مہینہ میں اپنے وقت پر ہوتی ہے یا نہیں، اس نماز کی تو وقت سے تاخیر کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ بہتیروں کی تو قضا ہوتی ہے اور قضا نہ بھی ہو تو اس قدر تاخیر تو

---

[1] منکرات، بری اور ناروا باتیں [2] بقدر لا یموت، اتنی مقدار جسے کھا کر انسان زندہ رہ سکے
[3] اکل۔ کھانا [4] مندوب۔ یعنی مستحب

ہوتی ہے جس سے جماعت فوت ہو جائے۔ خوش ہیں کہ ہم نے روزہ رکھ لیا' بڑا تعجب ہے کہ نماز کو چھوڑ دیا۔ روزہ کیا کفایت کر سکتا ہے' اللہ تعالیٰ نے مغفرت کو اس قدر بڑھا دیا کہ دس ضعف' ثواب کا وعدہ فرما دیا اور ہم اس قدر گناہ کرتے ہیں کہ حسنات[1] باوجود اتنے بڑھائے جانے کے بھی سیئات[2] کے برابر نہیں ہوتیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ حسنات کی تعداد بڑھی ہوئی رہتی۔ اس کو بھی جانے دیجئے۔ برابر تو رہتی کہ پھر بھی حسنات بموجب **سبقت[3] رحمتی علیٰ غضبی (مسند الحمیدی: ۱۱۲۶' اتحاف السادۃ المتقین۸: ۵۵۶' الدرر المنتثرہ: ۹۶)** کے غالب ہو جاتیں اور جب باوجود اضعافاً[4] مضاعفہ ہونے کے بھی نیکیاں گناہوں کے برابر نہیں ہوتیں بلکہ گناہ بڑھتا رہتا ہے تو پھر کیا حشر ہونا ہے۔

اچھا اس کو بھی جانے دیجئے' اگر ہمیشہ ہم اس پر قادر نہیں کہ معاصی[5] کو گھٹا دیں رمضان میں تو ایسا کر لیا جائے۔

ماہ رمضان کی عبادت کا اثر تمام سال رہتا ہے

تجربہ سے ثابت ہوا کہ عبادت کا اثر اس کے بعد گیارہ مہینے تک رہتا ہے جو کوئی اس میں کوئی نیکی بہ تکلف کر لیتا ہے اس کے بعد اس پر باآسانی قادر ہو جاتا ہے اور جو کوئی کسی گناہ سے اس میں اجتناب[6] کر لے تمام سال باآسانی اجتناب کر سکتا ہے اور اس مہینہ میں معصیت سے اجتناب کرنا کچھ مشکل نہیں کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں۔ پس جب شیاطین قید ہو گئے۔ معاصی آپ ہی کم ہو جائیں گے۔ محرک کے قید ہو جانے کی وجہ سے' اور یہ لازم نہیں آتا کہ معاصی بالکل مفقود ہی ہو جائیں کیونکہ دوسرا محرک یعنی نفس تو باقی ہے اس مہینہ میں وہ معصیت کرائے گا مگر ہاں کم اثر ہوگا کیونکہ ایک ہی محرک رہ گیا۔ اس میں ایک مہینہ کی مشقت گوارا کر لی جائے کوئی بات نہیں۔ غرض اس میں ہر عضو کو گناہ سے بچایا جاوے۔

کذب

ایک زبان ہی کے بیس گناہ ہیں۔ جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے ایک ان میں سے کذب[7] ہے جس کو لوگوں نے شیر مادر سمجھ رکھا ہے۔ اور کذب وہ شئے ہے کہ کسی کے نزدیک بھی

---

[1] حسنات' نیکیاں [2] سیئات۔ برائیاں [3] میری رحمت میرے غضب سے بڑھ گئی
[4] کئی کئی گنا' دگنا چوگنا' [5] گناہ' [6] پرہیز [7] جھوٹ

جائز نہیں اور پھر اس کو مسلمان کیسا خوشگوار سمجھتے ہیں۔ ذرا سا بھی لگاؤ کذب کا ہو جائے بس معصیت ہو گئی' یہاں تک کہ ایک صحابیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک بچہ سے بہلانے کے طور پر یوں کہا کہ لے یہاں آؤ چیز دیں گے۔ تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ آ جائے تو کیا چیز دو گی۔ انہوں نے دکھایا کہ یہ کھجور ہے میرے ہاتھ میں فرمایا اگر تمہاری نیت میں کچھ نہ ہوتا تو یہ معصیت لکھ لی جاتی۔ حضرات! کذب یہ چیز ہے۔ خیر یہ تو بڑے لوگوں کی باتیں ہیں۔ اگر اس سے احتراز نہ ہو سکے تو کذب مضر سے تو بچنا چاہیے۔

غیبت کے نتائج

اور پھر روزہ میں دوسرا گناہ زبان کا غیبت ہے لوگ یوں کہا کرتے ہیں کہ میاں ہم تو اس کے منہ پر کہہ دیں۔ منہ پر عیب جوئی کرو گے تو بہت اچھا کرو گے اور پیچھے تو ظاہر ہے جیسا اچھا ہے۔ بلکہ اگر منہ پر برا کہو گے تو بدلہ بھی تو پاؤ گے۔ وہ شخص تمہیں برا کہہ لے گا یا اپنے اوپر سے اس الزام کو دفع کرے گا۔ پیچھے برائی کرنا تو دھوکے سے مارنا ہے۔ یاد رکھو جیسا کہ دوسرے کا مال محترم ہے ایسی ہی بلکہ اس سے زیادہ آبرو ہے۔ چنانچہ جب آبرو پر آ بنتی ہے تو مال تو کیا چیز ہے۔ جان تک کی پرواہ نہیں رہتی۔ پھر آبروریزی کرنے والا کیسے حق العبد[1] سے بری ہو سکتا ہے۔ مگر غیبت ایسی رائج ہوئی ہے کہ باتوں میں احساس بھی نہیں ہوتا کہ غیبت ہو گئی یا نہیں۔ اس سے بچنے کی ترکیب تو بس یہی ہے کہ کسی کا بھلا یا برا اصلاً ذکر ہی نہ کیا جاوے کیونکہ ذکر محمود بھی اگر کیا جاوے کسی کا تو شیطان دوسرے کی برائی تک پہنچا دیتا ہے اور کہنے والا سمجھتا ہے کہ میں ایک ذکر محمود کر رہا ہوں۔ اور اس طرح ایک خیر اور ایک شر مل جانے سے وہ خیر بھی کالعدم[2] ہو گئی' اور حضرات اپنے ہی کام بہتیرے ہیں پہلے ان کو پورا کیجئے' دوسرے کی کیا پڑی۔ علاوہ بریں غیبت تو گناہ بے لذت بھی ہے اور دنیا میں بھی مضر ہے۔ جب دوسرا آدمی سنے گا تو عداوت پیدا ہو جائے گی اور پھر کیا ثمرات اس کے ہوں گے۔ اسی طرح زبان کے بہت گناہ ہیں۔ سب سے بچنا ضروری ہے۔

غلطی ان لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ حلال رزق نہیں ملتا

ان کے علاوہ ایک گناہ جو خاص روزے کے متعلق ہے۔ افطار علی الحرام ہے۔ بڑے تعجب

---

[1] حق العبد: بندے کا حق [2] کالعدم: گویا موجود ہی نہیں۔

کی بات ہے کہ اس مہینہ میں حلال کا کھانا بھی ایک وقت میں حرام ہو گیا اور پھر دن بھر تو ! سے لوگ چھوڑے رہیں اور شام کو حرام سے افطار کریں۔ اور دراصل بعض لوگوں نے خبط میں ڈال دیا ہے یوں کہتے ہیں کہ رزق حلال تو پایا نہیں جاتا۔ سوائے اس کے کہ دریا میں سے مچھلی شکار کر کے کھائی جائے یا سبزی کھا کر یا گھانس چر کر پیٹ بھر لیا جائے اور کچھ قصے اس کے متعلق مشہور کئے ہیں وہ ایک بزرگ کا قصہ بیان کیا کرتے ہیں کہ ان کا بیل لڑتے لڑتے دوسرے کے کھیت میں چلا گیا تو انہوں نے اس کھیت کا غلہ کھانا چھوڑ دیا کہ نہ معلوم دوسرے کے کھیت کی مٹی جو میرے بیل کے کھر میں لگ کر بلا اجازت چلی آئی کون سے دانہ میں شامل ہو گئی ہو۔ اگر یہ قصہ ہوا ہے تو وہ صاحب حال ہے دوسروں کے لئے ان کا فعل حجت نہیں ہوسکتا۔ قصداً اتنا مبالغہ کرنا تقویٰ کا ہیضہ اسی کو کہتے ہیں۔ جب اتنے شبہہ کو بھی حرام میں داخل سمجھا جاوے گا اور اس سے بچنا ظاہر ہے کہ مشکل ہے تو گمان یہ ہوگا کہ حرام سے بچنا مشکل ہے پس سب حراموں میں مبتلا ہو گئے اور حلال کو بالکل چھوڑ ہی دیا۔ میں کہتا ہوں کہ کنز و ہدایہ بالکل لغو ہی ہیں۔ جب یہی بات ٹھہری کہ حلال کا وجود ہی نہیں تو ناحق اتنا بسط[1] کیا صرف اتنا کافی تھا کہ الحلال لایو جد (حلال کا وجود ہی نہیں)۔ ہرگز نہیں جس پر کنز و ہدایہ فتویٰ دیدیں وہ حلال ہے میں کہتا ہوں کیا سب علماء حرام خور ہیں۔ ایک بزرگ تھے مولانا مظفر حسین صاحب' ان کی یہ حالت تھی کہ اگر کوئی ان کو مال حرام دھوکے سے بھی کھلا دیتا تھا تو قے ہو جایا کرتی تھی اور پھر بھی وہ دونوں وقت کھانا کھاتے تھے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حلال کا وجود دنیا میں ضرور ہے۔ ورنہ وہ کیا کھاتے تھے۔ اگر فرض کیجئے کہ مال حرام ہی کھاتے تھے تو طبیعت کو یہ نفرت نہیں ہوسکتی یا یہ کہ ہمیشہ قے ہی کیا کرتے ہوں گے تو کھانا فضول ہے۔

منشاء اس قول کا کہ حلال روزی نہیں ملتی ہے

غرض دنیا میں حلال بھی ہے حرام بھی ہے جو مسائل دریافت کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے۔ مگر لوگ پوچھتے ہی نہیں' اور یہ فساد پیدا کا ہے سے ہوا کہ لوگوں نے پوچھنا چھوڑ دیا جو جی میں آیا کرتے رہے حتیٰ کہ اس کے عادی ہو گئے۔ اب جو کسی نے منع کیا تو اس کا چھوڑنا نہایت دشوار معلوم ہوا۔ پس کہہ دیا کہ میاں یہ لوگ تو خواہ مخواہ بھی حلال کو حرام ہی کہا کرتے ہیں ان کی تو غرض یہی ہے کہ مال نہ بڑھے' اور مسلمانوں کو ترقی نہ ہو۔ بس ہوتے ہوتے یہ ذہن میں جم گیا کہ

---

[1] بسط۔ پھیلاؤ'

ان کے یہاں تو سب چیز حرام ہی ہے۔ حلال کا وجود ہی نہیں جو حلال تھا وہ بھی حرام ہی سمجھنے لگے۔ اور خوف سے مفتی کے پاس جانا چھوڑ دیا کہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے کس معاملہ کو حرام بتا دیں یا حلال بتائیں تو ہماری خاطر ہی سے شاید کہہ دیں اور فی نفسہ حرام ہی ہوگا کیونکہ حلال کا تو وجود ہی نہیں، سو یہ خیال بالکل غلط ہے بلکہ جس کو مفتی مباح[1] کہے وہ عنداللہ مباح ہے اس میں کچھ حرج نہیں۔ شیطان کے بہت سے جال ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ یہ سب حرام ہے۔ پھر بعض لوگ حرام و حلال میں خواہ مخواہ شبہ کر کے حلال کو بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ کہ جب اس میں وسوسہ ہے تو چھوڑ ہی دو چاہے مفتی کتنا ہی کہے کہ یہ حلال ہے مگر وہ اس کے چھوڑنے ہی کو اولیٰ سمجھتے ہیں۔ نہیں اس فعل میں کچھ حرج نہیں جو مباح ہے۔ اہل علم سے پوچھ لو کہ کوئی وجہ اس میں اباحت کی بھی ہے وہ کوئی ظالم نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ یہی چاہتے ہوں کہ تم کو دقت میں ڈالیں اور یہ خیال مت کرو کہ وہ حلال موجود ہی نہیں پوچھ لو۔ پھر جس سے وہ منع کریں اس پر عمل کرنے کے لئے ہمت باندھو۔

نفس کی کم ہمتی کا عمدہ علاج

اور اگر نفس کم ہمتی ہی کرے تو اس سے یوں کہو کہ یہ جو حکام وقت کے احکام ہیں ان کو کس طرح مانتا ہے اس کو بھی حاکم حقیقی کا حکم سمجھ کر مانو پھر دوسرے لوگ بھی ان شاء اللہ تم سے معارضہ نہ کریں گے۔ میرا ہی خود قصہ ہے کہ کبھی زیور بنواتا تو چونکہ چاندی کے واسطے روپیہ دینے سے ربوا[2] لازم آ جاتا ہے اس لئے جب کبھی زیور بنوانے کا اتفاق ہوتا تو میں چاندی دوسری جگہ سے خرید کر اسے دیدیتا، دو ایک مرتبہ تو اس نے کہا کہ روپیہ دے دو پھر تول کر حساب کر دینا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ یہ میرے دین کے خلاف بات ہے۔ پس اس نے اس کو خوشی سے منظور کر لیا۔ تو لوگ سب مان جاتے ہیں آدمی پکا چاہیے۔ اور اللہ میاں کی طرف سے اسباب ویسے ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔ خیال کر لیجئے کہ حاکم جب کسی کو امر شاق کا حکم دیتا ہے

تو اس پر مامور[3] کی اعانت بھی کیا کرتا ہے۔ حاصل یہ کہ دل کو مضبوط کرو اور اس پر عزم کر لو کہ ہم کوئی کام بلا پوچھے نہ کریں گے ہاں اس پوچھنے سے بعض صورتیں عدم جواز کی بھی نکلیں گی اور اس میں آمدنی کبھی کم ہو جاوے گی تو خوب سمجھ لو اور تجربہ کر لو کہ اس کم ہی میں برکت ہو جاوے گی۔

---

[1] مباح۔ جائز [2] ربوا۔ سود [3] مامور۔ جس کو حکم دیا گیا

رزق میں برکت کے معنی

اور اس کے یہ معنی نہیں کہ کم چیز مقدار میں بڑھ جاتی ہے کہ بازار سے تو ایک من گیہوں لائے اور گھر پر آ کر دو من اترے ممکن تو ایسا بھی ہے' ایک صاحب خیر نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ مسجد بنواتے تھے اور ایک تھیلی میں روپے رکھے تھے۔ اور کام شروع کیا' جب ضرورت ہوتی اس میں سے ہی ہاتھ ڈال کر نکال لاتے یہاں تک کہ سب کام بن گیا۔ حساب جو لگایا تو جتنا روپیہ تھا اس سے کم نہیں ہوا تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے مگر ہمیشہ ضرور نہیں۔ بلکہ اس کے معنی اور ہیں اور وہی اکثر واقع ہیں اور وہ یہ کہ یہ مقدار قلیل جب تمہارے ہی صرف میں آئے بیماری میں خرچ نہ ہو اور ایسے ہی فضول خرچیوں میں' مقدمات میں' لاطائل[1] تکلفات میں ضائع نہ جائے۔ جو کچھ آئے تمہاری ذات پر صرف ہو چاہے تھوڑا ہو اس سے بہتر ہے کہ زیادہ آئے اور تم پر خرچ نہ ہو اور آخر میں میں کہتا ہوں کہ نہ ہو برکت مگر خود اللہ میاں کی رضا ہی دنیا و مافیہا[2] سے بہتر ہے' اللہ میاں ملیں پھر کیا حقیقت ہے کسی چیز کی' مال و دولت کے مقابلہ میں کیا اللہ میاں کی کچھ وقعت نہیں سمجھتے ہو۔ حضرات! اللہ میاں کی رضا وہ چیز ہے کہ جس کی نسبت ایک بزرگ کہتے ہیں۔

؎ بمان اے آنکہ جز تو پاک نیست

دنیا کے حکام کی صرف خوشنودی کے واسطے کتنے کتنے سفر اور کیا کیا خرچ کرنا پڑتا ہے اور پھر ان کی خوشنودی دیرپا نہیں۔ ذرا سی بات پر بگڑ گئے اور اللہ میاں فرماتے ہیں کہ ہم شکور[3] ہیں۔ خیال کیجئے اس لفظ کو۔

ایک بادشاہ کے سامنے کوئی چیز لے جایئے اور وہ اس کی نسبت منظوری و عدم منظوری کچھ ظاہر نہ کرے مگر اس میں کوئی عیب نہ نکالے اور خازن کو حکم دے دے کہ رکھ لو تو لے جانے والے کے دماغ آسمان پر پہنچ جاویں گے اور سناتا پھرے گا کہ بادشاہ نے ہمارا ہدیہ رکھ لیا ہے' اور اللہ میاں کے یہاں ہم لوگ اپنے اعمال لے جاتے ہیں' اور ذرا ان اعمال کو بھی دیکھ لیجئے کہ وہ کس قابل ہیں۔

ہماری نماز کی مثال

ایک نماز ہی کو لے لیجئے اس وقت نظیر کے واسطے۔ کہ کھڑے ہوتے ہیں اللہ میاں سے باتیں

---

[1] لاطائل۔ بے فائدہ [2] دنیا و مافیہا۔ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے [3] شکور۔ قدردان

کرنے کواور کرتے ہیں کس سے گاؤخر سے۔ یایوں مثال دیجئے کہ ایک بادشاہ نے محض اپنی عنایت سے اپنے غلام کو دربار میں حاضری کی اجازت دی بلکہ یوں کہئے کہ زبردستی طلب کیا (ہم لوگ ایسے بھلے مانس تو کاہے کو ہیں کہ حاضری کی اجازت سے ہی دربار میں پہنچنے کو غنیمت سمجھیں) زبردستی بلائے ہوئے بلکہ پابہ زنجیر ہوکر دربار میں پہنچے اور کام ہم سے کیا ہے کہ بادشاہ کوان پر رحم آیا ہے اور چاہتا ہے کہ ان سے دربار میں کچھ گفتگو کرلے کہ درباریوں اور تمام رعایا میں ان کی عزت ہوجائے اپنا کچھ نفع مقصود نہیں۔

ے من نکردم خلق تا سودے کنم　　　بلکہ تابر بندگان جو دے کنم

(میں نے مخلوق کواس لئے پیدا نہیں کیا کہ میں ان سے فائدہ حاصل کروں بلکہ اس لئے پیدا کیا کہ ان پر جودوکرم کروں) ......ہائے......

من نکردم خلق تا سودے کنم　　　بلکہ تابر بندگان جودے کنم

اللہ میاں کا کیا نفع ہے ہمارے پیدا کرنے یا عزت دینے سے...... خیر! ان حضرات نے کیا مکافات کی اس بلانے کی کہ پہنچتے ہی منہ پھیر کر کھڑے ہوگئے اور کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ مگر بادشاہ تو کم ظرف نہیں ہے اس گستاخی پر نظر نہیں کرتا اور حکم دیتا ہے اپنے خادموں کو کہ اس بیوقوف کی انگلیاں کانوں سے نکال دو بلکہ ہاتھ باندھ دو کہ پھر انگلیاں کانوں میں نہ دے سکے اور منہ اس کا ہماری طرف کردو اور جلدی سے کچھ شفقت آمیز کلمات زبان سے فرمانے لگے کہ ایک دفعہ تو اس کے کان میں پڑ جائیں دیکھیں تو معلوم کیسے نہیں ہوتا مگر یہ تو قسم کھا کر چلے ہیں کہ الٹا ہی کریں گے۔ چٹ سے پھر انگلیاں کانوں کی طرف بڑھائیں مگر ہاتھ بندھے ہوئے تھے جلدی سے اس خوف سے کہ کہیں محبوب کا کلام کان میں پڑ جائے۔ اس جگہ سے بھاگ کر اصطبل میں گھوڑے کے پاس جاچھپے وہاں آدمی پکڑنے کے لئے پہنچا۔ گدھے کے پاس جاچھپے۔ غرض ایک گھنٹہ بھر یہی کیفیت رہی کہ یہ بھاگا کئے اور بادشاہ کے نوکر بلکہ خود بادشاہ۔ اللہ اکبر۔ ان کے پیچھے پھرا کیا۔ مگر انہوں نے وہی کیا جو شامت اعمال سے ہونا تھا۔ اب فرمایئے کہ یہ شخص کسی سزا کا مستحق ہے یا بادشاہ کواس پر رحم آنا چاہیے۔ یہ تو اس قابل ہے اگر ایک دفعہ بھی یہ حرکت اس نے کی ہے تو توہین بادشاہ کے جرم میں اس کو لے لیا جائے اور کبھی دربار کی حاضری کی اجازت نہ ہو۔

ہماری نماز پر سزا نہ ہونا غایت رحمت ہے

اب آپ اپنے معاملہ کو اللہ میاں کے ساتھ دیکھ لیجئے کہ ادھر سے تو حاضری کی اجازت ہر

وقت یعنی نفل نماز کے لئے اجازت ہے جب چاہو پڑھو (باستثناء تھوڑے سے وقتوں کے) مگر ہمیں توفیق نہیں ہوتی کہ اس اجازت کو غنیمت سمجھیں یہاں تک کہ پکڑ کر بلانے کی نوبت پہنچی۔ یعنی فرض نماز کا وقت آیا نہایت کاہلی کے ساتھ گرتے پڑتے پہنچے۔ برا بھلا وضو کیا اور باکراہ نیت نماز کی یعنی سامنے باتیں کرنے کو کھڑے کئے گئے۔ کھڑے ہوتے ہی منہ ایسا پھیرا کہ کچھ خبر نہیں صرف الفاظ زبان پر جاری ہیں۔ دھوکا دینے کے واسطے آداب شاہی بجا لا رہے ہیں یعنی سبحانک اللّٰھم (اے اللہ تو ہر عیب سے پاک ہے) پڑھا' اللہ میاں نے اس منہ پھیرنے پر نظر نہ کی اور کلام شروع کیا۔

چنانچہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (سب تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جو تمام جہانوں کے پروردگار ہیں) پر جواب ملنا حدیثوں میں آیا ہے۔ ذرا سی بھنک کان میں پڑتے ہی ایسے بھاگے کہ سیدھے گھر آ کر دم لیا کبھی بیوی کے پاس کبھی بچوں کے پاس کبھی مکان میں کبھی طویلہ میں پہرا کئے۔ مراد اس سے خیالات کا جولانی دینا غرض یہی مسخرا پن کیا کیجئے یہاں تک کہ بہ مشکل تمام دربار کی حاضری ختم تک پہنچی یعنی سلام پھیرا۔ بڑی خیر ہوئی بادشاہ کی ہم کلامی سے بچ گئے جانے وہ کاٹ کھاتا یا کیا کرتا۔

(یہ خبر نہیں کہ کیا کرتا اور کیا ہوتا اور یہ کیا پاتے)۔ صاحبو! اب ان گستاخیوں کی سزا وہی ہونی چاہیے تھی یا نہیں' جو مثال میں میں نے عرض کی کہ اگر ایک دفعہ بھی ہم ایسی نماز پڑھتے تو کبھی اللہ میاں کے یہاں ہم کو گھسنے نہ دیا جاتا اور فوراً دربار سے نکلتے ہی گرفتاری اور حبس دوام کا روبکار جاری ہو جاتا۔ مگر سنیے کہ اللہ میاں سے کیسا روبکار جاری ہوا کَانَ سَعْیُھُمْ مَّشْکُوْرًا (تمہاری کوشش قابل قدر ہے) اس نے دربار میں آ کر اتنی دیر کی مصاحبت کو بہت اچھی طرح انجام دیا مر جانے کی بات ہے' اچھی طرح تو جیسے انجام دی وہ ہم بھی خوب جانتے ہیں۔ اور جو وہاں حاضر تھے' انہوں نے بھی خوب دیکھا۔ بلکہ حاضرین کے سامنے شرم رکھنے کے واسطے اور فرماتے ہیں اُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰتٍ (وہ وہی لوگ ہیں جن کے گناہوں کو خداوند کریم نیکیوں سے بدل دیتا ہے)۔ گویا یہ بیوقوف ہے کتنی ہی گستاخیاں کیں مگر ہم اس آنے کو حاضری ہی میں لکھ لیتے ہیں۔ اور اس کی وہی عزت کی جائے جو باقاعدہ آنے والے کی کی جاتی ہے۔ اب فرمایئے کہ اگر ایک مرتبہ ایسا معاملہ بادشاہ کسی کے ساتھ کرے تو کیا دوبارہ اس شخص کی ہمت پڑ سکتی ہے کہ پھر اسی طرح وحشیانہ طریق سے دربار میں جاوے ہرگز نہیں بلکہ سر سے پیر تک خجالت کے پسینہ میں غرق ہو جائے گا۔ مگر ہم ایسے احسان فراموش ہیں کہ ایک دو دفعہ کیا معنی سینکڑوں بار بلکہ ہر روز پانچ بار یہی جفا کاری کرتے ہیں مگر ادھر سے مطلق خیال نہیں

کیا جاتا۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ ان لنگڑے لولے اعمال (بلکہ اعمال کیسے کہا جا سکتا ہے بداعمالیوں کو) میں بھی کمی اور کوتاہی ہے، بلکہ خدا تعالیٰ کے محرمات کی طرف میلان ہے۔

صاحبو! ذرا شرماؤ اور عمل کرو اور حرام سے بچو۔ خاص کر رمضان کے مہینہ میں۔

تراویح کی منکرات کا بیان

یہ منکرات تو روزہ کے ہوئے۔ اب ایک عمل اور ہے خاص رمضان کا جیسے دن کا عمل روزہ ہے ایسے رات کا عمل قیام ہے۔ اس میں یوں خبط کر دیا کہ تراویح کی بیس رکعت گنتی میں تو پوری کر لیں مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان میں توریت پڑھی جاتی ہے یا انجیل پڑھی جاتی ہے۔ یا تو شروع کا حرف سمجھ میں آتا ہے یا رکوع کی تکبیر، ایک حافظ کا قصہ ہے کہ قرآن شریف پڑھتے پڑھتے جہاں بھولے وہاں کچھ اپنی تصنیف سے پڑھ دیا۔ بڑی تعریف ہوتی رہی۔ مدتوں کہ ان کو کہیں متشابہ نہیں لگتا۔ **لاحول ولاقوۃ الاباللہ** (نہیں نیکی کرنے کی طاقت سوائے توفیق خداوندی کے اور نہیں گناہوں سے بچنے کی ہمت سوائے توفیق خداوندی کے)

صاحبو! اللہ میاں کو دھوکہ مت دو۔ بیس رکعتیں گنا کر ذرا ڈھنگ سر بھی تو کر لو۔ ایک یہ ظلم ہوتا ہے کہ حافظ مقتدیوں کو بھگاتا ہے اس طرح کہ قراءۃ کو اتنا طول دیتا ہے کہ کوئی ٹھہر ہی نہ سکے۔ پانچ پانچ سپارے ایک ایک رکعت میں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو فرماتے ہیں **بشرا ولا تنفرا ویسرا ولا تعسرا**۔ خوشخبری سناؤ اور نفرت مت دلاؤ اور آسانی کرو اور تنگی میں مت ڈالو۔ ہاں ایسا ہی شوق ہے تو تہجد میں پڑھو جتنا چاہو اور اس میں اور جس کا جی چاہے شریک ہو جائے۔ مگر اس میں بھی امام کے علاوہ تین سے زیادہ جماعت میں نہ ہوں کہ فقہاء نے مکروہ کہا ہے کیونکہ پھر نفل میں فرض کا سا اہتمام ہو جائے گا۔ بعضے لوگ ایک ہی شب میں ختم کرتے ہیں جسے شبینہ کہتے ہیں۔ اس میں تو کئی بدعتیں ہیں۔ غور کر کے دیکھ لیجئے کہ اس میں نیت صرف نمود کی ہوتی ہے کیا امام اور کیا مہتمم اور کیا سامعین۔ امام تو داد ملنے کے امیدوار رہتے ہیں کہ جہاں سلام پھیرا اور لوگوں نے منہ پر تعریف کر دی تو خوش ہو گئے ورنہ پڑھا بھی نہیں جاتا حدیث شریف میں منہ پر تعریف کرنے والے کے لئے حکم ہے کہ اس کے منہ میں خاک جھونک دو، اور امام صاحب کے قلب پر بھی اثر ہوتا ہی ہے اور اسی تعریف کرنے والے کو بعضے امام تو لقمہ بھی نہیں لیتے اسی وجہ سے کہ لوگ کہیں گے کہ اچھا یاد نہیں۔ اور مہتمم تو سامعین میں شامل ہی نہیں ہوتے۔ چائے پانی ہی سے فرصت نہیں ہوتی۔

میں پوچھتا ہوں کہ شبینہ سے چائے پانی مقصود ہے یا قراءت وسماعت۔ قرآن میں ایک شے البتہ چائے سے مدد مل جاتی ہے۔ سماعت اور قراءت میں۔ مگر جب ذریعہ مقصود میں مخل[1] ہوئے تو ذریعہ کہاں رہا اور یہ بھی جانے دیجئے مہتمم صاحب کو تو یہ ثابت کرنا منظور ہے کہ ہمارے یہاں فلانی مسجد سے اہتمام اچھا رہا۔ بس چائے پانی اچھا رہا۔ مگر اصل شے تو اچھی نہیں رہی اور رہے سامعین تو انصاف سے کہہ دیجئے کہ وہ قرآن شریف سننے کے لئے آتے ہیں یا نماز کے ساتھ دل لگی کرنے کو کچھ کھڑے ہیں کچھ بیٹھے ہیں۔ کچھ کبھی کھڑے ہو جاتے ہیں کبھی بیٹھ جاتے ہیں۔ کبھی کچھ لوگ بیٹھ بھی نہ سکے تو نیت توڑ کر لیٹے لیٹے سن رہے کریں بھی کیا بیچارے گھنٹوں تک کیسے کھڑے رہ سکتے ہیں اور بعضے جو اپنے اوپر جبر کر کے کھڑے بھی ہیں تو امام کی ذلتوں[2] کو چھوڑتے جاتے ہیں۔ وہ خواہ کیسی ہی غلطی کرتا چلا جائے بتلا نہیں سکتے کیونکہ حرج ہوگا اور قرآن شریف ختم سے رہ جائے گا اور بعض تو یہ غضب کرتے ہیں کہ خارج صلوٰۃ سے لقمہ دیئے جاتے ہیں۔ اس صورت میں اگر امام نے لیا تو نماز سب کی فاسد ہوئی اور نہ لیا تو وہ غلطی اگر مغیر معنی[3] ہے تو نماز فاسد ہوئی۔ اب ان سامعین کا گھنٹوں سے اپنے اوپر جبر کرنا بالکل ضائع گیا۔ علیحدہ بیٹھ کر سننا اور یہ برا ہوا اور تکلیف مفت میں ہوئی۔ غرض لقمہ لینے کی صورت میں بھی معصیت ابطال[4] عمل کی لازم آئی اور نہ لینے سے بھی نماز فاسد ہوئی ان سب صورتوں کو ملا کر آپ ہی کہہ دیجئے کہ نماز ہے یا کھیل۔ احکام ظاہری کے لحاظ سے بھی تو نماز صحیح نہ ہوئی۔ خشوع وخضوع کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

اور ایک خرابی شبینہ میں یہ بھی ہے کہ اکثر نفل کی جماعت لازم آتی ہے کیونکہ بعض ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اس کو تراویح کی جماعت میں کرتے ہوں کیونکہ سب مقتدیوں سے یہ نہیں ہو سکتا' کہ اول سے آخر تک شریک رہیں اور اسی کو تراویح رکھیں۔ اس لئے تراویح علیحدہ پڑھ لیتے ہیں پھر نفلوں میں اس کو پڑھتے ہیں اور نفلوں میں جماعت مکروہ ہے۔ غرض بہت سے منکرات اس شبینہ میں لازم آتے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ بعض حفاظ اپنا اپنا پڑھنے کے بعد مغالطہ دینے آتے ہیں۔ یہاں آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سننے کو آئے ہیں اور یہ بے ادبی نہیں ہے اور ایسے ہی بہت سے بدعات ہیں۔

ہاں اگر شبینہ میں ختم ہی مدنظر ہے (مگر اخلاص کو غور کر لیجئے گا) تو امر حسن ہے اس میں بھی

---

[1] مخل۔ خلل انداز [2] زلتوں۔ لغزشوں [3] مغیر معنی۔ معنی کو بدلنے والا [4] ابطال عمل۔ عمل کو باطل اور غیر نفع بخش بنا دینا۔

اعلان کی ضرورت نہیں تا کہ ریاء وسمعۃ[1] سے خالی رہے۔ جتنی ہمت ہو قرآن شریف پڑھو۔ امام کو گڑ بڑ میں نہ ڈالو اور سب منکرات مذکورہ سے بچو۔

عورتوں کو نامحرم کا قرآن سنانا بھی خالی از قباحت نہیں ہے

ایک بدعت رمضان میں یہ ہے کہ نامحرم حفاظ گھروں میں جا کر عورتوں کو محراب سناتے ہیں۔ اس میں چند قباحتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اجنبی مرد کی آواز جب وہ خوش آوازی کا قصد کرے عورت کے لئے ایسی ہے جیسے اجنبی عورت کی آواز مرد کے لئے۔ اور رواج یہی ہے کہ خوش آواز مرد تلاش کئے جاتے ہیں۔ اور حافظ صاحب بھی مردوں کی جماعت میں تو شاید سادہ سادہ ہی پڑھتے ہیں یہاں خوب بنا بنا کر ادا کرتے ہیں۔ سو عورتوں کے لئے جماعت کی ضرورت ہی کیا ہے۔

اپنی اپنی الگ پڑھ لیں اور کچھ ضرورت محراب سننے کی نہیں ہے اگر حافظ ہیں تو فرادیٰ فرادیٰ اپنی تراویح میں ختم کرلیں اور اگر حافظ نہیں ہیں تو الم تر کیف سے پڑھ لیں اور ناظرہ جتنا ہو سکے پڑھ لیا کریں۔

کیوں روپیہ خرچ کر کے گناہ مول لیا۔ دوسری بدعت اس میں استیجار علی العبادۃ[2] ہے۔ یعنی حافظ صاحب سے اجرت دے کر قرآن شریف پڑھوایا جاتا ہے اور استیجار علی العبادۃ حرام ہے۔

قبر پر اجرت دے کر قرآن خوانی کرنا حرام ہے

یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قبر پر جا کر حافظ کو مقرر کرنا جائز نہیں کیونکہ اس میں بھی استیجار علی العبادۃ ہے اس پر بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ کیا ہو گیا ہے۔ علماء نے میت کا ثواب ہی بند کر دیا۔ ہم کہتے ہیں اس کا ثواب ہی نہیں پہنچتا پھر بند کیا کر دیا کیونکہ ثواب پہنچنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اول عمل خیر کرنے والے کو ثواب ملتا ہے پھر اس کو اختیار ہے جسے چاہے بخش دے۔ جیسے اپنا مال جسے چاہے دے دے۔ اور یہاں خود کو ہی ثواب نہیں ملا تو بخشا ہی کیا۔ اگر کوئی کہے کہ قرآن شریف کا پڑھنا ثواب کی بات ہے اور اجرت لینا گناہ تو ایک معصیت اور ایک ثواب ہو گیا تو ثواب پہنچ جائے گا اور گناہ ہمارے ذمہ رہ جائے گا پھر ہم توبہ کرلیں گے تو یہ عمل حسن رہ گیا' تو ہم کہیں گے انما[3] الاعمال بالنیات (کاموں کا مدار تو نیتوں پر ہے)۔ قاری کی نیت دیکھ لیجئے

---

[1] سمعۃ۔ شہرت [2] استیجار علی العبادۃ۔ عبادت پر اجرت طلب کرنا۔

[3] الصحیح للبخاری ۱: ۲' سنن ابی داؤد: ۲۲۰۱' سنن الترمذی: ۱۶۴۷'
سنن النسائی باب: ۵۹ کتاب الطہارۃ' سنن ابن ماجۃ: ۴۲۲۷

کہ استحصال[1] مال ہے نہ ثواب۔ پھر ثواب کہاں جب اسی کو ثواب نہ ملا تو دوسرے کو کیا بخشے گا۔

بعض لوگ یہاں کہتے ہیں کہ یہ استیجار نہیں کیونکہ ہم کوئی مقدار مقرر نہیں کرتے جو ہمارے مقدر میں پہنچتا ہے۔ سبحان اللہ المعروف کالمشروط[2] جو بات مشہور ہوتی ہے اس میں ٹھہرانے کی کیا ضرورت ہوتی ہے اگر کسی طرح معلوم ہو جائے کہ یہاں کچھ نہ ملے گا وسط رمضان ہی میں حافظ صاحب چھوڑ کر بیٹھ رہیں۔ ثابت ہوا کہ مقصود حافظ صاحب کو اجرت ہی ہے ختم سے بحث نہیں۔ اگر کوئی شخص خالی الذہن ہو اور اس جگہ رواج بھی دینے کا نہ ہو تو جو کچھ ہدیہ قبول کیا جائے اس میں کچھ حرج نہیں بلکہ ان کو ان کی ضرورت کے موافق بطور ہدیہ دے دیا کرو اور چونکہ اس طرح سے دینے کی عادت نہیں اسی وجہ سے ان کی نیتوں میں فساد پیدا ہو گئے۔ اگر بلا سوال وحیلہ ان کے دے دیا جایا کرے تو نوبت کاہے کو آئے۔

ایک طالب علم کی حکایت

ایک طالب علم کا قصہ ہے کہ وہ ایک جگہ پڑھنے گئے کھانا مقرر نہ ہوا۔ اتفاق سے ایک موت ہوگئی اوروں کے لئے تو غمی تھی مگر اس بیچارہ کے لئے عید کا دن آ گیا۔ ان کا کھانا چالیس دن کے لئے مقرر ہو گیا۔ غنیمت سمجھا۔ جب چلہ قریب ختم کو پہنچا تو فکر ہوئی کہ پھر وہی فاقہ آتا ہے۔ اتفاق سے چلہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ایک اور موت ہوگئی۔ ان کے ایک چلہ کا سامان اور ہو گیا غرض اسی طرح کئی موٹے موٹے یکے بعد دیگر لڑھک گئے۔ ان طالب علم صاحب کو چاٹ لگ گئی اور ہر وقت انتظار میں رہنے لگے کہ کسی طرح کوئی مرے۔ ایک روز ایک شخص نے کہا کہ یہ طالب علم سارے محلّہ کو اسی طرح کھا جائے گا ورنہ اس کا کھانا مقرر کردو۔ کہیں اس طرح بھی اللہ میاں پہنچا دیتے ہیں۔ غرض یہ نوبت بد نیتی کی کاہے سے پہنچی صرف مستحقین کے خبر نہ لینے سے۔ یوں تو کبھی سالن بھی ڈنگ کا نہ ملے ہاں جمعرات کے دن حلوے آ جائیں گے اور جو کوئی جمعرات کی تخصیص سے منع کرے تو برا معلوم ہوگا۔ صاحبو! کیا آٹھ دن کا کھانا ایک دن کھا سکتے ہو۔ طالب علم غریب نے کیا قصور کیا ہے کہ ہفتہ بھر تک تو فاقہ کراؤ اور ایک دن اتنا لا کر رکھ دو کہ کھا نہ سکے۔ چاہیے کہ ان کی خدمت کر دی جایا کرے تا کہ ان کی نیت نہ بگڑے لوگوں نے تو اس کو بالکل چھوڑ ہی دیا اور سبب اس کا یہ ہے کہ

---

[1] استحصال۔ مال حاصل کرنا [2] المعروف کالمشروط۔ یعنی جو بات یا شرط رواج کے اعتبار سے عام اور مشہور ہوتی ہے وہ ایسی ہی ہے جیسے واقعۃً طے ہو چکی ہے۔

خادمان دین کولوگ حقیر سمجھتے ہیں اس لئے نہ ان کی کچھ وقعت ہے نہ خدمت اور اسی وجہ سے یہ بھی رواج ہوگیا کہ مؤذن وہی ہوتا ہے جو کسی کام کا نہ ہو لنگڑے لولے اپاہج جو کسی کام کے نہ رہیں وہ مؤذن بن جاتے ہیں پھر کوئی خبر نہیں لیتا۔ اس وجہ سے نیتیں بگڑ گئیں ایک میت کا چادر اکسی نے ایک فقیر کو دیدیا تھا۔ مؤذن کو جو خبر لگی تو فوراً پہنچے کہ واہ صاحب میرا حق اس کو دے دیا۔ خدا خدا کر کے تو یہ دن آتا ہے اس میں بھی ہمارا حق اوروں کو دے دیتے ہو۔

استیجار علی العبادۃ کا شیوع کیونکر ہوا اور انکے انسداد کا کیا طریقہ ہے

بیشک یہی بات ہے بہت انتظار کے بعد یہ دن نصیب ہوتا ہے مگر اس میں اس کا قصور نہیں ہے بلکہ ایک محلّہ کا قصور ہے۔ کیوں یہ نوبت پہنچائی اگر ہم لوگ مقرر کرلیں کہ گیارہ مہینہ میں اپنے کپڑوں کے ساتھ ایک کپڑا ان کو بھی بنادیں اور جہاں آپ کھاتے ہیں کبھی کبھی ان کی بھی دعوت کر دیا کریں اور اپنے خرچ کے روپیوں کے ساتھ ان کے لئے بھی کچھ روپیہ نکال دیا کریں۔ غرض غیر رمضان میں ان کی برابر خبر گیری کرتے رہا کریں۔ پھر رمضان شریف میں ان سے سوال کیا جائے کہ قرآن شریف سنادیجئے تو کیا نہیں سناویں گے۔ ضرور اور بخوشی منظور کرلیں گے۔ اس میں استیجار علی العبادۃ وغیرہ کی کوئی قباحت نہ لازم آئے گی۔ غرض اجرت پر حافظ سے قرآن شریف پڑھوانا جائز نہیں اور ایسے ہی عورتوں کو گھروں میں سنانا نامناسب ہے، میں کہتا ہوں جب عورتوں کو مسجد میں آنے سے روکا گیا ہے تو عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ مقصود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف مباعدت ہے مردوں اور عورتوں میں اور یہاں اختلاط لازم آتا ہے۔ کیا حاجت ہے عورتوں کو قرآن ختم سننے کی جب شارع علیہ السلام ہی کی طرف سے لازم نہیں کیا گیا تو ان کے ذمہ کچھ ضرور نہیں ہے۔ بس الم تر کیف سے پڑھ لیا کریں اور ایک خرابی اور ہوتی ہے کہ جب ایک جگہ حافظ عورتوں کے سنانے کے لئے مقرر کیا جاتا ہے تو سارے محلّہ سے عورتیں آ کر جمع ہوتی ہیں اور اس میں خروج[1] بلاضرورت ہے اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے المرأۃ عورۃ۔ عورت چھپانے کی چیز ہے۔

ختم قرآن کے دن کثرت چراغاں کے منکرات

ایک بدعت رمضان شریف میں چراغوں کی کثرت ہے ختم کے روز۔ لوگ یوں کہتے ہیں کہ اس میں شوکت اسلام ہے ہم کہتے ہیں رمضان میں ہی اظہار شوکت اسلام کی ضرورت ہے یا باقی

---

[1] خروج بلاضرورت ہے۔ بغیر ضرورت باہر نکلنا

تمام مہینوں میں بھی تو ہمیشہ چراغ بہت سے جلایا کیجئے یا یوں کہئے کہ اور دنوں میں اسلام کے چھپانے کا حکم ہے خوب جان لیجئے کہ شوکت اعمال صالحہ ہی میں ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ

آپ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ سنا ہوگا کہ جس وقت شام کو گئے ہیں اور نصاریٰ کے شہر کے پاس پہنچے تو کپڑوں میں پیوند لگے ہوئے تھے۔ اور سواری میں اونٹ تھا اس پر بھی خود سوار نہیں تھے۔ غلام سوار تھا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ یہاں اظہار شوکت کا موقع ہے کم سے کم گھوڑے پر سوار ہو جائیے۔

آپ نے بہت اصرار سے منظور کر لیا۔ جب سوار ہوئے تو گھوڑے نے کودنا اچھلنا شروع کیا۔ آپ فوراً اتر پڑے کہ اس سے نفس میں عجب پیدا ہوتا ہے (اللہ اکبر کیا پاکیزہ نفس حضرات تھے اپنے قلب کا خیال ہر وقت رہتا تھا) اور اظہار شوکت کے جواب میں فرمایا ''نحن قوم اعزنا الله بالاسلام ہم وہ قوم ہیں کہ اسلام سے ہی ہماری عزت ہے۔ چراغوں سے کہیں شوکت ہو سکتی ہے۔ شوکت اسلام تو اسلام ہی سے ہے۔ اسلام کو کامل کرو۔ میں کہتا ہوں ٹٹول کر دیکھو دلوں کو کہ اگر کوئی اور شخص تمہارے سوا مساجد کی زینت کر دے تو تمہیں ویسی خوشی ہوگی جیسی کہ اس بات سے ہوتی ہے کہ ہم نے اپنے خرچ یا اہتمام سے زینت کی ہے غور کر لیجئے کہ نہ ہوگی بس معلوم ہوا کہ صرف اپنا نام جتانے کے لئے ہے۔ ورنہ اظہار شوکت تو دونوں حالت میں برابر تھا۔ پھر ایک صورت میں فرحت کم کیوں ہوئی اور اس سے تو یہ روپیہ باذن مالک اگر مؤذن کو دے دیا جاتا تو اولیٰ تھا۔ مگر اس کو کیوں دیتے نام کیسے ہوتا۔ کیا یہ اسراف[1] نہیں ہے۔

اسراف کے معنی

میں کہتا ہوں اسراف کے معنی ہیں صرف المال بلا غرض محمود اور غرض کئی طرح کی ہوتی ہیں۔ اول غرض رفع ضرورت ہے یعنی ہر چیز کو اس مقدار پر اختیار کرنا کہ اس سے کم میں نہ ہو سکے۔

کپڑا پہننے سے تین غرضیں ہیں

مثلاً لباس کہ درجہ اول اس کی غرض کا رفع ضرورت ہے۔ یعنی ستر[2] اور یہ غرض ٹاٹ سے بھی

---

[1] اسراف۔ فضول خرچی [2] ستر۔ چھپانا

حاصل ہو سکتی ہے۔ دوسری غرض آسائش ہے۔ یہ لباس میں ٹاٹ سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ سردی کے موسم میں تھوڑی روئی کے لحاف سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ جب تک کافی روئی نہ ہو۔ شریعت میں اس کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ تیسری غرض آرائش ہے اور یہ بھی شریعت میں جائز ہے۔

ان الله جميل و يحب الجمال (اللہ تعالیٰ جمال والا ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے)

(الصحيح لمسلم كتاب الايمان: ۱۴۷، مسند احمد ۴:۱۳۳، مشكوة المصابيح ۵۱۰۸)

پس آرائش مباح ہے اور اس میں طبائع مختلف ہوتی ہیں۔ بعضوں کی غرض تو آرائش سے تحدیث[1] بالنعمۃ یعنی خدا تعالیٰ کی نعمت کا اظہار ہوا کرتی ہے اور یہ محمود ہے اور بعضوں کی غرض آرائش سے یہ ہوتی ہے کہ محتاج لوگ اس کی وسعت کو دیکھیں اور اپنی حاجت کا سوال کریں۔ اور ایک غرض عشاق کی آرائش سے ہے (جیسا حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے) وہ یہ کہ اللہ میاں کو اچھا معلوم ہو اور اس سے اچھی کوئی غرض نہیں ہو سکتی۔ دکھایا بھی جائے تو اللہ میاں کو۔

اور ایک غرض مباح ہے آرائش سے وہ یہ کہ اپنے ہی نفس کو لذت و فرحت ہو اس میں بھی کچھ حرج نہیں۔ یہ غرض صرف مال کی تو محمود ہیں اور اغراض میں سے ایک غرض مذموم بھی ہے اور وہ ریاؤ نمائش ہے تو جان لو کہ اول تو نفس ریاء ہی جائز نہیں پھر اس کثرت چراغ کے متعلق ایک دوسرا مقدمہ اور قابل نظر ہے وہ یہ کہ معصیت کو معصیت سمجھ کر کرنا اہل[2] ہے۔ اس سے کہ معصیت کو دین سمجھ کر کیا جائے تو چراغ ریاء کے لئے جلائے جاتے ہیں اور ریاء معصیت ہے۔ پھر یہ لوگ اس کو دین اور ثواب سمجھتے ہیں تو کتنی سخت بات ہوئی۔ یہ قباحتیں ہیں روشنی میں۔ علاوہ بریں اہتمام کرنے والے تو روشنی ہی میں مشغول رہتے ہیں۔ نماز میں ان کا دل نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات جس میں شرکت بھی نہیں ہوتی۔ اس روز کی تراویح ان کو معاف ہو جاتی ہے کہیں صفوں کے بیچ میں پھرتے ہیں کہیں ایک صف سے دوسری صف میں جاتے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو کوئی گردنوں کو پھلانگے گا اس کو پل کی طرح ڈال دیا جائے گا قیامت کے روز کہ مخلوق اس پر ہو کر گزرے گی۔ اتنے احکام کی مخالفت لازم آتی ہے۔ روشنی میں میں کہتا ہوں قرآن شریف اور احادیث کے احکام کیا اس لئے ہیں کہ بت پرست اس پر عمل کریں یا نصاریٰ عمل کریں اور مسلمان اپنے ہاتھوں میں لے کر بس فخر ہی کر لیا کریں۔

کچھ بعید نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت میں شکایت فرمادیں "یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی

---

[1] تحدیث بالنعمۃ۔ اظہار نعمت [2] اہل۔ زیادہ آسان

اَتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا'' قرآن کوصرف اپنے گھروں میں رکھنا اورزبان سے پڑھنا کافی نہیں بلکہ جو کچھ اس کے اندر ہے اس کو بھی دیکھو اوردل پر اثر ڈالو۔

ختم کی مٹھائی کے منکرات

اور ایک منکر ختم کے دن شیرینی کا تقسیم کرنا ہے اوراس کا منکر ہونا اگرچہ خلاف ظاہر ہے مگر میں سمجھائے دیتا ہوں یہ مٹھائی اگر ایک شخص کی رقم سے آتی ہے تو اس کا مقصود ریاء واشتہار وافتخار ہوتا ہے اوراگر چندہ سے ہوتی ہے تو اس کے تحصیل میں جبر سے کام لیا جاتا ہے اور جبر جیسا ایلام[۱] بدن سے ہوتا ہے ایسا ہی ایلام قلب سے بھی۔ جب دوسرے کو دبایا شرمایا جبر میں کیا شبہ رہا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ اس کا حکم اسی غصب کا سا ہے جو لاٹھی کے زور سے ہو۔ اللہ میاں اس تھوڑے ہی میں برکت دیتے ہیں جو رضاؤ خوشی کے ساتھ دیا جائے۔ اس کا خیال بہت ہی کم لوگ کرتے ہیں۔

مساجد کا استحکام ضروری ہے' نقش ونگار ضروری نہیں بلکہ ناجائز ہے

اکثر مسجدوں کے لئے بھی لوگوں سے محصل[۲] کی وجاہت کے ذریعہ سے وصول کرتے ہیں پھر اس میں بھی بعضے محض فضول زینت کے لئے جس کی ممانعت آئی ہے اگرچہ اپنے ہی مال سے ہو۔ ہاں استحکام[۳] منع نہیں ہے۔ مصالحہ عمدہ لگایا جائے۔ معمار تجربہ کار رہوں۔ اینٹ پختہ ہو۔ آرائش بالطبع کسی قدر ہو تو مضائقہ نہیں اوراس کی توکسی درجہ میں ضرورت ہی نہیں کہ لوگوں سے غصب کر کے آرائش میں خرچ کیا جائے۔ مسجد چھپٹر کی بھی ادائے نماز کے لئے کافی ہے بلکہ جو مقصود ہے یعنی خشوع وہ چھپٹر میں پکی مسجد سے کچھ کم نہیں ادا ہوتا بلکہ اس کے تو نقش ونگار میں ہی خیال بٹ جاتا ہے اور وہ اس سے محفوظ ہے تو جب اصل مقصود ہی حاصل نہ ہوا تو یہ تزئین کیا کرے گی۔ ایسا ہی حال ہے مٹھائی میں کہ اس میں بھی کہیں جبر کہیں تفاخر ہوتا ہے اوراس کا امتحان یوں ہوسکتا ہے کہ اگر وسط صلوٰۃ میں آدمی زیادہ جمع ہو جائیں تو مٹھائی کی فکر پڑ جاتی ہے۔ نمازیوں کو بھی اور مہتممین کو بھی۔ مہتممین کو تو اپنی آبرو کی پڑ جاتی ہے اور نمازیوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اب ایک ہی ایک بتاشہ ملے گا۔ خشوع تو کوسوں دور گیا۔ مٹھائی کیا آئی کہ اتنے گناہ چپکا لائی۔ علاوہ بریں اکثر عام بے نماز لوگ آتے ہیں اور تعجب نہیں کہ بعضے جنب[۴] بھی ہوں پھر لوگ باتیں کرتے اور مغالطے دیتے ہیں اورلغویات بکتے ہیں۔ غیبتیں کرتے ہیں اورایک دوسرے کا ظلم سمیٹتے ہیں۔

---

۱ ایلام۔ تکلیف وایذا پہنچانا ۲ حاصل کرنیوالا ۳ استحکام۔ مضبوطی ۴ جنب۔ وہ لوگ جو جنابت سے ہوں

مولد شریف کی مٹھائی بھی ایسی ہی ہے

یہی حال ہے مولود شریف کی مٹھائی کا۔ بعضے لوگ اس میں عرب کے فعل سے حجت پکڑتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اول تو کسی کا فعل حجت نہیں۔ پھر تم اپنے فعل کو ان کے فعل پر قیاس بھی نہیں کر سکتے۔ ان کی تو ایسی بے تکلف عادت ہے کہ جب کچھ آدمی رہ جائیں اور مٹھائی ختم ہو جائے کہہ دیتے ہیں خلاص۔ یعنی ہو چکی' ان کو یہاں کی طرح آبرو وغیرہ کی فکر نہیں ہوتی جس کو پہنچ گئی پہنچ گئی نہ پہنچے تو کچھ خیال نہیں۔ پس کہاں تمہارا فعل اور کہاں ان کا فعل

؎ کار پاکان را قیاس از خود مگیر　　گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(نیک لوگوں کو اپنے اوپر قیاس مت کرو اگرچہ شیر (درندہ) اور شیر (دودھ) ایک ہی طرح لکھا جاتا ہے)

میں کہتا ہوں شیرینی کی ایجاد کی وجہ اصل میں اظہار مسرت ہے' شکراً اللہ علی حصول النعمۃ۔ لیکن جب مباح (جائز) میں ایک منکر منضم ہو جائے بلکہ مستحب میں بھی تو اس کا ترک ضروری ہے اور اس سے تو یہ بہتر ہے کہ محتاجوں کو دے دیا جائے۔ جو روپیہ مٹھائی میں صرف ہوتا ہے محتاج کی خبر گیری بالاتفاق امر حسن ہے۔ تمام زمانہ میں کوئی بھی اس کا مخالف نہ ہوگا اور نہ منکرات لازم آئیں گے جو نماز میں مخل تھے اور شیرینی میں فی نفسہ کچھ حرج نہیں بلکہ حرج اس ہیئت میں ہے بلکہ اس ہیئت کے ساتھ بھی فسادات دور ہو جائیں' فساد لازم بھی اور فساد متعدی بھی۔ اور اس کے لئے پچاس برس سے کم میں کافی نہیں سمجھتا۔ جب کہ اصلاح کا سلسلہ برابر جاری رہے اور اصلاح میں اس وقت یہ کافی نہیں کہ خاص لوگ منکرات سے بچ جاویں کیونکہ عوام اپنے فعل کے لئے اسی کو سند گردانیں گے۔ اور عوام سے جلدی ازالہ منکرات کی توقع نہیں۔ پس اس وقت اصلاح یہ ہے کہ یہ عمل بالکل ہی ترک کر دیا جائے اور پھر اصلاح عقیدہ کا سلسلہ جاری رہے جب عام طور سے عقیدے درست ہو جاویں تب میں بھی اجازت دے دوں گا۔

لیکن اب تو بس ترک ہی کرایا جاوے گا۔ غور کر لیجئے۔ اور لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ (نماز کے قریب نہ جاؤ) کا قصہ نہ کیجئے۔ جہاں شیرینی کا جواز ہے وہاں ان منکرات کی حرمت بھی ہے اور جب تک دونوں جمع ہیں حرمت ہی کو ترجیح ہوگی۔

عید کے دن کی ایک بدعت کا بیان

منجملہ اور رسوم کے ہمارے قصبات میں ایک یہ رسم ہے کہ عید کے دن سحری کے وقت اذان

فجر کا انتظار کرتے ہیں اور اذان کے وقت کہتے ہیں کہ روزہ کھول لو۔ پھر کچھ کھاتے ہیں تو ان کے نزدیک اب تک رمضان ہی باقی تھا۔ شوال کی پہلی رات بھی گزر گئی اور ان کے یہاں ابھی روزہ ہی ہے۔ حدیث شریف میں تو **افطروا الرویته** (فتح الباری ۱۱۹:۴، المعجم الکبیر للطبرانی ۱۱:۲۸۶) اور ان کے یہاں ایک شب اور گزرنا چاہیے اور کوئی یہ نہ کہے کہ **افطروا الرویته** (چاند دیکھ کر عید الفطر کرو) پر عمل تو ہو گیا چاند دیکھ کر افطار کر لیا تھا۔ اب رات میں کھانا نہ کھانا' اور اذان کے وقت کھانا اپنا فعل ہے کیونکہ میں کہتا ہوں کہ انکار اکل یا عدم اکل پر نہیں بلکہ یہاں عقیدہ میں فساد ہے چنانچہ اس کو روزہ کھولنے سے تعبیر کرنا اس کی دلیل ہے اور یہ زیادت فی الدین نہیں تو کیا ہے ایسے موقع پر تو بالقصد رسم توڑنے کے لئے فجر سے پہلے ہی کھانا چاہیے۔

عمل عقیدہ میں مؤثر ہے

بعض کا خیال یوں ہے کہ عقیدہ بدل دو۔ اور درست کر دو۔ لیکن اعمال کے بدلنے میں عام مخالفت ہوتی ہے۔ اگر عمل باقی رہے جو کہ مباح ہے اور عقیدہ درست ہو جاوے تو کیا حرج ہے لیکن یہ خیال غلط ہے اس لئے کہ ثابت ہوتا ہے تجربہ سے کہ جیسا کہ عقیدہ کو اثر ہے عمل میں ایسا ہی اس کا عکس بھی ہے۔

نکاح بیوگان پر علماء کے اصرار کی وجہ

ایک مدت تک میں اس خیال میں رہا کہ علماء کیوں پیچھے پڑے ہیں۔ نکاح ثانی[1] کے جائز ہی تو ہے کیا کیا نہ کیا نہ کیا۔ پھر سمجھ میں آیا کہ حرج صدر سے نہیں نکلتا مگر عمل کو ایک مدت تک بدل دینے سے اس لئے رسوم میں عمل کی تبدیلی بھی ضروری ہے اور میرا یہ مطلب نہیں کہ عید کی شب میں کھانا فرض ہے۔

بلکہ اخراج حرج کے لئے ایسا کرنے سے ضرور ماجور ہوگا۔ اس کی نظیریں حدیث شریف میں موجود ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ منع فرما دیا۔ بعضے روغنی برتنوں میں نبیذ[2] بنانے سے' پھر فرماتے ہیں **کنت نهیتکم عن الدباء والحنتم فانبذوا فیها فان الظرف لایحل شیئا ولا یحرم** (**المصنف لابن ابی شیبة** ۳۴۴:۳) یعنی پہلے میں نے منع کر دیا تھا اب اس میں نبیذ بنایا کرو اور علت ارشاد بیان فرماتے ہیں۔ کہ برتن نہ کسی چیز کو حرام کرتا ہے اور نہ حلال کرتا ہے۔ پھر باوجود اس کے بھی منع فرما دیا تھا۔ صرف وجہ یہ تھی کہ لوگ شراب کے عادی ہیں۔ تھوڑے

---

[1] نکاح ثانی۔ بیوہ کا دوسرا نکاح [2] نبیذ۔ وہ کھارا پانی جس میں چھوہارے ڈال کر اسے میٹھا بنایا کرتے تھے۔

سے نشہ کو محسوس نہ کر سکیں گے اوران برتنوں میں پہلے شراب بنائی جاتی تھی اس لئے خمر[1] سے پورا اجتناب نہ کر سکیں گے اور گنہگار رہوں گے۔ پس پورے اجتناب[2] کا طریقہ یہی ہے کہ ان برتنوں میں نبیذ بنانے سے مطلقاً روک دیا جائے جب طبیعتیں خمر سے بالکل نفور ہو جائیں اور ذرا سے نشہ کو پہچاننے لگیں تو پھر اجازت دے دی جائے۔

رسوم اور بدعات کے متروک ہونے کا طریقہ

اسی طرح ان رسموں کی حالت ہے کہ ظاہری اباحت دیکھ کر لوگ اس کو اختیار کرتے ہیں اور ان منکرات کو پہچانتے نہیں جو ان کے ضمن میں ہیں تو اس کے لئے اصلاح کا کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا سوائے اس کے کہ چند روز اصل عمل ہی کو ترک کر دیں اور یہ بات کہ اصل عمل باقی رہے اور منکرات عام طور سے دور ہو جائیں سو ہمارے امکان سے تو باہر ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی نے یہ طریقہ اختیار فرمایا تھا تو ہم کیا ہیں اس کے سوا اور تدبیریں اختیار کرتے پھریں اور جب ایک تدبیر عقلاً بھی مفید معلوم ہوتی ہے اور نقلاً ثابت ہو چکی تو ضرورت ہی کیا ہے کہ اس سے عدول[3] کیا جائے۔

ایک رسم عید کے دن ایک کھانے کی تعیین کی ہے کہ سویاں ہی پکائی جاتی ہیں اس میں ایک مصلحت ہے جس کی وجہ سے اس کو اختیار کیا گیا ہے وہ یہ کہ اس کی تیاری میں زیادہ بکھیڑے کی ضرورت نہیں اور دن عید کا کام کاج کا ہوتا ہے اور مستحب ہے کچھ کھا کر عیدگاہ کو جانا اس لئے سہل الحصول چیز کو اختیار کر لیا۔ بعد ازاں دوست احباب کے یہاں بھیجنے کا رواج ہو گیا اس کی نظیر میں تہادی[4] الی العروس کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ثابت ہوا ہے۔ یوں کہتے ہیں کہ جیسے دولہا کے پاس خوشی کا دن دیکھ کر ہدیہ بھیجنا مستحسن ہے اسی طرح عید کا دن بھی خوشی کا ہے۔ احباب کے پاس کیوں تحفے نہ بھیجے جائیں۔

میں کہتا ہوں مقیس[5] علیہ ہی کو دیکھ لیجئے کہ ہر چند کہ تہادی الی العروس فی نفسہٖ موجب زیادتی محبت ہے لیکن واللہ بطریق رسم بھیجنا بغض کو بڑھاتا ہے۔ تجربہ اس پر دال ہے۔ ہاں خلوص کے ساتھ بھیجنے سے محبت بڑھتی ہے جیسا کہ دو دوست آپس میں ہدیہ کبھی کبھی بھیج دیا کریں اور رسم سے تو محبت بڑھتی نہیں۔

---

[1] خمر۔ شراب [2] اجتناب۔ پرہیز کرنا [3] عدول کرنا۔ گریز کسی چیز سے ہٹنا۔ [4] تہادی الی العروس۔ دولہے کی خدمت میں ہدیہ پیش کرنا۔ [5] مقیس علیہ۔ وہ بات جس پر کسی دوسری چیز کو قیاس کیا جائے

رسم سے ہدیہ بھی ناجائز ہوجاتا ہے

محبت اور خلوص کا جو اعلیٰ فرد ہے اسی کو دیکھئے کہ رسم کو دخل دینے سے کیا حقیقت اس کی رہ جاتی ہے اور وہ فرد وہ محبت ہے جو پیر و مرید میں ہوتی ہے کہ ایسی کہیں دو شخصوں میں نہیں پائی جاتی کہ جان سے زیادہ عزیز مرید کے نزدیک شیخ ہوتا ہے اور مال تو کیا چیز ہے اور کبھی کبھی شیخ کی خدمت میں نذر گزارا کرتے ہیں اور اس سے خلوص بڑھ جاتا ہے مگر جب اسی نذر کو رسم قرار دے دیا تو دیکھ لیجئے کہ زمانہ کی پیری مریدی کا کیا حال ہے۔ خلوص تو کیسا جس جگہ پیر صاحب پہنچ گئے۔ مرید آپ' آپ کو چھپنے لگے کہ ایسا نہ ہو کہ چندہ کی فہرست آ پہنچے۔ دعائیں مانگنی پڑتی ہیں کسی طرح پیر صاحب جلدی ٹلیں۔

اب فرمایئے کہ فی نفسہ[1] تو شیخ کو ہدیہ دینا موجب محبت تھا' یہاں موجب بغض کا ہے سے ہو گیا۔ صرف رسم سے۔ میرے ایک دوست کا قصہ ہے کہ ایک مدت تک انہوں نے حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس خط نہیں بھیجا۔ میں نے ان سے وجہ پوچھی تو کہا میں اس عرصہ میں خالی ہاتھ تھا' فکر میں ہوں کچھ روپیہ کہیں سے مل جائے تو عریضہ لکھوں میں نے کہا اس خیال میں مت پڑو۔ اب تو ضرور بلا ہدیہ خط بھیجو۔ اب دیکھ لیجئے کہ اس عرصہ تک اس خیال نے ان کو استفادہ سے روک دیا۔ فی نفسہ حسن ہو مگر قید رسم سے قبیح آ گیا' ایسے ہی عید کے دن کے ہدیہ ہیں۔

اس زمانہ کا ہدیہ اقراض ہے

اور اگر غور کیجئے گا تو ان ہدایا کو قرض پایئے گا کیونکہ دیتے وقت یہ ضرور نیت ہوتی ہے کہ اس کے یہاں سے بھی آئے گا اور اگر ایک مرتبہ نہ آئے تو ادھر سے بھی بند ہو جاتا ہے اور ہدیہ کی تعریف میں بلاعوض کی شرط ماخوذ ہے پس یہ ہدیہ بھی نہ رہا۔ پھر قرض دار ہونے سے یا قرض دار کرنے سے کیا فائدہ؟

حاصل یہ کہ جن اعمال میں فساد ہے ان اعمال سے ہی اجتناب چاہیے ذرا سی خوبی کو دیکھ کر بڑے بڑے منکرات میں پڑ جانا عقل سے بعید ہے۔

تمام وعظ کا خلاصہ

اب بیان ختم کرتا ہوں اور اصل مقصود کا خلاصہ پھر مختصراً اعادہ کرتا ہوں کہ روزہ رکھا مگر پیٹ

---

[1] فی نفسہ۔ بذات خود

حرام سے بھرا اور دن کو بھی غیبت وغیرہ میں مبتلا رہے تو یہ روزہ کس شمار میں ہے۔

حاصل یہ کہ روزہ کے آداب سیکھو اور عورتوں کو بھی سکھاؤ۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے **کم من صائم و قائم الحدیث** (**مسند احمد ۳: ۴۴۱، سنن الدارمی ۲: ۳۰۱، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۰۱۴**) یعنی بہت سے روزہ رکھنے والے اور قیام اللیل کرنے والے وہ ہیں کہ ان کی بھوک اور پیاس کی طرف اللہ میاں کو کچھ حاجت نہیں اور آداب کے موافق اگر ختم کرلیا تو اس کے حق میں فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم **تشفعان**

یعنی روزہ نماز دونوں شفاعت کریں گے پس اس شخص کے ساتھ دو محافظ موجود ہوں گے۔ عذاب سے بچانے کے لئے۔ پھر آپ کہہ سکتے ہیں کہ جس کے دو محافظ سرکاری موجود ہوں کیا اس کی نجات نہ ہوگی۔ خدائے تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔

الوعظ المسمی بہ

تقلیل المنام بصورۃ القیام

وھو الجزء الثانی من المجموعۃ

ملقبۃ بہ

ابواب المجاہدہ واسباب المشاہدہ

۱۴ رمضان المبارک ۱۳۴۰ھ کو نماز جمعہ کے بعد کھڑے ہو کر ۲ گھنٹے تک ارشاد فرمایا۔ جس میں اس بات کی وضاحت فرمائی کہ تقلیل منام کی تراویح کے ساتھ شریعت نے جو صورت تجویز فرمائی ہے اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ سامعین کی تعداد تقریباً ایک سو تھی۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ نے اسے قلمبند فرمایا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبہ ماثورہ

الحمد لله نحمدهٗ و نستعينه‘ و نستغفره و نؤمن به و نتوكل عليه و نعوذ بالله من شرور انفسنا و من سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له و من يضلله فلا هادى له و نشهد ان لا اِلٰه الا الله وحده لا شريک له‘ و نشهد ان سيدنا و مولانا محمداً عبدهٗ و رسوله صلى الله عليه وعلىٰ الٰه واصحابه وبارک وسلم ‘ امابعد......فاعوذ بالله من الشيطان الرحيم .

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالَّذِیۡنَ جَاهَدُوۡا فِیۡنَا لَنَهۡدِیَنَّهُمۡ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ (عنکبوت:۶۹)

(اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم انکو اپنے (قرب وثواب یعنی) جنت کے راستے ضرور دکھادیں گے اور بے شک اللہ تعالیٰ (کی رضا ورحمت) ایسے خلوص والوں کیساتھ ہے)

تمہید: غالباً سامعین کو یاد ہوگا کہ گذشتہ جمعہ کو بھی یہی آیت پڑھی گئی تھی اور اس کی تفسیر میں بہت سے ضروری مضامین بیان ہوئے تھے۔ مگر راس واساس سب کا مجاہدہ تھا۔ جس کے چار ارکان بتلائے گئے تھے۔ تقلیل طعام، تقلیل منام، تقلیل کلام و تقلیل الاختلاط مع الانام۔ اور یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ تقلیل طعام کو شریعت نے روزہ کی صورت میں مقرر فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ جو صورتیں اہل مجاہدہ نے تقلیل طعام کی اختیار کر رکھی ہیں شریعت میں اس کی مقصودیت کی اصل نہیں اور اس کے ضمن میں وجوہ ترجیح مجاہدہ شرعیہ کی مجاہدہ عرفیہ پر بیان کی گئی تھیں جن کا عدد اس وقت یاد نہیں اور اس وقت دو وجوہ ترجیح اور یاد آئے۔

فضیلت مجاہدہ شرعیہ

اور وہ یہ کہ مجاہدہ عرفیہ مظنہ ہے۔ فتنہ وغائلہ کا اور مجاہدہ شرعیہ میں یہ احتمال نہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ جو طریقہ مجاہدہ تقلیل طعام کا مرتاضین میں مستعمل ہے کہ کوئی ایک وقت کھانا کھاتا ہے کوئی دو وقت کھاتا ہے تو غذا میں بہت کمی کر دیتا ہے اس طریقہ سے عجب و ناز پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بزرگ خیال کرنے لگتا ہے کہ میں بڑا صاحب مجاہدہ ہوں کہ دوسروں سے کم کھاتا ہوں اور جو اس سے زیادہ کھاتے ہیں ان کو وہ بہائم و جانور سمجھتا ہے کہ یہ لوگ خاک مجاہدہ نہیں کرتے اور گو عجب کا علاج ممکن ہے مگر مشاہدہ یہی ہے کہ عجب کا اکثر علاج نہیں کیا جاتا اور علاج کرے کیونکر وہ تو اپنی حالت اچھی سمجھتا ہے کیونکہ عجب کے معنی یہ ہیں کہ اپنی حالت کو اچھا سمجھے اور جب وہ اپنی حالت کو اچھا سمجھے گا تو علاج کیسے کرے گا اور اگر علاج کرنا بھی چاہے تو ایک مانع قوی ایسا ہے جس کی وجہ سے ضعفاء کو علاج کی ہمت نہیں ہوتی۔

اصول سے اس عجب کا علاج (جو کم کھانے سے پیدا ہوا ہو) یہ ہے کہ خوب کھانے لگے۔ مگر اس میں ان کو یہ عار دامنگیر ہوتی ہے کہ تیرا کم کھانا تو مشہور ہو چکا ہے اب اگر کھانے پر گرے گا اور خوب کھانے لگے گا تو لوگ کہیں گے کہ بس اپنی اصل کی طرف لوٹ آئے ایک وقت کھانے پر نباہ تو نہ ہوسکا۔ اب یہ شخص محض مخلوق کے دکھانے کو ایک وقت کھاتا ہے تا کہ اس کا مجاہدہ لوگوں میں بنا رہے اور یہ ریا کا شعبہ ہے۔ اس کا علاج بھی وہی ہے کہ خوب کھانے لگے اور ایک وقت کی جگہ دو وقت کھانے لگے یہ علاج ایسا ہے کہ جو امر اس سے مانع ہے یہ اس کا بھی رافع ہے۔ مگر اس کے لئے ہمت کی ضرورت ہے کہ ایک دفعہ کو ننگ و عار کی پرواہ نہ کرے ان کو چولہے میں ڈالے اس کا خیال نہ کرے کہ لوگ کیا کہیں گے پھر تو اس علاج میں کچھ بھی دشواری نہیں۔ دشواری اسی وقت تک ہے جب تک ریا و عجب دل میں بھرے ہوئے ہیں۔ اور یہ بڑے سنگین امراض ہیں۔

بزرگوں نے لکھا ہے کہ ریا و عجب قلب میں سب سے اخیر میں نکلتے ہیں۔ واقعی ان دونوں سے بہت ہی کم لوگ بچے ہوئے ہیں ورنہ اکثر لوگوں کے تو رگ رگ میں عجب و ریا و کبر گھسا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ریا سے بچنے کی صورت میں ریا ہوتی ہے چنانچہ بعض ذاکرین جن کو ذکر جہر تعلیم کیا جاتا ہے وہ یوں کہتے ہیں کہ حضرت اس میں تو ریا ہوتی ہے۔ یعنی ہمیں ذکر خفی کی اجازت دیدی جائے مگر یاد رکھو اس میں نفس کا ایک کید ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ سبھی میں کید ہوتا ہے بلکہ

اس کا مدار شیخ محقق کی رائے پر ہے۔ جس کے لئے شیخ ہی خود ذکر خفی تجویز کرے اس میں تو کید نہیں اور جس کے لئے شیخ جہر تجویز کرے اور طالب خفی کو تجویز کرے تو اس میں کید ہے۔ اور وہ کید یہ ہے کہ یہ شخص یوں چاہتا ہے کہ میں ذکر میں آزاد رہوں لوگ میری ناغہ سے مطلع نہ ہوں اور یہ آزادی ذکر خفی ہی میں ہوسکتی ہے اگر تم سال بھر بھی ذکر نہ کرو تو ملنے ملانے والے یہی سمجھتے رہیں گے کہ چپکے چپکے کام کر لیتے ہوں گے اور ذکر جہر میں اگر ایک رات بھی آنکھ نہ کھلی تو سارا محلہ جان جائے گا کہ آج آنکھ نہیں کھلی بس سارا زور شور ختم ہوگیا تو اس میں ناغہ کا فوراً بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ اس لئے جب کوئی مجھ سے کہتا ہے کہ ذکر جہر میں تو ریا ہوتی ہے میں کہہ دیتا ہوں جس دن ناغہ ہوگا اس دن تواضع بھی پیدا ہوجائے گی خود شرماؤ گے کہ میری ناغہ کی سب کو اطلاع ہوگئی اور ذکر خفی میں یہ تواضع کہاں نصیب چاہے روز ناغہ کرتے رہو لوگ سمجھیں گے کہ مولانا ذکر خفی کیا کرتے ہیں اس لئے آواز نہیں آتی چاہے مولانا سو ہی رہے ہوں اس لئے یہ وسوسے واہیات اور فضول ہیں کہ ذکر جہر میں ریا ہوتی ہے۔ اس کا منشاء بھی ریا و عجب ہی ہے کہ تم اپنے نقص کو لوگوں سے چھپانا چاہتے ہو اور اس کا علاج یہی ہے کہ جہر کیا کرو الغرض تقلیل طعام کی جو صورت مرتاضین میں مستعمل ہے اس میں عجب و کبر کا بڑا غائلہ ہے اور اس کا علاج محققین کے اصول پر خوب کھانا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ اگر کسی عبادت میں عجب کا احتمال ہو تو اس کو ترک کردے اس طرح تو سب عبادات چھوٹ جائیں گی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب کسی عبادت کے دو طریقے ہوں جن میں سے ایک میں تو عجب کا مظنہ ہو اور دوسرے میں عجب کا احتمال بھی نہ ہو تو دوسرا طریقہ بہتر ہے اور شریعت نے جو صورت تقلیل طعام کی مقرر کی ہے (کہ روزہ میں صرف کھانے کے اوقات کو بدل دو غذا میں کمی نہ کرو ۱۲) اس میں عجب تو کیا پیدا ہوتا بلکہ اس کا مقابل تواضع پیدا ہوجاتی ہے کیونکہ افطار کے وقت ایسا روزہ دار ٹھنڈے پانی پر برف پر اور مختلف قسم کے کھانوں پر گرتا رہے۔ رمضان میں اکثر گھروں میں اور دنوں سے زیادہ کھانے پکتے ہیں۔ روٹی کے علاوہ گوشت اور پھلکیاں اور چنے کے دانے وغیرہ بھی پکائے جاتے ہیں ۔ پھر احباب بھی کچھ بھیج دیتے ہیں۔ خصوص مؤذن تو رمضان میں ایسے مختلف کھانے کھاتے ہیں کہ امراء سے بھی اچھے پڑ جاتے ہیں۔ تو جو شخص اتنی چیزوں پر گرے گا اس میں عجب کیا پیدا ہوتا وہ تو اپنے کو بہت ہی شرمندہ پائے گا۔ کہ آج میں کتنا کھا گیا لوگ کیا کہتے ہوں گے اور پھر مزا یہ ہے کہ اس کے ساتھ مجاہدہ بھی حاصل ہوگیا۔ چنانچہ اس کا بیان پہلے ہو چکا ہے۔

مجاہدہ عرفیہ کی خرابی

اور ایک مفسدہ مجاہدہ عرفیہ میں وہ ہے کہ جس کو میں اپنے احباب کے سامنے اکثر کہتا رہتا ہوں ۔ اور اس کو میں نصف العلم کہہ سکتا ہوں وہ یہ کہ مجاہدہ عرفیہ والا اپنے اعمال کو زیادہ اور نعماء الہیہ کو کم سمجھتا ہے اور دوسرے لوگوں کو اعمال میں کم اور نعماء سے زیادہ منتفع ہونے والا خیال کرتا ہے۔ نیز خیال کرتا ہے کہ لوگ لذات سے منتفع ہیں اور میں لذات سے الگ ہوں حالانکہ تقلیل طعام تو مجاہدہ ہے مگر ترک لذات مجاہدہ نہیں یہ محض اہل ریاضت کی عادت ہے جو دلیل شرعی نہیں ہو سکتی ۔ شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں دیکھئے الذالاشیاء دنیا میں وقاع ہے لیکن شریعت نے بضمن نکاح اس کی ترغیب دی ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

یامعشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانها اغض للبصر واحصن للفرج.

(الصحیح للبخاری ۷:۳، الصحیح لمسلم کتاب النکاح ۱:۲، سنن النسائی ۴:۱۶۹)

(اے جوانوں کی جماعت تم میں سے جو مہر دے سکے اس کو نکاح کر لینا چاہئے کیونکہ یہ پست نظری اور شرمگاہ کی حفاظت کا باعث ہے)

اور ترغیب نکاح سے محض کسر شہوت ہی مقصود نہیں بلکہ لذت بھی مراد ہے ورنہ کسر شہوت کی تو اور بھی صورتیں ہیں چنانچہ رہبانیت ہے۔ اختصاء ہے کافور کھالینا ہے۔ بعض صحابہؓ نے اپنے اجتہاد سے یا راہبوں کو دیکھ کر اختصاء کی اجازت چاہی تھی ۔ تو حضورؐ نے نہایت سختی سے منع فرمایا۔ پھر شریعت میں عزل سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اس میں شبع کامل ولذت اکمل نہیں ہوتی ۔ اگر نکاح سے محض کسر شہوت ہی مقصود ہوتی تو عزل پر انکار نہ کیا جاتا اور گو بعض نصوص سے ترغیب سے مقصود توالد ہے لیکن وہ خود موقوف ہے لذت پر تو مشروط کی ترغیب شرط کی ترغیب ہے۔

روحانیت اور کثرۃ جماع

پھر نکاح کی ترغیب کے بعد کثرت وقاع سے بھی شریعت نے منع نہیں کیا۔ چنانچہ (قلت وکثرت طعام کے لئے تو کچھ حدود حدیث میں وارد بھی ہیں ثلث لطعامه و ثلث لشرابه و ثلث لنفسه کہ تہائی پیٹ کھانے میں بھرے اور تہائی پانی میں اور تہائی سانس کے لئے رکھے۱۲) مگر کثرت وقاع کے لئے شریعت میں کوئی حد وارد نہیں شریعت نے اس سے بحث ہی نہیں کی یہ طبی مسئلہ ہے۔ اس سے اطباء بحث کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کثرت وقاع سے باطن کو ضرر نہیں ہوتا ورنہ شریعت اس سے بحث کرتی۔

پھر اہل شریعت کا طرزِ عمل دیکھوتو ان میں سب سے بڑے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضور کی یہ حالت تھی کہ تقلیل طعام تو آپ نے کی ہے لیکن تقلیل وقاع کا آپ کے یہاں اہتمام نہ تھا۔ آپ کے پاس نو بیبیاں تھیں اور دو خاص باندیاں ملا کر گیارہ کا عدد پورا ہو گیا تھا تو بعض دفعہ آپ نے ایک رات میں سب سے فراغت کی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ قوت بھی اورلوگوں سے بہت زیادہ تھی۔ حضرات صحابہ فرماتے ہیں کہ ہم باہم کہا کرتے تھے کہ حضور میں تیس مردوں کی قوت ہے اور بعض روایات میں چالیس بھی آیا ہے۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے آپ کو امت سے زیادہ بیبیاں رکھنے کی اجازت دی بلکہ حضورؐ نے جو نو پر اکتفا کیا یہ بھی آپ کا صبر تھا۔ ورنہ آپ کو تو تیس چالیس نکاح کرنے چاہئیں تھے۔ اپنی قوت کے موافق مگر مخالفین نو ہی پر شور مچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ نے بہت نکاح کئے حالانکہ کثرت وقلت امور اضافیہ ہیں تمہاری قوت کے اعتبار سے اگر یہ مقدار زیادہ ہے تو کیا یہ عدد حضور کی قوت کے اعتبار سے بھی زیادہ ہے۔ ہرگز نہیں۔ آپ کی قوت کے لحاظ سے تو یہ کچھ بھی نہیں۔ غرض حضورؐ نے کثرت وقاع سے احتراز نہیں فرمایا۔ اگر یہ مضر باطن ہوتا تو آپ ضرور اس سے احتراز کرتے۔

اس پر شاید کوئی کہے کہ حضور ﷺ کو اس سے باطنی ضرر نہ تھا۔ اس لئے آپ احتراز نہ کرتے تھے۔ مگر ہم کو احتراز کرنا چاہیے تو میں کہتا ہوں کہ یہ وہی بات ہے جس کا جواب خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرما دیا۔ جس کا قصہ احادیث میں اس طرح ہے کہ حضرات ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے بعض صحابہ نے حضورؐ کے معمولات پوچھے۔ انہوں نے ظاہر فرمایا جس کا حاصل یہ تھا کہ آپ رات کو کچھ دیر سوتے ہیں کچھ دیر جاگتے ہیں۔ کچھ دیر عبادت کرتے ہیں کچھ وقت بیبیوں کی باتوں میں صرف کر دیتے ہیں کبھی روزہ رکھتے ہیں کبھی افطار کرتے ہیں۔ راوی کہتے۔ ہیں۔

فکانھم تقالوھا وقالوا این نحن من النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقد غفر اللہ ماتقدم من ذنبہ وماتاخر فقال احدھم اما انافاصلی اللیل ابداً وقال آخر انا اصوم النھار ابداً ولا افطر وقال الاخر انا اعتزل النساء فلا اتزوج ابداً

یعنی ان حضرات نے حضورؐ کے دستور العمل کو سہل دیکھ کر قلیل سمجھا اور کہنے لگے کہ حضور کو تو زیادہ عمل کی ضرورت نہیں اور تقلیل عمل مضر نہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے آپ کے سب اگلے پچھلے گناہ

بخش دیئے ہیں۔ (بالفرض اگر ہوں وگرنہ آپ میں گناہ کا وجود ہی نہ تھا ۱۲) لیکن ہم کو بوجہ اپنے نقصان مرتبہ کے زیادہ عمل کی ضرورت ہے۔ اس لئے ایک نے قسم کھالی کہ میں تو آج سے تمام رات نہ سوؤں گا یہ عمل شاق تو اس نے اختیار کیا۔ دوسرے بولے کہ میں ساری عمر روزے ہی رکھا کروں گا۔ تیسرے بولے میں کبھی نکاح ہی نہ کروں گا۔ صحابہؓ کی بھی عجیب حالت تھی کہ حضورؐ کے عمل قلیل دیکھ کر یہ خیال نہیں پیدا ہوا کہ لاؤ ہم بھی کم ہی کیا کریں کیوں مصیبت میں پڑے واقعی ہم تو اپنے مرشد کی عبادت کم دیکھ کر یہی کہیں کہ ہم کو بھی زیادہ کی کیا ضرورت ہے۔ مگر صحابہؓ نے اس کے برعکس یہ کہا کہ گو حضور کم کریں مگر ہم کو زیادہ ہی کرنا چاہیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور ان حضرات کے خیالات کی غلطی ظاہر فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ تم نے ایسا ایسا کہا یاد رکھو میں تم سے زیادہ حق تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔ لیکن باوجود اس کے

اصوم وافطر واصلی وارقد و اتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی متفق علیه: (الصحیح للبخاری والصحیح لمسلم)

یعنی میں کبھی روزہ رکھتا ہوں، کبھی افطار کرتا ہوں اور کچھ جاگتا ہوں، کچھ سوتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ (یہی میری سنت ہے) اور جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ تو دیکھئے ان صحابہ کے خیال کا یہی حاصل تھا کہ حضورؐ کو لذات کے استعمال سے ضرر نہیں ہوتا مگر ہم کو ضرور ہوگا۔ اس لئے ہمیں لذات سے بچنا چاہیے۔ مگر حضورؐ نے اس خیال کو خلاف سنت بتلایا۔ پس ثابت ہوا کہ کثرت وقاع سے ضرر کا اعتقاد رکھنا دین میں بدعت ایجاد کرنا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کثرت وقاع میں ہر شخص کو اپنی قوت کا اندازہ کر لینا ضروری ہے۔ اسراف تو ہر شئے میں مذموم ہے پھر حضورؐ کے بعد صحابہؓ کے طرز عمل کو دیکھا جائے تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ رمضان میں افطار کر کے عشاء کے وقت تک گیارہ عورتوں سے فارغ ہوا کرتے تھے۔ ان میں باندیاں بھی تھیں۔ شاید کوئی یہ کہے کہ مغرب سے عشاء تک وقت ہی کیا ہوتا ہے، جس میں گیارہ سے فراغت کر لیتے تھے اور جلدی جلدی فارغ ہوتے تھے تو یہ ان کے ضعف کی دلیل ہے اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کے زمانہ میں عشاء کی نماز دیر میں ہوتی تھی اس لئے ان کو کافی وقت ملتا تھا اور ہم اس لئے جلدی پڑھتے ہیں کہ شاید زیادہ دیر کرنے سے کوئی نماز ہی کو نہ آوے۔ اور ہم کسی کو کیوں کہیں ہمیں سب سے پہلے اپنا ہی احتمال ہے کہ شاید ہم ہی نہ آویں۔ غرض صحابہ کا کثرت وقاع میں

یہ طرز عمل تھا اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ یہ وہ بزرگ ہیں جو اتباع سنت و زہد و عبادت میں صحابہ کے اندر ممتاز تھے۔ ان کے طرز سے بھی معلوم ہوا کہ کثرت وقاع زہد و عبادت کیخلاف نہیں اور نہ باطن کو مضر ہے اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی لذت نہیں۔ جب شریعت نے اس سے نہیں روکا بلکہ ترغیب دی ہے تو ثابت ہوا کہ ترک لذات کو مجاہدہ میں کوئی دخل نہیں یہ محض اہل ریاضت کا معمول ہے اگر اس میں اعتقاد فاسد نہ ہو تو ایک طبی معالجہ ہے۔ بس افطار میں شربت و برف پینا خلاف مجاہدہ ہرگز نہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک مجاہدہ عرفیہ والے کی نظر اپنے مجاہدہ پر ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے کو نعماء الٰہیہ سے بہ نسبت دوسروں کے کم منتفع سمجھتا ہے اور زیادہ کھانے والا اس بلا میں مبتلا نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنے کو سر سے پیر تک خدا کی نعمتوں میں غرق پاتا ہے اور پھر سمجھتا ہے کہ میں مجاہدہ کیا خاک کرتا ہوں۔ روزہ افطار کر کے تو میں نے اتنا کھا لیا کہ دو آدمی بھی اتنا نہ کھاتے اس لئے اس میں تواضع کی شان پیدا ہوتی ہے۔

شکر نعمت

اور جو تقلیل طعام کرنے والا اپنے کو نعماء الٰہیہ سے کم منتفع ہونے والا سمجھتا ہے وہ احمق بس خدا کی نعمتوں کو روٹیوں ہی میں منحصر سمجھتا ہے۔ حالانکہ اس کے سوا اور ہزاروں نعمتیں خدا کی اس پر ہیں جن میں یہ شخص سر سے پیر تک غرق ہے۔ مثلاً درندوں اور سانپ بچھو سے حفاظت کی جاتی ہے یہ کتنی بڑی نعمت ہے خدا نے لباس دیا یہ نعمت ہے علم دیا یہ نعمت ہے۔ عزت و جاہ دی یہ نعمت ہے اپنے ذکر کی توفیق دی یہ نعمت ہے۔ مکان دیا بیوی بچے دیئے یہ نعمت ہے ہم زبان لوگوں میں رکھا یہ نعمت ہے۔ اور اس نعمت کی قدر بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں مثلاً جب کہیں غیر ملک میں سفر کا اتفاق ہو جہاں کی زبان آپ نہ جانتے ہوں اور نہ وہاں کوئی آپ کی زبان جانتا ہو تب اس کی قدر معلوم ہوتی ہے کہ ہم زبانوں میں ہونا کتنی بڑی نعمت ہے۔ ایک حاجی اپنا قصہ بیان کرتے تھے کہ وہ حج کو جاتے ہوئے راستہ میں سویس پر اتر پڑے وہاں اردو داں کوئی نہ تھا۔ اب یہ اپنے لئے مکان اور کھانے کا انتظام کرنا چاہتے ہیں مگر ان کی سمجھے کون بے حد پریشان ہوئے ایک شخص نے صرف ہندی داں کا پتہ بتلانے کے لئے ان سے چار روپے اجرت کے لئے وہ ڈاک خانہ کا ایک ملازم تھا یہودی، تب یہ اس کے پاس پہنچے اور نہ معلوم پہلے شخص سے اجرت کا معاملہ کیوں کر طے کیا ہوگا اور کس طرح اشاروں میں یہ مفہوم ادا کیا ہوگا۔ میں کسی ہندی داں سے ملنا چاہتا ہوں کیا خبر زبان

باہر نکالی ہوگی یا کس طرح سمجھایا گیا ہوگا۔

زبان باہر نکالنے پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک شخص ہرن خرید کر لایا کسی نے اس کی قیمت پوچھی اس کی قیمت گیارہ روپے بتلانا چاہتا تھا مگر یہ لغت یاد نہیں آیا اس لئے اس نے گیارہ روپے کا عدد اس طرح بتلایا کہ اول ایک ہاتھ کی انگلیاں کھول کر پانچ کا عدد بتلایا پھر دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے پانچ اور بتلانا چاہا تو ہرن کی رسی منہ میں پکڑ لی دس تو یہ ہوئے پھر گیارہواں بتلانے کے لئے زبان باہر نکال دی ترکیب تو اچھی تھی مگر نتیجہ یہ ہوا کہ ہرن بھاگ گیا تو صاحبو! زبان کا نطق بھی خدا تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے جس کو ہم رات دن قینچی کی طرح چلاتے رہتے ہیں۔ پھر زبان دینے کے بعد ہم زبانوں میں رکھنا یہ بھی بڑی نعمت ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

ہرکہ اواز ہم زبانے شد جدا　　بے نواشد گرچہ داروصد نوا

ترجمہ: جو اپنے ہم زبان کسی سے جدا ہوا وہ کتنا ساز و سامان رکھتا ہو بے نوا ہے۔

مولانا نے تو کسی اور حالت پر فرمایا ہے مگر اس حالت پر بھی یہ چسپاں ہوتا ہے۔ مولانا کی مراد تو ہم زبان سے ہم زبان باطنی یعنی ہم راز ہے شیخ محقق ہو جماعت ذاکرین ہو کہ جب ذاکر اپنے شیخ یا اپنی جماعت سے الگ ہوتا ہے تو سخت الجھن میں پڑ جاتا ہے۔ واقعی نااہلوں میں پھنس کر اپنی جماعت کی قدر ہوتی ہے تو مولانا کی مراد ہم زبان سے ہم زبان باطن ہے۔ کیونکہ اس طریق میں ظاہری ہم زبان کی ضرورت نہیں۔ اگر طالب و شیخ کی زبان جدا جدا ہو جب بھی فیض ہوتا ہے۔ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں ایک رومی شیخ آئے تھے جن کا نام تھا سعد آفندی حضرت اس وقت مثنوی پڑھا رہے تھے اور تقریر اردو ہی میں فرمایا کرتے تھے مگر وہ محظوظ تھے۔ ایک خادم نے حضرت سے عرض کیا کہ اگر یہ اردو سمجھتے تو ان کو اور زیادہ حظ آتا۔ حضرت نے فرمایا کہ اس حظ کے لئے اس زبان کی ضرورت نہیں اور یہ شعر پڑھا۔

پارسی گو گرچہ تازی خوشترست　　عشق را خود صد زبان دیگرست

بوئے آں دلبر چوپراں می شود　　ایں زبانہا جملہ حیراں می شود

ترجمہ:۔ اگرچہ عربی اچھی ہے مگر فارسی ہی کہو۔ عشق کی سو زبانیں ہیں۔ جب محبوب کی خوشبو بکھرتی ہے یہ زبانیں سب حیران رہ جاتی ہیں۔

تو دیکھئے ہم زبانوں میں ہونا کتنی بڑی نعمت ہے۔ مگر وہ احمق ان نعمتوں پر نظر نہیں کرتا وہ

صرف دو روٹیوں ہی کو نعمت سمجھتا ہے۔ حالانکہ حق تعالیٰ کی نعمتیں اتنی ہیں کہ **وان تعدو انعمة الله لاتحصو ھا** (اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے) جس کا ادنیٰ طریقہ امتنان ہے جو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے بیان فرمایا ہے۔ ہر نفسے کہ فرومی رود ممد حیات است وچوں می آید مفرح ذات پس در ہر نفسے دو نعمت موجود است ودر ہر نعمتے شکر واجب یعنی جو سانس اندر جاتا ہے۔ معین حیات ہے اور جو سانس باہر آتا ہے وہ روح کا مفرح ہے۔ اس لئے ہر سانس میں دو نعمت ہیں اور ہر نعمت پر شکر واجب ہے اب خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا احصاء کیوں کر ہو سکتا ہے۔ تم جتنی مقدار معین کرو گے ہر سانس پہلی میزان کو غلط کر دے گا بلکہ خود یہ سانس ہی ایک نعمت ایسی ہے کہ اس کا بھی احصاء نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگوں نے حبس دم کر کے اس نعمت سے منتفع ہونے میں بھی تقلیل کی ہے مگر اس نعمت میں تقلیل کا قصد کرنا ان کا بیہودہ پن ہے۔ اور میں حبس دم کو بے ہودہ نہیں کہتا بلکہ اس خیال کو بیہودہ کہتا ہوں یعنی تقلیل نعمت کے خیال سے حبس دم کرنے کو ورنہ حبس دم تو بعض اغراض محمود کے لئے بزرگوں نے بھی کیا ہے۔

شاہ ابو سعیدؒ کا واقعہ

شیخ ابو سعید گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے تو ایک مرتبہ ایک تجلی کے اشتیاق میں جو ایک بار پہلے حاصل ہوئی تھی حبس دم کر کے یہاں تک عزم کر لیا کہ جب تک تجلی نہ ہوگی سانس نہ چھوڑوں گا جب بہت دیر ہوگئی اضطراراً شدت کے ساتھ جو سانس چھوٹا ہے اس کے صدمے سے پسلی ٹوٹ گئی۔ اس سے تجلی ظاہر ہوئی اور اس میں ایک ہاتھ ظاہر ہوا جس میں معجون کی طرح کوئی دوا تھی وہ ان کے منہ میں ڈال دی گئی اس کے کھاتے ہی پسلی جڑ گئی۔ اور اسی حالت میں یہ بھی حکم دیا گیا کہ چوزہ کا شوربا چند روز پیو۔ شیخ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ نے سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کو جو ان کے شیخ تھے اس واقعہ کی اطلاع دی۔ انہوں نے اسی روز سے چوزہ کے شوربے کا ان کے لئے اہتمام فرما دیا۔ مگر خدا کے لئے کوئی صاحب غلط کشف نہ گھڑنے لگیں کہ روز آ آ کر شیخ کو سنایا کریں کہ آج مجھے یہ کھانے کا حکم ہوا ہے آج یہ پینے کا حکم ہوا ہے جیسے آج کل ایک شیخ پورپ کی طرف ہیں ان کے یہاں کشف کا بازار بڑا گرم ہے ان کے مریدوں کو روز ایسے ہی کشف ہوتے ہیں کہ آج حکم ہوا ہے کہ فلاں شخص کو اتنے روپے دیدو۔ فلاں جگہ فاتحہ کر دو یا فلاں جگہ عرس میں شرکت کرو۔ فلاں ملازم کو ترقی دو۔ فلاں کو معزول کر دو اور وہ خدا کے بندے سب کو صحیح سمجھتے ہیں سو خوب سمجھ لو کہ شیخ محقق کے یہاں جھوٹے کشف نہیں چل سکتے وہاں قلعی کھل ہی جاتی ہے تو پھر کفش

پڑنے لگتے ہیں اور شیخ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ جس خاص تجلی کے اشتیاق میں حبس دم کر کے بیٹھے تھے اس کا پہلی بار حاصل ہونے کا واقعہ یہ ہوا تھا کہ شیخ نظام الدین بلخی رحمۃ اللہ علیہ نے بعد تعلیم ذکر وشغل کے نظر بصیرت سے یہ معلوم کر کے ذکر وشغل سے کہ ان میں عجب ہو گیا ہے سب ذکر وشغل چھوڑوا کر معالجہ کے طور پر شکاری کتوں کی خدمت ان کے سپرد کی تھی ایک مرتبہ یہ ان کتوں کو جنگل میں لے جا رہے تھے کہ کتوں نے دور سے کسی شکار کو دیکھا بس اب وہ کہاں تھے وہ بھی ہرن ہو گئے۔۔ کچھ دور تو شیخ ابو سعید ان کے ساتھ ساتھ بھاگتے رہے جب دیکھا کہ یہ میرے قابو سے باہر ہیں تو اس خوف سے کہ کہیں رسی ہاتھ سے چھوٹ جائے اور کتے بھاگ جائیں تو شیخ کا عتاب ہو گا۔ انہوں نے کتوں کی زنجیر کو اپنی کمر سے باندھ لیا کتوں نے جو زور میں دوڑنا شروع کیا تو بیچارے نہ سنبھل سکے گر پڑے اب یہ حال ہے کہ کتے دوڑتے چلے جا رہے ہیں اور یہ ڈھیلوں پتھروں پر گھسٹتے جا رہے ہیں بدن میں کانٹے چبھ رہے ہیں سر میں چوٹ آ رہی ہے مگر یہ راضی ہیں۔ اسی حالت میں ان پر ایک خاص تجلی نمودار ہوئی جس کی لذت میں سب تکالیف بھول گئے۔ ادھر حضرت شیخ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ پر ان کی حالت مکشوف ہوئی تو خدام سے فرمایا کہ ابو سعید پر اس وقت خدا کا فضل ہو گیا اور جنگل میں اسے دولت نصیب ہو گئی۔ جاؤ اس کو اٹھا لاؤ۔ پھر اسی وقت شیخ عبد القدوس رحمۃ اللہ علیہ کی روحانیت سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کو مکشوف ہوئی کہ شیخ فرما رہے ہیں نظام الدین؟ محنت لینے کا تو مضائقہ نہیں مگر ہم نے یعنی ہمارے مجاز نے تم سے اتنی محنت نہ لی تھی۔ شیخ نظام الدین کے اس عتاب سے کانپ گئے اور پھر کبھی شیخ ابو سعید سے ایسی محنت نہیں لی۔ تھوڑی دیر میں جو شیخ ابو سعید جنگل سے آئے۔ شیخ نے ان کو پھر ذکر وشغل میں لگا دیا جس کے بعد وہ حبس دم کا قصہ ہوا۔ اس قصہ کے بعد شیخ نے فرمایا ابو سعید جو دولت میں تمہارے گھر سے لایا تھا وہ آج تم کو سونپ رہا ہوں گویا حصول نسبت کی بشارت تھی۔

حضرت سررزیؒ کا واقعہ

اسی طرح شیخ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کے قصہ کی نظیر سررزی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ بھی ہے جو مولانا نے مثنوی میں فرمایا ہے۔ انہوں نے بھی کسی تجلی کے شوق میں جب کسی مجاہدہ سے کام نہ چلا حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ یا تو وہ تجلی ہو ورنہ میں اپنی حیات کو منقطع کر دوں گا وہاں سے جواب ملا کہ زندگی تیرے قبضہ میں تھوڑی ہی ہے۔ دیکھیں حیات کو کیسے منقطع کر دو گے انہوں نے فوراً

اپنے کو پہاڑ کے اوپر سے گرا دیا۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا چوٹ تک بھی تو نہ لگی۔ اب یہ بڑے جھنجلائے اور کہا یہ کیا مصیبت ہے کہ نہ مرنے دیں نہ جینے دیں یہ ناز کا مقام تھا اس لئے ایسے الفاظ کہہ گئے اور ان کے لئے یہ الفاظ خلاف ادب نہ تھے ہر وقت کا جدا ادب ہے مولانا فرماتے ہیں۔

؎ گفتگوئے عاشقاں درکار رب　　　جوش عشق است نے ترک ادب

ترجمہ:۔ رب کے معاملے میں عاشقوں کی گفتگو ترک ادب نہیں کہلاتی وہ جوش عشق ہے آگے فیصلہ خوب ہے۔

؎ بے ادب ترنیست زدکس در جہاں　　　باادب ترنیست زدکس در نہاں

یعنی باطن میں اس سے بڑھ کر باادب کوئی نہیں اور ظاہر میں اس سے بڑھ کر بے ادب کوئی نہیں کیونکہ ظاہر میں بعض دفعہ اہل ناز ایسے الفاظ کہہ ڈالتے ہیں کہ دوسرا کہے تو مردود ہو جائے مگر وہ غلبہ حال کی وجہ سے معذور ہوتے ہیں مگر باطن میں وہ اتنے مؤدب ہوتے ہیں کہ جان تک فدا کر دیتے ہیں غرض جب پہاڑ سے بھی گر کر نہ مرے اور یہ کہا کہ نہ مرنے دیں نہ جینے دیں تو غیب سے ارشاد ہوا کہ تم خود ہی تجویز کرتے ہو راستہ ہم سے پوچھو جب وہ تجلی نصیب ہوگی پوچھا کہ پھر بتلا دیجئے وہ کیا راستہ ہے حکم ہوا کہ بارہ برس تک بھیک مانگو۔ چنانچہ یہ خلوت ترک کر کے شہر میں آئے اور در بدر بھیک مانگنے میں لگ گئے اور کہیں کہیں دھکے اور مکے بھی کھائے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

؎ ایں چنیں شیخ گدائے کوبکو　　　عشق آمد لا ابالی فاتقوا

ترجمہ:۔ ایسے شیخ کو عشق نے کوچہ کوچہ کا گداگر کر چھوڑا عشق بہت بے پرواہ ہے۔

بارہ برس جب بھیک مانگنے کے پورے ہو چکے تو حکم ہوا کہ ابھی بارہ برس اور باقی ہیں۔ اب دینا شروع کرو۔ پوچھا دوں کہاں سے آپ نے جمع کرنے تو دیا ہی نہیں واقعی وہ اپنے عاشقوں کو خوب نچاتے ہیں کسی نے خوب کہا ہے گو الفاظ سخت ہیں۔

؎ عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن　　　دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

سوئے زلفش نظرے کردن درویش دیدن　　　گاہ کافر شدن وگاہ مسلماں بودن

ترجمہ:۔ عشق کیا ہے محبوب کا غلام بننا' دل دوسرے کو دینا اور حیران رہ جانا کبھی اس کی زلفیں دیکھنا اور کبھی چہرہ اور کبھی فانی اور کبھی باقی ہونا۔

اس میں کفر سے مراد فنا ہے اور اسلام سے مراد بقاء یہ صوفیہ کی خاص اصطلاح ہے ولا مشاحۃ

فی اصطلاح جیسے کافر عشقم یعنی فانی عشقم قرآن میں بھی کفر کا اطلاق معنی حسن میں آیا ہے۔ جیسے:
وَمَنۡ يَكۡفُرۡ بِالطَّاغُوتِ اور ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں نے اپنی قوم سے کہا تھا'
کفرنا بکم ہم نے تم سے کفر کیا یعنی الگ ہوتے ہیں تو کفر کا لفظ اس شعر میں ظاہر ہی میں سخت معلوم ہوتا ورنہ معنی اچھے ہیں جیسے ان آیتوں میں اچھے معنی میں کفر کا استعمال ہوا ہے۔ غرض شیخ سررزی نے پوچھا دوں کہاں سے حکم ہوا کہ اب تمہارے پاس چاروں طرف سے دنیا آوے گی اس کو خرچ کرنا شروع کردو۔ چنانچہ اب ایک جگہ بیٹھ گئے اور فتوحات شروع ہوئیں بارہ برس تک خوب سخاوت کی اس کے بعد وہ نعمت حاصل ہوئی یہ گفتگو حبس دم کے سلسلہ میں آ گئی تھی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ سانس ہی ایک ایسی نعمت ہے کہ جس کا احصاء نہیں ہوسکتا مگر جو شخص مجاہدہ عرفیہ اختیار کرتا ہے وہ ان نعمتوں کو نعمت ہی نہیں سمجھتا بس وہ کھانے پینے ہی کو نعمت سمجھتا ہے اور جب اس نے کھانے پینے میں کمی کر دی تو وہ اپنے اعمال کو زیادہ سمجھتا ہے۔ اور نعماء الٰہی کو اپنے اوپر کم سمجھتا ہے گویا وہ دو روٹی کم کھانے سے خدا کے خزانے میں زیادتی کر رہا ہے۔ پاگل وہاں کیا بچت ہوتی۔ ایک ایک جانور اتنا کھانے والا ہے کہ وہاں تم جیسوں کو پوچھتا کون ہے۔ تمہاری ان دو روٹیوں کے کم کرنے سے وہاں کچھ اضافہ نہیں ہوتا پھر جب اس شخص کو اپنے اندر کیفیات و ذوق کی کمی محسوس ہوتی ہے تو خدا سے اس کے دل میں شکایت پیدا ہوتی ہے کہ میں اتنا مجاہدہ کرتا ہوں پھر بھی میرے حال پر رحم نہیں کیا جاتا حالانکہ

آنکس کہ تو نگرت نمی گرداند　　　او مصلحت تو از تو بہتر داند

ترجمہ:۔ جو تمہیں دولت مند نہیں بناتا وہ تمہاری بہتری تم سے زیادہ چاہتا ہے۔

نہ معلوم کیفیات پیدا ہوتیں تو تیرا کیا حال ہوتا۔ ادنیٰ بات تو یہ ہے کہ یہ شخص ان کو خدا کا فضل و انعام نہ سمجھے گا بلکہ اپنے مجاہدہ کا ثمر اور اپنا حق سمجھے گا کہ یہ تو ہونا چاہیے ہی تھا کہ میں اتنی مصیبتیں جھیلتا رہتا ہوں پس مجاہدہ عرفیہ والے کو نعمت باطن ملے تو وہ تو اس کے نزدیک اس کا حق ہے گویا یوں ہی ہونا چاہیے تھا اور نہ ملے تو شکایت کرتا رہے گا اور جو زیادہ کھا کر روزہ رکھتا ہے اور افطار میں بھی خوب کھاتا ہے اسے جب کوئی نعمت باطن حاصل ہوتی ہے تو وہ اس کو اپنا حق یا اپنے مجاہدہ کا ثمرہ نہیں سمجھتا کیونکہ وہ اپنے نزدیک صاحب مجاہدہ ہے ہی نہیں بلکہ وہ ہر نعمت کو فضل و انعام حق سمجھے گا۔ اور اگر کچھ ذوق و شوق و کیفیت حاصل نہ ہو تو اس کے دل میں خدا سے شکایت کبھی نہ

ہوگی بلکہ اپنے نفس ہی سے شکایت ہوگی کہ کم بخت تو کرتا ہی کیا ہے جو تجھے کچھ حاصل ہوتا تو یہ شخص متواضع بھی ہے اور شاکر بھی اور مجاہدہ عرفیہ والا معجب بھی ہے اور شاکی بھی یہ تو تمہ ہے ما سبق کا۔

تراویح اوران کی تعداد

اب میں مجاہدہ کے دوسرے رکن کو بیان کرتا ہوں دوسرا رکن ہے مجاہدہ کا تقلیل منام۔ رمضان اس کا بھی جامع ہے کہ اس میں ایک عبادت ایسی مشروع ہے جو تقلیل منام کو مستلزم ہے اور وہ تراویح ہے جس کا نام قیام رمضان ہے۔ حدیث میں ہے

ان اللہ فرض لکم صیامہ' و سننت لکم قیامہ'

(سنن النسائی ۴: ۱۵۸، مسند احمد ۱: ۱۹۱، کنز العمال: ۲۳۷۲۲)

(بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر (اس ماہ رمضان کے) روزے فرض کئے میں نے تمہارے لئے اس ماہ کا قیام (تراویح) سنت کی) اس پر سب کا اتفاق ہے کہ مراد قیامہٗ سے حدیث میں تراویح ہے۔ رہا عدد سو اس وقت اس کی اثبات سے ہم کو بحث نہیں عمل کے لئے ہم کو اتنا کافی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیس رکعت تراویح اور تین وتر جماعت کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ یہ روایت موطا امام مالک میں گو منقطع ہے مگر عملاً متواتر ہے۔ امت کے عمل نے اس کو متواتر کر دیا ہے۔ بس عمل کے لئے اتنا کافی ہے۔ دیکھئے اگر کوئی پنساری کے پاس دوا لینے جائیں تو اس سے یہ نہیں پوچھتا کہ یہ دوا کہاں سے آئی اور اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ وہی دوا ہے جو میں لینا چاہتا ہوں بلکہ اگر شبہ ہوتا ہے تو ایک دو جاننے والوں کو دکھلا کر اطمینان کر لیا جاتا ہے اب اگر کوئی پنساری سے یہ کہے کہ میرا اطمینان تو اس وقت ہوگا جب تم بائع کے دستخط دکھلا دو گے کہ تم نے اس سے یہ دوا خریدی ہے تو لوگ یہ کہیں گے کہ اس کو دوا کی ضرورت ہی نہیں اور پنساری بھی صاف کہہ دے گا کہ مجھے دستخط دکھلانے کی ضرورت نہیں' لیتے ہو لو نہیں لیتے ہو مت لو۔ اسی طرح محققین سلف کا طرز یہ ہے کہ وہ مدعی کے لئے مغز زنی نہیں کرتے تھے بس مسئلہ بتلا دیا اور اگر کسی نے اس میں حجتیں نکالیں تو صاف کہہ دیا کہ کسی دوسرے سے تحقیق کر لو جس پر تم کو اعتماد ہو ہمیں بحث کی فرصت نہیں۔ مولانا عبدالقیوم صاحب مقیم بھوپال رحمۃ اللہ علیہ سے جب کوئی مسئلہ پوچھتا تو کتاب میں دیکھ کر جواب دیا کرتے تھے اور فرما دیا کرتے تھے کہ کتاب میں یوں لکھا ہے اور جو کوئی حدیث پوچھتا تو فرما دیتے کہ بھائی میں تو مسلم نہیں ہوں میرے آباؤ اجداد سب مسلمان تھے اور اسی طرح ان کے آباؤ اجداد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک سب مسلمان تھے جو لوگ حضورؐ کے زمانہ میں تھے انہوں نے حضورؐ کے

طرز عمل کو دیکھ کر عمل کیا اور جوان کے بعد تھے انہوں نے اپنے بڑوں کو دیکھ کر عمل کیا اور جوان کے بعد تھے انہوں نے اپنے بڑوں کو دیکھ کر عمل کیا اسی طرح سلسلہ بہ سلسلہ ہمارے گھر میں وہی ہوتا آ رہا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل تھا۔ اس لئے مجھے حدیث ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں اس کی ضرورت تو نو مسلموں کو ہے اس جواب کا حاصل وہی قطع نزاع ہے کہ فضول بحث کو یہ حضرات پسند نہ کرتے تھے۔ بھلا عوام کو اگر بتلا بھی دیا جائے کہ حدیث میں یہ ہے تو ان کے طریق استنباط کا علم کس طرح ہوگا اس میں پھر وہ فقہاء کے محتاج ہوں گے تو پہلے ہی سے فقہاء کے بیان پر کیوں اعتماد نہیں کرتے۔

عمل بالحدیث

مولانا عبدالقیوم صاحبؒ بڑے عجیب بزرگ تھے۔ ایک مرتبہ بیگم صاحبہ ان کی زیارت کے لئے آئیں جب رخصت ہو کر گھر کو واپس جانے لگیں تو مولانا نے ان کے جوتے سیدھے کر دیئے وہ کہنے لگیں مولانا آپ نے یہ کیا کیا آپ تو ہمارے بزرگ ہیں۔ میں آپ کی جوتیاں سیدھی کرتی نہ کہ آپ نے مجھے شرمندہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ تم مجھ سے زیادہ بزرگ ہو۔ اور انہوں نے عرض کیا توبہ توبہ میں کیا چیز ہوں۔ میرے پاس اس کی دلیل ہے وہ یہ کہ میں بیس برس سے وعظ کہہ رہا ہوں کہ بیوہ عورتیں نکاح کر لیں مگر کچھ اثر نہیں ہوا یہ تو میری بزرگی تھی اب تم اپنی بزرگی کا امتحان کر دیکھو ایک اشتہار دے دو کہ جو بیوہ عورت نکاح نہیں کرے گی اس کو سزا ہوگی اور اگر بے سروسامانی کا عذر ہو تو سرکار کی طرف سے اس کے نکاح میں امداد کی جائے گی دیکھو پھر کتنی بیوہ عورتیں نکاح کرتی ہیں۔ بیگم صاحبہ کو علماء کی بڑی قدر تھی فوراً مولانا کے ارشاد کی تعمیل کی۔ اب کیا تھا دھڑا دھڑ نکاح ہونے لگے۔ دیکھئے مولانا نے دین کا کام کس خوبصورتی سے نکالا پھر افسوس کہ ان لوگوں کو ترک عمل بالحدیث رکھ لیا ہے۔ ورنہ واللہ عامل بالحدیث ہمارے ہی حضرات ہیں۔

البتہ کسی سے الجھنا اور بحث کرنا پسند نہیں کرتے اور اگر کوئی خواہ مخواہ الجھتا ہی ہے تو اس میں ان کا وہ مذاق ہے جو حاجی صاحب فرماتے تھے جب کوئی تم سے مناظرہ کرے تو سب رطب و یابس جمع کر کے اس کے سامنے رکھ دو کہ ان دلائل میں تم خود فیصلہ کر لو کون قوی ہے کون ضعیف ہے کونسی شق حق ہے اور کون سی باطل ہے۔ مجھے فیصلہ کی فرصت نہیں (کیونکہ تمہارے فیصلہ پر وہ پھر نقض وارد کر دے گا تو سلسلہ کلام ختم نہ ہوگا ۱۲) اور حضرت حاجی صاحب نے اس پر ایک حجام کی حکایت بیان فرمائی کہ وہ کسی کی حجامت بنا رہا تھا اس نے کہا کہ میری داڑھی میں سے سفید بال چن دینا اس نے استرہ لے کر ساری داڑھی مونڈ کر سامنے رکھ دی کہ جناب آپ خود سفید و سیاہ کو الگ کر لیجئے مجھے انتخاب کی فرصت نہیں۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک فحش حکایت مثنوی میں

بیان فرمائی کہ ایک شخص بیٹھا بانسری بجا رہا تھا کہ دفعتہً ریح صادر ہوئی تو اس نے بانسری ادھر لگا دی کہ بی اگر میرا بجانا تجھ کو پسند نہیں تو اب تو بجالے۔ حکایت تو ظاہر میں گندی ہے مگر اس کا مطلب عجیب ہے یعنی جب مدعی بک بک کرنے لگے تو تم خاموش ہو جاؤ اور اس سے کہو کہ میاں اب تم بولو ہم خاموش ہو جاتے ہیں۔ واقعی اس مضمون کے ادا کے لئے اس سے کوئی بہتر حکایت نہ تھی۔ صاحب حق کا بولنا ایسا ہی خوشنما ہے جیسا منہ سے بانسری کا بولنا کیوں کہ بانسری خود نہیں بولتی بلکہ اس کے اندر کوئی دوسرا بولتا ہے۔ یہی حال صاحب حق کا ہے کہ وہ خود نہیں بلکہ حق اس کی زبان سے بولتا ہے۔ بی یسمع بی ینطق بی یبصر الحدیث عارف فرماتے ہیں۔

ؔ درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند   آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

ترجمہ:۔ آئینے کے پیچھے طوطی کی طرح ہوں جو استاذ ازل کہتا ہے میں وہی کہتا ہوں اور جس طرح بانسری کی آواز سے انس و جن وحش وطیور مست ہو جاتے ہیں اسی طرح صاحب حق کی گفتگو ایک عالم کو منور کر دیتی ہے۔ اور مدعی کا بولنا ایسا ہی ہے جیسے مقعد کا بولنا کہ عالم میں اس سے بدعت اور گمراہی اور سرکشی کی سڑاہند پھیل جاتی ہے اس کا تو خاموش رہنا زیبا ہے لیکن اگر وہ بک بک کرنے لگے اور منع کی قدرت نہ ہو تو اس سے الجھو نہیں تم خاموش ہو جاؤ۔ اور اسے بولنے دو اہل بصیرت حق کی خوشبو اور باطل کی بدبو کا خود امتیاز کر لیں گے۔ الغرض عمل کے لئے تو تراویح کا اتنا ثبوت کافی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً اس کو مسنون فرمایا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں صحابہ عملاً تراویح کی بیس رکعتیں پڑھتے تھے عوام کے لئے اتنا کافی ہے اس سے زیادہ تحقیق علماء کا منصب ہے۔ اس سے اس وقت بحث نہیں۔ اس تراویح کا نام قیام رمضان بھی ہے کیونکہ یہ رمضان کے ساتھ مخصوص ہے اور احادیث میں اس کو قیام رمضان سے تعبیر کرنا اس کی دلیل ہے کہ تراویح تہجد سے الگ کوئی عبادت ہے۔ کیونکہ تہجد رمضان کے ساتھ مخصوص نہیں اور اس کے علاوہ اس پر اور بھی دلائل قائم ہیں کہ یہ دونوں الگ الگ عبادتیں ہیں۔

تراویح میں مجاہدہ

اب اصل مدعا سنئے کہ جس طرح صوم کو تقلیل طعام میں دخل ہے۔ اسی طرح تراویح کو تقلیل منام میں دخل ہے اور جیسا روزہ میں تبدیل عادت کی وجہ سے مجاہدہ کی شان آئی تھی اسی طرح یہاں بھی شریعت نے محض تبدیل عادت سے مجاہدہ کا کام لیا ہے کیونکہ عام عادت یہی ہے کہ اکثر

لوگ عشاء کے بعد فوراً سور ہتے ہیں تو نیند کے وقت میں تراویح کا امر کر کے عادت کو بدل دیا جس سے نفس پر گرانی ہوتی ہے جو کہ مجاہدہ ہے۔ پھر قاعدہ ہے کہ نیند کا وقت نکل جانے کے بعد پھر دیر میں نیند آتی ہے۔ اس طرح بھی تقلیل منام ہو جاتی ہے اور اگر کوئی شخص روزانہ دس بجے ہی سونے کا پہلے سے عادی ہو اسے بھی تراویح سے مجاہدہ کا ثمرہ اس طرح حاصل ہو جاتا ہے کہ آزادی کے ساتھ جاگنا گراں نہیں ہوتا مگر تقید کے ساتھ فوراً ہی گرانی شروع ہو جاتی ہے۔ دیکھئے آپ اپنی خوشی سے ایک جگہ گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں لیکن اگر تم سے یہ کہہ دیا جائے کہ میاں گیارہ بجے تک تم یہیں بیٹھے رہنا۔ تو بس اسی وقت سے آپ بھاگنا چاہتے ہیں۔ اور منٹ گراں گزرنے لگتا ہے۔ شریعت نے اس راز کو سمجھا اور محض ذرا سی تقید سے مجاہدہ کا کام لے لیا تو شریعت نے تقلیل منام کے لئے بھی عجیب مجاہدہ تجویز کیا ہے۔ واللہ شریعت پر تو یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

؎ زفرق تابقدم ہرکجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

ترجمہ:۔ سر سے پاؤں تک جہاں بھی دیکھیں کرشمہ وناز یہ کہتے ہیں کہ دل دینے کی جگہ تو یہ ہے۔ ایسی سہل شریعت کو پھر لوگ خونخوار کہتے ہیں ان کو خدا کا خوف نہیں آتا۔ اور اگر بالفرض کسی کو شریعت کے احکام میں کچھ گرانی معلوم بھی ہو تو آخر کیا تم کڑوی دوا نہیں پیتے۔ کریلے نہیں کھاتے۔ تمبا کو نہیں کھاتے جس سے اول اول چکر آتے ہیں مگر عادت کے بعد اس کے بغیر چین نہیں آتا تو یہی سمجھ کر تم ذرا اعمال شریعت کی عادت تو کر لو۔ واللہ پھر یہ خود تم کو چمٹ جائیں گے۔ معشوق اگر منہ نہ لگائے تو اس کی تلخی کیوں جھیلتے ہو اور معشوق تو اکثر تلخ مزاج ہی ہوتے ہیں۔ اگر وہ نرمی سے ملنے لگے تو پھر اس میں اور بازاری عورت میں کیا فرق ہے۔

؎ خوبی ہمیں کرشمہ وناز وخرام نیست بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

ترجمہ:۔ کرشمہ وناز ہی صرف خوبی نہیں معشوقوں کے ایسے بہت سے کرشمے ہیں جن کا کوئی نام ہی نہیں تو جب دنیا کے کاموں میں تلخی اور گرانی جھیلنے سے بچے ہوئے نہیں ہو پھر دین ہی کے کاموں میں اس سے بچنا کیوں چاہتے ہو خصوصاً جب کہ تلخی لذیذ بھی ہے جیسے تمبا کو والوں کو اس کی تلخی لذیذ معلوم ہوتی ہے اور اگر تم کو اس تلخی میں مزا نہیں آتا تو صبر ہی کر لیا ہوتا۔ جیسا دنیا میں بعض قوانین سخت ہوتے ہیں اور ان پر صبر کیا جاتا ہے۔ عارف فرماتے ہیں

؎ صبر کن حافظ بتلخی روز وشب عاقبت روزے بیابی کام را

ترجمہ:۔حافظ دن رات کی تلخی پر صبر کا انجام کار کسی روز کامیاب ہو جاؤ گے۔

یہ تو ان کے لئے ہے جو عاشق نہیں کہ تلخی کو محسوس کرتے ہیں اور جو عشاق ہیں ان کے لئے تو حافظ یوں فرماتے ہیں۔

؎ آں تلخوش کہ صوفی ام الخبائث خواند　　　اشہی لنا واحلی من قبلۃ العذاری

یعنی تلخی ہی محسوس نہیں ہوتی۔ تلخوش سے مراد طریق عشق ہے اور زاہد خشک اسی کو ام الخبائث اسی لئے کہتا ہے کہ عشق میں بعض دفعہ ظاہراً حدود شریعت سے تجاوز ہو جاتا ہے اور حقیقت میں وہ تجاوز نہیں ہوتا مگر اس حقیقت کی زاہد خشک کو خبر نہیں ہوتی۔اس لئے وہ اہل عشق پر خواہ مخواہ ملامت کرتا ہے۔

گرم بازاری عشق

اور اسی تلخی کے متعلق مولانا فرماتے ہیں۔

؎ ناخوش تو خوش بود بر جان من　　　دل فدائے یار دل رنجان من

ترجمہ:تمہاری ناخوشی میری جان کے لئے خوشی ہے رنجیدہ دل یار پر میرا دل فدا ہے۔

غرض عشاق کو احکام شریعت کی تلخی لذیذ معلوم ہوتی ہے جیسے مرچوں کی تیزی لذیذ ہوتی ہے مرچیں کھاتے ہوئے روتے بھی ہیں اور کھاتے بھی جاتے ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ رونا ہمیشہ محرومی اور رنج ہی سے نہیں ہوتا بلکہ رونا کبھی لذت سے بھی ہوتا ہے۔کعبہ کو پہلی بار دیکھ کر جو حال ہوتا ہے اس کو یاد کر لیجئے۔عشق کی خاصیت ہے کہ وصال کے وقت بھی آنکھ قبضہ میں نہیں رہتی۔اس وقت رونا آتا ہے مگر وہ رونا محرومی کا نہیں بلکہ دوسری ہی قسم کا رونا ہے کعبہ کو دیکھ کر یہ حال تو عام طور پر ہوتا ہے اور جن کی خاص حالت ہوتی ہے انہوں نے اس موقع پر جان دے دی ہے ایک عاشق کا قصہ ہے کہ وہ حج کو جارہے ہیں اول تو لوگ اس کو مسخرہ سمجھے مگر جب مکہ میں پہنچے اور مطوف کے ساتھ طواف بیت اللہ کو چلے تو جس وقت دروازہ میں سے بیت اللہ پر نظر پڑی ہے تو ان پر وجد طاری ہوا اور یہ شعر پڑھا۔

؎ چوں رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر　　　کہ مباد بار دیگر نرسی بدیں تمنا

ترجمہ:۔جب محبوب کے کوچے میں پہنچو تو جان دے دو کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر یہ تمنا حاصل نہ ہو سکے۔اور گرتے ہی جان نکل گئی۔بیت اللہ تک پہنچنے بھی نہ پایا غرض رونا کبھی دوسری قسم کا بھی ہوتا ہے جیسے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کہ مجھے حق تعالیٰ کا حکم ہوا ہے کہ تم ایک سورت پڑھ کر سناؤ تو وہ دریافت فرماتے ہیں۔ آ اللہ سمانی۔ کیا خدا تعالیٰ نے میرا نام لے کر فرمایا۔ حضورؐ نے فرمایا ہاں تو وہ رونے لگے۔ حضرت حاجی صاحب کی تحقیق ہے کہ رونا گرم بازاری عشق کا ہے۔ اسی کو عارف شیرازی فرماتے ہیں

؎ بلبل برگ گلے خوشرنگ در منقار داشت　　واندراں برگ ونوا خوش نالہائے زار داشت

گفتمش درعین وصل ایں نالہ وفریاد چیست　　گفت مارا جلوۂ معشوق دریں کار داشت

ترجمہ:۔ ایک بلبل ایک خوشرنگ پھول کی پتی چونچ میں لے کر زار وزار رو رہا تھا میں نے اس سے کہا عین وصال کے وقت یہ رونا دھونا کیسا ہے۔ تو اس نے کہا معشوق کے جلوے نے ہمیں یہی سپرد کیا ہے۔

پس یہ نہ خوشی کا رونا ہے نہ غم کا مولانا فرماتے ہیں۔

؎ عاشق زیں ہر دو حالت بر تر است

ترجمہ:۔ عشق ان دونوں حالتوں سے اونچا ہے۔

تو شریعت میں اگر تلخی بھی ہوتی وہ بھی لذیذ ہوتی اور اگر لذیذ بھی نہ ہوتی تو اس کو صبر ہی کا محل سمجھا ہوتا مگر وہاں تو تلخی ہے ہی نہیں وہاں تو سر سے پیر تک حلاوت ہی حلاوت ہے۔ جس کی دل کشی کا یہ حال ہے۔

؎ زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

(سر سے پاؤں تک جہاں بھی دیکھیں کرشمہ وناز ہے یہ کہتے ہیں کہ دل دینے کی جگہ تو یہی ہے)

لطافت مجاہدۂ شرعیہ

غرض شریعت نے رمضان میں صرف بیس رکعت تراویح مقرر کر کے تقلیل منام کی معتدل صورت کردی جس میں بہت زیادہ جاگنا بھی نہیں پڑتا اتنی دیر تک تو عام طور پر لوگ جاگتے رہتے ہیں جتنی دیر تراویح میں لگتی ہے مگر تقید کے ساتھ جاگنے سے مجاہدہ کا فائدہ حاصل ہو جاتا ہے اور دوسرے طریق میں مرتاضین آنکھیں پھوڑتے تھے۔ چھت میں رسیاں باندھتے تھے کہ جب نیند آتی اس میں لٹک جاتے جس سے نیند اڑ جاتی تھی ان دونوں مجاہدوں میں ایسا فرق ہے جیسے قند میں اور شیرہ میں۔ اس لطافت کا ادراک لطیف ہی لوگوں کو ہوتا ہے مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ جیسا شخص چاہیے جس کو شریعت کی لطافت کا ادراک ہوا گران کو اس لطافت کا ادراک نہ ہوتا تو

وہ دین کے ایسے عاشق نہ ہوتے کہ دین کے واسطے جان ہی دے دی۔ آپ کے زمانہ میں شیعہ کو دہلی کے اندر بہت غلبہ تھا۔ اور یہ لوگ مرزا صاحب کے دشمن تھے۔ جان لینے کو پھرتے تھے جس دن کی صبح کو آپ شہید ہوئے۔ رات میں آپ کو مکشوف ہو گیا تھا کہ آج شہادت کا دن ہے۔ تو آپ نے صبح سے پہلے غسل کیا نہا دھو کر سرمہ وعطر لگا کر شہادت کے لئے تیار ہو گئے اور باہر جو تشریف لائے تو بار بار یہ شعر پڑھتے تھے۔

ے سرجدا کرد از تنم یارے کہ با ما یار بود　　قصہ کوتہ کرد ورنہ درد سر بسیار بود

ترجمہ:۔ دوست نے میرا سر تن سے جدا کر دیا درد سر تو بہت تھا مگر شکر ہر قصہ کوتاہ ہو گیا۔ اسی حالت میں مخالفین آئے اور آپ سے کچھ سوالات کئے جواب حق ملا۔ تو ظالموں نے قرابینوں سے آپ کو شہید کر دیا۔ دفن کے وقت لوگوں نے چاہا کہ پتھر پر کوئی شعر حسب حال کنندہ کرا کر قبر پر نصب کریں مگر کوئی شعر حسب حال نہ ملا تو ایک اہل دل نے کہا کہ خود ان ہی کے دیوان سے نکالو تو اول ہی وہلہ میں یہ شعر نکلا۔

بلوح تربت من یافتند از غیب تحریرے　　کہ ایں مقتول را جز بیگناہی نیست تقصیرے

ترجمہ: میری لوح تربت پر غیب سے یہ تحریر پائی گئی کہ اس مقتول کا گناہ بے گناہی کے سوا کچھ نہیں۔

واقعی بہت ہی حسب حال شعر ہے۔ غرض شریعت کی لطافت کو ایسے حضرات سمجھتے تھے۔

تحقیق اسرار کا نقصان

تم اگر نہ سمجھ سکو تو تم کو تحقیق کی کیا ضرورت ہے۔ بس خدا اور رسول کا حکم سمجھ کر عمل شروع کر دو۔ آخر اگر کوئی فقیر تم کو گولیاں دے دے کہ یہ قوت باہ کی ہیں تو ان کو جلدی سے منہ میں کیوں باہ لیتے ہو (یعنی رکھ لیتے ہو ۱۲) ہندی مثل ہے کہ آم کھانے سے کام پیڑ گننے سے کیا کام؟ تم کو اسرار کے پیچھے پڑنے سے کیا مطلب تم کو عمل سے کام ہے۔ روزہ میں اور تراویح میں کچھ ہی اسرار ہوں تم کو اس سے کیا بحث مقصود تو رضائے حق ہے اور وہ عمل سے حاصل ہو جاتی ہے اسرار کے جاننے پر رضا موقوف نہیں پھر تم ان کے درپے کیوں ہوتے ہو پھر کیا ضرور ہے کہ جن سے تم پوچھتے ہو ان کو بھی اسرار معلوم ہوں اور اگر معلوم بھی ہوں تو یہ کیا ضرور ہے کہ وہ تم کو بتلا بھی دیں کیونکہ ان کا مذاق یہ ہے کہ وہ ہر ایک کو اسرار نہیں بتلایا کرتے جس کو اہل دیکھتے ہیں اسی کو بتلاتے ہیں اور نا اہل کے متعلق انکا یہ ارشاد ہے۔

؎ بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی بگذار تابمیرد از رنج خود پرستی

ترجمہ: مدعی سے عشق و مستی کی باتیں نہ کہو اسے چھوڑ وہ خود پرستی کے رنج سے مرتا ہے تو مرجائے۔

مولوی غوث علی صاحب پانی پتی کے پاس ایک خان صاحب آئے اور کہا میں نے سنا ہے کہ آپ کو کیمیا آتی ہے۔ کہا ہاں آتی ہے خان صاحب نے کہا پھر ہمیں بھی بتلا دیجئے کہا نہیں بتلاتے اس نے کہا آخر کیوں نہیں بتلاتے کہا کیا میں تمہارے باوا کا نوکر ہوں۔ پھر کہا خان صاحب خدمتیں کرو، بدن دباؤ، حقہ بھرو، کبھی سال دو سال میں جی چاہ گیا تو بتلا بھی دیں گے جس محنت سے ہم نے حاصل کی ہے تم اس کی آدھی محنت تو دکھلاؤ۔ اسی طرح عارفین برسوں ناک رگڑوا کر جسے اہل سمجھتے ہیں اسے اسرار پر مطلع کر دیتے ہیں ہر ایک کو نہیں بتلایا کرتے گو جانتے بھی ہوں حافظ رحمۃ اللہ علیہ اسی کو فرماتے ہیں۔

؎ مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

ترجمہ: راز کا پردے سے باہر جانا ہی مصلحت کے خلاف ہے ورنہ یہاں ہر بات کی خبر ہے۔

مصلحت نیست کی وجہ یہ ہے کہ بعض دفعہ بدون اسرار جانے عمل کرنا زیادہ مفید ہوتا ہے اور اسرار جاننے سے فائدہ کم ہوتا ہے جیسے حکیم اپنے گھر سے بنی بنائی دوا دیدے تو اعتقاد زیادہ ہوتا ہے اور بعض دفعہ ایسی معمولی چیز ہوتی ہے کہ اجزاء معلوم ہو جانے کے بعد اس کی وقعت نہیں رہتی جیسے ایک عالم کے سر میں شدت کا درد ہوا انہوں نے ایک درویش سے تعویذ لیا۔ اس کے باندھتے ہی فوراً درد جاتا رہا۔ بڑا تعجب ہوا تعویذ کھول کر دیکھا تو اس میں صرف بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھی تھی۔ ان کے خیال میں یہ بات آئی کہ یہ تو میں بھی لکھ سکتا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی فوراً درد شروع ہو گیا۔ اب تعویذ کو لاکھ باندھتے ہیں اثر نہیں ہوتا اسی لئے اکثر تعویذ دینے والے تعویذ کو کھول کر دیکھنے سے منع کیا کرتے ہیں تاکہ اعتقاد کم نہ ہو اسی طرح احکام شرعیہ کے اسرار جاننے سے بعض کج فہموں کے دل میں احکام کی وقعت کم ہو جاتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ بس یہی حکمت مقصود ہے تراویح سے تقید کے ساتھ جاگنا ہو۔

شاہانہ مجاہدہ

اس سے اول تو تراویح کی وقعت کم ہوتی ہے پھر وہ الحاد میں پھنستا ہے کہ مقصود تقید ہے تو ہم کسی دوسرے طریقہ سے تقید کر لیں گے۔ حالانکہ اول تو حکمت کا اسی میں انحصار نہیں نہ معلوم کتنی

حکمتیں ہوں گی پھر یہ حکمت اس قید کے ساتھ مقصود ہے کہ اس خاص عمل کے ساتھ پائی جاوے۔ اس عمل کے بغیر یہ حکمت مطلوب نہیں پس دونوں کا مجموعہ مطلوب ہوا پھر دوسرے طریقہ سے یہ مقصود کیوں کر حاصل ہو جائے گا۔ غرض اہل ریاضت تقلیل منام کے لئے جو صورتیں مجاہدات کی اختیار کرتے ہیں ان کو دیکھ کر پھر شرعی مجاہدہ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے شاہانہ علاج کیا ہے کہ نہ آنکھیں پھوڑنے کی ضرورت ہے نہ رسیاں باندھنے کی ضرورت ہے۔ نہ سیاہ مرچیں چبانے کی ضرورت ہے۔ بلکہ بیس رکعت تراویح عشاء کے بعد پڑھ کر سو رہو تقلیل منام ہو گیا۔ پھر مزید لطافت یہ کہ تراویح جماعت سے ہوتی ہے الگ الگ جاگنا مشکل تھا جماعت کے ساتھ جاگنا اور بھی سہل ہو گیا۔ پھر بیچ میں نیند آنے لگے تو ہر چار رکعت پر قدرے توقف مستحب کیا گیا جس میں اگر کسی کو نیند آنے لگی ہو تو وہ ٹہل سکتا ہے۔ پانی منہ پر ڈال سکتا ہے۔ باتیں کر کے نیند کو دفع کر سکتا ہے اس طرح سے بیس رکعت کی مقدار جاگنا کچھ بھی دشوار نہیں بس یہ ویسا ہی علاج ہے جیسا ایک بادشاہ نے طبیب سے کہا تھا کہ میں آج بیمار ہوں میری نبض دیکھ کر علاج کرو مگر شرط یہ ہے کہ مجھے نہ دوا پینی پڑے نہ لگانی پڑے۔ بس ویسے ہی علاج ہو جائے۔ طبیب نے نبض دیکھ کر کہا بہتر ہے ایسا ہی علاج ہو جائے گا۔ اس نے گھر جا کر ایک پنکھے پر کچھ دوا چھڑک دی اور شاہی خادم سے کہا کہ بادشاہ کو اس پنکھے سے ہوا کرنا بس پنکھا جھلتے ہی فوراً نیند آ گئی۔ اور سانس کے ذریعے سے دوا کا اثر دماغ میں اور دماغ سے دل میں پہنچا تو جب بادشاہ جاگا ہے تو خاصا چاق وچوبند تھا بیماری کا نام کو بھی نشان نہ تھا۔

رسم روزہ کشائی

اسی طرح ایک مرتبہ دہلی میں شاہزادہ نے روزہ رکھا تھا اس کی روزہ کشائی کا بڑی دھوم دھام سے انتظام ہوا گویا یہ رسم روزہ کشائی کی بدعت ہے مگر اس وقت سے روزہ کی تعظیم ہوتی تھی اور اس بہانہ سے غرباء کو بہت کچھ مل جاتا تھا۔ اسی لئے فقیہ ابواللیث فرماتے ہیں کہ جب سے ریا کار مر گئے اور مخلصین پیدا ہوئے اس وقت سے لوگ بھوکے مرنے لگے۔ کیوں کہ ریا کار بہت کام دین کے کرتے تھے۔ کوئی وقف کرتا تھا کوئی لنگر جاری کرتا تھا۔ کوئی سرائے اور مسافر خانہ بناتا تھا۔ گو یہ سب نام ونمود کے لئے ہوتا تھا مگر مخلوق کو تو راحت ہوتی تھی پھر کیا عجب ہے کہ مخلوق کی دعاؤں سے ان

ریا کاروں کی بھی مغفرت ہوگئی ہو تو روزہ کشائی کی رسم ہمارے واسطے تو بدعت ہے لیکن اگر بادشاہ کریں تو ان کے واسطے بدعت نہیں ہے۔ بلکہ غنیمت سمجھا جاوے گا کہ دین کی قدر و عظمت تو انہوں نے کی۔ جیسے کالج علی گڑھ میں مولود شریف ہونے کی بابت میرے ایک دوست نے خوب لطیفہ کہا تھا کہ' مولود شریف کی محفل ہمارے تو بدعت ہے۔ مگر کالج میں واجب ہے کیونکہ بد دینی کا کچھ انسداد تو ہے مگر اس فتوے کے لئے محقق کی ضرورت ہے ہر شخص کا یہ کام نہیں کہ بدعات کو جائز کرنے لگے۔ غرض روزہ کشائی کا انتظام ہوا بہت کھانے پکوائے گئے ہزاروں آدمیوں کو دعوت دی گئی۔ بچہ نے عصر کے وقت تک تو صبر کیا مگر عصر کے بعد اس نے پانی مانگا کہ میرا پیاس سے برا حال ہے۔ بادشاہ کو بڑی پریشانی ہوئی کہ اگر اس وقت اس نے روزہ توڑ دیا تو ساری خوشی خاک میں مل جائے گی۔ اور ساری محنت برباد ہو جائے گی ادھر بچے کی حالت کا بھی فکر تھا کہ وہ پیاس سے بیتاب ہے۔ فوراً طبیبوں کو بلایا کوئی ایسی تدبیر کرو جس سے شہزادہ کی پیاس کو تسکین ہو جائے اور روزہ بھی نہ ٹوٹے۔ سب اطباء عاجز ہو گئے کسی کی سمجھ میں کوئی تدبیر نہ آئی۔ صرف ایک ہندو طبیب کے ذہن میں ایک تدبیر آئی اس نے کہا حضور اسی وقت لیموں منگائے جائیں چنانچہ منگائے گئے اس نے چند لڑکوں کو بلا کر کہا کہ تم شہزادہ کے سامنے تراش تراش کھانا شروع کرو بس دوسروں کو لیموں کھاتے دیکھ کر بچہ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ طبیب نے کہا اس لعاب کو نگلنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا اب کیا تھا اب تو منہ میں لعاب کا دریا پیدا ہو گیا اور بچہ نے اس کو نگلنا شروع کیا۔ فوراً پیاس کو سکون ہو گیا۔

شریعت کی آسانی

صاحبو! اس پر تو آپ کو تعجب ہوتا ہے مگر میں بقسم کہتا ہوں کہ شریعت نے امراض باطنہ کے سارے علاج شاہانہ ہی کئے ہیں اور اس طرح ہر چیز کا علاج کر کے دعوے سے فرماتے ہیں الدین یسر کہ دین آسان ہے۔ کسی طبیب کا منہ نہیں کہ وہ یہ دعویٰ کرے الطب یسر کیونکہ اس میں چیر پھاڑ بھی ہے اپریشن بھی ہے نشتر بھی لگایا جاتا ہے مگر حق تعالیٰ تمام احکام کو بیان فرما کر ارشاد فرماتے ہیں:

مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (خدا نے تم پر دین میں کچھ بھی تنگی نہیں کی)

الہ آباد میں ایک بار اس آیت کا میں نے بیان کیا تھا اور دعویٰ کیا تھا کہ آج میں اس مسئلہ کو ثابت کروں گا کہ دین میں کہیں ذرہ برابر تنگی نہیں اس وعظ میں نو تعلیم یافتہ بہت تھے۔ وہ میرا منہ

تکتے تھے۔ مگر جب میں نے تقریر شروع کی اور دلائل بیان کئے تو سب مان گئے اور سب کی گردنیں خام ہو گئیں۔ اس وعظ[1] کے لئے دعا کیجئے کہ جلد طبع ہو جائے اس کے مطالعہ سے اس قسم کے تمام شبہات دور ہو جائیں گے۔ بخدا شریعت میں تنگی نہیں۔ بلکہ جہاں اس کا توہم ہوتا ہے وہ تنگی خود ہمارے اندر ہے ہم اپنی تنگی کو شریعت کی طرف منسوب کرر ہے ہیں جیسے ہمارے یہاں ایک گنوار عورت اپنے بچے کو پاخانہ پھرا کر جلدی میں اسے پونچھ پانچھ کر عید کا چاند دیکھنے کھڑی ہوگئی۔ انگلی میں کچھ پاخانہ لگا رہ گیا تھا۔ ناک پر انگلی رکھنے کی عورتوں میں بہت عادت ہے۔ اس نے جو ناک پر انگلی رکھ کر چاند دیکھا تو اپنی انگلی میں سے پاخانہ کی بدبو ناک میں پہنچی تو وہ کہتی ہے کہ اوئی اب کے سڑا ہوا چاند کیوں نکلا۔ جس طرح اس بیوقوف نے اپنی انگلی کی سڑاہند کو چاند کی طرف منسوب کیا تھا۔ یوں ہی ہم لوگ اپنی طبائع کی تنگی کو دین کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ دین تنگ ہے ہم لوگوں کو آئینہ شریعت میں اپنی بھونڈی صورت نظر آ رہی ہے اب لگے آئینہ ہی کو برا کہنے جیسے ایک حبشی چلا جا رہا تھا راستہ میں ایک آئینہ پڑا پایا اٹھا کر جو اپنا منہ دیکھا تو ایک ڈراؤنی صورت نظر آئی تو آپ آئینہ کو دیکھ کر فرماتے ہیں کہ ایسی بری صورت کا تھا جبھی تو کوئی پھینک گیا۔ سبحان اللہ آپ نے آئینہ کو بدصورت قرار دیا مگر اپنی بابت یہ بدگمانی نہ ہوئی کہ شاید میری ہی صورت نظر آئی ہو یہی حال ہمارا ہو رہا ہے کہ آئینہ شریعت میں اپنی صورت جب بدنما نظر آتی ہے تو شریعت کا قصور بتلاتے ہیں۔ جیسے ایک بچہ کے ہاتھ سے لوٹے میں روٹی کا ٹکڑا گر پڑا تھا۔ اس نے جو جھک کر نکالنا چاہا تو پانی میں اپنی صورت نظر آئی۔ اس نے باپ کو پکارا ابا اس نے میری روٹی چھین لی۔ اس نے پوچھا کس نے چھین لی کہا اس نے یہ جو لوٹے میں بیٹھا ہے۔ ابا جان بھی دیکھنے آئے کہ لوٹے میں کون بیٹھا ہے۔ وہ جو لوٹے پر جھکے تو پانی میں ان کو اپنی صورت نظر آئی۔ مقطع داڑھی سفید بال تو آپ اس کو خطاب کر کے کہتے ہیں کہ تجھے شرم نہیں آئی یہ لمبی داڑھی لگا کر بچہ کا ٹکڑا چھین لیا۔ تف ہے تیری اوقات پر۔ اسی طرح جس کو شریعت میں شبہ ہے تو درحقیقت وہ شبہ اس کے اندر ہے شریعت میں کوئی شبہ نہیں۔

مولانا قاسم صاحب علیہ الرحمۃ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت قرآن شریف میں ارشاد ہے ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ یہ کتاب کامل ہے اس میں شک نہیں حالانکہ اس میں تو بہت کفار شک کرتے ہیں اور بعض کج فہم مسلمان بھی فرمایا کہ وہ ان کے اندر ہے۔ قرآن کے اندر نہیں اور حق

---

[1] الحمدللہ یہ وعظ مسمی بہ نفی الحرج طبع ہو گیا ہے ۱۲ جامع

تعالیٰ نے لاریب فیہ فرمایا ہے لاریب فیھم نہیں فرمایا' اس کی ایسی مثال ہے جیسے یرقان والا کہتا ہے ہذاالثوب اصفر (یہ کپڑا زرد ہے۱۲) مگر طبیب کہتا ہے۔

ھذا لاصفرة فیہ وانما الصفرة فی عینک (کہ اس کپڑے میں تو زردی نہیں ہاں تیری آنکھوں میں زردی ہے جس سے تجھ کو ہر چیز زرد نظر آتی ہے۱۲) بتلایئے یہ کلام سچا ہے یا نہیں' یقیناً سچا ہے بس یونہی قرآن کا دعویٰ ہے کہ دین میں تنگی نہیں۔ اب جو کوئی تنگی کا مدعی ہے اس کی نگاہ میں خود تنگی ہے یا فہم میں تنگی ہے۔ صاحبو! اگر قرآن کے اس دعوے میں کچھ بھی خامی ہوتی تو یہ آیت ایک عالم کے سامنے جن میں ملاحدہ وفلاسفہ واہل کتاب سب ہی موجود ہیں دعویٰ کے ساتھ پیش نہ کی جاتی پھر اوپر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم الدین یسر (الدر المنثور ۱:۱۹۲، تفسیر القرطبی ۳:۴۳۲، کشف الخفاء للعجلونی ۱:۴۹۸) فرما کر اس کی تاکید نہ فرمادیتے۔ مگر حضورؐ نے تمام عالم کو مخاطب کر کے دعویٰ فرمایا ہے کہ دین آسان ہے اور ہم بھی حقیقت کے بھروسے پر دعویٰ کرتے ہیں کہ بیشک دین آسان ہے۔ اسی الدین یسر کا ایک نمونہ ہے کہ شریعت نے تقلیل منام کی صورت تراویح میں تجویز کی۔

اہتمام شب قدر

اور اس تقلیل کو تہجد سے اور تقویت ہو جاتی ہے۔ خصوصاً لیالی قدر میں کہ ان راتوں میں حضورؐ نے رمضان کے تمام اجزاء سے زیادہ جاگنے کا اہتمام فرمایا ان راتوں میں ازواج مطہرات کو بھی اہتمام کے ساتھ جگاتے تھے پھر ان میں بھی شریعت نے ہماری راحت کی کس قدر رعایت کی ہے کہ لیالی قدر پے در پے نہیں ہیں بلکہ طاق راتیں ہیں یعنی اکیسویں اور تیئسویں اور پچیسویں اور ستائیسویں اور انتیسویں راتیں کہ بیچ میں ایک ایک رات کا فصل رکھا گیا ہے تاکہ ایک رات زیادہ جاگ کر بیچ کی رات میں زیادہ سولو اور تہجد کے لئے جاگنا بھی مشکل نہیں کیونکہ سحری کے لئے اکثر لوگ اٹھتے ہی ہیں تو کھانے سے پہلے کچھ رکعتیں نماز کی پڑھ لینا کیا دشوار ہے۔ اس لئے جو شخص تہجد کا عادی بننا چاہے اس کو رمضان میں عادی بننا نہایت آسان ہے کیونکہ اس میں تہجد کے لئے اٹھنا مشکل نہیں سحری کھانے سب ہی اٹھتے ہیں پھر ان شاء اللہ تعالیٰ سال بھر کے لئے عادی ہو جائے گا۔

تہجد کا نور

غرض تراویح اور تہجد کے اہتمام سے تقلیل منام ہو جاتی ہے اور یہ خود دینی مجاہدہ بھی ہے پھر

اس میں دینی فوائد کے علاوہ دنیوی فوائد بھی ہیں چنانچہ نیند کم ہونے سے رطوبات فضلیہ کم ہوتی ہیں جو صحت کے لئے معین ہے۔ نیز اس سے چہرہ پرنور پیدا ہوتا ہے چنانچہ ایک محدث کا قول ہے **من کثرت صلوته فی اللیل حسن وجهه فی النهار** (جو رات میں زیادہ نماز پڑھے گا دن میں اس کا چہرہ خوبصورت ہو جائے گا) بعض لوگوں نے اس کو حدیث مرفوع بتایا ہے مگر یہ صحیح نہیں ان لوگوں کو مغالطہ ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک محدث حدیث بیان کررہے تھے۔ **قال رسول الله صلی الله علیه وسلم کذا و کذا** اور درمیان میں ایک بزرگ آ گئے جن کے چہرہ پرانوار تھے۔ تو محدث نے ان کی طرف اشارہ کر کے فرمادیا **من کثرت صلوته فی الیل حسن وجهه فی النهار** کہ جو رات کو نماز زیادہ پڑھے گا دن میں اس کا چہرہ خوبصورت ہو جائے گا تو بعض لوگ جو پوری مجلس میں حاضر نہ تھے وہ اسی کو حدیث سمجھے حالانکہ حدیث اس کے بعد بیان ہوئی تھی اسی لئے مجلس علم میں اخیر تک رہنا چاہیے تب صحیح مضمون حاصل ہوتا ہے ورنہ وہی مثال ہوتی ہے کہ آدھا تیتر آدھا بٹیر۔ عالمگیر کے زمانہ میں ایک عورت نے چار آشنا کر رکھے تھے اور ہر ایک سے نکاح بھی کر رکھا تھا مگر ایک شوہر کو دوسرے کی اطلاع نہ تھی عالمگیر کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس عورت کو بلوایا نہایت پریشانی میں جارہی تھی۔ راستہ میں اسے ایک طالب علم ملے اور کہا اگر تو مجھے اتنے روپے دے تو میں تجھے رہائی کی تدبیر بتلاؤں ورنہ عالمگیر تجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔ اس نے وعدہ کیا کہ جو کہو گے وہ دوں گی تم تدبیر بتلاؤ اس نے کہا تو یہ کہہ دینا کہ میں نے ایک عالم کے وعظ میں سنا تھا کہ خواہ مخواہ بدکاری کی جاتی ہے خدا تعالیٰ نے چار نکاح تک جائز کئے ہیں اور جو وہ پوچھیں کہ یہ مردوں کے لئے کہا تھا یا عورتوں کے لئے تو کہہ دینا کہ آگے میں نے سنا نہیں اس نے جا کر یہی بیان کر دیا عالمگیر نے معذور سمجھ کر سزا نہ دی اور آئندہ کے لئے ہدایت کر دی کہ خبردار وعظ کبھی ادھورا نہیں سنا کرنا۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ تہجد سے چہرہ پرنور پیدا ہوتا ہے واللہ تہجد پڑھنے والا حسین بھی نہ ہو تب بھی اس پر حسن ہوتا ہے۔

؎ نور حق ظاہر بود اندر ولی! — نیک بیں باشی اگر اھل دلی

ترجمہ:۔ دل میں نور حق ظاہر ہوتا ہے اگر تو اہل دل ہے تو اچھی طرح دیکھ لے گا۔

کسی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

؎ مرد حقانی کی پیشانی کا نور — کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

الغرض رات کو جاگنا باعث حسن ظاہری و نور ہے تو تقلیل منام میں علاوہ مجاہدہ ہونے کے یہ فوائد بھی ہیں۔

اعمال رمضان

پھراس کے ساتھ شریعت نے ایک اور رعایت کی ہے جس پر سو جان سے فدا ہونے کو جی چاہتا ہے وہ یہ کہ مجاہدہ مرتاضین کے نزدیک تو محض ترک کا نام ہے مثلاً ترک طعام وترک منام وغیرہ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ترک پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اس کے ساتھ افعال بھی مشروع فرمائے ہیں۔ اور مجاہدات حقیقیہ یہ اعمال ہی ہیں اور تروک تو مجاہدہ حکمیہ ہیں یعنی مجاہدات حقیقہ کے لئے معین ہونے کے سبب بحکم مجاہدہ ہیں وجہ یہ ہے کہ قرب الی اللہ کے لئے اعمال ہی موضوع ہیں۔ مثلاً روزہ میں صرف ترک طعام پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ اور کام بھی مشروع کئے گئے ہیں عملاً بھی وقولاً بھی عملاً تو یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان حدیث شریف میں وارد ہے **کان اجود الناس بالخیر و کان اجود ما یکون فی رمضان کان جبریل یلقاہ کل لیلۃ فی رمضان یعرض علیہ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم القرآن فاذالقیہ جبریل کان اجود بالخیر من الریح المرسلۃ** (الصحیح للبخاری ۱:۵، الصحیح لمسلم کتاب الفضائل: ۴۸، مسند احمد ۱: ۳۶۳، مشکوۃ المصابیح: ۲۰۹۸)

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوں تو ہر وقت ہی سب سے زیادہ سخی تھے مگر سب سے بڑھ کر رمضان میں آپ سخی ہوتے تھے۔ اور جبرئیل علیہ السلام ہر شب میں آپ سے ملتے تھے۔ ان کی ملاقات کے وقت آپ ہوا سے بھی زیادہ فیض رساں ہوتے تھے۔ (ہوا کی فیض رسانی کہ اس سے بارش ہوتی ہے معلوم ہے اس جود میں سے بعض کی تصریح بھی وارد ہے مشکوۃ میں بیہقی سے بروایت ابن عباس آیا ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذادخل شھر رمضان اطلق کل اسیروا عطی کل سائل (الدر المنثور ۱:۱۸۵، کنز العمال: ۱۸۰۶۰) (جب رمضان کا مہینہ داخل ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر قیدی کو چھوڑ دیتے اور ہر سائل کو عطا فرماتے) اس میں آپ نے عملی تعلیم فرمائی ہے کہ رمضان میں اور دنوں سے زیادہ فیض رساں ہونا چاہیے اور قولاً یہ کہ آپ ارشاد فرماتے ہیں۔ **ھذا شھر المواساۃ ھذا شھر یزادفیہ رزق المؤمن من تقرب فیہ بخصلۃ من الخیر کان کمن ادی فریضۃ فیما سواہ** (کنز العمال: ۲۳۲۹۴) یعنی یہ مہینہ ہمدردی کا ہے اس مہینہ میں مومن کا رزق زیادہ کیا جاتا ہے جو اس میں نفل کام کرے اس کو اور دنوں کے فرض کے برابر ثواب ملے گا اور جو اس میں فرض ادا کرے اس کو اور دنوں کے ستر فرضوں کے برابر ثواب ملے گا۔ اس میں کس قدر ترغیب وتحریض ہے صدقہ، خیرات اور اعمال صالحہ کی کہ رمضان میں رکعات نافلہ کا ثواب فرض نمازوں کے برابر ملتا ہے اور جو فرض کو اس ماہ میں ادا کرتے ہیں ان کو ستر فرضوں کا ثواب ملتا ہے۔

تعجیل فی الخیر

مگراس سے بعض لوگوں نے کیسا الٹا مطلب سمجھا کہ بعض لوگ رمضان سے پہلے بعض نیک کاموں کو روکے رکھتے ہیں۔ مثلاً کسی کی زکوٰۃ کا سال شعبان میں پورا ہوگیا اب وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتا رمضان کے انتظار میں روکے رکھتا ہے چاہے رمضان میں اس کو توفیق ہی نہ ہو روپیہ چوری ہی ہو جائے یا رمضان کے انتظار محتاج کا قلیہ ہو جائے۔ یاد رکھو شارع کا اس ترغیب سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ رمضان کے انتظار میں نیک کاموں کو روکا جائے بلکہ شارع کا مقصود تاخیر عن رمضان سے روکنا ہے اگر رمضان تک کسی کو توفیق نہ ہو تو رمضان میں ہرگز دیر نہ کرے جو کرنا ہو کر ڈالے تقدیم علی رمضان سے روکنا نہیں۔ وشتان بینھما (ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے) مگر کم فہمی نے یہ نتیجہ پیدا کیا کہ لوگ رمضان میں خرچ کرنے کے فضائل اور ثواب سن کر اس کے انتظار میں طاعات کو روکنے لگے خوب سمجھ لو کہ تعجیل فی الخیر میں خود بہت بڑا ثواب ہے اور وہ اتنا بڑا ثواب ہے کہ رمضان سے پہلے جو تم خرچ کرو گے تو گو اس میں کمابہ نسبت رمضان میں خرچ کرنے کے ثواب کم ہو مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کیفاً وتقریباً الی اللہ وہ تعجیل بہتر ہے اور اس درجہ میں اس کا ثواب رمضان کے ثواب سے بڑھ جائے گا۔ مجھے کوئی تو اطمینان ہے جو میں شرح صدر کے ساتھ اس مضمون کو بیان کر رہا ہوں بس قسم سے زیادہ اطمینان دلانے کا ذریعہ میرے پاس کوئی نہیں تمہیں کیا خبر ہے کہ شعبان میں اگر تم غریب کو زکوٰۃ دیتے تو اس وقت اس کے دل سے کیسی دعا نکل جاتی جس کے سامنے ستر رمضان بھی ہیچ ہیں۔ یہی بات تو لوگوں کو معلوم نہیں یاد رکھو جب زکوٰۃ کا سال پورا ہو جائے اس کے بعد تاخیر کرنے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ اس تاخیر سے گناہ ہوتا ہے یا نہیں بعض وجوب علی الفور کے قائل ہیں ان کے نزدیک تاخیر سے گناہ ہوتا ہے اور بعض وجوب علی التراخی کے قائل ہیں ان کے نزدیک گناہ نہیں ہوتا پس احتیاط اسی میں ہے کہ وجوب کے بعد دیر نہ کی جائے تاکہ سب کے نزدیک گناہ سے محفوظ رہے پھر اگر رمضان کے انتظار میں صدقات کا روکنا موجب ثواب ہوتا تو شریعت نے کہیں تو یہ کہا ہوتا کہ رمضان سے اتنے دن پہلے تمام صدقات کو روک دو جب شریعت نے کہیں یہ نہیں کہا تو اب ہمارا ایسا کرنا یہ زیادتی فی الدین اور بدعت ہے کہ جس کام کے لئے شریعت نے ثواب بیان نہیں کیا تم اس کو ثواب سمجھ کر کرتے ہو یہ مقاومت ہے حکم شرع کی مگر چونکہ اب تک جہل میں مبتلا تھے علم نہیں تھا اسی لئے امید ہے کہ گنہگار نہیں ہوئے ہو گے ہاں اب

جولوگ ایسا کریں گے وہ گنہگار رہوں گے کیونکہ اب مطلع صاف ہوگیا۔ غرض شریعت نے محض تقلیل طعام بصورت صیام پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ اعمال کی بھی ترغیب دی۔ اسی طرح تقلیل منام میں بھی محض بیداری پر اکتفا نہیں کیا کہ خالی بیٹھے جاگتے رہو بلکہ فرماتے ہیں۔

وسعت رحمت

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ

نیک بندوں کی تعریف فرماتے ہیں کہ وہ رات کو کم سویا کرتے تھے اور پچھلے حصہ شب میں استغفار کیا کرتے تھے یہاں تو استغفار مشروع ہوا دوسری جگہ ارشاد ہے۔

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا

ان کے پہلو خوابگاہوں سے الگ رہتے ہیں اپنے پروردگار کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے ہیں۔ یہاں مفسرین کا قول یہ ہے کہ یدعون سے یصلون مراد ہے۔ مطلب یہ کہ رات کو نماز پڑھتے ہیں مگر طرز کلام سے عموم ظاہر ہو رہا ہے۔ لہٰذا مطلق دعا وذکر بھی مراد ہوسکتی ہے۔ اسی لئے بزرگوں نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو تہجد کی توفیق نہ ہو تو وہ رات کو کسی وقت جاگ کر تین بار سبحان اللہ کہہ کر ہی سو رہا کرے۔ وہ بھی يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا میں داخل ہو جائے گا۔ بس دو تین بجے جب آنکھ کھل جائے سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ لیا کرے یہ تسبیح بھی کام آ جائے گی۔ حق تعالیٰ کے یہاں بڑی رحمت ہے اسی وسعت رحمت پر قاضی یحییٰ بن اکثم محدث کی حکایت یاد آ گئی ہے کہ جب ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی روح کو حق تعالیٰ کی جناب میں پیش کیا گیا تو ان سے سوالات شروع ہوئے یہ کسی بات کا جواب نہیں دیتے اور ہکا بکا خاموش کھڑے ہیں ادھر سے سختی کے ساتھ حکم ہوا کہ بڈھے بولتا کیوں نہیں تو آپ نے حدیث بیان کرنی شروع کی۔ **حدثنا فلان عن فلان عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال ان اللہ یستحیی من ذی الشیبۃ المسلم. (مجمع الزوائد ۱۰:۱۴۹، کنز العمال: ۴۲۶۴۴)** ہم سے فلاں نے اور ان سے فلاں نے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ بڈھے مسلمان سے حیا فرماتے ہیں تو میں اس وقت اس لئے خاموش ہوں کہ سوچ رہا ہوں کہ یہاں اس حدیث کیخلاف میرے ساتھ معاملہ کیوں ہو رہا ہے کیا اس حدیث کے راوی ثقہ نہیں یا کیا بات ہے وہاں سے ارشاد ہوا کہ ہمارے نبی سچے ہیں۔ اور تمہارے راوی بھی سب ثقہ جاؤ آج ہم تم کو اسی حدیث کی وجہ سے بخشتے ہیں اور بڈھا سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔

؎ رحمت حق بہانہ می جوید　　　رحمت حق بہاء نمی جوید

ترجمہ: اللہ کی رحمت تو بہانہ تلاش کرتی ہے قیمت نہیں۔

تہجد بے نماز

تو جس طرح قاضی یحییٰ کا حدثنا حدثنا بلکہ بڑھاپا وہاں کام آ گیا اسی طرح ان شاء اللہ آپ کو رات کی کروٹیں بدلتے ہوئے اللہ اللہ کر لینا بھی کام آ جائے گا اور آپ تہجد والوں میں شمار ہو جاویں گے۔ اور بے نماز کے تہجد ہو گی گویا صرف اذان ہی ہو گی۔ جیسے مرغ ارات کو اذان دیا کرتا ہے اور نماز نہیں پڑھتا۔ بس آپ کی بھی اذان ہی اذان ہو گی نماز تو ہو گی نہیں مگر خدا کے واسطے اس اذان کی تشبیہ سے اس وقت چلا چلا کر سبحان اللہ یا اللہ اللہ مت کہنے لگنا کہیں سونے والوں کی نیند میں خلل آوے پھر تو وہ پریشان کرنے میں حافظ جنازہ کی اذان ہو جائے گی۔ (یہ اس خانقاہ کے متعلقین میں سے ایک بھولے شخص تھے) جو ایک غیر آباد مسجد میں موذن تھے ایک دفعہ مغرب کے بعد کھانا کھا کر سو گئے زیادہ رات گئے جو آنکھ کھلی تو آپ نے عشاء کی اذان دی۔ تقریباً بارہ بجے ہوں گے پھر خیال ہوا کہ کوئی صبح کی اذان سمجھ کر سحری سے نہ رک جاوے۔ تو اذان کے بعد یہ بھی پکار دیا کہ یہ عشاء کی اذان ہے صبح کی نہیں ہے لوگ پریشان نہ ہوں یعنی مسجد میں نہ آویں پڑیں سوتے رہیں اور کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ عبداللہ بن عباس کے مؤذن نے بھی تو اذان کے اخیر میں **الاصلوا فی الرحال (الصحیح للبخاری ۱:۱۶۳، سنن ابی داؤد: الجمعہ باب: ۸)** کہا تھا کہ اپنے گھروں ہی میں نماز پڑھ لو مسجد میں آنے کی ضرورت نہیں بات یہ ہے کہ وہ اذان تو وقت پر تھی اس لئے ادائے سنت کے لئے اعلان کے ساتھ اذان دے کر **الاصلوا فی الرحال** کہہ دیا تھا تا کہ لوگ پریشانی سے بچیں۔ بخلاف حافظ جنازہ کی اذان کے کہ بے وقت تھی اس لئے خود پریشانی کا سبب تھی ان سے کوئی پوچھے کہ جب تم کو بلانا مقصود نہیں اور نہ ۱۲۔۲ بجے لوگ آ سکیں تو پھر ایسے وقت میں چلا کر اذان دینے کی کیا ضرورت تھی آہستہ اذان کہہ لی ہوتی اس سے بھی سنت ادا ہو جاتی۔ غرض شریعت نے جاگنے کے ساتھ ذکر و استغفار وصلوۃ کو بھی مشروع فرمایا ہے محض بیداری پر اکتفا نہیں کیا پھر اس میں بھی کوئی یہ قید نہیں کہ ۲ بجے اٹھو یا تین بجے اٹھو۔ بس صبح سے پہلے اٹھنا چاہیے حق تعالیٰ نے حضور کو خطاب فرمایا ہے......

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ آپ کے پروردگار کو معلوم ہے کہ آپ کبھی دو تہائی رات سے

کچھ کم جاگتے ہیں کبھی آدھی رات اور کبھی تہائی رات جاگتے ہیں۔اور ایک جماعت بھی ان لوگوں میں سے جو آپ کے ساتھ ہے۔اس کے بعد فرماتے ہیں وَاللّٰهُ یُقَدِّرُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ کہ رات اور دن کا پورا اندازہ حق تعالیٰ ہی کرتے ہیں یہ جملہ بیکار نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم اندازہ ٹھیک طور پر نہیں کر سکتے کہ ہمیشہ ایک ہی وقت پر اٹھو اس لئے کسی خاص وقت کی تعیین لازم نہیں کی جاتی جب آنکھ کھل جائے اسی وقت اٹھ جانا چاہیے یہی معنی ہیں اس کے جو فرمایا ہے عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَیْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ اور پھر بیماروں کو اور کسب معاش کرنے والوں کو وقت تھی ان کی آنکھ بعض دفعہ صبح کے قریب ہی کھلتی ہے تو ارشاد فرماتے ہیں۔

عَلِمَ اَنْ سَیَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰی وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاٰخَرُوْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنْهُ یعنی بیماروں اور مسافروں کو زیادہ بیداری معاف ہے۔ان کی جب آنکھ کھل جائے صبح سے پہلے پہلے وہ جتنا قرآن پڑھ سکیں نماز میں پڑھ لیا کریں چاہے دو رکعت ہی پڑھ لیا کریں۔ اس سے بھی کامل ثواب مل جائے گا۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو حدیث میں آتا ہے کہ بعد وتر کے دو رکعت پڑھ لیا کرے اس کی نسبت کفتاہ وارد ہے جس کی ایک تفسیر یہ ہے کہ اس سے بھی تہجد کا ثواب مل جاتا ہے۔ سبحان اللہ ہماری روٹیوں کی بھی تو رعایت ہے کہ تجارت کے لئے سفر کرو تو طویل بیداری معاف ہے جتنا ہو سکے کر لیا کرو کوئی طبیب ایسا ہے جو اسے یوں کہہ دے کہ اس نسخہ میں سے آدھا پی لو یا ربع پی لو تو صحت کے لئے کافی ہے۔ایسا کوئی طبیب نہ ملے گا وہ تو قدحے ہی پلاوے گا مگر حق تعالیٰ ایسے ہیں کہ رعایت فرماتے جاتے ہیں کہ زیادہ نہ ہو سکے تو اخیر شب میں دو رکعت ہی پڑھ لو تو اتنا بھی نہ ہو سکے تو سونے سے پہلے وتر کے بعد دو رکعت پڑھ لو یا رات کو دو تین بار سبحان اللہ ہی کہہ لو بس کافی ہے۔غرض یہاں بھی ترک منام کے ساتھ فعل مشروع ہوا ہے محض بیداری پر اکتفا نہیں فرمایا۔

دقیق مسئلہ پر تنبیہ

اور اس میں ایک مسئلہ دقیقہ پر تنبیہ فرما دی ہے تمہید اس کی یہ ہے کہ بعض لوگ مجاہدات بمعنی تروک ہی کو مقصود سمجھ جاتے ہیں۔ان میں بعض تو ملحد ہیں جو ضرورت اعمال ہی کے منکر ہیں ان سے تو اس وقت بحث نہیں غضب تو یہ ہے کہ بکثرت اہل علم کا بھی یہی حال ہے گو اعتقاد نہ ہو کہ وہ مجاہدات حکمیہ تقلیل طعام و تقلیل منام و تقلیل کلام و تقلیل اختلاط مع الانام کو نہایت اہتمام سے

اختیار کرتے ہیں اور گو جانتے ہیں کہ ان سے مقصود سہولت فی الاعمال ہے مگر باوجود اس کے پھر کیفیات کو حالاً مقصود سمجھتے ہیں اور اعمال کو حالاً اصل مقصود نہیں سمجھتے گو ان کا یہ اعتقاد نہ ہو مگر برتاؤ یہی ہے چنانچہ مجاہدات کے بعد جب ان پر کیفیات ذوق وشوق ونشاط کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ کام میں لگے رہتے ہیں اور جہاں کبھی کسی وجہ سے ان کیفیات میں کمی پیدا ہوئی تو اب یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا مجاہدہ بھی بیکار ہوا اور ہمارا رتبہ خدا کے یہاں کم ہوگیا پھر اس خیال کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اعمال ہی سے بے رغبتی ہو جاتی ہے اب اگر جاہل ہے تو اعمال بالکل چھوٹ گئے اور اگر پکے ہوئے تو استغفار میں لگ گئے تاکہ وہ کیفیت عود کر آئے۔ استغفار اچھی چیز ہے مگر اس حالت کا تو علاج نہیں خود غلط بود آنچہ ماپنداشتیم تمہارا وہ خیال ہی غلط ہے کہ میں مردود ہوگیا جس کے تدارک کے لئے استغفار کر رہے ہو نہ مجاہدہ بیکار ہوا نہ تم مردود ہوئے اصل بات یہ ہے کہ کبھی تو ابتداء میں مجاہدہ کا اثر جدت کی وجہ سے زیادہ ہوتا ہے ذوق وشوق کا غلبہ ہوتا ہے اور اب انس کی حالت ہے جس میں غلبہ نہیں رہا۔ اس لئے کیفیات میں کمی ہوگئی تو بھلا استغفار سے حالت انس مبدل بحالت ابتداء کیونکر ہو جائے گی کبھی کبھی بیماری کی وجہ سے کیفیات میں کمی آ جاتی ہے۔ استغفار اس کا رافع کیونکر ہوگا۔ کبھی حق تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہوتا ہے کہ ہمارا بندہ اپنے لطف کے واسطے ہی کام کرتا ہے یا ہم اس کے مطلوب ہیں اس لئے کیفیات سلب کر لی جاتی ہیں۔ یہاں استغفار سے کیسے کام چلے گا اکثر مشائخ ایسے شخص کو استغفار تعلیم کرتے ہیں اور جب استغفار میں بھی دل نہ لگا تو کچھ اور وظیفہ بتلاتے ہیں جب اس سے بھی جی گھبرایا تو کچھ اور بتلا دیتے ہیں اب یہ شخص مجموعۃ الاوراد ہو جاتا ہے مگر مرض اب بھی جوں کا توں ہے۔ البتہ اگر خوش قسمتی سے اسے کوئی طبیب الٰہی مل گیا وہ ان تعلیمات کو سن کر کہے گا۔

گفت ہر دارد کہ ایشاں کردہ اند — آں عمارت نیست ویراں کردہ اند

بے خبر بوند از حال دروں — استعیذاللّٰہ مما یفترون

ترجمہ: اس نے کہا جو دوا بھی انہوں نے دی وہ عمارت کو ویران کر گئے۔ اندر کے حال سے بے خبر تھے ان کے افتراء سے خدا کی پناہ۔

ارے یہ قلت کیفیات کسی معصیت کی وجہ سے تھوڑا ہی تھی جو استغفار بتلا دیا بلکہ اس کا منشا تو کچھ اور تھا۔

دید از زاریش کو زار دل ست — تن خوش ست اما گرفتار دل ست

عاشقی پیداست از زاری دل؛ نیست بیماری چو بیماری دل

ترجمہ:۔اس کی زاری سے یہ پتہ چلا کہ اس کا دل ضعیف ہے جسم تندرست ہے مگر دل گرفتار ہے۔عاشقی دل کی کمزوری سے ظاہر ہے دل کی بیماری کی طرح کوئی بیماری نہیں۔

اب طبیب الٰہی علاج کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ اس مرض کی دوا یہ ہے کہ تم ان کیفیات التفات پر التفات ہی نہ کرو اگر کیفیات نہ رہیں نہ سہی خدا تو ہے۔

؎ روزہا گر رفت گو رو باک نیست تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

ترجمہ:۔دن اگر چلے گئے تو کیا حرج ہے اے محبوب تو ہمیشہ باقی رہ۔

طاعات میں صرف خدا کو مطلوب سمجھو کیفیات کو ہرگز مطلوب نہ سمجھو بلکہ جس کو وصال سمجھ رہے ہو اس پر بھی نظر نہ کرو کہ ہم کو یہ وصال میسر ہوگا نہیں تم صرف عمل کو مقصد سمجھو ہمت سے اسی میں لگے رہو زبان حال سے یوں کہتے رہو۔

؎ یا بم اورا یا نہ یا بم جستجوئے می کنم حاصل آید یا نہ آید آرزوئے می کنم

ترجمہ:۔اس کو پاؤں یا نہ پاؤں ڈھونڈتا تو ہوں حاصل ہو یا نہ ہو جستجو تو کرتا ہوں۔

عارف فرماتے ہیں۔

؎ فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب کہ حیف باشد از وغیر او تمنائے

ترجمہ۔جدائی اور وصال کیا چیز ہیں دوست کی رضا کو تلاش کر کے اس سے اس کے سوا کسی چیز کی تمنا کرنا باعث صد حیف ہے۔

اور

؎ میل من سوئے وصال و میل اوسوئے فراق کام ترک کام خود گرفتم تا برآید دوست

ارید وصاله' و یرید هجری فاترک ما ارید لما یرید

ترجمہ:۔عربی و فارسی دونوں شعروں کا مطلب یہ ہے کہ میں تو وصال چاہتا ہوں مگر وہ ہجر چاہتا ہے اس لئے اس کے ارادے کی بناء پر میں نے اپنی چاہ کو چھوڑ بھی دیا۔

؎ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

عارف کہتا ہے کہ تم کیفیات کو کیا لئے پھرتے ہو ہمارے نزدیک تو فراق و وصل بھی کوئی چیز نہیں بلکہ اصل چیز رضائے محبوب ہے جس کا ذریعہ عمل ہے جب تک تم عمل میں لگے ہوئے ہو رضا

حاصل ہے اور جب رضا حاصل ہے تو سب کچھ حاصل ہے چاہے وصال ہو یا نہ ہو کیفیات ہوں یا نہ ہوں اس تعلیم کے بعد راستہ صاف نظر آنے لگتا ہے اور ساری پریشانی ایک منٹ میں جاتی رہتی ہے۔ اس تعلیم کا خلاصہ پھر کہے دیتا ہوں کہ کیفیات پر نظر نہ کرو محقق ایک نکتہ میں علاج کر دیتا ہے بشرطیکہ اس کا انقیاد کرو ہمارے حاجی صاحب کی یہی تعلیم تھی جب کوئی ذاکر شکایت کرتا کہ حضرت ذکر سے نفع نہیں ہوتا تو فرماتے یہ کیا کچھ کم نفع ہے کہ تم ذکر تو کر رہے ہو۔

حالانکہ خدا کی ایک مخلوق اس سے محروم ہے اب اس تمہید کے بعد سمجھو کہ شریعت نے مجاہدات کے ساتھ اعمال کی قید لگا کر جس نکتہ پر تنبیہ کی ہے وہ یہ ہے کہ اصل مقصود رضاء الٰہی ہے جس کا طریق عمل ہے اور مجاہدات حکمیہ اس کیلئے محض سبب سہولت ہیں خود مقصود نہیں پس اگر عمل موجود ہو اور مجاہدہ کے آثار خاصہ مرتب نہ ہوں تو کچھ حرج نہیں اور اگر مجاہدہ کے آثار خاصہ موجود ہوں اور عمل مفقود ہو تو وہ محض بیکار چیز ہیں اس لئے شریعت نے ہر مجاہدہ کے ساتھ ایک نہ ایک عمل بتلا دیا روزہ میں بھی اعمال کی ترغیب دی ہے تاکہ معلوم ہو کہ تقلیل طعام خود مقصود نہیں بلکہ عمل مقصود ہے اور تقلیل منام کی صورت بھی تراویح اور تہجد کی نماز میں تجویز کی ہے تاکہ معلوم ہو کہ محض جاگنا مقصود نہیں بلکہ عمل مقصود ہے پس اگر یہ عمل نہ ہوں تو تقلیل منام کی عادت کوئی فائدہ مند چیز نہیں اور اگر اعمال موجود ہیں تو تقلیل منام کا ثمرہ خاصہ حاصل نہ ہو کیفیات طاری نہ ہوں تو بے فکر رہو غرض شریعت نے کسی مجاہدہ حکمیہ کو مجاہدہ حقیقیہ سے خالی نہیں رکھا اور کسی جگہ محض ترک پر اکتفا نہیں کیا یہ فرق ہے مجاہدہ عرفیہ اور مجاہدہ شرعیہ میں یہ دوسرا رکن تھا مجاہدہ کا جس کے متعلق اس وقت بیان ہوا۔ اب دو رکن اور رہے ان شاء اللہ ان کے متعلق پھر کبھی بیان ہو جائے گا اب میں ختم کرتا ہوں اور اس بیان کا نام تقلیل المنام بصورۃ القیام تجویز کرتا ہوں۔ اب دعاء کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائے اور عمل کی توفیق عنایت ہو۔ آمین

وصلی اللہ علیٰ خیر خلقه سیدنا و مولانا محمد
وعلیٰ آله و اصحابه اجمعین و آخر دعونا ان
الحمد لله رب العالمین

ہفت اختر کا دوسرا وعظ

روح القیام

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہٗ نے یہ وعظ ۹ رمضان المبارک ۱۳۳۳ھ بروز جمعہ جامع مسجد تھانہ بھون میں تقریباً ۲۰۰ سامعین کی موجودگی میں بیٹھ کر ارشاد فرمایا جو روح صلوۃ کے سلسلہ میں علمی مضامین پر مشتمل ہے۔

بیان مبارک سوا تین گھنٹے تک جاری رہا۔

مولوی عبدالحلیم صاحب لکھنوی مرحوم نے اسے قلم بند فرمایا۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

خطبہ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ لا ھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہٗ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہٗ و رسولہ صلی اللہ علیہ علیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلمٗ امابعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرحیم .

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَاَنَا اخۡتَرۡتُكَ فَاسۡتَمِعۡ لِمَا يُوۡحٰى ۞ اِنَّنِىۡۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِىۡ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكۡرِىۡ (سورۃ طٰہٰ:۱۳)

اور میں نے تم کو (نبی بنانے کے لئے) منتخب فرمایا ہے سو جو کچھ وحی کی جارہی ہے اس کو سن لو (وہ یہ ہے کہ) میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں تم میری ہی عبادت کیا کرو اور میری ہی یاد کی نماز پڑھا کرو۱۳)

تمہید

یاد ہوگا کہ اس جمعہ کو میں نے صوم کی روح کا مضمون بیان کیا تھا اور ایک قاعدہ کلیہ بھی بتلایا تھا کہ ہر عبادت کی ایک صورت ہے اور ایک روح ہے چنانچہ صوم کی روح مجاہدہ ہے اور مجاہدہ کا حاصل مخالفت نفس ہے ہر چند کہ اس کے اعادہ کی ضرورت نہ تھی مگر اس لئے اعادہ کر دیا تا کہ اس پر تنبیہ ہو جائے نیز آج کے مضمون سے ارتباط ظاہر ہو جائے خلاصہ یہ کہ جس طرح صوم کی ایک روح ہے اسی طرح ہر عبادت کی ایک روح ہے۔ مجھ کو اس وقت ہر عبادت کی روح بیان کرنا مقصود نہیں کیونکہ نہ اس وقت اس کی ضرورت ہے اور نہ فرصت ہے البتہ ان عبادات کی ارواح بیان کروں گا جو رمضان سے متعلق ہیں اسی وجہ سے صوم کی روح کا بیان کیا گیا تھا کہ یہ رمضان کی سب سے بڑی عبادت ہے اب بھی انہیں عبادتوں کو ذکر کیا جائے گا جو رمضان کی خصوصیات سے ہیں اور ان کی خصوصیت نصوص سے ثابت ہے۔

خصوصیت تراویح

ان میں سے ایک عبادت نماز ہے اور ایک قرآن ہے اور دونوں سے زائد اس میں ایک نئی نماز سنت قرار دی گئی ہے اور عبادتیں بھی بڑھ سکتی تھیں ان سب میں نماز کو بڑھانے سے معلوم ہوا کہ اسے رمضان سے خصوصیت ہے جو اور کسی عبادت کو نہیں اس کا نام تراویح ہے اس کا پڑھنا بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ روایات سے اس کا مرغوب فیہ ہونا مامور بہ ہونا معمول بہ ہونا مطلوب ومقصود ہونا محمود ہونا سب ثابت ہے خود آپ ؐ کے فعل سے بھی اس کے بعد صحابہؓ کی مواظبت سے بھی اس لئے محققین نے اسے سنت موکدہ لکھا ہے گو آپ ؐ سے یہ ثابت ہے کہ تین شب کے بعد آپ تراویح کے لئے تشریف نہیں لائے اور یہ فرمایا کہ مجھے اس کے تم پر فرض ہو جانے کا اندیشہ تھا اس سے معلوم ہوا کہ اگر اندیشہ فرضیت کا نہ ہوتا تو آپ کا عزم تھا تشریف لانے کا اور عزم بجائے فعل کے ہوتا ہے پس جب آپ نے عزم کیا تو اس سے بھی تا کد ثابت ہو جائے گا جیسا کہ فعل سے ثابت ہوتا ہے اس کے سنت موکدہ ہونے کی ایک یہ تقریر ہے جو اپنے عنوان کے اعتبار سے نئی ہے۔

دوام تراویح

اور جو عنوان اس کا مشہور ہے وہ یہ ہے کہ مواظبت دو طرح پر ہے۔ ایک حقیقی دوسرے حکمی

مواظبت حقیقی تو یہ ہے کہ کسی فعل کا دوام حساً واقع ہوا ہو مثلاً ظہر کی سنتیں ہیں فجر کی سنتیں ہیں مواظبت حکمی یہ ہے کہ ایک فعل ایسے طرز سے واقع ہوا ہے کہ وہ طرز بتلا رہا ہے کہ اس کا دوام مطلوب ہے۔ چنانچہ آپ دو تین شب تشریف لائے اس کے بعد پھر تشریف نہیں لائے تو صحابہؓ سے فرمایا کہ مجھے تم سب کا آنا معلوم تھا مگر میں اس لئے نہیں آیا کہ ایسا نہ ہو تم پر فرض ہو جائے اور نہ ہو سکے تو تم گنہگار رہو اور اس کے یہ معنی نہیں کہ چلو یہ تو ایک گنجائش کی بات معلوم ہوئی کہ فرض نہیں اب کاہے کو مشقت اٹھائیں کہ جاگیں اور تھکیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ گناہ تو ہوگا مگر ترک فرض کے برابر نہ ہوگا۔ شاید کوئی یہ کہنے لگے کہ خیر زیادہ گناہ تو نہیں ہے تھوڑا گناہ ہے اگر چھوڑ دیں گے تو کچھ بڑا گناہ نہیں ہوگا۔ جو یہ کہے پہلے وہ میری اس رائے کو قبول کرلے تب یہ سمجھا جائے گا کہ یہ تھوڑی سی چیز کی وقعت نہیں کرتا اور اسے مہمل سمجھتا ہے تب میں بھی ایسے شخص کے لئے فتویٰ دے دوں گا کہ اسے چھوڑ دینا جائز ہے اور وہ رائے یہ ہے کہ ایک چھوٹی سی چنگاری لے کر اپنے چھپر پر یا اپنے کپڑوں کے صندوق میں رکھ دے اور اگر کوئی کہے تو یہ کہہ دے کہ یہ تو چھوٹی سی چنگاری ہے بڑا انگارہ تو نہیں ہے اور اگر یہ چھوٹی سی چنگاری رکھنے سے رکے کہ اثر تو چھوٹی بڑی کا یکساں ہے تو اس سے کہا جائے گا کہ حضور اثر دونوں کا یہاں بھی یکساں ہے۔

اثر ترک سنت

وہ کیا ہے ناخوشی حق تعالیٰ کی بلکہ ایک اعتبار سے تو ترک سنت کا اثر ترک فرض سے بھی بڑھ کر ہونا چاہیے وہ بات یہ ہے کہ گو حق تعالیٰ کی عظمت سب سے بڑھی ہوئی ہے اور ان کے حقوق بھی بڑھے ہوئے ہیں اور انبیا کی نہ اتنی عظمت نہ ایسے حقوق ہیں مگر فطری مذاق یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو چیز شاہد ہے اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے چنانچہ دیکھ لیجئے کہ جس قدر آپ حکام ملکی سے ڈرتے ہیں حق تعالیٰ سے نہیں ڈرتے تو کیوں اس لئے کہ حق تعالیٰ کے سلاسل (زنجیریں) واغلال نظر نہیں آتے اور حکام کا طوق وزنجیر پیش نظر ہے۔ حق تعالیٰ کا جیل خانہ (جہنم) نظر نہیں آتا حکام کا جیل خانہ سامنے موجود ہے اور لیجئے اپنی حسین بیوی کی طرف کس قدر طبعی کشش ہوتی ہے حق تعالیٰ کی طرف اتنی نہیں ہوتی پس اس سے معلوم ہوا کہ غائب کا اس درجہ کا اثر نہیں ہوتا جس درجہ حاضر کا ہوتا ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو مشاہد ہیں آپ سے باتیں کر سکتے تھے۔ آپ کو دیکھ سکتے تھے آپ کے پاس بیٹھ سکتے تھے گو ہم نے آپ کو نہیں دیکھا مگر اس سے بھی بہت بڑا اثر ہوتا

ہے کہ جس وقت ہم آپ کا شکل و حلیہ معمولات خورد و نوش عادات نشست و برخاست عبادات و اخلاق معلوم کرتے ہیں تو بالکل وہی اثر ہوتا ہے جو آپ کو خود کرتے ہوئے دیکھ کر ہوتا ہے بخلاف حق سبحانہ کے کہ کبھی آج تک نہ انہیں کسی نے دیکھا اور نہ اس دنیا میں دیکھ سکتا ہے کہ کہیں بھی نہیں کوئی چیز ذہن میں بھی ایسی نظر نہیں آتی کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آ جاتی ہے۔

؎ اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم   وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم

ترجمہ: (اے اللہ تعالیٰ آپ وہم و گمان خیال و قیاس سے بالاتر ہیں اور جو کچھ بزرگوں نے کہا ہے اور ہم نے سنا اور پڑھا اس سے بھی برتر ہیں ۱۲)

؎ دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر   ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

(دفتر تمام ہو گیا اور عمر اختتام کو پہنچی ایک وصف بھی آپ کا بیان نہ کر سکے ۱۲)

وہ تو وراء الوراء ثم وراء الوراء ہیں جیسا کہا گیا ہے۔ **کل ما خطر ببالک فھو ھالک واللّٰہ تعالیٰ اجل من ذٰلک** یعنی جو تصویریں ذہن میں گزرتی ہیں وہ سب فنا ہونے والی ہیں خدا اس سے بہت برتر ہیں ہم تو کیا سب سے بڑھ کر علم عارفین کا ہے حتیٰ کہ حکمائے یونان بھی ان کے سامنے طفل مکتب ہیں۔

قوۃ قدسیہ

یہ میں دعویٰ ہی نہیں کرتا حکماء کو بھی اس کا اقرار ہے جہاں انہوں نے قویٰ مدرکہ کی تقسیم کی ہے وہاں ایک قوت قدسیہ مانی ہے کہ وہ عقلاء کو میسر نہیں ہے اہل باطن کے ساتھ خاص ہے سو اس کا خود ان کو اقرار ہے گو اس قوت قدسیہ کی تحصیل کی ان کو ہمت نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ ان حکماء کی یہ حالت رہی کہ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ یعنی یہ لوگ علم ہی میں اتراتے رہے اور سمجھے کہ بہت بڑا کمال ہے اور گو خود حکماء میں بھی دو فرقے تھے۔ اشراقیین و مشائیین اور اشراقیین نے کثرت مجاہدہ سے اس قدر قلب کی صفائی کر لی تھی کہ حقائق کونیہ اشیاء کی ان کو منکشف ہو جاتی تھیں مگر چونکہ ان کے علوم پر دلائل قائم نہیں اور مشائیین کو جو کچھ علم ہوا وہ استدلال سے معلوم ہوا لہذا ان کو اشراقیین کے مقابلہ میں اپنے ہی علوم لذیذ و محکم معلوم ہوئے اگرچہ اس کا اعتراف کرتے رہے کہ دو قسم کے لوگ ہیں فاقد قوت قدسیہ اور واجد قوۃ قدسیہ مگر اس وقت قدسیہ کی طرف توجہ نہ کی علماء ظاہرین بھی جن پر ان علوم کا غلبہ ہوا علوم باطنہ کو انہوں نے بھی بے قدر و مرجوح سمجھا۔

مشہور ہے کہ ایک بہت بڑے عالم فلسفی حضرت نجم الدین کبریٰؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ حضرت کچھ تعلیم ذکر و شغل فرمایئے۔ حضرت نجم الدین کبریٰؒ نے تعلیم دی اور قاعدہ کے موافق فرما دیا کہ کیفیت سے اطلاع دیتے رہنا۔ جب یہ ذکر میں مشغول ہوئے خلوت میں تو انہیں یہ معلوم ہوا کہ کوئی چیز قلب سے نکلی جاتی ہے عرض کیا حضرت ذکر سے یہ کیفیت ہوئی آپ نے فرمایا کہ جو چیز نکلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے یہ علوم فلسفہ ہیں عرض کیا حضور یہ تو بڑی محنت سے حاصل کئے ہیں ان کا نکلنا تو گوارا نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ جاتے رہیں گے تو کیا ہے ان سے بہتر علوم حاصل ہوں گے۔

؎ بینی اندر خود علوم انبیاء　　　　بے معید و بے کتاب و اوستا

(تم کو بے معین اور بغیر استاد و کتاب کے انبیاء جیسے علوم حاصل ہوں گے ۱۲)

ان کے بعد تم کو وہ علوم حاصل ہوں گے کہ نہ کتاب کا واسطہ ہوگا نہ استاد کی ضرورت ہوگی کسی طرح ان کی سمجھ میں نہ آیا اور یہ کہہ کر حضرت یہ ادھار ہے چلے گئے مگر ایک دن کی صحبت کام کر چکی تھی ایک دن تو بہت ہے واقعی ایک ساعت بھی کام کر جاتی ہے۔

؎ صحبت نیکاں اگر یک ساعت است　　　　بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است

(نیک لوگوں کی صحبت اگر ایک گھڑی بھی ہے تو وہ سو برس کے زہد و طاعت سے بہتر ہے ۱۲)

؎ یک زمانے صحبت با اولیا　　　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

(اللہ والوں کی تھوڑی دیر کی صحبت بھی سو سال کی بے ریا عبادت و طاعت سے بہتر ہے ۱۲)

اس صحبت کا یہ اثر ہوا کہ جو اس علوم فلسفیہ کے ذہول (فراموشی) کو گوارا نہ کرتے تھے وہ بھی اس کی نسبت فرماتے ہیں۔

؎ نهاية اقدام العقول عقال　　　　وغاية سعي العالمين ضلال

ولم نستفد من بحثنا طول عمرنا　　　　سوى ان جمعنا فيه قيل يقال

یعنی آخر یہ کہنا پڑا کہ ساری عمر بجز بک بک اور قیل و قال کے کچھ حاصل نہ ہوا اور عمر بھر یونہی ضائع کی خلاصہ یہ کہ حکماء کو بھی اس کا اقرار ہے کہ ایک فرقہ واجدہ قوۃ قدسیہ ہے مگر اس کا علم نہیں کہ وہ کون ہے حقیقت میں وہ فرقہ عارفین کا ہی ہے جن کو قوت قدسیہ مرحمت ہوئی ہے سو اس سے بڑھ کر کیا علم ہوگا مگر اتنے بڑے علم والے بھی گو اول اول بہت دوڑتے ہیں اور جس قدر معرفت بڑھتی

جاتی ہے ان کا اشتیاق بڑھتا جاتا ہے جس کی مثال ایسی ہے جیسے استسقاء (جلندھر۱۲) کی بیماری والا کہ جس قدر پانی پیتا جاتا ہے پیاس بڑھتی جاتی ہے۔

؎ دل آرام در بر دل آرام جو   لب از تشنگی خشک برطرف جو

(محبوب گود میں ہے اور محبوب کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ نہر کے کنارے پر ہیں اور ہونٹ پیاس سے خشک ہیں۱۲)

؎ نگویم کہ برآب قادر نیند   کہ برساحل نیل مستسقیذ

(یہ ہم نہیں کہتے کہ پانی پر قادر نہیں بلکہ دریائے نیل کے کنارے پر جلندھر کے بیمار کی طرح ہیں) یعنی ان کی یہ حالت ہوتی ہے جیسے رود نیل پر کسی مستسقی کو بٹھا دو۔ کبھی اس کی تشنگی رفع نہ ہوگی اور اگرچہ اعتقاداً یہ جانتے ہیں کہ ذات منکشف نہیں ہوسکتی مگر شدت اشتیاق میں کچھ نہیں یاد رہتا اور برابر طلب میں لگے رہتے ہیں لیکن جب تھک تھکا کے ہر طرف سے لوٹتے ہیں تو پھر آخر یہی کہتے ہیں۔

؎ عنقا شکار کس نشود دام باز چیں   کایں جا ہمیشہ باد بدست ست دام دار

(جس طرح عنقا کو کوئی شکار نہیں کرسکتا جال پھیلانا اور کوشش کرنا لاحاصل ہے۔ اسی طرح ذات بحت کہنہ کا ادراک نہیں کرسکتا اس لئے فکر و سوچ بیکار ہے۱۲)

جیسا عنقا کسی کا شکار نہ ہوا ہوگا ذات بھی مدرک نہیں ہوسکتی پس وہ غیر مدرک وراء الوراء ثم وراء الوراء ہیں۔ غرض وہ ایک ایسی ذات ہیں جہاں نہ صورت نہ شکل نہ کسی نے دیکھا نہ دنیا میں دیکھ سکتا ہے۔

بے پایاں رحمت

اور اس کا مقتضیٰ یہ بھی تھا کہ ہم سب کبھی نجات نہ پاتے کیونکہ دین واجب ہے اور وہ موقوف ہے معرفت پر لہٰذا معرفت بھی واجب ہوئی اور وہ حاصل نہیں ہوسکتی لہذا ہم حق تعالیٰ کے حق سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔ سبحان اللہ کیا رحمت ہے کہ اپنی شان کے موافق معرفت واجب نہیں کی مدرک کی شان کے موافق واجب کی ہے حتیٰ کہ چار آدمی مختلف فہم کے اگر اپنی سمجھ کے موافق حق تعالیٰ کو الگ الگ سمجھیں تو سب ناجی ہیں۔ علماء محققین نے لکھا ہے کہ ہمیں جتنا فہم ہے ہم اسی قدر سمجھنے کے مکلف ہیں اسی قاعدہ کے محکم کرنے سے بہت سی احادیث اشکال سے صاف ہوجاتی ہیں۔

معارف الحدیث

حدیث میں آیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک کفن چور تھا اس نے مرنے کے وقت اپنے سب

بیٹوں کو جمع کر کے کہا کہ میں تمہارا کیسا باپ تھا یعنی تمہارے ساتھ کیسا برتاؤ کیا ہے انہوں نے کہا بہت اچھا برتاؤ کیا اس نے کہا اس کے عوض میرا ایک چھوٹا سا کام کر دو گے انہوں نے کہا جان و دل سے کر دیں گے کہا کہ جب میں مر جاؤں تو میری لاش کو جلا دینا اور اس کی راکھ کو محفوظ رکھنا اور جب خوب زور شور کی آندھی چلے تو اس راکھ کو منتشر کر دینا شاید میں اس طرح سے خدا کے ہاتھ نہ لگوں اور عذاب سے بچ جاؤں اور خدا تعالیٰ مجھ پر قادر ہو گئے تو مجھ پر ایسا سخت عذاب کریں گے کہ کبھی کسی پر نہ کیا ہوگا۔ چنانچہ جب وہ مر گیا تو اس کے بیٹوں نے اس کی وصیت پر عمل کیا حق تعالیٰ نے اس کے تمام اجزاء جمع کر کے نفخ روح کیا جب زندہ ہو گیا تو پوچھا کیوں صاحب یہ کیا حرکت تھی ایسا کیوں کیا اس نے عرض کیا اے پروردگار تیرے خوف سے ایسا کیا حدیث میں آتا ہے۔ **فغفر لہ** یعنی اتنی بات پر اس کی مغفرت کر دی گئی۔ اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب اسے خدا کی قدرت میں شک تھا تو مومن کیسے ہوا۔ جب مومن نہ ہو تو مغفرت کیسے ہو گئی اور اس کا جواب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ شاید پہلی امم میں غیر مومن کی بھی مغفرت ہوا کرتی ہو سو اس کا احتمال اس لئے نہیں کہ یہ امر نصوص سے معلوم ہے کہ اس امت پر رحمت زیادہ ہے حتیٰ کہ کفار پر بھی بہ نسبت پہلے کفار کے رحمت زیادہ ہے کہ گناہ کرتے ہیں اور بنی اسرائیل کی طرح مسخ نہیں ہوتے۔ عاد کی طرح تیز ہواؤں سے ہلاک نہیں کئے جاتے کسی کو الٹ دیا گیا۔ کسی کو فرشتے کی چیخ سے ہلاک کر دیا۔ کہیں اس امت میں بھی ہے اور اس امت کے کفار کے واسطے نص قطعی ہے کہ مغفرت نہیں ہوگی سو پہلی امم کے کفار کی مغفرت ہوگی تو اس امت کے کفار کی بھی ہوگی۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ان پر رحمت زیادہ ہے اور لازم باطل ہے لہٰذا ملزوم بھی باطل پس یہ جواب نہیں چل سکتا پس اعتراض باقی رہا کہ وہ قدرت میں تردد کی وجہ سے کافر تھا تو مغفرت کیسے ہو گئی۔ غرض یہ اشکال ہے بعضوں نے اس سے بچنے کے لئے **ان قدر اللہ** (اگر قادر ہو گئے اللہ تعالیٰ ۱۲) کے معنی ہیں تاویل کی کہ **قدر** کے معنی ضیق (تنگی کی ۱۲) کے بھی آتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان تکلفات کے بغیر اس کا جواب نہایت سہل ہے وہ یہ کہ اس کی سمجھ اتنی ہی تھی اور وہ اپنی سمجھ کے موافق مکلف تھا۔ وہ یوں سمجھتا تھا کہ بس قدرت اتنی ہی ہوتی ہے۔ اتنی عقل نہ تھی کہ یہ سمجھتا کہ وہ قدرت اس سے بہت آگے ہے۔ اسی طرح اس باب میں اعرابیوں کی عجیب و غریب حکایتیں مشہور ہیں۔ ایک اعرابی کی حکایت ہے کہ ایک واعظ نے اپنے وعظ میں بیان کیا کہ حق تعالیٰ کے نہ ہاتھ ہے نہ پاؤں نہ آنکھ ہے نہ ناک نہ اور اعضاء۔ غرض وہ جوارح سے بالکل

پاک ہے۔ ایک اعرابی سن کر کہنے لگا کہ بطخ شامی کی طرح گول مول اور اپاہج تیرا ہی خدا ہوگا ہمارے خدا کے سب کچھ ہے۔ غرض ہر شخص اپنی فہم کے موافق سمجھتا ہے اور اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے اس رحمت کا کہ باوجود ان بدیہی غلطیوں کے پھر بھی ان سب کا نام دفتر عارفین میں لکھا ہوا ہے اور دوسرے تو کنہ ذات کی کیا سمجھتے جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی **لا احصی ثناء علیک (مسند احمد ۶:۵۸، اتحاف السادۃ المتقین ۲:۷۱)** (میں تیری تعریف ہی نہیں کر سکتا ہوں ۱۲) فرماتے ہیں پھر کسی اور کی کیا مجال جو کنہ اور حقیقت دریافت کر سکے۔

فطرۃ خاص کا اثر

بہر حال خدا کی شان وراء الوہم ثم وراء الوہم واہم سے بالاتر ۱۲) ہے تو مثل محسوس کے ذات کو مطابق واقعہ کے فرض نہیں کر سکتے اور حضورؐ کو فرض کر سکتے ہیں کیونکہ گو ہم نے آپ کو نہیں دیکھا مگر آپ کی ہر ادا ہمارے پیش نظر ہے اس لئے آپ مثل محسوس کے ہیں اور محسوس کا اثر زیادہ ہوتا ہے پس اس کا مقتضا یہ ہے کہ آپ کا خلاف کرتے ہوئے زیادہ شرم آنی چاہیے تھی۔ اس تقریر سے یہ ثابت ہوا کہ تراویح میں یہ گنجائش نہیں کہ اسے بالکل گناہ نہ سمجھ کر یا تھوڑا گناہ سمجھ کر چھوڑا جائے چنانچہ اس فطرۃ خاص کا یہ اثر ہے کہ جو گیارہ ماہ فرض بھی نہیں پڑھتے وہ بھی تراویح کا اہتمام کرتے ہیں۔

تخفیف تراویح

تو تعجب ہے کہ ایسے لوگ جو بارہ مہینے فرض پڑھتے چلے آتے ہیں وہ اس میں تخفیف کرنا چاہتے ہیں آج ہی میں نے ایک خط کا جواب لکھا ہے تعجب تو یہ ہے کہ وہ حضرت پڑھے جنہیں اگر کوئی جاہل ہوتو اسے سمجھانا سہل ہے مگر یہ پڑھے جن بہت مشکل سے سمجھتے ہیں اس خط میں لکھا تھا کہ آج کل کسل غالب ہے اگر ان احادیث پر عمل کر لیا جائے جن میں آٹھ یا بارہ رکعت کی تصریح ہے تو کیا حرج ہے مجھے بھی فکر ہوئی کہ اس کا کیا جواب لکھوں پھر میں نے اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ اس مولوی کا کوئی جواب سمجھا دے چنانچہ حق تعالیٰ نے مجھے سمجھا دیا۔ میں نے یہ لکھا کہ سیدھی سی بات ہے کہ بیس رکعت کے سنت موکدہ ہونے پر اجماع منعقد ہو چکا ہے اور اجماع کی مخالفت ناجائز ہے اور یہ اجماع علامت ہے ان احادیث کے منسوخ ہونے کی اور اگر اجماع میں شبہ ہو کہ بعض علماء نے صرف آٹھ کو سنت موکدہ لکھا ہے تو جواب یہ ہے کہ اجماع اس قول سے منعقد ہے۔

پس اس کے مقابلہ میں شاذ قول قابل اعتبار نہیں ہوگا جب تاکد ثابت ہو گیا تو اس کے ترک کرنے سے مورد عتاب ہوگا۔

انہوں نے ایک اور بات لکھی تھی کہ صاحب فتح القدیر کی رائے ہے کہ آٹھ رکعتیں پڑھنا چاہیے میں نے لکھا کہ جمہور کے مقابلہ میں ایک صاحب فتح القدیر کی رائے نہیں چل سکتی۔ خصوصاً جب کہ ان کا عمل خود ان کے خلاف ہو کیونکہ صاحب فتح القدیر کی یہ علمی تحقیق ہے مگر پڑھیں انہوں نے بھی ہمیشہ بیس۔ لہذا ان کی تحقیق قابل عمل نہیں۔

تراویح میں اجتہاد

ایک شخص دہلی کے نئے مجتہدین سے آٹھ تراویح سن کر مولانا شیخ محمد صاحبؒ کے پاس آئے تھے اور انہیں تردد تھا کہ آٹھ ہیں یا بیس۔ یہ نئے مجتہد اپنے کو عامل بالحدیث کہتے ہیں کیوں صاحب حدیث میں بیس بھی تو آئی ہیں ان پر کیوں نہ عمل کیا کہ ان کے ضمن میں آٹھ پر بھی عمل ہو جاتا۔ بات کیا ہے کہ نفس کو سہولت تو آٹھ ہی میں ہے۔ بیس کیونکر پڑھیں اصل یہ ہے کہ جو کچھ ان کے جی میں آتا ہے کرتے ہیں اور شاذ اور ضعیف احادیث کو بھی سہارا بنا لیتے ہیں۔ قاری عبدالرحمان صاحبؒ ان کے غلاۃ (غلو کرنے والے ۱۲) کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ یہ بے شک عامل بالحدیث ہیں لیکن الف لام الحدیث میں عوض مضاف الیہ کے ہے اور وہ مضاف الیہ نفس ہے یعنی عامل بحدیث النفس تو واقعی یہ لوگ حدیث نفس کے عامل ہیں حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عامل نہیں یہ لوگ اپنے نفس کے موافق احادیث تلاش کیا کرتے ہیں جیسے کسی کی حکایت مشہور ہے کہ اس سے پوچھا گیا کہ تمہیں قرآن کا کونسا حکم سب سے زیادہ پسند ہے کہا رَبَّنَآ اَنۡزِلۡ عَلَيۡنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (اے رب ہم پر آسمان سے مائدہ یعنی خوان نازل فرما ۱۲) تو اسی طرح انہوں نے بھی تراویح کی تمام احادیث میں سے صرف آٹھ رکعت والی حدیث پسند کی حالانکہ بارہ بھی آئی ہیں اور وتر کی تمام احادیث میں سے ایک رکعت والی حدیث پسند کی حالانکہ تین رکعتیں بھی آئی ہیں پانچ بھی آئی ہیں سات بھی آئی ہیں خیر تو وہ بیچارے ان کے بہکانے سے تردد میں پڑ گئے تھے۔ مولانا سے پوچھا مولانا نے فرمایا کہ بھئی سنو اگر محکمہ مال سے اطلاع آئے کہ مالگزاری داخل کرواور تمہیں معلوم نہ ہو کہ کتنی ہے تم نے ایک نمبردار سے پوچھا کہ میرے ذمے کتنی مالگزاری

ہے اس نے کہا آٹھ روپے پھر تم نے دوسرے نمبردار سے پوچھا اس نے کہا بارہ روپے اس سے تردد بڑھا تم نے تیسرے سے پوچھا اس نے کہا بیس روپے تو اب بتاؤ تمہیں کچہری کتنی رقم لے کر جانا چاہیے۔ انہوں نے کہا صاحب بیس روپے لے کر جانا چاہیے اگر اتنی ہوئی تو کسی سے مانگنا نہ پڑے گی اور اگر کم ہوئی تو رقم بچ رہے گی اور اگر میں کم لے گیا اور وہاں ہوئی زیادہ تو کس سے مانگتا پھروں گا۔ مولانا نے فرمایا بس خوب سمجھ لو اگر وہاں بیس رکعتیں طلب کی گئیں اور ہیں تمہارے پاس آٹھ تو کہاں سے لا کر دو گے۔ اگر بیس ہیں اور طلب کم کی ہیں تو بچ رہیں گے اور تمہارے کام آئیں گے کہنے لگے ٹھیک ہے سمجھ میں آ گیا اب میں ہمیشہ بیس رکعتیں پڑھا کروں گا۔ بس بالکل تسلی ہوگئی۔ سبحان اللہ کیا طرز ہے سمجھانے کا۔ حقیقت میں یہ لوگ حکمائے امت ہوتے ہیں۔ ایک اور عامی شخص نے مولانا سے پوچھا تھا کہ:

وَلَا الضَّآلِّيْنَ ہے یا و الظالین پوچھا قرآن میں لکھا کیا ہے۔ اس نے کہا قرآن میں تو وَلَا الضَّآلِّيْنَ لکھا ہے۔ آپ نے فرمایا بس جو قرآن میں لکھا ہے وہی ٹھیک ہے۔ واقعی ایسے عامی کو اس سے زیادہ سمجھانے کا اس سے بہتر کیا طریقہ ہوگا۔

بہرحال تراویح میں اختصار ان لوگوں نے کیا ہے جو پہلے سے نمازی ہیں افسوس ہے اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ کہتے ہیں جماعت تو سنت موکدہ علی الکفایہ ہے بس محلہ کے تیلی جلاہے پڑھ لیں گے ہم پر سے بھی ادا ہو جائے گی۔ کیا ظلم وستم ہے تم خدا کے ساتھ قانون بگھارتے ہو۔ اگر خدا تعالیٰ عطاء کے وقت بھی قانون برتیں کہ جس طرح تم ارکان ضروری ادا کرتے ہو وہ بھی ضرورت کے موافق دیدیا کریں تو بتاؤ کہ تمہارا کیا حال ہوگا۔ مثلاً ایک دن تمہیں آدھ سیر اناج سے زیادہ نہ دیں یا ایک لوٹے پانی سے زیادہ نہ دیں تو تم کیا کرو گے بلکہ وہ تو اتنا بھی نہ دیں تو تم کیا کر لو کیونکہ ان پر کسی کا دینا واجب تو ہے نہیں محض اپنے فضل و رحمت و احسان سے دیتے ہیں۔

فضل و احسان باری

اس فضل و احسان پر ایک عابد کی حکایت یاد آ گئی کہ وہ کہا کرتا تھا کہ میں جنت کا مستحق ہوں اپنے اعمال کی وجہ سے کیونکہ وہ جو فرما رہے ہیں پانچ سو برس سے برابر اسی کے موافق عمل کر رہا ہوں۔ ہاں اپنے فضل سے چاہے کچھ اور دیدیں باقی جتنا مجھے اعمال پر ملے گا وہ میرے استحقاق

ہی کی وجہ سے ملے گا۔ چند روز کے بعد مر گیا آسمان پر حاضر کئے گئے وہاں کے فرشتوں نے کہا چلو وہ چلے۔ میدان میں سخت تابش تھی بہت پیاس لگی فرشتوں سے پوچھا یہاں پانی ہے۔ انہوں نے کہا ہے مگر بہ قیمت ملتا ہے۔ پوچھا کیا قیمت ہے کہا یہاں ایک پیالہ پانی کی قیمت پانچ سو برس کی عبادت ہے۔ ان حضرت کے پاس کل عبادت پانسو ہی برس کی تھی۔ پیاس کے مارے بے تاب تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ پانسو برس کی عبادت کے بدلے میں وہ پیالہ لے لیا۔ پھر تھوڑی دور چلے۔ اس سے زیادہ پیاس لگی پھر پانی کو پوچھا فرشتوں نے وہی جواب دیا انہوں نے کہا کہ اب تو عبادت نہیں رہی۔ اب حق تعالیٰ کے سامنے پیش کئے گئے ارشاد ہوا کیا لائے ہو۔ بولو اب مغفرت کا استحقاق کس بات پر ہے عرض کیا اے اللہ مغفرت محض تیرے فضل سے ہے اور میں غلطی میں مبتلا تھا۔ یہ تو یہاں کے ایک پیالہ پانی کی قیمت ہے پھر اور چیزیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا ان کی کیا قیمت ہوگی۔ ہزار برس کی عبادت سے بھی زیادہ ہوگی۔ خصوص تمہارے نرخ نامہ کے موافق شرح اس کی یہ ہے کہ مقدمہ ظاہر ہے کہ اموال تمہارے یہاں زیادہ پیارے ہیں اعمال سے چنانچہ ہر شخص کو جب کوئی ضرورت پیش آتی ہے اعمال آسانی سے تجویز کرتا ہے مثلاً میرا فلاں کام ہو جائے تو میں دو رکعت نماز پڑھوں گا یا ایک روزہ رکھوں گا ایسا بہت کم ہوگا کہ کوئی یہ کہے کہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلاؤں گا یا ایک مسافر کو راہ خرچ دوں گا۔

قانونی برتاؤ

اس مقدمہ کے بعد نعمتوں کی قیمت اول اموال سے سن لو جب ایک حکایت سے معلوم ہوگی کہ ایک درویش کسی بادشاہ کے پاس ہدایت کرنے گئے بادشاہ سے پوچھا اگر تم کسی جنگل میں شکار کو جاؤ اور اتفاق سے اپنے لشکر سے جدا ہو کر راستہ بھی بھول جاؤ اور تلاش کرنے میں اس قدر پیاس لگے کہ راستہ چلنا دشوار ہو جائے بلکہ دم پر بن جائے اور اس وقت تمہارے پاس کوئی شخص ایک پیالہ پانی لے کر آئے اور کہے کہ آدھی سلطنت کے عوض یہ ایک پیالہ مل سکتا ہے تو تم کیا کرو گے پیاس کے مارے جان دو گے یا آدھی سلطنت دے کر وہ پیالہ لے لو گے۔ بادشاہ نے کہا پانی لے لوں گا۔ درویش نے کہا اچھا اس کے بعد تم پانی پی کر چلے تھوڑی دور چل کر پیشاب لگا اور اتفاق سے وہ بند ہو گیا اور کسی طرح نہیں اترتا۔ ایک طبیب راستہ میں ملا اس نے کہا آدھی سلطنت

مجھے دو تو میں پیشاب اتار دوں گا تو تم کیا کرو گے۔ بادشاہ نے کہا جان زیادہ پیاری ہے۔ اسے بھی آدھی سلطنت دے دوں گا۔ درویش نے کہا۔ سبحان اللہ اسی سلطنت پر اس قدر گھمنڈ ہے جس کی قیمت ایک کٹورے پیشاب اور ایک پیالہ پانی کے برابر ہے۔ اسی کے بھروسے انا کذا و انا کذا (میں ایسا اور میں ایسا ۱۲) ہے۔ خیال کرو کہ دنیا کے پانی کی کس قدر قیمت ہے گھڑے کے گھڑے یونہی پی جاتے ہیں بلکہ غور کیا جائے تو ایک شخص کئی کئی تالاب پی چکا ہے۔ گو وہ تم میں باقی نہیں رہا فضلہ بن کر خارج ہو گیا۔

اس خارج ہونے پر ایک ظرافت آمیز حکایت یاد آئی کہ ایک احمق نے ایک بیل خریدا تالاب پر پانی پلانے لے گیا اکثر جانوروں کی عادت ہے کہ پانی پینے کے وقت موتتے ہیں۔ وہ بیل بھی موتنے لگا۔ اس احمق نے جو بیل کو موتتے دیکھا کہنے لگا کہ لے جاؤ اپنا بیل ہم پھوٹا ہوا بیل نہیں لیتے۔ بس اسی طرح تم پھوٹے ہوئے ہو۔ اگر پیٹ میں پانی نہ ٹھہرے تو کیا کیا جاوے دینے والے نے تو دریغ نہیں کیا۔ غرض جب ایک کٹورے پانی کی قیمت دنیا میں آدھی سلطنت اور آخرت میں ایک ہزار برس کی عبادت ہے تو جو کچھ ہمیں یہاں ملتا ہے یا وہاں ملے گا سب حق تعالیٰ کا فضل ہے کسی کو کسی چیز کا بھی استحقاق نہیں۔ اب جو تم خدا تعالیٰ کے ساتھ قانون بگھارتے ہو کہ جماعت تراویح سنت موکدہ علی الکفایہ ہے تو اگر وہ بھی تمہارے ساتھ قانون برتتے تو ایک گناہ پر ہلاک کر دیتے اگر وہ تمہیں کھانا صرف اتنا ہی دیں کہ بھوکے نہ مرو تو نانی یاد آ جاوے۔ غرض یہ پڑھے لکھے لوگ ہیں کہ انہوں نے جو کچھ پڑھا ہے تراویح پر اس کی مشق ہوتی ہے حالانکہ تراویح چونکہ سنت ہے اس لئے اس کا عملاً بہت اہتمام کرنا چاہیے گو اعتقاداً فرض کا اہتمام زیادہ ہے اور عملاً اس کا اہتمام اس لئے زیادہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر محسوس ہے اور یہ ایک طبعی بات ہے۔ چنانچہ اگر ایک قرآن رکھا ہوا اور ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قمیص مبارک بھی رکھا ہو۔ دیکھ لو دل کدھر کھنچتا ہے۔ طبیعت کا جذب کدھر زیادہ ہوتا ہے۔ گو اعتقاداً وہ حق تعالیٰ کا کلام ہے اس کی تعظیم واجب ہے مگر عملاً تم اس کے ساتھ وہ برتاؤ کرو گے جو قرآن کے ساتھ نہیں کرتے۔ پھر بھی نہ یہ شرک ہے نہ ترک ادب ہے کیونکہ فطرۃً انسان اس کے خلاف پر قادر نہیں۔ البتہ حدود شرعیہ سے تجاوز معصیت و بدعت ہے۔ غرض جب ہم آپ کے ملبوسات سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں تو آپ کی سنت کی کیوں نہ وقعت ہو بہرحال تراویح رمضان کی خصوصیات میں سے ہے۔ یہ تقریر

اس پر مبنی ہے کہ یہ ثابت ہو کہ اس ماہ کی خصوصیات میں سے ہے۔

تراویح و تہجد میں فرق

بعض لکھے پڑھے اس میں بھی کلام کرتے ہیں۔ میرے پاس ایک خط آیا ہے کہ تراویح یہ وہی تہجد ہے جو پچھلی رات کو پڑھی جاتی تھی۔ اس نے یہ صورت اختیار کر لی ہے میں نے لکھا کہ دلیل سے ثابت ہے کہ تہجد اور ہے اور تراویح اور ہے چنانچہ تہجد کی مشروعیت حق تعالیٰ کے کلام سے ثابت ہوتی یَاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ○ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا○ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا○ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا○ ہے۔ (اے کپڑوں میں لپٹنے والے رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف رات کہ (اس میں قیام نہ کرو بلکہ آرام کرو یا اس نصف سے کسی قدر کم کر دو یا نصف سے کچھ بڑھا دو اور قرآن کو خوب صاف صاف پڑھو۱۲) اس کی دلیل ہے پھر دوسرا رکوع گیارہ بارہ مہینے میں نازل ہوا جس کا حاصل اس فرضیت کا منسوخ کر دینا ہے اور تراویح کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **سننت لکم قیامه (سنن النسائی ۴:۱۵۸، مسند احمد ۱:۱۹۱، کنز العمال: ۲۳۷۲۲)** (میں نے تمہارے لئے اس میں تراویح مسنون کی ہے۱۲) اگر یہ تہجد ہے تو اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف کیوں منسوب کیا۔ اس سے لازم آتا ہے کہ جو خدا کی طرف منسوب ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف منسوب فرماتے ہیں۔ لہذا معلوم ہوا کہ تہجد اور ہے جس کی مشروعیت حق تعالیٰ کے کلام سے ثابت ہوتی ہے اور تراویح اور ہے جس کی سنیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ثابت ہوتی ہے اور بڑی بات یہ ہے تعامل امت نے دونوں میں فرق کیا ہے۔ غرض یہ عبادت مخصوص ہے اس کے ساتھ اور حقیقت اس کی نماز ہے۔

روح صلوٰۃ

میں اس حقیقت کی روح کو بیان کرنا چاہتا ہوں کہ جس کی ایک جزئی تراویح بھی ہے پھر خواہ یوں کہیے کہ نماز ایک نوع ہے خصوصیات لگ کر اصناف جدا جدا ہو گئے ہیں یا یوں کہئے کہ نماز ایک جنس ہے فصول لگ کر انواع جدا جدا ہو گئے ہیں بہر حال اتنا تو معلوم ہے کہ ان میں چند مشترک ہیں مگر یہ پتہ چلنا مشکل ہے کہ وہ خصوصیات جو مابہ الامتیاز ہیں آیا عوارض ہیں کہ ان کو اصناف کہا جائے یا ذاتیات ہیں کہ انہیں انواع کہا جائے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تراویح مطلق نماز ہونے کے اعتبار سے خصوصیات میں سے ہے۔ رمضان کی کیونکہ مطلق نماز لابشرط شئی (نہ کسی شرط کے ساتھ۱۲)

کے مرتبہ کا ایک مصداق تراویح بھی ہے اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تراویح نماز خاص ہونے کے اعتبار سے مخصوص ہے اس ماہ کے ساتھ۔ بہر حال تراویح نماز خاص ہونے کے اعتبار سے مخصوص ہے اس ماہ کے ساتھ۔ بہر حال تراویح کو خواہ مطلق نماز کہو یا نماز خاص کہو وہ اس ماہ کی خصوصیات سے ہے اس لئے آج نماز کی روح کے بیان کرنے کا خیال ہے۔

صورۃ صلوۃ

اور اس شبہ کو دوبارہ دفعہ کئے دیتا ہوں کہ اکثر لوگوں کے ذہن میں یہ وسوسہ دوڑنے لگا ہے کہ نماز کی صورت مقصود نہیں صرف روح مقصود ہے۔ اس میں دو فرقے ہیں ایک وہ لوگ ہیں جو صورت کو بھی ترک تو نہیں کرتے لیکن مقصود اصلی روح ہی کو سمجھتے ہیں اور صورت کو غیر مقصود سمجھ کر ان کے قلب میں اس کی کوئی وقعت نہیں اور بالکل بے قدر سمجھتے ہیں دوسرے وہ لوگ ہیں جو صورت کو کسی درجہ میں بھی معمول بہ نہیں سمجھتے۔ چنانچہ صوفیا نے نماز کی روح نکالی کہ ذکر ہے بس اب اس کی صورت سے آزاد ہو گئے اور اعتقاد کر لیا کہ فقط ذکر کر لینا کافی ہے جو روح نماز کی ہے لیکن جس طرح انہوں نے نماز کی روح نکالی کبھی اس طرح ان صوفی صاحب نے اپنی روح نہ نکالی کہ آپ کی صورت بھی غیر مقصود ہے پھر صورت کو غذا صورت کو لباس کیوں دیتے ہیں۔ خوب سمجھ لو کہ جس طرح روح صلوٰۃ روح انسان کی غذا ہے صورت صلوۃ صورت انسان کی غذا ہے پس صورت انسان کو علاوہ اس غذائے طبعی کے یہ ایک غذا اور بھی عطا فرمائی گئی ہے تو جس طرح تم نے اس غذا کو حذف کیا ہے اس غذا کو بھی حذف کر دو۔ کہ نہ کھاؤ اور نہ پیو تو ہم جانیں کہ شاہ صاحب واقعی اپنے رنگ کے پکے ہیں کہ ہر جگہ اپنے مذاق کی رعایت کرتے ہیں اس کے کیا معنی کہ نماز کی صورت تو اڑا دو اپنی صورت کو پالتے رہو۔ اگر کوئی چھٹا نک بھر گھی کھائے تو شاہ صاحب پاؤ بھر گھی کھاتے ہیں۔

ایک شاہ صاحب کا بہت گھی کھا کھا کے دعوتیں اڑا اڑا کے پیٹ بہت پھول گیا تھا۔ ایک مرید نے پوچھا کہ شاہ صاحب آپ اس قدر موٹے کیوں ہیں۔ کہنے لگے کہ نفس کتا ہے اور کتا جب مر جاتا ہے تو پھول جاتا ہے اس نے کہا حضور جب یہ مر گیا ہے تو کوڑے پر پھینک دیجئے۔ مرے ہوئے کتے کو تو کوڑے پر پھینک دیتے ہیں۔ بس شاہ صاحب چپ رہ گئے۔ واقعی کہی بڑی کھری۔ وہ مرید کیا تھا بلکہ آپ کا بھی پیر تھا۔ سو یہ کیفیت ہے کہ اپنی صورت کو حذف نہ کیا بلکہ اس

کے پالنے کے لئے طرح طرح کے جال پھیلاتے ہیں اور نماز کی صورت کو حذف کر دیا۔

ایک اور شاہ صاحب تھے وہ بھی نماز نہیں پڑھتے تھے ان کے مریدوں میں مشہور تھا کہ شاہ صاحب مکہ میں نماز پڑھتے ہیں۔ میرے دوست نے کہا کہ جب نماز وہاں پڑھتے ہیں تو کھانا بھی وہیں کھالیا کریں کہ متبرک ہوگا۔ واقعی بڑی عجیب بات کہی نماز کے لئے مکہ اور کھانے کے لئے ہندوستان بلکہ استنجا بھی وہیں کرلیا کریں کیا ہندوستان بمپولیس ہے کہ استنجے کے لئے یہاں چلے آتے ہیں۔ اگر مکہ کو بیت اللہ ہونے کی وجہ سے زیادہ شرف حاصل ہے تو ہندوستان میں بھی بہت متبرک مقامات ہیں بیشمار انبیاء صحابہ اولیاء کے مزارات ہیں بلکہ آدم علیہ السلام کا نزول سب سے پہلے یہیں ہوا تو مکہ کے برابر تو نہیں مگر تھوڑا بہت کچھ تو ہے۔

کچھ نہیں سب جھوٹی باتیں ہیں۔ یوں بک دیا کہ مکہ میں نماز پڑھتے ہیں لوگوں نے نفس پرستی کی وجہ سے ایسی ایسی خرافات و مزخرفات گھڑلی ہیں۔ بہر حال جہلائے صوفیہ پر تو اس روح نکالنے کا یہ اثر ہوا کہ وہ صورت کو کسی درجہ میں ضروری نہیں سمجھتے اور پابندان ظاہر پر اس کا یہ اثر ہوا کہ وہ یہ تو نہیں کہ نماز کو فرض نہ سمجھیں مگر یہ ضرور ہوا کہ ان کے قلب میں ظاہری رکوع و سجود کی وقعت زیادہ نہیں ہے۔ میں نے یہاں تک دیکھا ہے کہ اس کی کوشش تو کرتے ہیں کہ نماز میں خطرات نہ آئیں مگر تعدیل و ادائے سنن کی پرواہ بھی نہیں ہوتی حالانکہ ان کا درجہ اس سے بڑھ کر ہے۔

حقیقت ولایت

حضرت حاجی صاحبؒ کے ایک مرید صاحب کشف تھے۔ یہ خیال ہوا کہ نماز ایسی پڑھنا چاہیے جس میں کوئی خطرہ نہ آوے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کو بغیر آنکھ بند کئے حضور قلب نہ ہو تو آنکھ بند کر کے نماز پڑھنا جائز ہے ورنہ مکروہ ہے چنانچہ انہوں نے آنکھیں بند کر کے اس طرح نماز پڑھی کہ کوئی خطرہ نہیں آنے پایا۔ جب فارغ ہوئے تو بہت خوش ہوئے پھر متوجہ ہوئے نماز کی ہیئت مکشوف ہوئی۔ دیکھا نہایت حسین و جمیل ہے۔ پھر غور کر کے ہر ہر عضو کو دیکھنے لگے اتفاقاً آنکھوں پر نگاہ پڑی دیکھا تو آنکھیں نہیں ہیں۔ بہت پریشان ہوئے۔ حضرت سے آ کر عرض کیا۔ تمام واقعہ مفصل نہیں عرض کیا۔ مگر کیا ٹھکانا ہے حضرت کی فراست کا' فی البدیہہ فرمایا کہ تم نے نماز آنکھیں بند کر کے پڑھی ہوگی۔ پھر فرمایا گو تم نے اس طرح نماز پڑھی کہ خطرات نہ آئیں مگر آنکھیں بند کرنا

سنت کے خلاف تھا۔ تو آنکھیں کھول کر نماز پڑھنا گو خطرات آئیں افضل ہے اور آنکھیں بند کر کے نماز پڑھنا گو خطرات نہ آئیں مفضول ہے کیونکہ خلاف سنت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہمشکل بننا افضل ہے۔ حضرت اللہ کے نزدیک تو صورت بھی حضور ﷺ کی مقبول ہے۔ میرے ایک دوست قنوج میں وکیل ہیں اوہ اپنا قصہ بیان کرتے تھے کہ میں کسی شہر میں گیا کہیں راستہ میں ایک بڑی بی مجھے ملیں اپنے گھر بلا کر لے گئیں میری بڑی خاطر کی حلوا کھلایا۔ میں نے پوچھا کہ بڑی بی اس خاطر کا کیا سبب ہے نہ میں تمہیں جانوں نہ تم مجھے۔ بڑی بی نے کہا میرا ایک بیٹا تمہاری ہی صورت کا ہے وہ پردیس میں ہے مجھے تمہاری صورت دیکھ کر وہ یاد آ جاتا ہے۔ پھر جب یہ ادھر سے گزرتے ان کے پاس ضرور جاتے وہ بھی ان کی بہت خاطر کرتی تھیں۔ تو خیال کرو وہ بڑھیا ادنیٰ درجہ کی رحیم تھی جب اسے اپنے محبوب بیٹے کی صورت اس قدر پیاری ہے تو حق تعالیٰ کو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت عبادت کی کیوں نہ محبوب ہوگی یہ یاد رکھو کہ ولایت شعبہ نبوت کا ہے۔ جتنا زیادہ مشبہ بالنبوۃ ہو گا اسی قدر اس کی ولایت میں کمال ہوگا۔ عوام جوش وخروش والے کو زیادہ پسند کرتے ہیں سمجھتے ہیں کہ بڑا کامل ہے حالانکہ وہ کامل نہیں البتہ معذور ہے کامل وہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہو۔ ہر ادا ویسی ہو نشست وبرخاست خورد ونوش ہنسا بولنا۔

حقیقت خشوع

غرض یہ سب باتیں حضور ﷺ ہی کی طرح ہو بس یہ ہے کہ کامل حضور ﷺ سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے۔ مگر آپ کو بھی نماز میں استغراق نہ ہوتا تھا۔

خود فرماتے ہیں کہ میں یہ سوچ کر آتا ہوں کہ آج نماز میں تطویل کروں گا۔ مگر بچہ کی آواز سنتا ہوں تو اس خوف سے مختصر کر دیتا ہوں کہ شاید کوئی بچہ والی عورت نماز میں ہو اور بچہ کی آواز سے پریشان ہو اس وقت عورتوں کو مسجد میں حاضر ہونے کی اجازت تھی مگر جب سے فتنہ کا خوف پیدا ہوا ممانعت ہوگئی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بچہ کا رونا نماز میں سنتے تھے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نماز میں استغراق نہ ہوتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں استغراق کا ہونا کمال نہیں۔

اس سے ایک اور مسئلہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **مخافة ان تفتن امه** یعنی احتمال تھا کہ اس کی ماں کو پریشانی ہو معلوم ہوا کہ انبیاء کا کشف دائمی نہیں ہوتا۔ لہذا

اولیاء کا بھی دائمی نہیں ہوسکتا اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خشوع استغراق کو نہیں کہتے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں خشوع یقیناً ہوتا تھا اور کیوں کر نہ ہوتا جب حق تعالیٰ مطلق مومنین کاملین کے باب میں فرماتے ہیں قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ (تحقیق ان مسلمانوں نے آخرت میں فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں ۱۲) پس جب ایمان کے لوازم سے خشوع ہے تو نبوت کے لوازم سے بدرجہ اولیٰ ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو استغراق تھا نہیں۔ معلوم ہوا کہ خشوع اور حضور قلب اور شئے ہے اور استغراق اور شئے ہے اور اگر دونوں ایک ہی ہوں تو اجتماع نقیضین (دوضدوں کا جمع ہوجانا ۱۲) لازم آئے گا۔ کیونکہ باقتضائے آیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں خشوع ہے اور بدلالت حدیث استغراق نہیں اگر یہ دونوں ایک ہی شے سے ہوتے تو ایک ہی شے کا ہونا اور نہ ہونا لازم آئے گا۔ اور یہ محال ہے جو لوگ غلطی سے یہ سمجھ گئے کہ خشوع و استغراق ایک ہی شے ہے اور خشوع ہے روح صلوۃ تو استغراق بھی روح صلوۃ ہے اور جب استغراق نہیں تو روح نہیں جب روح نہیں تو بے روح کی نماز کس کام کی۔ تو یہ سمجھے کہ ہماری نماز بے قدر ہے کہ اس میں استغراق نہیں حالانکہ ابھی ثابت ہو چکا ہے کہ استغراق اور شئے ہے اور وہ روح صلوۃ نہیں۔ ورنہ لازم آئے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز بھی بے روح ہو۔

بہرحال جب ان لوگوں نے استغراق کو مقصود بالذات سمجھ لیا اور وہ حاصل نہیں تو صرف رکوع و سجود کو بے معنی حرکات سمجھ کر بے قدری کرنے لگے اگر ان سے کہو کہ رکوع و سجود میں تعدیل کرو جو نہایت آسان ہے کبھی نہ کریں گے اور استغراق کے اس قدر درپے ہیں۔

راز یہ ہے کہ اس کی وقعت قلب میں نہیں ہے کیونکہ آدمی جسے عزیز و باوقعت سمجھتا ہے اس کا اہتمام کرتا ہے۔ اگر آپ کسی پر عاشق ہوں تو کیا آپ یہ چاہیں گے کہ اس کی آنکھیں نہ ہوں یا ناک کٹی ہوئی ہو حالانکہ عشق یہاں بھی روح کے ساتھ ہے کیونکہ اگر روح نکل جائے تو پھر معشوق کے پاس کھڑا بھی ہونے کو جی نہیں چاہتا مولانا فرماتے ہیں۔

؎ عاشقی بامردگاں پائندہ نیست — زانکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست

مردوں کے عشق کو بقا نہیں چونکہ مردہ پھر ہمارے پاس آنے والا نہیں ہے ۱۲)

؎ عشق بامردہ نباشد پائیدار — عشق را باحی با قیوم دار

مردہ کے ساتھ عشق کو پائیداری نہیں اس لئے اس حی قیوم کا عشق اختیار کرو جو ہمیشہ باقی ہے

۱۲) اس کا دوسرا مصرعہ نتیجہ ہے کہ جب مردہ کی محبت پائیدار نہیں رہتی تو اہل حقیقت اس پر نظر رکھتے ہیں۔ عشق رابا حی وقیوم دار (خدائے حی وقیوم کا عشق اختیار کرو۱۲) آگے اس سے بیان کرتے ہیں کہ محبت پائیدار کیوں نہیں رہتی۔

؎ عشقہائے کز پے رنگے بود عشق نبود عاقبت ننگے بود

(جو عشق ومحبت محض رنگ وروپ پر ہوتا ہے وہ واقع میں عشق نہیں بلکہ محض ننگ ہوتا ہے یعنی اس کا انجام حسرت وندامت ہے۱۲)

کیونکہ جب رنگ وروپ پر عاشق ہے اور وہ اس وقت ہے جب تک کہ روح ہے اور جب روح نکل گئی تو رنگ کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ آگے نصیحت فرماتے ہیں کہ

؎ غرق عشق شو کہ غرقست کہ اندریں عشقہائے اولین و آخرین

(عشق حقیقی میں غرق ہو جاؤ اس میں غرق ہونا اولین وآخرین کا عشق ہے۱۲)

اب یہ شبہ ہو کہ یہاں تو اس لئے عاشق ہوتے ہیں کہ مل جاتا ہے اور وہاں یہ حالت ہے کہ

؎ بحر لیست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست ایں جاجز ایں کہ جان بسپارند چارہ نیست

عشق کا دریا ایسا دریا ہے کہ اس کا کوئی کنارہ نہیں اس جگہ بجز جان سونپنے کے چارہ نہیں۱۲)

آگے اس شبہ کا جواب دیتے ہیں

؎ تو مگو مارا بداں شہ بار نیست برکریما کارہا دشوار نیست

(یوں نہ خیال کرنا کہ بھلا ہماری رسائی اس دربار تک کہاں ہے کیونکہ کریموں کو کوئی کار دشوار نہیں ہوتا اگر تم اپنی کوشش سے نہیں پہنچ سکتے مگر وہ کریم ہیں اپنے فضل سے تم کو رسائی عنایت کر دیں گے۱۲)

حقیقت جواب کی یہ ہے کہ اگر وہاں تک تمہیں پہنچنا پڑے تو بیشک دشوار ہے وہاں تو یہ حالت ہے کہ

؎ خود بخود آں بت عیار ببری آید

وہ تو خود ہی متوجہ ہوتے ہیں حدیث قدسی ہے **من تقرب الی شبراً تقربت الیہ ذراعاً و من تقرب الی ذراعاً تقربت الیہ باعاً (مسند احمد ۲:۴۱۳، الترغیب والترھیب ۴:۱۰۴، کنز العمال: ۱۱۷۹) (الحدیث)**

جو میری طرف ایک بالشت بڑھے میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں جو میری طرف ایک ہاتھ بڑھے میں اس کی طرف ایک باع (دونوں ہاتھوں کا پھیلاؤ بھر) بڑھتا ہوں۔

ے نہ گردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا   کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

عشق کا راستہ دوڑنے سے ہرگز قطع نہیں ہوتا جیسا انگور کو جتنا زیادہ قطع کئے جایئے اور بڑھے گا۔ اسی طرح یہ راستہ ہے کہ بڑھتا چلا جاتا ہے اور کسی طرح قطع نہیں ہوتا۔ ہاں وہ خود قطع کر دیتے ہیں اس کی مثال محسوسات میں ایسی سمجھئے کہ ایک بچہ ہے جو ابھی کھڑا ہو سکتا ہے چل پھر نہیں سکتا۔ آپ اسے محبت سے پکارتے ہیں کہ آؤ آؤ وہ اگر آپ کی آواز پر متوجہ ہو کر آنے کا قصد کرے تو پھر تو آپ خود دوڑ کر اسے گود میں اٹھا لیتے ہیں اور اگر وہ التفات نہیں کرتا تو آپ بھی توجہ نہیں کرتے۔ یہ جانتے ہیں کہ یہ بچہ آ نہیں سکتا۔ مگر پھر بھی بڑے بڑے عقلاء اس میں مبتلا ہوتے ہیں تو کیوں تاکہ اس بچہ کی طلب و رغبت کا امتحان کریں۔ اسی طرح حق تعالیٰ بھی ہماری نسبت فرماتے ہیں وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ (اور اللہ تم کو جنت کی طرف بلاتے ہیں ۱۲) اگر اس پر یہ شبہ ہو کہ جب ہم اس راستہ کو قطع نہیں کر سکتے تو بغیر بلائے ہمیں قطع کرا دیا ہوتا تو حضور آپ بھی تو اپنے بچہ کو باوجود عقل کے بلاتے ہیں تو کیوں اس لئے کہ محبت کا یہی مقتضا ہے اسی طرح حق تعالیٰ کی رحمت کا مقتضا ہے کہ اپنی رحمت سے بلاتے ہیں اگر کوئی جانے کا قصد کرتا ہے تو خود پہنچ کر اٹھا لیتے ہیں اور اگر کوئی ادھر سے بے التفاتی کرتا ہے تو اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ (کیا ہم اس کو تمہارے گلے مڑھ دیں گے اور تم اس سے نفرت کئے چلے جاؤ ۱۲) وہ بھی بے پرواہ ہو جاتے ہیں اب معلوم ہو گیا کہ

ے بر کریماں کارہا دشوار نیست (کریموں پر کار دشوار نہیں ہے ۱۲)

یہ شبہ بھی دفع ہو گیا غرض عشق مجازی میں اصل محل عشق کا روح ہے اور صورت تو واقع میں مردہ ہے جس کے ساتھ رنگ کی وجہ سے عشق ہے اور رنگ روح کی وجہ سے ہے تو ثابت ہوا محبت روح کے ساتھ ہے۔

تزئین صورۃ

مگر پھر بھی صورت کی ایسی فریفتگی ہے کہ اس کو دیکھ کر کہتا ہے۔

از فرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا ست

(سر سے پیر تک جس طرف نگاہ ڈالتا ہوں کرشمہ دامن دل کھینچتا ہے کہ یہی جگہ ہے ۱۲)

جس طرف نگاہ کرتا ہوں دل نکلا جاتا ہے اس کی خوبی دیکھ کر بے ساختہ یہ نکلتا ہے۔

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آ جائے ہے   تھامتا ہوں دل کو پر ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

اس کی جوتی اس کی جراب دیکھ کر یہ حالت ہے دل کھنچتا ہے تو کیوں صاحب عاشق تو آپ روح کے ہیں مگر اس روح کے تعلق کی وجہ سے آپ کو صورت بھی محبوب ہے۔ یہی یہاں بھی سمجھ لیا ہوتا کہ رکوع وسجود نماز کے ہاتھ پاؤں ہیں جس طرح تم معشوق ظاہری کی آرائش کے دلدادہ ہو اسی طرح اس کی بھی تزئین وتحسین کرو۔ چوڑی' مہندی' کنگھی' چوٹی سے نہیں ہوتی بلکہ اس کا وہ طریقہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بتا گئے ہیں جیسا کہا گیا ہے۔

دلبر ماست کہ حسن خداداد آمد　　　　دلفریباں نباتی ہمہ زیور بستند

(دلفریباں نباتی زیور متعارف سے مزین ہیں ہمارے محبوب میں خداداد حسن ہے۱۲)

اس زیور متعارف کی اسے ضرورت نہیں سادگی ہی اس کا زیور ہے کہ اعتدال ہو اس کو توڑ ومروڑ و نہیں کہ رکوع کیا تو گھڑی کے لنگر کی طرح اچھلے اور فوراً کھڑے ہو گئے سجدہ کیا تو اس قدر جلدی کہ اپنے سر میں بھی چوٹ لگی اور مسجد کا فرش بھی ٹوٹا۔ دو شخص تھے آقا اور نوکر۔ ان دونوں نے آپس میں شرط لگا رکھی تھی کہ دیکھیں کون پہلے فارغ ہوتا ہے۔ نماز شروع کی لگے دونوں صاحب جھٹا جھٹ رکوع سجدہ کرنے۔ نماز ختم ایک شخص نے دیکھ کر کہا کہ معلوم ہوتا ہے آپ لوگ قراءۃ اور دعائیں التحیات وغیرہ گھر سے پڑھ کر آتے ہیں صرف اٹھنا بیٹھنا رہ جاتا ہے۔

بے رحم امام

بعضے امامت میں بھی ایسا کرتے ہیں۔ ایک شخص کہتے تھے کہ میں نے ایک امام کی اقتداء کی انہوں نے نیت باندھی میں نے بھی نیت باندھنا چاہی جتنی دیر میں نے نیت باندھی وہ رکوع میں چلے گئے میں رکوع میں گیا تو وہ سجدہ میں پہنچ چکے تھے۔ میں سجدے میں گیا تو وہ کھڑے ہو چکے تھے۔ غرض میں ان کا ساتھ نہ دے سکا۔ تو نیت توڑ کر علیحدہ ہو گیا۔ افسوس لوگوں نے یہ گت بنائی ہے نماز کی اور اگر کسی کو رحم آ گیا اور اس نے اس کی اصلاح کی تو اس قدر لمبی صورتیں پڑھنا شروع کر دیتے ہیں کہ لوگ اکتا جاتے ہیں۔ رڑکی میں ایک امام تھے گرمی کا زمانہ مقتدی دھوپ میں جل رہے ہیں مگر انہیں لمبی صورتیں پڑھنے کا شوق تھا۔ ایک مرتبہ کوئی بڑی صورت پڑھی۔ کسی نے کہا کہ حضرت کچھ تو ہم لوگوں کے حال پر رحم کیجئے۔ گرمی اور دھوپ اس قدر ہے اور آپ ایسی لمبی لمبی سورتیں پڑھتے ہیں کہنے لگے کہ یہاں کی دھوپ نہیں برداشت کی جاتی تو وہاں دوزخ کی آگ کیونکر برداشت ہو گی۔ سبحان اللہ گویا ان کے نزدیک سب دوزخی تھے اور یہ انہیں دوزخ کا عادی

بناتے تھے۔ منحوس کہیں کا۔ بہر حال یہ وہ حالت ہوئی کہ

؎ اگر غفلت سے باز آیا جفا کی   تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

غرض اعتدال نہیں ہے بڑھائیں گے تو اس قدر کہ لوگوں کو عذاب ہو جائے گھٹائیں گے تو اس قدر کہ بچوں کا کھیل ہو جائے کہیں افراط کہیں تفریط

حقیقی اعتدال

وجہ اس کی یہ ہے کہ سنت کا اتباع نہیں نماز روزہ تو بڑی چیز ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تو ہر فعل میں اعتدال و انتظام تھا۔ نشست و برخاست میں خورد و نوش میں گفتار میں رفتار میں۔ اسی کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کان خلقه القران کہ قرآن میں جو امور مذکور ہیں وہ آپ کے لئے مثل امور طبعیہ عادیہ کے ہو گئے تھے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ جب کوئی آپ کے پاس آتا آپ اپنی جگہ سے کھسک جاتے اللہ اکبر ایسی باریک باتیں آپ سے طبعی امور کی طرح سرزد ہوتی تھیں۔ اس میں مصلحت یہ ہے کہ آنے والے کی دل جوئی اس کی قدردانی اس کے آنے سے مسرت کا اظہار اور قرآن میں ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا (اے ایمان والو جب تم سے کہا جاوے کہ مجلس میں جگہ کھول دو تو تم جگہ کھول دیا کرو۱۲) قرآن میں تو یہ ہے کہ تمہیں جب جگہ چھوڑنے کا حکم ہو اس وقت کھسک جاؤ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو باوجود یہ کہ جزئی حکم نہیں ہوا تھا مگر آپ کھسک جاتے تھے کہ آپ کی نظر اس حکم کی علت پر تھی۔ پس ایسی غامض باریک۱۲) بات اور وہ آپ کی (صلی اللہ علیہ وسلم) طبیعت کا مقتضا ہو گئی تھی پس آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کھسک جاتے تھے۔

اور انتظام کی نسبت شمائل ترمذی میں تصریح ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ہر کام انتظام سے ہوتا تھا۔ چنانچہ ہر ہفتہ مسجد قبا میں تشریف لے جانے کا معمول تھا۔ برابر تشریف لے جاتے تھے اوروں کو کام کا شروع کرنا سہل ہے مگر اس کو اخیر تک نباہ دینا یہ بہت دشوار ہے۔

لوگ کہتے ہیں چاہ مشکل ہے   سب غلط ہے نباہ مشکل ہے

ہم سے اگر اس قدر پابندی ہو گی تو دشواری سے ہو گی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کچھ مشکل نہ تھا۔ حق تعالیٰ نے آپ کی طبیعت کی ساخت ہی ایسی رکھی تھی کہ کوئی کام آپ کا اعتدال و انتظام کے خلاف نہ ہوتا تھا اور آپ بے تکلف چھوٹی چھوٹی باتوں کی بھی رعایت فرماتے تھے۔ پچھلی شب کو آپ

جنت البقیع تشریف لے جاتے تھے۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ ایک بار میری نوبت میں آپ بقیع تشریف لے گئے تو قام رویداً آہستہ اٹھے تا کہ پاس کے سونے والوں کو تکلیف نہ ہو۔ وانتعل رویداً جوتا بھی آہستہ پہنا۔ نسائی شریف میں ہے کہ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دروازہ بند کیا تو آہستہ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے اس رعایت کا حالانکہ آپ کی شان محبوبیت کی تھی۔ حضرت عائشہ کو بھلا آپ سے کیا تکلیف ہوتی ان کی تو آپ کے ساتھ یہ کیفیت تھی کہ ؎

گر برسروچشم من نشینی   نازت بکشم کہ نازنینی

(اگر میری آنکھ وسر پر بیٹھے تو ناز تیرے اٹھاؤں اس لئے کہ تو نازنین ہے۱۲)

مگر پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال تھا کہ انہیں اذیت نہ ہو یہ امور آپ کے طبعی تھے تکلف سے کبھی ایسا نہیں ہوسکتا۔

اصلاح اخلاق

اگر ہو تو کب تک ہوسکتا ہے مثل مشہور ہے کہ نئے نمازی کا پاؤں نہیں مڑتا جب تک عادت نہ ہو ایک ولایتی بوڑھے آدمی تھے انہوں نے مولانا فتح محمد صاحبؒ سے عقد انامل سکھانے کی درخواست کی۔ مولانا سکھانے بیٹھے ان سے ایک انگلی کھلواتے ہیں تو سب کھل جاتی ہیں ایک بند کراتے ہیں تو سب بند ہو جاتی ہیں۔ ملا دو پیازے کی طرح کہ مرتے مرتے مسخرہ پن کر گئے۔ ٹانگیں اونچی کر کے مر گئے۔ اب جو ان کی ٹانگیں نیچی کرتے ہیں تو وہ بیٹھ جاتے ہیں اور اگر ان کو لٹاتے ہیں تو ٹانگیں اونچی ہو جاتی ہیں۔ خیر یہ ولایتی بہت دیر تک اس کی کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح آ جائے جب طالب علم ہنسنے لگے تو آپ کہتے ہیں کہ فرض کر لو کہ ایک کھلی ہے اور سب بند ہیں۔ سبحان اللہ۔ جب گننے بیٹھو گے تو یہی کہہ لینا کہ فرض کر لیا کہ ایک کھلی ہے اور سب بند ہیں۔ نئے نمازی کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ پہلے بہت دشوار معلوم ہوتی ہے اس کے بعد پھر مشق ہوتے ہوتے آسان ہو جاتی ہے اسی طرح اخلاق بھی کہ شروع میں ان کی پابندی مشکل ہوتی ہے آخر میں مشق اور عادت ہونے کے بعد سہل ہو جاتے ہیں۔

اب لوگ مشقت سے گھبراتے ہیں اور اصلاح اخلاق بدوں اس کے ہوتی نہیں۔ حضرت شاہ غلام علی صاحب مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ کہیں سے مٹھائی آئی مرزا صاحب نے فرمایا غلام علی مٹھائی لو۔ یہ گئے اور جا کر ہاتھ پھیلا دیا۔ فرمایا بڑے ہی

گنوار ہوارے کوئی برتن یا کاغذ لاؤ۔ خیر یہ بیچارے کاغذ لے گئے اور مٹھائی لا کر کھائی۔ دوسرے وقت پوچھا غلام علی مٹھائی کھائی تھی۔ عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا کچھ ہے یا سب کھالی۔ عرض کیا سب کھالی۔ فرمایا بڑے ہی گنوار ہو۔ ارے مٹھائی بھی کوئی پیٹ بھرنے کی چیز ہے جو ایک دم سے کھا گئے۔ بیچارے بات بات میں گنوار بنتے تھے۔ ساری عمر یوں ہی گزر گئی لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ۔
ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد (جس نے خدمت کی وہ مخدوم ہوا ۱۲) مخدوم العلماء ہوئے۔

تنبیہ مرشد

درستی اخلاق کی یہ مثال ہے کہ مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ قزوین میں رواج ہے کہ بدن گودوایا کرتے ہیں۔ ایک شخص نے گودنے والے سے کہا کہ میری کمر پر شیر کی تصویر بنادو۔ اس نے سوئی لے کر جیسے ہی اس کو چبھویا اس نے کہا آہ غضب کرتا ہے بھئی کیا بناتا ہے اس نے کہا دم بناتا ہوں بولا کہ بھئی دم کا کیا کام ہے۔ کیا بغیر دم کے شیر نہیں ہوتا۔ اس دم نے تو دم نکال دیا۔ اس نے چھوڑ دیا۔ پھر اس نے دوسری طرف سوئی چبھوئی پھر پوچھا ارے بھئی کیا بناتا ہے کہا پیٹ بناتا ہوں کہا ارے یہ کوئی کھانا کھائے گا۔ پیٹ بھی چھوڑ دے اس نے پیٹ بھی چھوڑ دیا۔ اسی طرح اس نے دوسری طرف سوئی چبھوئی پھر پوچھا اب کیا بناتا ہے کہا منہ بناتا ہوں بولا اے بھائی یہ تو تصویر ہے اسے بولنا نہیں پڑے گا اسے بھی چھوڑ۔ اس نے اسے بھی چھوڑ دیا پھر اور طرف سوئی چبھوئی اس نے پھر پوچھا کہ بھئی اب کیا بناتا ہے اس نے کہا کان بناتا ہوں کہا کیا شیر بوچے نہیں ہوتے کان بھی چھوڑ اس نے جھلا کے سوئی پھینک دی اور کہا کہ۔

شیر بے گوش و سر و شکم کہ دید این چنیں شیرے خدا ہم نافرید

شیر بغیر کان و سر اور پیٹ کا کس نے دیکھا ۱۲) ایسا شیر تو خدا نے بھی نہیں بنایا۔ میں کیا بناؤں گا۔ آگے نتیجہ کے طور پر فرماتے ہیں۔

گر بہر زخمے تو پر کینہ شوی پس کجا بے صیقل چو آئینہ شوی

اگر ہر زخم پر تم پر کینہ ہو یعنی مرشد کی ہر تنبیہ پر ناک بھوں چڑھاؤ تو کس طرح قلب مثل آئینہ کے صاف ہو سکتا ہے ۱۲)

کہ ہر تنبیہ مرشد پر اگر تمہاری یہ حالت ہو کہ تمہارے نفس پر کدورت ہو تو۔

چوں نہ داری طاقت سوزن زدن پس تو از شیر ژیاں ہم دم مزن

جب سوئی چبھنے کی تم میں طاقت نہیں ہے تو شیر ہونے کا دعویٰ نہ کرو ۱۲)

اگر سوئی چبھنے کا تحمل نہیں تو اخلاق تو یوں ہی درست ہوتے ہیں حضرت پیروں نے یوں ہی اخلاق درست کئے ہیں اور اب تو یہ حالت ہے کہ چاہتے ہیں کہ ہمیں کچھ نہ کرنا پڑے اور سب کچھ ہو جائے چنانچہ کہتے ہیں حضرت ایسی عنایت فرمایئے کہ گناہوں سے نفرت ہو جائے تو گویا ان کے نزدیک پیر پانچواں کمین ہے کہ ان کے گناہوں کو صاف کیا کرے گا۔ گویا مہتر ہے اور اس کے تو یہ معنی ہیں کہ اے پیر ہم نے تو اس واسطے تمہیں پیر بنایا ہے کہ ہمارا گوہ اٹھا کر پھینک دیا کرو۔ بس چھ ماہی کیا ہوگی بڑی بڑائی ایک روپیہ ورنہ پیر تو خود کھلایا کرتے ہیں۔ تو کمین تو ہوا پانچواں اور بھنگی سے بدتر کہ اسے چھ ماہی کچھ مل تو جاتا ہے اور اس غریب کو اور اپنے پاس سے دینا پڑتا ہے۔

ارادہ میں غلطی

مولانا گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ کسی کے پاس ایک شخص آئے اور کہا کہ ہمیں اپنا چیلہ بنا لو انہوں نے کہا کہ بھئی چیلہ بننا بہت مشکل ہے۔ تو کہنے لگے اچھا پھر گرو ہی بنالو۔ اسی طرح آج کل جو لوگ مرید ہونے آتے ہیں وہ بھی حقیقت میں گرو بننے آتے ہیں چنانچہ ایک شخص بیعت کے ارادے سے میرے پاس آتے تھے۔ جب یہاں آئے تو دو عیب مجھ میں نکالے ایک کپڑا قیمتی پہنتے ہیں دوسرے لطائف کی تعلیم نہیں۔ میں نے کہا ٹاٹ تو آپ بھی نہیں پہنتے اور میں نے کب دعویٰ کیا کہ میں لطائف کی تعلیم دیتا ہوں۔ جب کوئی دعویٰ کرے تو آپ کہیں انہیں اس کی یہ سزا ملی کہ وہ ایسی جگہ پہنچے جہاں یہاں سے بھی زیادہ قیمتی کپڑے پہنے جاتے ہیں بھلا ایسے لوگوں کی کیا اصلاح ہو جو خود پیر کی اصلاح کے خیال سے آئیں ہمارے یہاں ایک بی بی مہمان آئیں۔ ہمارے یہاں ایک اور عزیز بھی مہمان آئی ہوئی تھیں۔ ان کی بچی کے پاس گڑیا تھی دیکھ کر کہا کہ یہ کیسے بزرگ ہیں جن کے یہاں کی لڑکیاں گڑیاں کھیلتی ہیں اور یہ منع نہیں کرتے۔ مجھے اس کی اطلاع ہوئی میں نے اس سے کہا کہ اول تو وہ لڑکی ہمارے یہاں رہتی نہیں دوسرے ہمیں اس کی اطلاع نہیں تھی کہ ہم منع کرتے۔ باقی تمہارے مذاق کے موافق جواب یہ ہے کہ تم اپنی اصلاح کے واسطے آئی ہو یا ہماری اصلاح کے واسطے۔ یہ تو ضدم ضدا ہوئی کہ ہم کوئی خرابی نکال کر تمہاری اصلاح کریں تم ہمارا عیب ڈھونڈ کر اس کی اصلاح کرو۔ یہ تو کچھ ٹھیک نہیں۔ یوں کرو کہ ہم پر عیب ہیں پہلے تم ہمارے عیبوں کی اصلاح کرو تم جس طرح بتاؤ گی ہم تمہارے کہنے کے موافق کریں گے۔ جب تمہارے نزدیک

ہماری اصلاح ہو جائے گی پھر ہم تمہاری اصلاح اسی طرح کریں گے۔ بیچاری بہت شرمندہ ہوئیں اور بہت معذرت کی۔ بھلا یہ کوئی طریقہ ہے کہ جاؤ اپنی اصلاح کو اور بیٹھ جاؤ پیر کی اصلاح کرنے۔ اگر پیر پسند ہو تو اس کے پاس ٹھہرو اگر پسند نہ آئے تو کسی دوسرے کو تلاش کر لو۔ اگر کوئی مریض طبیب سے یوں کہنے لگے کہ آپ نے گل بنفشہ چار ماشہ کیوں لکھا تو اس کے جواب میں وہ یہی کہے گا کہ آپ اپنا علاج کرانے آئے ہیں یا مجھے سبق پڑھانے آئے ہیں۔ واقعی ان باتوں سے کدورت ہوتی ہے پھر نفع نہیں ہوتا یہ گویا اس وقت میں مریدوں کا برتاؤ ہے۔ اس لئے شیخ کے کہنے کا تحمل نہیں کرتے ہاں جو سعید ہیں وہ سب کچھ برداشت کرتے ہیں۔

نصیحت گوش کن جانا کہ از جاں دوست تر دارند جواناں سعادت مند پند پیر دانا را

(نصیحت مانو اس لئے سعادت مند جوان پیر دانا کی نصیحت کو جان سے زیادہ محبوب سمجھتے ہیں ۱۲)

صورۃ عمل کی قیمت

بہر حال اول اول تو مشقت ہی ہوگی اس کے بعد جو باتیں مشقت اور تکلیف سے کرنا پڑتی تھیں طبعی بن جائیں گی غرض اعتدال ہر امر میں مطلوب ہے۔ پس نماز میں بھی اعتدال استغراق سے زیادہ ضروری ہے۔ پس یہ نہ سمجھو کہ اگر استغراق نہ ہو تو ایسی نماز بیکار ہے۔ واعظوں نے اس شعر کے معنی کہ ؎

برزباں تسبیح و در دل گاؤ خر ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

زبان پر تسبیح دل میں گاؤ خر یعنی دنیاوی خیالات ایسی تسبیح کب اثر رکھے ۱۲)

گھڑے کہ ایسی نماز مفید نہیں۔ خوب سمجھ لو کہ جس روز معافی کی خریداری ہوگی۔ یہ صورتیں ہی معافی کے بھاؤ بکیں گی۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ امراء کے دربار میں مٹی کے مصنوعی آم مصنوعی خربوزہ پستہ بادام بڑی قدر و وقعت کے ساتھ خریدے جاتے ہیں۔ کہ بڑا کامل ہے کہ نقل کو اصل سے ملا دیا کیا عجب ہے کہ تمہارے ساتھ ایسا ہی ہوا رے صاحب دیکھ لینا کہ ایسا ہی ہوگا۔ خود فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی ۱۲) اسی وقت اس میں ایک لطیفہ ذہن میں آیا فرماتے ہیں اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ یہ نہیں فرمایا **اعمالهم و اموالهم** اشارہ اس طرف ہے کہ اعمال تو نہیں نفس و مال تو ہے۔ زکوٰۃ دی مال خرچ ہوا نماز پڑھی نفس پر تعب ہوا بس وہی خرید لیا گو۔ وہ نفس و مال عبادت معتد بہا نہ سہی۔ مگر

بشرطیکہ تم انہیں اعمال میں مصروف کرو پھر چاہے وہ عمل کامل نہ ہو کیا ٹھکانا ہے۔ اس رحمت کا کہ گھوڑا مر گیا جھول کے وہ دام دیئے جو گھوڑے کے تھے۔ **الفسھم** میں یہ لطیفہ اسی وقت سمجھ میں آیا۔ بہر حال یہ چاہے اس کی تفسیر نہ ہو مگر میری تقریر اس تفسیر پر موقوف بھی نہیں دوسری نصوص میں بھی یہ مضمون موجود ہے۔ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰتٍ کہ سیئات کو حسنات سے بدل دیں گے۔

سیئات کی قیمت

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے حسنات ہی سیئات ہیں۔ کیوں جی کبھی سنا ہے کہ کسی نے تنکے اور لکڑی کے وہ دام دیئے ہوں جو مصری کے ہوں۔ مصری کے ساتھ میں تو مجبوراً ہی لینا پڑتا ہے مگر صرف تنکوں کے ساتھ بھی کبھی ایسا ہوا ہے۔

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را   کہ بیک گل مے خری گلزار را

(ایسا بازار کہاں ہوگا کہ ایک پھول کے بدلے سارا چمن مل جائے ۱۲)

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد   آنچہ در و ہمت نہ آید آں دہد

(فانی وحقیر جان لیتے ہیں اور اس کے بدلے باقی جان عطا کرتے ہیں جو وہم وگمان میں بھی نہیں آتا عنایت کرتے ہیں ۱۲)

دنیا کے درمیان میں خدمت پوری لی جاتی ہے اور معاوضہ خیال سے کم ملتا ہے۔ یعنی اپنے خیال میں وہ جتنے کا مستحق سمجھتا ہے اتنا نہیں ملتا۔ اگر بادشاہ بھی کسی کو کتنا ہی دے دے تب بھی یہ ہوس ہوتی ہے کہ ابھی اور ملتا۔ وہاں یہ ہے کہ خدمت ناقص مگر معاوضہ اس قدر کہ **مالا رات عین ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر (مسند احمد ۲:۳۱۶، مجمع الزوائد ۱۰:۴۱۴، کنزالعمال: ۳۹۲۵۹)** کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا نہ کسی بشر کے قلب پر خطرہ گزرا۔ وہ ایسا خریدار ہے کہ اگر صورت درست ہوگی وہی خرید لی جائے گی۔ چنانچہ قیامت میں دیکھ لینا۔

حدیث شریف میں جو رکوع وسجود کی فضیلت آئی ہے وہ مطلق ہے۔ اس میں یہ نہیں ہے کہ قلب میں گاؤ خر کے خیالات نہ ہوں۔ ہاں اعتدال ضروری ہے چنانچہ جس نے اعتدال نہیں کیا تھا اسے آپ نے فرمایا **صل فانک لم تصل (لم اجد الحدیث فی "موسوعة اطراف الحدیث النبوی شریف")** نماز پھر سے پڑھو۔ اور اس میں یہ نہیں پوچھا تھا کہ روح بھی تھی یا نہیں اور یہ رحمت ہے جو بواسطہ آپ کے مرحمت ہوئی کہ متبدیوں کو اعتدال کا تو امر کیا مگر روح

ڈالنے کا امر نہیں کیا۔ ابتداء میں عیسیٰ علیہ السلام یہ کیا کرتے تھے کہ تصویر بنا لیتے تھے پھر اس میں روح پھونکتے تھے۔ اسی طرح ابھی تم تصویر بناؤ روح بعد میں پھونک دی جائے گی۔ مگر تصویر تو پوری بناؤ۔ یہ نہیں کہ تصویر ادھوری ڈھالی تو اگر اس میں روح ڈالی بھی گئی تو لنڈوری کس کام کی ہو گی تو یہی بات ہے کہ تم رکوع وسجود اچھی طرح کرلو۔ اگر روح نہ ڈال سکو تو کچھ حرج نہیں۔

سالک کو تنبیہ

اسی طرح سالک کو چاہیے کہ اگر ذکر ہو اور فکر نہ ہو تو فکر نہ کرے۔ ذکر اچھی طرح کرتا رہے۔ ان شاء اللہ سب کچھ ہو جائے گا۔ یہ نہ کرے کہ بجائے اس کے کہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتا دلگیر ہو کر اسے بھی چھوڑ دے۔ جیسا نور جہاں کے بچپن کی حکایت ہے اور وہی سبب ہوا جہانگیر کے نور جہاں پر فریفتہ ہونے کا کہ یہ میلہ میں گیا تھا کبوتروں کا بڑا شوق تھا ہاتھ میں دو کبوتر لئے تھے۔ نور جہاں لڑکی سامنے آ رہی تھی اسے دیکھ کر وہ کبوتر اسے دے دیئے کہ ذرا تھامے رہ میں ابھی آ کر لے لوں گا۔ جب فارغ ہو کر آیا تو دیکھا کہ ایک کبوتر اڑ چکا تھا۔ تعجب سے پوچھا کہ کیسے اڑ گیا۔ اس نے دوسرا کبوتر چھوڑ کے دکھا دیا کہ ایسے اڑ گیا۔ اس کے اس بھولے پن پر فریفتہ ہو گیا۔

شاہد آں نیست کہ موی ومیانے دارد — بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

(معشوق وہ نہیں کہ اچھے بال اور پتلی کمر رکھتا ہو حسین وہ ہے کہ اس میں کچھ آن ہو ۱۲)

تو یہ مثال اس پر یاد آئی کہ بجائے اس کے کہ اس کی کوشش کرتے کہ نماز میں روح بھی پیدا کریں صورت کو بھی چھوڑ بیٹھے جس طرح اس نے کیا کہ بجائے اس کے کہ پریدہ کو ڈھونڈتی پر وریدہ کو بھی پر وریدہ کر دیا۔ تم بھی بزرگوں کے کلام کے اچھے معنی سمجھے کہ اگر گاؤ خر کے خیالات ہوں تو نماز نہ پڑھو۔ معنی یہ ہیں کہ ایسی نماز میں کوشش کرو کہ یہ خیالات نہ آئیں۔ نہ یہ کہ اسے بھی چھوڑ دو اگر یہ معنی سمجھے تو وہ نام کی نور جہاں تھی تم تو بالکل ظلمت جہاں ہو بلکہ وہ بھی جہانگیر کے حق میں تو ظلمت جہاں تھی خود چاہے جیسی ہو کیونکہ **کل ماشغلک عن الحق فھو طاغوتک** (جو چیز تجھ کو حق سے روگرداں کر دے وہی شیطان ہے ۱۲) اسی کے عشق میں جہانگیر نے کیا کیا۔ اس کے شوہر کو لڑائی میں بھیج کر بہانہ سے قتل کرایا۔ غرض اس کے حق میں تو وہ بھی ظلمت جہاں ہو گئی تھی۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک شخص کبوتر کے پیچھے دوڑا جا رہا تھا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے دیکھ کر فرمایا **شیطان یتبع شیطانۃ** کہ ایک شیطان شیطان کے پیچھے جا رہا ہے۔ تو واقع میں وہ کبوتر شیطان نہ تھا مگر اس کا شیطان تھا پس تفسیر حدیث کی ہے کہ **یتبع شیطانته** اس تفسیر کو بزرگوں

نے طاغوت تک میں مضاف الیہ کوذکر کر کے ظاہر کر دیا۔ یعنی شیطان یتبع شیطانتہ معنی یہ ہیں کہ ایک شیطان اپنے شیطان کے پیچھے جا رہا ہے تو نور جہاں اس اعتبار سے ظلمت جہاں ہوئی۔ اس طرح تم بھی اگر اس کے یہ معنی سمجھو گے تو ظلمت جہاں ہو گے۔

الغرض روح کے سمجھنے میں دو غلطیاں ہوئیں ایک تو جہلائی صوفیہ کو کہ انہوں نے روح کو مقصود سمجھ کو صورت کو بالکل اڑا دیا اور دوسرے اہل ظاہر کو کہ انہوں نے صورت کو اڑایا تو نہیں مگر صورت کو بے وقعت و بے قدر سمجھنے لگے پس اس وقت روح سے میرا وہ مقصود نہیں کہ جو لابشرط شے کے مرتبہ میں ہے یعنی بشرط تحققہ فی ضمن الصلوٰۃ (اس کے نماز کے ضمن میں محقق ہونے کی شرط پر۱۲) کیونکہ لابشرط شے کا مرتبہ تو ماہیت کا ہے کیونکہ زید میں اگر روح آئے اور عمرو میں نہ آئے تو یہ صادق آیا کہ روح عمرو کی لابشرط شے کے درجہ میں پائی جاتی ہے مگر اس سے عمرو زندہ نہیں ہو سکتا اسی طرح اگر زید مر جائے تو یہ صادق آتا ہے کہ لابشرط شے روح زید کی مفارق ہو گئی مگر یہ لازم نہیں آتا کہ عمرو بھی مر جائے میں بشرط شے کے مرتبہ میں جو روح ہے اسے بیان کروں گا۔ مثلاً زید کی روح بشرط تحققہ فی زید (اس کے زید میں محقق ہونے کی شرط پر۱۲) کہ جب اس میں آئے گی تو وہ زندہ ہوگا اور اگر نکلے گی تو وہ مرے گا تو گویا یہ روح ہے اس خصوصیت کے مرتبے میں جو آج مقصود بالبیان ہے۔ البتہ اس روح کے ہم نوع اور افراد بھی ہیں یعنی دوسرے افراد ذکر کر کے ان کی بھی قدر کرنا چاہیے۔ بہر حال دو غرض سے آج بیان کیا جاتا ہے ایک تو یہ کہ اس نماز خاص کی بھی قدر کریں اور افراد ذکر کی بھی قدر کریں کہ وہ بھی روح صلوۃ کے مشارک فی النوع ہیں۔

توجہ الی اللہ کا ماقبل میں اثر

الغرض آج بیان سے مقصود یہ ہے کہ نماز کی روح کیا ہے پس جس طرح لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (اس امید پر کہ تم متقی ہو جاؤ۱۲) سے روح صوم کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح اس آیت میں بہ نسبت اس کے روح نماز کی کسی قدر زیادہ صراحت ہے اور ہر چند کہ یہ آیت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کی ہے مگر چونکہ عقائد واخلاق میں ہم میں اور امم سابقہ میں کچھ فرق نہیں۔ فرق صرف اعمال ظاہرہ میں ہے اس لئے یہ آیت ہم پر بھی حجت ہے۔ اور اس حیثیت سے بھی حجت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ قصہ بلا نکیر ہم کو سنایا جا رہا ہے میں اس وقت صرف اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (میری ہی یاد کی نماز پڑھا کرو۱۲) کے متعلق بیان کرنا چاہتا ہوں اور دوسرے اجزاء کو محض تبرکا اور ادبا تلاوت کیا ہے کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی ایک سورۃ کی بہت سی

آیتیں پڑھے اورایک آیت سجدہ کو چھوڑ دے تو مکروہ ہے اسی طرح مجھے بھی اوراجزاء کا چھوڑ نا خلاف ادب معلوم ہوا۔ ترجمہ اس جزوکا یہ ہے کہ نماز کو قائم رکھومیرے ذکر کے واسطے لذکری میں لام غایت کا ہے یعنی نماز کی غایت وروح میری یاد ہے یہاں روح سے مراد بخارات لطیفہ جوقلب میں پیدا ہوتے ہیں۔ جوہر مجرد نہیں بلکہ نماز کی غایت وہی اس کی روح ہے۔ یعنی غایت نماز سے کیا ہے حق تعالیٰ کی یاد۔ جیسا کہ صوم کی غایت وروح مجاہدہ ہے۔ جس کا بیان اس سے پہلے ہو چکا۔ حق تعالیٰ نے اس لام سے نماز کی روح بتلا دی حاصل یہ ہوا کہ نماز کی روح کیا ہے جسے پیش نظر رکھنا چاہیے وہ میری یاد ہے۔ اے صاحبو! نماز کو غور کر کے دیکھو کہ اس میں روح ہوتی ہے یا نہیں لیکن اگر روح نہ ہوتو ایسا بھی نہ کرنا کہ ہاتھ پاؤں بھی کاٹ دو کیونکہ پھر روح کیونکر آئے گی۔ اس لئے مادہ محفوظ رکھو کہ یہ ہی مردہ تصویریں پھر زندہ ہو جائیں گی۔ اسے اس طرح سمجھو کہ کوئی جانور ہے اس کی روح نکل چکی ہے ایک حکیم آیا اس کے پاس ایک ایسا عمل ہے کہ ایک جانور کی روح دوسرے جانور میں منتقل کر دیتا ہے۔ مگر شرط ضرور یہ ہے کہ اس جانور کی گردن جڑی ہوئی ہو۔ اگر تم نے اس جانور کی گردن کاٹ دی ہے تو وہ صاحب عمل اس میں کس طرح روح منتقل کر سکتا ہے تو جن کے پاس روح نہیں وہ اعضائے نماز کو ضرور درست رکھیں اور یہ شبہ نہ کرو کہ جو نماز ہم پہلے پڑھ چکے ہیں اس کا کیا تدارک ہوا۔ یادرکھو جب روح پڑے گی سب میں پڑ جائے گی۔ اس واسطے کہ ہم توجہ الی اللہ کا اثر دیکھتے ہیں کہ ماقبل میں بھی ہوتا ہے۔ أُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ (اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے گذشتہ گناہوں کی جگہ نیکیاں عنایت فرمائے گا ۱۲)

پچھلے سیئات حسنات سے بدل جاتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے **الاسلام یھدم ما کان قبلہ** ۱۲(**طبقات ابن سعد** ۶:۲:۴) اسلام اپنے قبل کی بداعمالیوں کو ساقط کر دیتا ہے ۱۲) تو دیکھئے عمل حال کا پچھلے اعمال میں بھی اثر ہوتا ہے۔ جب تمہارے حال کے اعمال میں روح پڑے گی تو پچھلے اعمال میں بھی پھیلے گی۔

اس میں راز یہ ہے کہ وہ اعمال باعتبار اپنے اثر کے قائم ہیں۔ عامل میں اور عامل ان کا محل ہے اور محل زمانہ حال میں موجود ہے تو حال بھی زمانہ حال میں موجود ہے وہ ماضی کہاں ہے جس پر شبہ ہوا اور گو اعمال رخصت ہو چکے ان کا اثر ہم میں باقی ہے۔ اور حقیقت میں عمل تو یہ اثر ہی ہے کیونکہ اس کے معنی مصدری تو محض اعتباری انتزاعی شے ہے پس حاصل مصدر ہی فعل ہے جو کہ اثر ہے اور یہ اثر باقی رہتا ہے۔

اعمال ماضیہ بالقاء

یہی وجہ ہے کہ اہل کشف کو صورتیں اعمال کی نظر آ جاتی ہیں۔ حضرت عثمانؓ کی مجلس میں ایک شخص کسی نامحرم عورت کو دیکھ کر آیا تھا آپ نے فرمایا کہ کیا حال ہے لوگوں کا کہ ہماری مجلس میں آتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہے اسی طرح جب کوئی طاعت کرتا ہے تو اس کا ایک اثر اس میں پیدا ہوتا ہے جس کا اہل کشف کو علم ہوتا ہے فرشتوں کو تو اعمال ماضیہ کا نامہ اعمال دیکھنے سے علم ہوتا ہے اور اہل کشف کے لئے یہ شخص اپنا آپ نامہ اعمال ہے اسی کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

غذائک فیک و ما تبصر　　　　دوائک منک و ما تشعر

تمہاری غذا خود تمہارے اندر ہے اور تم دیکھتے نہیں تمہاری دوا تم ہی سے ہے اور تم نہیں شعور کرتے ۱۲)

وانت الکتاب المبین الذی　　　　با حرفه یظهر المضمر

(تم وہ کتاب ہو کہ اس کے حروف سے پوشیدگیوں کا ظہور ہوتا ہے ۱۲)

وتزعم انک جرم صغیر　　　　و فیک انطوی العالم الاکبر

(تم اپنے آپ کو جرم صغیر سمجھتے ہو حالانکہ تمہارے اندر ایک عالم اکبر لپٹا ہوا ہے ۱۲)

تو گویا تم خود کتاب مبین ہو قرآن مجید میں ہے وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا (جو جو اعمال انہوں نے کئے ہیں ان میں موجود پالیں گے ۱۲) حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے اس کی بھی تفسیر فرمائی تھی۔ مشہور تفسیر تو اس کی **مکتوب فی الصحیفه** (نامہ اعمال میں لکھا ہوا ۱۲) سے کی ہے مگر مولانا فرماتے تھے کہ خود اعمال حاضر ہوں گے جب ظاہر الفاظ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا سے معلوم ہوتا ہے یعنی قیامت کے روز سارے اعمال کو حاضر پائیں گے اس پر اشکال یہ ہے کہ جو اعمال ختم ہو چکے وہ کیسے عود کریں گے۔ محقق دوانی نے اسے اس طرح رفع کیا ہے کہ انہوں نے اپنے رسالہ زوراء میں یہ ثابت کیا ہے کہ حقائق اعمال کے جوہر ہیں۔ یہ رسالہ حضرت نے میرے پاس بھیجا تھا شاید بھیجنے سے یہ مقصود ہو کہ ان کی تحقیق حضرت کو پسند آئی ہو واللہ اعلم میں اس کو یقیناً کہہ نہیں سکتا کیونکہ کچھ فرمایا نہیں۔ میں نے اس رسالہ کو دیکھا میری سمجھ میں یہ بات تو نہیں آتی کہ حقائق اعمال جوہر ہیں۔ ہاں اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ معنی مصدری قیامت میں نہ ہوں گے بلکہ حسب تحریر مولانا محمد یعقوب صاحب

ان اعمال کے اثر قیامت کے روز شکلیں بن کر اہل محشر کو نظر آئیں گی۔ مثلاً جو چوری کر چکا ہے وہاں نظر آئے گا کہ چوری کر رہا ہے۔ زنا کر چکا وہاں نظر آئے گا۔ کہ زنا کر رہا ہے۔ غرض جو آثار اعمال کے اس کے بدن میں جمع ہیں سب وہاں اعمال بن کر نظر آئیں گے۔

اس کی مثال یہاں بھی خدا نے پیدا کر دی ہے یعنی جس طرح بائیسکوپ کے اندر گذشتہ واقعات کی صورتیں نظر آتی ہیں اسی طرح قیامت کے دن یہ بھی بائیسکوپ بن جائے گا اور اس کے ہاتھ پیر گراموفون کی طرح جو کچھ اس نے کیا ہے بولیں گے۔ ایک زانی کی حکایت ہے کہ زنا کر کے غسل کر رہا تھا۔ غسل کا پانی نالی سے بہہ رہا تھا۔ ایک بزرگ کا ادھر سے گزر ہوا اس پانی کو دیکھ کر کہا اس میں زنا بہہ رہا ہے۔ پوچھا حضرت آپ کو کیونکر معلوم ہوا فرمایا کوئی زانی غسل کر رہا ہے۔ مجھے پانی کے ہر ہر قطرہ میں زنا کی تصویر نظر آتی ہے۔ تو حضرت تمام اعمال کے آثار اس میں پیدا ہو جاتے ہیں تو جو صورت صلوٰتیہ پہلی ہیں وہ سب اس شخص کے اندر موجود ہیں تو یہ صلوۃ جس میں نفخ ہوا روح کا اسی سے سب میں روح پھیل جائے گی۔ دیکھو جس وقت ایک آئینہ پر روشنی کا عکس پڑتا ہے تو وہ اپنے پاس کے آئینوں کو بھی روشن کر دیتا ہے بشرطیکہ کوئی مانع نہ ہو جو صورت ایک آئینہ کے اندر آتی ہے سب میں پہنچ جاتی ہے اسی طرح اگر پہلی نمازوں میں قابلیت ہے تو بھی ایک روح ان میں بھی پہنچ جائے گی۔ کما قیل

؎ آفتابے در ہزاراں آبگینہ تافتہ

(ایک سورج ہزاروں شیشوں میں چمکتا ہے ۱۲)

اس واسطے میں کہتا ہوں کہ صورت کی حفاظت کی بہت ضرورت ہے مگر صرف صورت ہی پر قناعت نہ کرو اس کی بھی کوشش کرو کہ روح کو اس سے متعلق کر دو اور وہ روح کیا ہے وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (میری یاد کے واسطے نماز کو قائم رکھو ۱۲) حق تعالیٰ کا ذکر ہے اب اپنی نماز کو دیکھنا چاہیے کہ ہے بھی ذکر۔

ذکر کے معنی میں دشواری

سو پہلے ذکر کی حقیقت سمجھ لیجئے۔ میں اس کے مراتب بیان کرتا ہوں اس کے دو مرتبے ہیں ایک ذکر حق اور ایک ذکر ذکر حق۔ ذکر حق کے معنی ہیں یاد حق یاد کسے کہتے ہیں غیر محقق صوفیوں نے اس کے معنی بہت دشوار کر دیئے ہیں حالانکہ بالکل سہل ہے جیسے بعض مدرسین کی عادت ہوتی ہے

کہ سہل مقام کو بھی طالب علم کے سامنے دشوار کہہ دیتے ہیں معلوم نہیں اس میں کیا مصلحت ہے شاید یہ خیال ہو کہ دشوار کہہ دینے سے طالب علم کو توجہ زیادہ ہوگی مگر یہ مقصود تو اس طرح بھی حاصل ہوسکتا ہے کہ یوں کہہ دیا کرے غور سے سنو۔ معلوم ہوتا ہے کہ نیت ہی خراب ہے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ہم ایسے فاضل ہیں کہ ایسے مشکل مقامات کو اس طرح بے تکلف پڑھا دیتے ہیں ایسے ہی بعض مدعین تصوف میں بھی خبط ہوتا ہے۔

کانپور میں میری مدرسی کے زمانہ میں ایک طالب علم مولوی فضل حق تھے مجھ سے صدرا پڑھتے تھے صدرا میں مثناۃ بالتکریر کا مسئلہ نہایت دشوار مشہور ہے۔ جب یہ سبق آیا تو میں نے یہ بتلانے سے پہلے کہ یہ فلاں دشوار مقام مشہور ہے اس کی تقریر کردی اور اپنے اطمینان کے لئے ان سے بھی کہلوایا جب معلوم ہوگیا کہ یہ سمجھ گئے تو میں نے کہا یہی مسئلہ مثناۃ بالتکریر کا ہے جو بہت دقیق مشہور ہے وہ یہ سنتے ہی گھبرا گئے۔ میں نے کہا ڈرو نہیں بس اب تو نکل گیا۔ دیکھو کس قدر سہل مقام کو دشوار مشہور کر رکھا ہے ؎

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا　　　جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

پھر جب سالانہ امتحان ہوا تو ممتحن بھی بڑے ہی رحم دل تھے۔ یہی مسئلہ پوچھا انہوں نے اس کو ایسا عمدہ لکھا کہ ممتحن نے لکھا کہ میں نے اب تک اس مسئلہ پر ایسی صاف تقریر کسی کی نہیں دیکھی۔ واقعی وہ چھپوانے کے قابل تھی۔ اب معلوم نہیں وہ جامع العلوم میں ہے یا تلف ہوگئی میں نے کہہ تو دیا تھا کہ اس پرچہ کو محفوظ رکھا جاوے۔ سو بعض مدعیان تصوف کی یہ کیفیت ہے کہ وہ مسائل ضروریہ معاملیہ تصوف کو ایسا چکر دے کر بیان کرتے ہیں کہ سننے والوں کو مشکل ہو چنانچہ ذکر کے معنی اس عنوان سے بیان کئے کہ ذکر وہ ہے کہ نہ ذکر ذکر ہو نہ ذکر ذاکر ہو۔ اب سب چکر میں ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہوا۔ اس کے بعد یہ خیال ہو جاتا ہے کہ جب اس کا سمجھنا مشکل ہے تو کرنا بدرجہ اولیٰ مشکل ہے کیونکہ کرنا بغیر سمجھے نہیں ہوسکتا۔

مراتب ذکر

الحمد للہ میں بتاتا ہوں کہ ذکر کے معنی بہت آسان ہیں۔ ذکر کے وہ معنی ہیں کہ جو ہر ایک گنوار سمجھ سکتا ہے۔ سنو ذکر کے معنی ہیں یاد۔ یاد کیونکر ہوتی ہے۔ جس وقت بیٹے کو یاد کرتے ہو تو کیا یہ خیال دل میں ہوتا ہے کہ میں یاد کر رہا ہوں۔ یا صرف بیٹے کا خیال ہوتا ہے کسی محبوب کو یاد کرتے

ہوتو اس وقت ذہن میں اس بات کا خیال نہیں ہوتا کہ میں اس کے حسن و جمال کو یاد کر رہا ہوں کیونکہ اگر یہ خیال ہوتو اس جملہ کی یاد ہوگی محبوب کی یاد نہ ہوگی تو حاصل ذکر کا یہ ہوا کہ یاد کرنے والا اس وقت سوائے اس کے جسے یاد کر رہا ہے کسی اور جز کا خیال بالکل نہ کرے حتیٰ کہ اس کا بھی کہ میں اس کو یاد کرتا ہوں۔

تو یہ حقیقت ہے ذکر کی۔ تو خدا کی یاد بھی ایسی ہی ہے کہ سوائے خدا کے کسی اور کا دل میں خیال نہ ہو۔ حتیٰ کہ اس کا بھی کہ میں اس وقت خدا کو یاد کر رہا ہوں۔

یہ اول درجہ ہے ذکر کا اس کا حاصل یہ ہے کہ قلب میں مذکور کا خیال ہو ذکر کا خیال نہ ہو۔ دوسرا مرتبہ ذکر کا یہ ہے کہ مذکور کی یاد نہ سہی تو ذکر ہی کی یاد سہی یعنی یہی سہی کہ میں اس وقت یاد کر رہا ہوں۔ یہ ذکر کی یاد ہے مذکور کی بلاواسطہ یاد نہیں۔ مگر یہ بھی کافی ہے حالانکہ یہ حق ذکر سے متنزل ہے چاہیے تو یہ تھا کہ کافی نہ ہوتا کیونکہ یہ ان کی یاد نہیں مگر افسوس تو یہ ہے کہ ہم یاد کی بھی یاد نہیں کرتے اور مذکور کی تو کیا یاد کریں گے۔ نماز پڑھتے ہیں تو اس وقت یہ بھی خیال نہیں ہوتا کہ ہم نماز پڑھ رہے ہیں بلکہ دنیا بھر کے بیہودہ خیالات جمع ہو جاتے ہیں۔ نماز پڑھنے میں کہیں بیوی کا خیال ہے کہیں بچوں کا خیال ہے۔ مولویوں کو درس کا خیال ہے ۔

شب چوعقد نماز بربندم   چہ خورد بامداد فرزندم

رات کو جب نماز کی نیت کرتا ہوں تو بجائے تکبیر تحریمہ کے یہ کہتا ہوں کہ صبح کو میرے بال بچے کیا کھائیں گے ۱۲)

ایک زباں داں اسکی عجیب تفسیر کرتے تھے کہ شب چوعقد نماز بربندم از غایت ہجوم مشاغل دنیا بجائے تحریمہ میگویم چہ خورد بامداد فرزندم (رات کو جب میں نماز کی نیت کرتا ہوں تو دنیا کے مشاغل کی کثرت سے تکبیر تحریمہ کی بجائے یہ کہتا ہوں کہ صبح کو میرے بال بچے کیا کھائیں گے ۱۲)

یعنی اوروں کی تکبیر تحریمہ تو اللہ اکبر ہے مگر ان کی تکبیر تحریمہ چہ خورد بامداد فرزندم (صبح کو میرے بال بچے کیا کھائیں گے ۱۲) ہے۔

امام غزالی کے ایک بھائی صاحب کشف تھے۔ وہ ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے۔ امام غزالی نے اپنی والدہ سے اس کی شکایت کی والدہ نے انہیں ساتھ پڑھنے کی تاکید کی۔ خیر انہوں نے امام غزالی کی اقتداء کی اتفاقاً نماز میں انہیں یہ خیال آیا کہ کتاب الحیض کا ایک مسئلہ لکھنے سے

رہ گیا بس جھٹ سے نیت توڑ کر الگ ہو گئے۔ امام غزالیؒ نے پھر اس واقعہ کی اپنی والدہ سے شکایت کی۔ والدہ نے ان سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں ایسے شخص کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا جس کا قلب خون حیض میں آلودہ ہے۔ انہوں نے کہا تم نے خدا کی طرف سے توجہ چھوڑ کر ان کے قلب کی طرف توجہ کیوں کی اگر ان کا قلب خون حیض سے آلودہ ہے تو تمہارا قلب بھی تو اس قلب خون آلودہ سے آلودہ ہے تم کیا منہ لے کر اعتراض کرتے ہو۔ خیر یہ حکایت اس پر یاد آ گئی کہ ایک وہ قلوب تھے کہ فقہ کے خیال کو بھی ذکر حقیقی کے سامنے پسند نہیں کیا۔ ایک ہمارے قلوب ہیں کہ نماز کا بھی خیال نہیں اور وہ صاحب حال تھے ورنہ نماز میں دین کا خیال آنا یہ نماز کے منافی نہیں۔ ہماری نماز میں تو کہیں دوکان کا خیال ہے کہیں مکان کا خیال ہے سو ذکر کا بھی ذکر نہیں باقی اول درجہ تو وہی تھا کہ ذکر بھی ذکر نہ ہو فقط مذکور ہی کا ذکر ہو۔

تو درو گم شو وصال ایں ست و بس   گم شدن گم کن کمال این ست و بس

تم محبوب میں فنا ہو جاؤ بس یہی وصال ہے اور اس فنا ہونے کے بھی بھول جاؤ۔ بس یہی کمال ہے ۱۲) یہ فناء الفناء ہے کہ فنا کی بھی خبر نہ ہو۔ اسی طرح بھول چکی یہ ہے کہ بھول کو بھی بھول ہو جائے سونے والا وہ ہے جسے سونے کی بھی خبر نہ ہو۔ فانی وہ ہے جسے فنا کی بھی خبر نہ ہو۔ اسی طرح ذاکر وہ ہے جسے ذکر کی بھی خبر نہ ہو اور اس تقریر سے اب تو فناء الفناء بھی مشکل بات نہ نکلی۔ غرض ذکر حق یہ ہے کہ ذکر کا بھی ذکر نہ ہو۔ واقعی اگر اس کی شرح نہ کی جائے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بڑی دقیق بات ہے جو ہماری سمجھ سے باہر ہے بہرحال ذکر حقیقی تو وہ تھا کہ ذکر کا ذکر نہ ہو مگر یہاں دوسرے دلائل سے ذکر ذکر ہی پر اکتفا کیا گیا ہے کہ تم ذکر ذکر ہی رکھو۔ ہم اپنی رحمت سے اسے بھی لذکری میں داخل کر دیں گے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اس کی کیا دلیل کہ صرف ذکر ذکر پر اکتفا کرنے کی اجازت دیدی اس کی دلیل حدیث میں ہے **من توضاء ثم صلی رکعتین مقبلاً علیهما بقلبه لم یحدث فیهما نفسه (لم اجد الحدیث فی "موسوعة اطراف الحدیث النبوی شریف")** (جس شخص نے وضو کیا پھر دو رکعت نماز حضور قلب سے ادا کیں کہ ان میں وسوسہ نہ آیا ۱۲) تحیۃ الوضوء کی فضیلت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اچھی طرح سے وضو کر کے دو رکعت پڑھے اور ان پر متوجہ رہے اب غور کرو کہ ان پر متوجہ رہنے کے کیا معنی۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ نمازی ہی کی طرف متوجہ رکھو یہی ذکر الذکر ہوا پس بادشاہ کی شان میں اگر

قصیدہ کہو تو اگر ممدوح کا خیال نہ ہو تو مدح کا تو خیال ہو۔ اسی طرح اگر یہاں اگر ذکر ہی کی طرف توجہ ہو کہ ہم اسے اپنی رحمت سے اپنی ہی توجہ میں شمار کریں گے۔

غیر مقلدیت

اس کا راز فقہاء نے سمجھا ہے کہ ایک قاعدہ لکھا ہے واقعی فقہاء بڑے عارف تھے اور اسی کی بدولت یہ لوگ حدیث میں اجتہاد کر سکتے تھے آج کل ہر شخص مجتہد و محدث ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ ایک تارک تقلید گنوار تھا اس سے کسی نے پوچھا فاتحہ خلف الامام کی کیا دلیل ہے اس نے کہا کہ ترمجی (ترمذی) میں آیا ہے کھداج کھداج حدیث میں آیا ہے خداج خداج یہ اس کی خرابی ہے۔ یہ محدث ہیں صاحب محدث نہیں یہ لوگ محدث ہیں چند حدیثوں کے غلط سلط بے سمجھے یاد کر لینے سے کوئی محدث ہو سکتا ہے؟

نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری دارد

(یہ بات نہیں کہ جس کے پاس آئینہ ہو وہ سکندری بھی جانتا ہو ۱۲)

ذکاوۃ اور بھولپن

بعضے لوگ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کو غیر مقلد کہتے ہیں ان کے صاحبزادے کی حکایت سے اس کا اندازہ کر لیجئے کہ اس حکایت سے اول ان کی مقلدیت کا درجہ دیکھ لیجئے پھر سمجھ لیجئے کہ اگر یہ غیر مقلد ہوتے تو ان کے صاحبزادے بھی اپنے باپ کی تربیت کی وجہ سے غیر مقلد ہی ہوتے۔ ان کا نام مولوی محمد عمر تھا۔ مجذوب منش تھے۔ پڑھا وڑھا کچھ زیادہ نہیں تھا مگر ذکی غضب کے تھے اور ساتھ ہی بھولے بھی تھے۔ تیز اور ذہین تو اس قدر تھے کہ ایک شخص نے کنز شروع کرانے کی درخواست کی راضی ہو گئے انہوں نے شروع کی پہلے دن دس ورق پڑھائے اس کے بعد انہوں نے کہا بس کہنے لگے ابھی سے بس۔ بھولے اس قدر تھے کہ مولوی محبوب علی صاحب جامع مسجد میں وعظ کہا کرتے تھے آواز ذرا پست تھی انہوں نے بھی ان کا وعظ سنا۔ وعظ سن کر بہت پسند کیا۔ مگر ان کی آواز پر رحم آیا۔ گھر آ کر خدا سے دعا کی کہ اے اللہ ان کی آواز کو بلند کر دے۔ اس کے بعد فوراً ان سے پوچھوا بھیجا کہ آپ کی آواز کچھ بلند ہوئی یا ابھی نہیں۔ کس قدر ناز ہے کہ دعا کرتے ہی دریافت کرتے ہیں کہ آواز بڑھی بھی یا نہیں۔ سو یہ مولوی محمد عمر صاحب ایک مرتبہ دہلی کی جامع مسجد میں تشریف لائے چند آدمی حدیث پڑھ رہے تھے۔ آپ بھی وہاں جا کر بیٹھے

لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ لوگ غیر مقلد ہیں۔ فرمایا ہمیں ان کی غیر مقلدی سے کیا لینا ہے ہم تو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سننے آئے ہیں ان میں سے ایک شخص نے حدیث پڑھتے پڑھتے کہا امام صاحب نے حدیث کے خلاف کیا۔ بس یہ سنتے ہی آگ لگ گئی۔ کہنے لگے کہ تمہارا یہ منہ ہے کہ تم امام صاحب پر اعتراض کرو اور غصہ ہو کر اٹھ گئے کہ چلو بھئی یہاں سب بددین جمع ہیں۔ تو واقعی ان حضرات پر اعتراض کرنے کے لئے منہ چاہیے۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حدیث کا سبق پڑھا رہے تھے کسی حدیث میں امام شافعیؒ کے تمسک کا جواب دیا تو ایک طالب علم غایت سرور سے کہنے لگے کہ حضرت اگر امام شافعیؒ بھی ہوتے تو وہ بھی مان جاتے۔ مولانا کو یہ سنتے ہی بہت تغیر ہوا فرمایا کہ میں کیا چیز ہوں اگر امام شافعیؒ ہوتے مجھ سے بولا بھی نہ جاتا اور میں تو ان ہی کا مقلد ہوتا۔ حضرت اتنا ادب ہوتا ہے مجتہدین کا۔ تو اجتہاد سہل بات نہیں ہے۔ حدیث یاد کر لینا اور بات ہے اجتہاد اور بات ہے۔ یہ فقہاء ہی کا حصہ ہے۔ جس کے متعلق حدیث ہے من یرد اللہ بہ خیراً یفقھہ فی الدین یعنی جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو خیر منظور ہوتی ہے اسے دین کی سمجھ دے دیتا ہے ان کو ایسی سمجھ دی گئی تھی کہ انہوں نے ایسے اصول بنائے جو آج تک نہیں ٹوٹے۔

مرض اجتہاد

چنانچہ انہوں نے ایک قاعدہ بیان کیا جس سے بحث مقام کا راز نکلے گا اور وہ یہ ہے کہ بعض احکام میں سبب حکم کو علت حکم کی قائم مقام کر دیتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے پہلے اس پر غور کیا کہ سفر میں قصر کی کیا علت ہے معلوم ہوا کہ علت قصر کی مشقت ہے لیکن حقیقت مشقت کا معلوم کرنا بعض جگہ دشوار تھا اس لئے اس کے سبب یعنی سفر کو قائم مقام علت یعنی مشقت کا کر دیا۔ مگر یہ علت سمجھنا یا سبب کو علت کی جگہ رکھنا یہ کام فقہاء ہی کا تھا باقی ہمیں جائز نہیں۔ نہ علت نکالنا نہ اس میں ایسا تصرف کرنا ایک تو اس لئے کہ ہم میں وہ فہم نہیں دوسری بات یہ ہے کہ فقہا تو اس لئے علت نکالتے تھے کہ حکم کا تعدیہ کریں ہمیں حکم کا تعدیہ تھوڑا ہی کرنا ہے اور اس وقت اجازت دینے میں ایک خرابی یہ ہے کہ الحاد کا دروازہ کھلتا ہے آج کل یہ مرض بہت پھیل گیا ہے کہ ہر حکم کی علت اپنے جی سے تراشتے ہیں۔ چنانچہ داڑھی رکھنے میں کیا حکمت ہے اور نماز پڑھنے میں کیا حکمت ہے۔ روزہ رکھنے میں کیا حکمت ہے اور اس کا نام انہوں نے فلاسفی رکھا ہے تو یہ فلاسفی گھڑنا جائز نہیں کیونکہ یہ

سمجھتے ہیں کہ جو حکمت ہم نے تراشی ہے وہ مدار حکم ہے تو جہاں یہ مدار حکم نہ ہوگا ایک شخص نے وضو کی حکمت سمجھائی اور تھوڑی دور تک خوب سمجھائی کہ کیسی رعایت کی ہے کہ وضو میں اطراف دھونا مقرر کئے ہیں جو چھ ہیں۔ اور جہات بھی چھ ہی ہیں اور یہ سب جہات سے محیط ہیں اور چونکہ عرب میں اکثر یہی اعضاء کھلے رہتے تھے جن پر گرد وغبار اور پیشاب مواشی کی چھینٹیں پڑی رہتی تھیں اس لئے صرف ان کے دھلوانے پر اکتفا کیا۔ اب آگے ٹھوکر کھائی کہ کہا کہ جب علت یہ ہے تو اب چونکہ ہم آئینہ دار بنگلوں میں رہتے ہیں یہاں گرد وغبار کہاں۔ اس لئے ہمیں وضو کی ضرورت نہیں چنانچہ یہ کمبخت بے وضو ہی نماز پڑھتا رہا اور لیجئے روزہ کیوں فرض ہوا کسر قوت بہیمیہ کے لئے۔ چونکہ ہم نے تعلیم کی وجہ سے اپنے نفس کی تہذیب کر لی ہے اس لئے اب ہمیں روزہ رکھنا تحصیل حاصل ہے نماز تواضع کے لئے فرض کی گئی ہے کیونکہ وَارْكَعُوْا مَعَ الرَّاكِعِيْنَ فرمایا ہے اور ہم میں پہلے ہی سے تواضع ہے اس لئے نماز کی ضرورت نہیں۔ سو فقہاء نے تو اس واسطے علتیں نکالی تھیں کہ ایک حکم بہت جگہ متعدی ہو سکے اور انہوں نے اس واسطے نکالیں کہ حکم کہیں بھی باقی نہ رہے۔ میں اسی لئے حکمتیں بیان کرتے ڈرتا ہوں کہ لوگ انہیں مدار حکم سمجھ لیتے ہیں گو ہم طالب علموں کو ایسی حکمتیں سب معلوم ہیں لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ مولوی حکمتیں نہیں جانتے وہ سب کچھ جانتے ہیں مگر مصلحت کی وجہ سے بیان نہیں کرتے۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں ہے کہ راز آشکارا ہو جائے ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی ایسی خبر نہیں کہ نہ معلوم ہو ۱۲)

کوئی ایسی بات نہیں کہ مولویوں کے پاس نہ ہو۔ بہر حال میں اس وقت بیان کرتا ہوں۔

فقہا کا فہم:

چونکہ اہل علم کا مجمع ہے اس لئے مضر نہ ہوگا بلکہ اور جی لگے گا اعمال میں۔ تو فقہاء تعدیہ کے لئے بیان کرتے تھے میں تادیہ کے لئے بیان کرتا ہوں ہمیں اپنی حکمتوں کے متعلق یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہم انہیں حکم کا منشاء نہ سمجھیں بلکہ حکم کو انکا منشاء سمجھیں کیا معنی کہ حکم متضمن ہے بہت سی حکمتوں کو منجملہ ان کے یہ بھی ہے تو اتنا فرق ہے ہماری اور فقہاء کی حکمتوں کی تخریج میں کہ ان کی حکمت منشاء ہے حکم کا اور ہماری حکمت کا منشاء حکم ہے۔ بہر حال فقہاء کی تمیز تو دیکھئے کہ کتنی بڑی بات نکالی جس کا ذکر آتا ہے اور اتنی بڑی بات نکال کر پھر غلطی سے محفوظ رہے دوسرا ہوتا اور ایسی حکمت

نکالنا اس غلطی سے بچنا اس کو ایسا ہی دشوار ہوتا جیسا کسی نے کہا ہے۔

درمیاں قعر دریا تختہ بندم کردۂ　　　　باز میگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(قعر دریا میں تختہ سے باندھ دیا ہے پھر کہتا ہے کہ ہشیار رہ کہ دامن نہ بھیگے ۱۲)

یہ فقہاء قعر دریا میں پھنسے اور خشک نکل گئے یعنی انہوں نے دیکھا کہ سفر اور قصر میں کیا تعلق ہے معلوم ہوا کہ چونکہ سفر میں مشقت ہے اس لئے قصر ہونا مصلحت ہے دیکھئے یہاں یہ دریا میں گرے مگر تر دامن نہیں ہوئے۔ یہاں سخت غلطی کا موقع یہ تھا کہ جب سفر میں مشقت نہ ہو تو قصر بھی نہ ہو۔ اگر آج کل کے سفہاء ہوتے واقعی ایسا کرتے پھر اس سے جو تشویش وخلجان ہوتا ظاہر ہے مشقت ایسا امر خفی اور غامض تھا کہ اس کی تشخیص ہی میں اکثر تردد رہتا۔ مگر وہ تو فقہاء ہیں دریا میں ہیں۔ اور دامن بچا کر الگ ہو گئے کہ گو علت قصر مشقت ہے مگر اس کا قائم مقام اس کے سبب (یعنی سفر) کو سمجھ لیا۔ اب سفر شرعی ہے اگر مشقت نہ بھی ہو تو قصر کرنا پڑے گا۔ جیسا آج کل ریل کی وجہ سے کسی کو بھی مشقت نہیں رہی۔ سبحان اللہ کیا فہم تھا۔ اگر یہ حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ہوتے تو مخصوصین ومقربین میں ہوتے کیسا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راز کو سمجھا اور گمراہی سے بچ گئے۔ میں نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے پوچھا کہ اگر کوئی شخص کرامت سے کلکتہ پہنچ جائے تو قصر ہوگا یا نہیں فرمایا ہوگا کیونکہ وہ مسافت قصر پر پہنچ گیا ہے۔ گو مشقت نہ ہو تو اسی فہم کی بدولت کہیں شرائع میں خلل نہیں ہونے پاتا اگر کوئی یہ کہے کہ یہ کیونکر معلوم ہوا کہ جو کچھ ان حضرات نے سمجھا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصود کے خلاف نہیں۔ اس کی تحقیق نقلی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احکام کا مدار مسیرۃ سفر ہی کو جا بجا فرمایا ہے اور تحقیق عقلی یہ ہے کہ فقہاء یہ سمجھے کہ اصل حکمت اس حکم کی تیسر ہے پس اگر مدار حکم کا مشقت حقیقت ہو گی تو تعسر (دشواری ۱۲) ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ معلوم کرنا بڑا دشوار ہوگا کہ ہمیں مشقت اس درجہ کی ہوئی کہ قصر کریں یا نہیں ہوئی کہ نہ کریں پس مشقت حقیقت کی مدار سمجھنے میں اصل موضوع ہی فوت ہو جائے گا یعنی یسر (آسانی ۱۲)

امام اعظم کی دقت نظر

امام صاحب کے اکثر ایسے ہی دقائق ہوتے ہیں چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ اگر کوئی نمازی کے سامنے گزرے تو اسے ہٹاؤ اگر نہ ہٹے **فلیقاتله** اس سے قتال کرو۔ بعض اس کو ظاہر پر محمول کرتے ہیں حنفیہ اسے زجر پر محمول کرتے ہیں کیونکہ اس حکم کی علت پر غور کرو کہ کیا ہے علت

اس کی حفاظت ہے جمعیت صلوۃ کی اور یہ ایک صفت ہے صلوٰۃ کی اور ذات یقیناً قابل حفاظت ہوتی ہے۔ صفت سے پس اگر یہاں صفت کی حفاظت کے لئے جھگڑو گے تو نماز ہی ٹوٹ جائے گی۔ تو یہ عقل کے خلاف ہے۔ شارع صفت کا اس قدر اہتمام کریں کہ ذات کی بھی پرواہ نہ رہے۔ سبحان اللہ امام صاحب کی کیسی گہری نظر ہے اہل ظاہر کی نظر اتنی عمیق (گہری۱۲) نہیں اسی سے امام صاحب پر اعتراضات کرتے ہیں بہرحال فقہاء کے اس قول پر تصوف کا وہ راز منطبق ہو گیا کہ اقامت صلوۃ کی علت ذکر اللہ ہے اور ذکر صلوۃ سبب ہے ذکر اللہ کا لہٰذا یہ سبب قائم مقام اس علت کے ہوگا جس طرح فقہاء نے بیان کیا ہے کہ مشقت علت ہے قصر کی اور سفر سبب ہے مشقت کا اس سبب کو قائم مقام کردیا علت کا۔

علت اقامت صلوٰۃ

اسی طرح ذکر اللہ علت ہے اقامت صلوۃ کی اور ذکر الصلوۃ سبب ہے ذکر اللہ کا تو ذکر الصلوۃ اس طرح سے قائم مقام علت کا یعنی ذکر اللہ کا ہے اسی واسطے شارع علیہ السلام دونوں کو ایک ہی درجہ میں سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں **مقبلا علیھما بقلبہ** (حضور قلب سے) اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے لذکری (میرے ذکر کے لئے)

ہائے جو لوگ حدیث کو نہیں مانتے وہ بڑی مصیبت میں ہیں ان کو چاہیے کہ ذکر اللہ کی حقیقت حاصل کریں کیونکہ قرآن میں تو وہی مامور بہ ہے توجہ الی الصلوٰۃ کو کافی نہ سمجھیں کیونکہ یہ کفایت تو مدلول حدیث کا ہے۔ غرض کس قدر رحمت ہے کہ ذکر الصلوۃ بجائے ذکر اللہ کے ہوگیا۔ اور ذکر الصلوۃ زیادہ دشوار نہیں ہے۔

علمی کوتاہی

پھر ہم جو اس میں بھی کوتاہی کرتے ہیں اس عملی کوتاہی کا اصلی سبب ہماری علمی کوتاہی ہے۔ یعنی اصل کوتاہی ہماری یہ ہے کہ ہم ذکر الصلوۃ کے معنی نہیں سمجھے۔ اس لئے ہمیں دشوار معلوم ہوتا ہے ہم اس کے معنی یہ سمجھے کہ صرف نماز ہی کا دل میں خیال رہے اور کسی کا خطرہ دل میں نہ آوے۔ نہیں بلکہ یہ معنے ہیں کہ صرف نماز ہی کا خیال دل میں رہے اور کسی شئے کا خطرہ دل میں خود نہ لاوے۔ آوے، تو آنے دو تم خود کوشش کر کے نہ لاؤ۔ کوشش کر کے تم فقط نماز کا خیال لاؤ۔ اس کے

خود بخود جو خیالات آئیں انہیں آنے دو تم ان کے روکنے کے مکلف نہیں ہو اور نہ روک سکتے ہو۔

اسے اس طرح سمجھو کہ ایک شخص سے کوئی معشوق یوں کہے کہ فقط ہمیں کو دیکھنا اور کسی کو نہ دیکھنا اس نے اس کو دیکھنا شروع کیا اتفاق سے محاذات شعاع میں ایک کبوتر اڑتا ہوا گیا اس لئے اس پر بھی نظر پڑ گئی تو کیا معشوق یہ کہے گا کہ تم نے ہماری مخالفت کی ہرگز نہ کہے گا کیونکہ یہ شخص تو اس کے درپے نہ ہوا تھا وہ خود اس کے آگے آ گیا بقول مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کے ایک رسالہ میں مولانا نے غیر مقلدوں کا رد کیا ہے تو اس میں ان کے اس الزام کا کہ مولانا تو غیر مقلدوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں عجیب لطیف رد کیا ہے لکھتے ہیں کہ مولانا تو ان کے پیچھے نہیں پڑے وہ خود ہی آگے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

حقیقت حضور قلب

اسی طرح خطرات دو قسم کے ہیں ایک وہ جو تمہارے آگے کھڑے ہوتے ہیں ایک وہ جن کے تم پیچھے پڑے رہتے ہو۔ اس میں اہل ظاہر کو سخت غلطی ہوتی ہے کہ وہ ان دونوں میں فرق نہیں کرتے اور اسی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ صاحب ذکر وخشوع بہت مشکل ہے۔ مشکل نہیں نہایت سہل ہے۔ میں اس کو ایک مثال سے سمجھاتا ہوں یہ مسئلہ تو معلوم ہے کہ نماز بغیر نیت کے نہیں ہوتی اور یہ بھی معلوم ہے کہ نیت زبان سے نہیں ہوتی بلکہ یہ قلب کا فعل ہے کہ اس کی طرف دل میں توجہ کرنا کہ میں نماز پڑھتا ہوں بس یہی حقیقت ہے ذکر الصلوۃ کی جس طرح شروع میں نیت کے وقت اس کی طرف توجہ ہوتی ہے اگر تمام نماز میں ویسی ہی توجہ رہے تو ذکر الصلوۃ حاصل ہو گیا۔ اب تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ ذکر الصلوۃ کس قدر سہل ہے۔

ایک عبادت اس صلوٰۃ میں خصوص تراویح میں اور ویسے بھی رمضان میں قرآن ہے اس کی طرف توجہ کرنے کی حقیقت بھی بتلائے دیتا ہوں دیکھو اگر کسی حافظ کو کوئی رکوع کچا یاد ہو تو اسے کیونکر پڑھے گا۔ خوب دھیان سے پڑھے گا یہی حاصل ہے توجہ الی القرآن کا۔ پس جس طرح ایک رکوع پڑھتے بیسوں رکعت اسی طرح پڑھ لیا کرو۔ یہی معنی ہیں حضور قلب فی الصلوٰۃ (نماز میں حضور قلب ۱۲) کے اگر کوئی کہے کہ یہ تو تم نے گھڑ لئے نہیں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے حضور قلب فی الصلوۃ وفی القرآن کی یہی حقیقت لکھی۔ اب بتلاؤ کیا مشکل ہے۔ حضور قلب سے نماز پڑھنا۔ بس اتنا ہی تو کرنا پڑے گا جو خیال نیت کے وقت دل میں تھا اسے پوری نماز میں رکھو اور کیا مشکل ہے حضور قلب

سے قرآن پڑھنا بس اتنا ہی تو ہے کہ جو کیفیت تمہارے کچے رکوع کے پڑھنے کے وقت ہوتی ہے اسے بیسوں رکوعوں میں رکھو اب بھی اگر کسی سے حضور قلب نہ ہو تو یہ اس کی کوتاہی ہے۔

حفاظت خطرات

بہر حال اس تقریر میں اہل ظاہر کی اصلاح یہ ہے کہ وہ نماز و قرآن کو خیال سے پڑھیں اور اہل باطن کی اصلاح یہ ہے کہ خواہ مخواہ اس کے درپے ہوتے ہیں کہ خطرات نہ آئیں۔ حقیقت تو اسی قدر ہے جو میں نے بیان کی۔ اپنی طرف سے حاشیہ نہ چڑھاویں کیونکہ کب تک چلے گا۔ نفس چند روز مقید رہے گا اس کے بعد گھبرا کر شتر بے مہار کی طرح اس قدر آزاد ہو جائے گا کہ پھر تمہارے قبضہ سے نکل جائے گا اب جو تم یہ کرو گے کہ خطرات نہ آویں تم انہیں روکو گے چار پانچ روز رکے رہیں گے اس کے بعد پھر سب بھرمار ہو جائیں گے کیونکہ پہلے تو یہ تھا کہ آتے تھے اور نکل جاتے تھے۔ اب تم نے سب کو دل کے دروازہ پر جمع کر لیا ہے جب دروازہ کھلے گا ایک دم سے بھرماریں گے پھر نکلتے نکلتے بھی کئی مہینے لگ جائیں گے۔ یہ کوئی شاعری نہیں ہے تجربہ کی بات کہتا ہوں چنانچہ تم بھی تجربہ کر کے دیکھ لو تو ڈاٹ نہ لگاؤ یونہی رہنے دو۔

روح قرآن

بہر حال یہ ہیں حقائق واقعیہ اور یہ ہیں حقائق سہلہ اور یہ ہیں معنی الدین یسر (دین آسان ہے ۱۲) کے تو یہ ہے روح قرآن وصلوۃ جو اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ (میری یاد کے لئے نماز قائم کرو ۱۲) میں مذکور ہے اس کو اس طرح سمجھو کہ قراءت قرآن جز وصلوۃ ہے تو جو روح صلوۃ کی ہوگی وہی روح اس کے سب اجزاء اور جز وقراءت کی بھی ہوگی بلکہ یہ تو نماز کا اتنا بڑا جزو ہے کہ اس کے قائم مقام کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی اور ارکان کے تو قائم مقام ہیں۔ اس کا کوئی قائم مقام نہیں حتیٰ کہ جس کو قراءت نہ آتی ہو تو اس کو تکبیر و تہلیل پر اکتفا کرنے کا حکم ہے جس سے ان کا قائم مقام قرآن ہونے کا شبہ ہوتا ہے مگر دیکھئے یہ تکبیر و تہلیل بھی اجزائے قرآن میں سے ہیں کیونکہ فرماتے ہیں وَلَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ (اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے ۱۲) دیکھئے تکبیر اس میں موجود ہے اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ بہت جگہ آیا ہے سُبۡحٰنَ اللّٰہِ بھی وارد ہے پس جب اتنا بڑا جزو ہوا تو اس کی روح بھی وہی ذکر ہوگی اور اس تقریر سے نماز کی خصوصیت تو رمضان کے ساتھ ثابت ہوگئی۔

خصوصیت قرآن بالرمضان

اب قرآن کے رہ گئی تو قرآن کو شروع ہی سے رمضان سے خصوصیت ہے۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیٓ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن شریف نازل کیا گیا ہے ۱۲) اس سے خصوصیت باعتبار نزول کے ثابت ہوئی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل علیہ السلام سے دور رمضان ہی میں کرتے ہیں۔ نیز فقہاء نے لکھا ہے کہ رمضان میں ایک قرآن ختم کرنا تراویح میں مسنون ہے۔ نیز ان تمام نصوص سے معلوم ہوا کہ قرآن کی تلاوت رمضان میں زیادہ مطلوب ہے۔ یہ خصوصیت تو تشریعی ہے تکوینی خصوصیت یہ ہے کہ اس ماہ میں ہر شخص خود بخود قرآن کی طرف راغب ہو جاتا ہے اس لئے میں ذاکرین کے واسطے بھی اس ماہ میں اسے ذکر سے افضل سمجھتا ہوں میرا یہ مطلب نہیں کہ ذکر نہ کریں وہ بھی کریں مگر زیادہ تر قرآن کی تلاوت کریں کیونکہ ذکر تو بارہ مہینے یکساں ہے اور رمضان میں قرآن پڑھنے میں خاص برکات نازل ہوتی ہیں جس طرح مکہ میں جا کر طواف بکثرت کرنا چاہیے اور عبادات کو بھی کرنا چاہیے مگر طواف سب سے زیادہ اسی طرح رمضان میں قرآن یہ عبادتیں ہیں رمضان کی پس ان عبادتوں کو ان کی صورت وروح کے ساتھ ادا کیا کرو یعنی توجہ کے ساتھ کیا کرو۔ بہر حال یہ ہے روح صلوۃ کی جس کو حق تعالیٰ فرما رہے ہیں اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (میری یاد کے لئے نماز کو قائم کرو ۱۲) اب میں اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں اب حق تعالیٰ سے توفیق عمل کی دعا کرو۔ آمین۔

سہو نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سبب

ضمیمہ روح القیام

بعد نماز عصر

اس وقت نماز پڑھتے میں ایک شبہ کا جواب منجانب اللہ قلب میں آیا۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ نماز پڑھنے میں جو کچھ قلب پر وارد ہوتا ہے صحیح ہوتا ہے۔ شبہ یہ ہوتا ہے کہ جب ذکر کے دو مرتبے ہیں ایک اعلیٰ کہ ذکر مذکور اور ایک ادنیٰ کہ ذکر ذکر ہے اور یہ ثابت ہے

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں سہو ہوتا تھا تو معاذ اللہ ہماری طرح کیا حضور صلی اللہ علیہ کو بھی نماز کی طرف توجہ نہ تھی۔ کیونکہ اگر کسی چیز کی طرف پوری توجہ ہو تو سہو کے کوئی معنی نہیں۔ جواب یہ ہے کہ واقعی سبب سہو کا عدم توجہ الی الصلوۃ (نماز کی طرف توجہ نہ کرنا ۱۲) ہے۔ مگر اس عدم توجہ الی الصلوۃ (نماز کی طرف توجہ نہ کرنے ۱۲) کے سبب دو ہیں ایک توجہ الی مافوق الصلوۃ (نماز سے مافوق مرتبہ کی طرف توجہ الی اللہ (اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنا ۱۲) جو ذکر کا اعلیٰ درجہ ہے اور یہ شان تھی حضور ﷺ کی۔ دوسرا توجہ الی مادون الصلوٰۃ (نماز سے ادنیٰ مرتبہ کی طرف توجہ کرنا ۱۲) جس میں ادنیٰ درجہ بھی ذکر کا نہیں اور یہ حالت ہے ہماری کہ غفلت میں مبتلا ہیں پس حضور ﷺ کا متوجہ الی الصلوٰۃ نہ ہونا اور ہے ہمارا اور ہے اور سہو دونوں کا خاصہ مشترکہ ہے اسی کو فرماتے ہیں۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر

(پاک لوگوں کے کام کو اپنے اوپر قیاس مت کرو ۱۲)

۔ ثم کتب الی حبی المولوی ظفر احمد انه وجد موافقه ' فی کتب السلف ونقل ما ذکر العلامة الطحطاوی فی اواخر سجود السهو ما نصه و سهو نبینا صلی الله علیه وسلم کان لمقام شغله بالله تعالیٰ عن الصلوة و فی هذا المعنی قیل ۔

یا سائلی عن رسول الله کیف سها — والسهو عن کل قلب غافل لا هی

قدغاب عن کل شئی سره فسها — عماسوی الله فی التعظیم لله

ابو السعود . انتهی بلفظه ۱۲ منه مدظله

(پھر محبی مولوی ظفر احمد صاحب نے مجھ کو لکھا کہ میں نے اس کی تائید کتب سلف میں پائی ہے چنانچہ علامہ طحطاوی نے سجود سہو کے اواخر میں ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں سہو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہونے کی وجہ سے تھا۔ اس بارہ میں کہا گیا ہے ۔ اے مجھ سے دریافت کرنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں کہ آپ کو نماز میں کس طرح سہو ہو گیا حالانکہ سہو قلب غافل اور لہو ولعب کرنے والے کا کام ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر شئے سے آپ کی روح غائب ہو گئی سوا اللہ تعالیٰ کی تعظیم کی وجہ سے ماسوی اللہ کو بھول گئے ۱۲)

سلسلہ

ہفت اختر کا پہلا وعظ

روح الصیام

روح الصیام نامی وعظ ۲ رمضان المبارک ۱۳۳۳ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں جمعہ کے روز بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔
مولانا عبدالحلیم صاحب مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا۔
سامعین کی تعداد تین سو کے قریب تھی۔

خطبہ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہ ' و نستعینہ' و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ' و نشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہ' و رسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم ' امابعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم .

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرۃ:۱۱۸)

(ترجمہ) اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا اس توقع پر کہ تم متقی بن جاؤ)

تمہید

یہ تو اس آیت کے سنتے ہی سے معلوم ہو گیا کہ روزہ کے متعلق بیان ہوگا کیونکہ اس میں روزہ کا مضمون ہے۔ لیکن یہ بھی خیال ہوا ہوگا کہ ہم تو اس کے متعلق بہت مرتبہ سن چکے ہیں پھر بار بار اعادہ (لوٹانا) کی کیا ضرورت ہے؟

صاحبو! آپ بھی تو ایک ہی فعل کا بہت مرتبہ اعادہ کیا کرتے ہیں رات کو کھانا کھا چکتے ہیں پھر صبح کو کھاتے ہیں۔ صبح کو کھا چکتے ہیں پھر شام کو کھاتے ہیں۔ یہ کیا بات ہے کہ وعظ کے متعلق یہ خیال پیدا ہوا اور اپنے روزمرہ کے افعال پر یہ خیال نہ ہوا اگر یہ کہو کہ کھانے کی تو ضرورت ہے تو جو ضرورت وہاں ہے وہی یہاں بھی ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ روٹی کو تو غذا سمجھتے ہو اور اسے نہیں سمجھتے حالانکہ جس طرح جسم کی غذا ہے اسی طرح روح کی بھی غذا ہے جس طرح جسم کو ہر وقت غذائے جدید کی ضرورت ہے کیونکہ حرکات مختلفہ سے جو اجزا متحلل ہو گئے ہیں۔ قیام بدن کے لئے ان کے بدل کی ضرورت ہے اسی طرح جو غذائے روحانی تم کو پارسال یا دو چار مہینے پہلے مل چکی ہے وہ غذا جزو روح بن کر نفس کی حرکات مختلفہ کبر، حسد، بغض، ریا وغیرہ سے متحلل ہو چکی۔ پس جس طرح غذائے جسمانی بدل ما یتحلل (جسم کے جو اجزاء تحلیل ہو گئے ان کا عوض) بن جاتی ہے اسی طرح وعظ بھی بھولے ہوئے مضامین کا بدل ہے۔ اب معلوم ہو گیا ہوگا کہ وعظ کے اعادہ کی بھی وہی ضرورت ہے جو غذا کے اعادہ کی ہے۔ اور وعظ کی بھی وہی غایت ہے جو غذا کی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ غذا جزو بدن بنتی ہے اور وعظ جزو روح۔ اب اگر وعظ کا اعادہ ہو تو ضرورت سے خالی نہیں۔

فلسفیانہ خبط

یہیں سے راز ان مضامین کے اعادہ کا سمجھ میں آ گیا ہوگا جو حق تعالیٰ کے کلام میں بار بار آئے ہیں۔ اہل فلسفہ کو یہ خبط ہے کہ انہیں قرآن مجید کے تکرار مضامین پر بہت شبہے ہوتے ہیں کیونکہ وہ ہر چیز میں فلسفہ کا رنگ ڈھونڈتے ہیں اور وہی ان کے دماغوں میں بسا ہوا ہے حتیٰ کہ عادات و معاشرات روزمرہ میں بھی اسی کا خبط غالب ہوتا ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نے مجھے تصور شیخ کا مسئلہ نقل کرنے کو دیا تھا۔ میں بیٹھا لکھ رہا تھا کہ ایک نووارد معقولی طالب علم آئے اور پوچھنے لگے کیا لکھ رہے ہو میں نے کہا تصور شیخ کا مسئلہ لکھ رہا ہوں کہنے لگے کون شیخ! بوعلی سینا! اللہ اکبر اتنا غلو[1] کہ جب شیخ بولو تو بوعلی سینا ہی مراد ہو۔

ایک شخص کی حکایت سنی ہے کہ وہ تیل لینے کسی تیلی کے کولہو پر گئے دیکھا کولہو میں بیل چل رہا ہے اور بیل کے گلے میں گھنٹی بندھی ہوئی ہے پوچھا میاں تیلی گھنٹی لٹکانے میں کیا حکمت ہے۔ اس نے کہا میاں ہم غریب لوگ ہیں ہمارے ذمہ اور بھی بہت سے کام ہیں۔ آدمی نہیں رکھ سکتے۔ ایک

---

[1] حد سے گذرنا

دفعہ ہنکا کے چلے جاتے ہیں اور اس گھنٹی کی آواز سے یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ بیل چل رہا ہے۔ جب آواز رک جاتی ہے تو آ کے پھر ہنکا دیتے ہیں۔ کہنے لگے آواز سے تو یہ لازم نہیں آتا کہ بیل چل رہا ہے ممکن ہے کہ بیل کھڑا ہوا گردن ہلاتا ہو اور اس لئے گھنٹی کی آواز آتی رہتی ہو۔ اس نے کہا میاں آپ یہاں سے کہیں اور جگہ تشریف لے جایئے۔ ہم آپ کے ہاتھ تیل بھی نہیں بیچتے۔ آپ تو اس بیل کو بھی اپنی طرح منطقی بنا دیں گے۔ پھر وہ بیل بھی نہیں رہے گا۔

ایک اور حکایت ہے کہ ایک طالب علم کہیں وطن سے باہر تحصیل علم کرنے گئے تھے جب فراغت کر کے وطن واپس آئے تو باپ نے اپنے جی میں یہ خیال کیا کہ صاحبزادے بہت دور سے بہت دن کے بعد آئے ہیں لاؤ کھانے میں آج کچھ تکلف کر دیں۔ غریب آدمی تھے۔ گھر میں دو بیضے تھے۔ وہ تلوا لئے۔ جب کھانا کھانے بیٹھے دستر خوان پر تین آدمی تھے۔ ایک وہی منطقی طالب علم اور ان کا چھوٹا بھائی اور ایک باپ۔ ان حضرت کو معقول کا جوش اٹھا باپ سے کہنے لگے کہ میں ایسا علم پڑھ کے آیا ہوں کہ ان دو انڈوں کے سو انڈے بنا سکتا ہوں۔ باپ کو یہ سن کر بہت تعجب ہوا کہنے لگے ہاں بیٹا کیونکر بنتے ہیں ضرور بناؤ گے۔ دیکھئے ایک یہ انڈہ اور ایک یہ اور ایک ان دونوں کا مجموعہ تین ہوئے پھر تین یہ اور ایک ان تینوں کا مجموعہ چار ہو گئے۔ وہلم جراالی مالا یتناہی۔ اسی طرح اعتبار کرتے چلے جاؤ سو کیا بے شمار انڈے بنتے چلے جائیں گے۔ باپ نے اس خبط کا عملی اور نہایت لطیف جواب یہ دیا کہ ایک انڈہ چھوٹے بیٹے کو اٹھا کر دیدیا اور ایک خود اٹھا لیا اور ان سے کہا جو اٹھانوے انڈے تم نے دیئے ہیں وہ تم کھالو۔ اب تو میاں کی آنکھیں کھل گئیں۔ غرض فلسفہ میں غلو ہو جاتا ہے تو ہر ہر چیز میں اسی کا رنگ نظر آتا ہے اور ہر شے کو اسی رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔ اسی واسطے ہمارے بزرگ تمام علوم کو مخلوط کر کے پڑھاتے ہیں کہ نرے فلسفہ سے فلسفیانہ خبط اور غلو نہ ہو جائے۔

بعضے یورپ والے اس طرز کے مخالف ہیں وہ کہتے ہیں پہلے علوم آلیہ سے فراغت ہو جانا چاہیے تا کہ علوم عالیہ میں کامل بصیرت ہو۔ مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ بصیرت خاک بھی نہیں ہوتی بلکہ خبط ہو جاتا ہے۔

خوبیٔ تکرار

غرض اہل فلسفہ کے دماغ میں فلسفہ یہاں تک رچ گیا کہ وہ قرآن مجید کو بھی چاہتے ہیں کہ کتب فلسفہ کے طرز پر ہو۔ معقولی کتابوں میں تو تکرار عیب ہے اور قرآن مجید میں تکرار اعلیٰ درجہ کی

خوبی ہے کسی کی حس صحیح اور عقل سلیم ہو تو وہ جانے کہ تکرار کیا کچھ جذب مقناطیسی رکھتی ہے۔ کتب معقولات میں تو ضابطہ کا طرز اختیار کیا گیا ہے اور قرآن مجید میں دوسرا طرز اختیار کیا گیا ہے اور وہ طرز ضابطہ کا طرز نہیں ہے بلکہ شفقت کا طرز ہے۔ دیکھو جب باپ اپنے بیٹے کو ایک دن نصیحت کرتا ہے دوسرے دن جب اس کو نصیحت پر عمل کرتے نہیں دیکھا پھر وہی نصیحت کرتا ہے پھر خلاف کرتے دیکھتا ہے پھر وہی نصیحت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر سو مرتبہ بھی ضرورت پڑے گی تو یہ سو مرتبہ برابر وہی نصیحت کرتا رہے گا۔ نہ اسی کو یہ خیال ہوگا کہ ایک ہی بات کا کیا بار بار اعادہ کروں۔ اور نہ کسی اور ہی کو اس اعادہ وتکرار پر اعتراض ہوگا۔ تو اس کی کیا وجہ ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ باپ کو بیٹے کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی شفقت ہے۔ شفقت کے ہوتے ضابطہ کا برتاؤ نہیں کیا جاتا اور اگر باپ اپنے بیٹے کی تربیت اسی طرح کرے کہ ایک بار کہہ کر پھر نہ کہے کہ ایک مرتبہ تو کہہ چکا ہوں تو سب سے پہلے یہی معقولی حضرات نامعقول بن کر اعتراض کریں گے کہ تم تو بیٹے کے ساتھ قانونی برتاؤ کرتے ہو۔ اپنے اوپر سے الزام اتارتے ہو۔ ایک استاد کے دو شاگرد ہوں ایک محبوب دوسرا مبغوض۔ دونوں کے ساتھ استاد کا برتاؤ جدا جدا ہوگا۔ مثلاً دونوں سے ایک دفعہ کہے گا پڑھو۔ اگر دونوں پھر خاموش ہو جائیں گے تو محبوب سے کہے گا پڑھ۔ اگر پھر خاموش ہو جائے گا تو اس سے زیادہ سختی سے کہے گا اور اس مبغوض سے دوبارہ کچھ نہ کہے گا کیونکہ مقصود تو یہ ہے کہ اسے کل پٹیوں بھی اور الزام بھی نہ آوے اور اس دوسرے کے ساتھ محبت ہے اس لئے بار بار کہتا ہے کہ کل نہ پٹے۔ کیوں صاحب ان دونوں کے درمیان کیا تفاوت سمجھیں گے۔ یہی کہ اس کی شفقت باعث ہوئی ہے تکرار تنبیہ پر۔

کیا فلاسفہ یہ چاہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا برتاؤ ہمارے ساتھ ضابطہ کا ہو۔ حضرات! فلاسفہ اس کی قدر کیا جانیں۔ یہ تو اہل محبت ہی خوب سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو ہم سے اس درجہ شفقت ہے کہ ایک بات کو دس مرتبہ کہہ کر نہیں چھوڑتے۔ پھر کہتے ہیں پھر کہتے ہیں چنانچہ اسی کو فرماتے ہیں۔ اَفَنَضۡرِبُ عَنۡكُمُ الذِّكۡرَ صَفۡحًا اَنۡ كُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّسۡرِفِيۡنَ کیا ہم تمہارے حد سے بڑھ جانے کی وجہ سے اپنی نصیحت روک لیں گے۔ نہیں بار بار نصیحت کریں گے جن پر حق تعالیٰ کی صفات کمال کا ظل (سایہ) ہے ان کو بھی مخلوق سے اس قدر محبت ہوتی ہے کہ وہ کوئی سنے یا نہ سنے برابر نصیحت کرتے رہتے ہیں۔ اور ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ

کس بشنود یا نہ شنود من گفتگوئے میکنم

(یعنی کوئی شخص سنے یا نہ سنے میں برابر نصیحت کئے چلا جاؤں گا)

اور یہ خیال ہوتا ہے کہ ۔

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس　　　در بند آن مباش کہ شنید یا نشنید

ترجمہ: اے حافظ تیرا کام فقط دعا کرنا ہے اور بس اس بات کی فکر میں مت رہ کہ اس نے سنا یا نہ سنا۔

عجب خلوص

اس بشنود یا نشنود پر ایک حکایت یاد آئی۔ مولانا سید احمد بریلوی نے مولانا عبدالحئی صاحب سے فرمایا کہ وعظ کہا کرو۔ انہوں نے کہا کہ حضرت میرا وعظ کون سنے گا۔ فرمایا خدا سنے گا عرض کیا حضرت جب لوگ تھوڑے ہوں گے تو مضامین کی آمد کہاں ہوگی فرمایا تم لوگوں کی طرف منہ ہی نہ کرو چنانچہ لوگوں کی طرف پشت کر کے وعظ شروع کیا پھر تو بے انتہا مخلوق جمع ہونا شروع ہوگئی۔ اللہ اکبر کیا خلوص ہے کہ اگر کوئی نہ سنے گا تو خدا تو سنیں گے یہی وہ خلوص ہے جس کی وجہ سے یہ حضرات منبع فیوض بنے۔ انہیں کے رفیق حضرت مولانا اسماعیل صاحبؒ وعظ کے لئے کہیں تشریف لے گئے۔ چنانچہ وعظ کہا۔ جب ختم کر کے اٹھے اس وقت ایک شخص وعظ سننے کے اشتیاق میں پہنچا جب سنا کہ وعظ ہو چکا تو ایک آہ سرد بھری اور کہا افسوس اتنی دور سے آنے کی محنت ضائع گئی۔ مولانا نے فرمایا افسردہ کیوں ہوتے ہو چلو اب پھر کہہ دوں۔ اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے مسجد میں لے گئے۔ وہاں صرف مولانا تھے اور وہ شخص تھا۔ مولانا نے من اولہ الی آخرہ (اول سے آخر تک) سارا وعظ اسی طرح کہہ دیا۔ کتنا سخت کام ہے کہ جو نشاط دس ہزار آدمیوں کے مجمع میں ہوا تھا۔ وہی ایک آدمی میں ہو۔ صاحب ہم سے تو ایسا کبھی نہ ہو سکے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کی مخلوق پر نظر ہی نہ تھی وہ جو کچھ کہتے تھے خالق کی رضا کے لئے کہتے تھے۔ اور یہ خیال ہوتا تھا کہ جسے ہم راضی کرنا چاہتے ہیں وہ میں بھی تھا اور ایک میں بھی ہے۔ الحاصل خلوص پیدا کرنے سے ان تکراروں اور اس طرز کی قدر ہو سکتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح باپ اپنی شفقت کی وجہ سے تکرار سے دلگیر نہیں ہوتا اسی طرح حق تعالیٰ بھی تکرار نہیں چھوڑتے۔

عنایت و رعایت

باپ کی شفقت پر ایک مثال یاد آئی کسی بنئے کی حکایت مشہور ہے کہ اس کے گھر میں کوا آ کر بیٹھا اس کا بیٹا چھوٹا تھا۔ اس نے پوچھا ابا یہ کیا ہے کہا کہ بیٹا اسے کوا کہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس

نے سومرتبہ پوچھا کہ یہ کیا ہے اور وہ برابر جواب دیتا رہا اور ذرا بھی چیں[1] بجبیں نہ ہوا۔ مگر اسے بہی پر لکھتا رہا جب باوا بڈھے ہوئے اور صاحبزادے جوان۔ اتفاقاً ایک مرتبہ کوا آ کر بیٹھا۔ پوچھا بیٹا یہ کیا ہے کہا کوا ہے۔ پھر پوچھا کہ کیا ہے۔ تو گھور گھار کے کہہ دیا کوا ہے۔ جب تیسری مرتبہ پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ تو کہا کہ تمہاری عقل ماری گئی ہے جو فضول بات کی رٹ لگادی باپ نے کہا بیٹا خفا نہ ہو ذرا ٹھہر جاؤ یہ کہہ کر وہی بہی اٹھالیا اور دکھایا کہ تم نے سومرتبہ پوچھا تو میں نہ گھبرایا اور تم میرے تین ہی مرتبہ کے پوچھنے سے اس قدر گھبرا گئے اور خصوص آج کل تو غالب حالت یہی ہے کہ کوئی بیٹا باپ کو باپ سمجھ کر اطاعت نہیں کرتا۔ جب تک کمائی رہتی ہے تو کمائی کے لالچ سے خدمت کرتے رہتے ہیں اور جب وہ کمائی کے قابل نہیں رہتا تو پھر ان میں عمر کے ساتھ دو نقطے بھی بڑھ جاتے ہیں یعنی باپ سے پاپ ہو جاتا ہے۔

صاحبو! جب باپ کی یہ شفقت ہے تو شفقت پیدا کرنے والے کو کتنی شفقت ہوگی اگر حق جل شانہ کو بندوں سے بلاشفقت التفات ہوتا تو ایک مرتبہ تو نرمی سے فرمادیتے کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ پھر جب عمل نہ کرتے تو دوبارہ ڈانٹ کر فرماتے۔ پھر تیسری مرتبہ چپت بھی لگتی پھر برابر جب تک عمل نہ کرتے چپت لگتی رہتی۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے اس شفقت کا کہ برابر گناہ دیکھتے ہیں اور سمجھاتے رہتے ہیں۔ یہ بھی تو نہیں ہوتا کہ مدت دراز کے سمجھانے کے بعد ہی قوم نوح کی طرح طوفان میں غرق کر دیئے جائیں۔ یا قوم لوط کی طرح طبقہ زمین الٹ دیا جائے یا قوم عاد کی طرح تیز آندھیوں میں برباد کر دیئے جائیں یا بنی اسرائیل کی طرح جو گناہ کریں وہ دروازوں پر لکھ دیا جائے یا کوئی فرشتہ آ کر ہلاک کر دے اسی کو شاعر کہتا ہے۔

تصدق اپنے خدا کے جاؤں یہ پیار آتا ہے مجھے انشا
ادھر سے ایسے گناہ پیہم ادھر سے یہ دمبدم عنایت

اور پھر اتنی عنایت کے بعد بہت بڑی عنایت یہ ہے کہ جب خلوص سے **اللھم اغفرلی** (اے اللہ مجھ کو بخش دے) کہا سب نامۂ اعمال سے مٹا دیا۔ یہ نہیں کیا کہ نامۂ اعمال میں رہنے دیتے۔ گو معاف کر دیتے جیسا کہ عدالت میں ہوتا ہے کہ اگر مقدمہ خارج بھی کر دیا جاتا ہے تو مسل کو پھاڑ کر نہیں پھینک دیا جاتا بلکہ وہ داخل دفتر کر دی جاتی ہے۔ یہاں اتنے ہی سے خوش ہو

---

[1] پیشانی پر جھری ڈالنے والا

جاتے ہیں اور کمال شکر گزار ہوتے ہیں اور وہاں یہ قانون ہے کہ مقدمہ بھی خارج اور مسل بھی خارج تا کہ فرشتوں کی نظر میں بزرگ ثابت ہو اور انہیں ہم پر کسی قسم کے اعتراض کا موقع نہ ملے۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے اس رعایت کا اسی طرح یہ تکرار مضامین بھی عین عنایت و رعایت ہے۔ مگر بھلے مانس معترضین نے اس رعایت کی یہ قدر کی کہ اعتراض کر دیا کہ کیوں ہے یہ رعایت اپنے اوپر بھی تو یہ اعتراض کیا ہوتا کہ ہم میں کیوں ہے تکرار۔ کیوں ہیں دو آنکھیں دو ہاتھ دو کان دو پاؤں' وہاں تو یہ تمنا ہے کہ دو کی جگہ چار ہو جائیں تو اچھا ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ کھا کر دوبارہ کیوں کھاتے ہو۔ ایک مرتبہ سو کر دوبارہ کیوں سوتے ہو۔

خلاصہ یہ کہ یہ اعتراض ہی فضول ہے کہ جب ایک مرتبہ یہ مضمون ہو چکا تھا تو پھر کیوں ہوا۔ کیونکہ یہ موٹی سی بات ہے اکثر اگر ایک مرتبہ کہنے کا اثر نہیں ہوتا تو دوبارہ کہنے کا اثر ہو جاتا ہے۔ دیکھو حکیم سے نسخہ لکھوا کر لاتے ہو ایک ہی مرتبہ کے استعمال سے فائدہ نہیں ہوتا بلکہ تین دن پی کر دیکھتے ہو۔ اور اگر ایک مرتبہ پینے کے بعد فائدہ محسوس (ظاہر) نہ ہوا اور کوئی یہ رائے دے کہ اس نسخہ سے فائدہ نہیں ہوا اسے چھوڑ دو تو تم خود یہ جواب دو گے کہ ایک مرتبہ کے استعمال سے فائدہ نہیں ہوا کرتا۔ کم از کم تین دن تو پینا چاہیے۔ جب جسمانی نسخہ کی نظیر موجود ہے تو پھر روحانی نسخہ کو اسی پر کیوں نہیں قیاس کر لیتے۔

تاثیر اجزاء

کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ جب پہلی نصیحت سے فائدہ نہ ہوا تو وہ بیکار گئی سو پہلی نصیحت بیکار نہیں گئی۔ اس سے بھی نفع ہوا اور نفع یہ ہوا نفع کی استعداد پیدا کر دی دوسری نصیحت نے اس استعداد کو اور قوی کر دیا۔ تیسری مرتبہ کی نصیحت نے اس استعداد کو ظاہر کر دیا جس طرح دوا میں کہ پہلی دوسری خوراک سے بھی نفع ہوا تھا۔ مگر وہ محسوس و ظاہر نہ تھا۔ تیسری خوراک سے ظاہر ہو گیا تو نفع مجموعہ مرتب ہوا۔ جس طرح ایک قطرہ پانی کا نل سے پتھر کی سل پر ٹپکتا رہے تو برس دن میں مثلاً اس میں گڑھا ہو جائے گا تو کوئی عاقل یہ نہ کہے گا کہ گڑھا اخیر قطرہ سے ہوا ہے بلکہ یہ گڑھا مجموعہ قطرات کا اثر ہے۔ جس طرح اخیر قطرہ موثر ہے پہلا دوسرا قطرہ بھی موثر تھا ہاں ان کا اثر ظاہر نہ تھا۔ اب اخیر قطرے کے ساتھ مجموعہ کا اثر ظاہر ہوا اسی طرح ترازو میں پانچ سیر رائی رکھو تو پلہ جھک جائے گا مگر ایک دانہ رکھ کر دیکھو گے تو اس سے پلہ کا جھکنا محسوس نہ ہو گا اسی طرح دو تین سے بھی تاوقتیکہ ان کی

معتد بہ مقدار نہ ہو جائے۔ معتد بہ مقدار سے پلہ جھک جائے گا تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اخیر دانہ سے جھکا بلکہ اس پلہ کے جھکانے میں مجموعہ کا ہر ہر جز ومؤثر ہے۔ چنانچہ کوئی سریع الحس ایک دانہ رائی کا عمدہ کانٹے میں ڈال کر دیکھے تو اسے فوراً پلہ کا جھکنا محسوس ہو جائے گا۔

اس کو فلاسفہ نے بھی مان لیا ہے اور اس پر یہ تفریع کی ہے کہ زمین کا مرکز ثقل وزن کے بدلنے سے بدلتا رہتا ہے اور مرکز حجم نہیں بدلتا۔ اب ایک آن ایسی فرض کرو کہ تمام عالم کو سکون ہے پھر ایک چیونٹی چلی تو ساری زمین ہل گئی۔ لوگ انہیں بیوقوف کہیں گے کہ کہیں اتنی بڑی زمین اتنی سی چیونٹی سے ہل سکتی ہے۔ زمین تو بے شک ہلے گی مگر زلزلہ کی طرح نہیں ہلے گی جو محسوس ہو آپ علوم درسیہ پڑھیں تو سارے تعجبات جاتے رہیں اور آپ کی بھی سمجھ میں آ جائے کہ ایک چیونٹی کی حرکت سے ساری زمین کیونکر ہل سکتی ہے۔ مقصود میرا ان تمام مثالوں سے اس کی تائید کرنا ہے کہ مجموعہ کا ہر جز ومؤثر ہوتا ہے اب اگر اس دفعہ کے وعظ میں نفع ہوا تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس سے پہلے کے وعظ بیکار گئے بلکہ ان سے بھی نفع ہوا کہ انہوں نے بتدریج نفع کی استعداد پیدا کر دی مگر یہ نفع ظاہر نہ ہوا اخیر میں آ کر ظاہر ہوا۔ جس طرح ایک بچے کو کل بھی دیکھا تھا اور آج بھی دیکھا تو یہ بچہ بہ نسبت کل کے آج بڑھا اور اگر روز نہ بڑھے تو ایک دم سے پچاس برس کا بڈھا کیونکر ہو سکتا ہے۔

تسلی سالکین کی

اسی طرح سالکوں کو بھی تسلی رکھنا چاہیے جن کی یہ حالت ہے کہ اگر ذکر وشغل سے کچھ واردات وثمرات حاصل نہیں ہوتے تو دلگیر ہوتے ہیں کہ ہماری محنت ضائع ہو رہی ہے کیونکہ آج کل ذاکروں کو یہ بھی خبط ہے کہ ذکر وشغل شروع کرتے ہی ثمرات کے متوقع (آرزومند) ہو جاتے ہیں۔ کے آمدی و کے پیر شدی یہ نہیں خیال کرتے کہ کام کب سے شروع کیا ہے' مجھے اس موقع پر ایک مثال یاد آتی ہے۔ ہے تو بیہودہ سی مگر نتیجہ خیز ہے۔ عوام میں مثل مشہور ہے کہ رات پڑی بوند' نام رکھا محمود ابھی نطفہ کا قیام بھی متحمل ہے مگر انہوں نے بناء الفاسد علی الفاسد شیخ چلی کے طور پر طے کر لیا کہ لڑکا ہوگا اس کا یہ نام رکھیں گے پھر وہ بڑھے گا اس کے اولاد ہوگی اس کا یہ نام ہو گا۔ وھلم جرا مسلسل۔ اب اگر بچہ نہ ہوا کہ لڑکی ہوئی تو سوچتے ہیں کہ ہائیں یہ کیا ہوا۔ اسی طرح ذکر سے پہلے یہ حضرات یوں سوچ لیتے ہیں کہ اس طرح احوال ہوں گے۔ اور کیفیات وواردات ہوں گے اور یوں انوار ہوں گے۔ اور جب شروع کیا تو اسی وقت سے اب وحی کا انتظار ہے۔ غضب کی

بات ہے کہ تعلیم ظاہری میں تو میزان شروع کر کے بخاری کے فوراً متوقع نہیں ہوتے مگر تعلیم باطنی میں یہ چاہتے ہیں کہ سیڑھیاں چڑھنا نہ پڑیں ایک دم سے اڑ کے پہنچ جائیں۔ سلوک کے ساتھ اس بدسلوکی و بے صبری کی وجہ یہ ہے کہ یہ جانتے نہیں کہ ذکر کیا چیز ہے۔ اگر یہ جانتے تو صبر ہوتا بلکہ ان ثمرات کا انتظار بھی نہ ہوتا کیونکہ انتظار کرنا ایک شے کے بعد دوسری شے کا اس وقت ہوتا ہے کہ یہ پہلی شے مقصود بالعرض ہو اور وہ دوسری شے مقصود بالذات ہو۔ جب یہ ذکر کے بعد ثمرات کا انتظار کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ذکر مقصود بالعرض سمجھتا ہے اور ان ثمرات کو مقصود بالذات

مجالست محبوب

خبر بھی ہے ذکر کیا شئے ہے۔ حدیث قدسی میں وارد ہے۔ انا جلیس من ذکرنی (جو مجھ کو یاد کرتا ہے میں اس کا ہمنشیں ہوں) ذکر محبوب کی مجالست ہے ارے ظالم تو محبوب حقیقی کی مجالست کو چھوڑ کر کسی اور چیز کے پیچھے پڑا ہے۔ ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے جب کوئی عرض کرتا کہ حضرت ذکر کرتے بہت روز ہو گئے مگر کچھ معلوم نہیں ہوا۔ حضرت فرماتے کہ خدا کا شکر کرو کہ تمہیں ذکر ہی کی توفیق ہو گئی۔ اب اگر کوئی ثمرات کے پیچھے پڑے تو اس سے بڑھ کر اور کیا جہل ہوگا کہ اس کے نزدیک محبوب حقیقی کی مجالست بھی مقصود بالعرض ہے۔ مطلق محبوب کی مجالست کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں۔

ہرکجا دلبر بود خرم نشیں — فوق گردون ست نے قعر زمین

ترجمہ: جس جگہ محبوب ہو خوش وخرم بیٹھ وہ جگہ مرتبہ میں آسمان سے بلند ہے نہ زمین پست۔

ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ — جنت است آں گرچہ باشد قعر چاہ

ترجمہ: جہاں محبوب ہو وہ جگہ جنت ہے اگر چہ کنواں ہی کیوں نہ ہو۔

گفت معشوقی بعاشق کاں فتا — تو بغربت دیدۂ بس شہر ہا

پس کدامی شہر از آنہا خوشتر است — گفت آں شہرے کہ دروے دلبر است

کسی معشوق نے عاشق سے پوچھا کہ تم نے سیاحت میں کونسا شہر پسند کیا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے سب میں عمدہ وہ شہر ہے جہاں محبوب کی زیارت ہو عشاق نے تو یہاں تک کیا ہے کہ اگر مسمیٰ کی مجالست نصیب نہیں ہوئی ہوتی تو اسم کی مجالست کو غنیمت سمجھا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

دید مجنوں را یکے صحرا نورد — در بیابان غمش بنشستہ فرد

ترجمہ:۔کسی نے مجنوں کو جنگل میں تنہا دیکھا (کہ غمگین بیٹھا ہوا ہے)

ریگ کاغذ بود و انگشتاں قلم ۔۔۔ مے نمودی بہر کس نامہ رقم

یعنی ریت پر انگلیوں سے کچھ لکھ رہا ہے۔

گفت اے مجنون شیدا چیست ایں ۔۔۔ می نویسی نامہ بہر کیست ایں

پوچھا اے مجنوں کسے خط لکھ رہے ہو۔

گفت مشق نام لیلیٰ مے کنم ۔۔۔ خاطر خود راتسلی مے کنم

کہنے لگا کہ لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں (اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں)

یہ تو وہ لوگ ہیں جنہیں مسمیٰ کی مجالست میسر نہیں فقط اسم کی مجالست پر قناعت کرتے ہیں اور تم ہو کہ تمہیں مسمی، کی مجالست پر بھی قناعت نہیں۔

آغوش رحمت

ہاں اگر کوئی حافظ جی ہی ہوں کہ انہیں مسمیٰ نظر نہ آتا ہو تو کیا کیا جائے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ہمیں تو نظر نہیں آتا تو نظر آنے کی کیا صورت ہے۔ میں تمہیں خوشخبری دیتا ہوں کہ تم ذکر برابر کرتے رہو یہی تمہاری آنکھوں کا نسخہ ہے یہی نسخہ ہے ایک دن تمہیں قلب کا بینا بنا دے گا۔ مولانا فرماتے ہیں۔

بود وائے دیدہ آمد نورساز ۔۔۔ شدز بوئے دیدۂ یعقوب ساز

(خوشبو وہ چیز ہے کہ آنکھ کے لئے دوائے نور بخش ہے)

یعنی ایک خوشبو سے یعقوب کا دیدہ کھل گیا تھا بلکہ ایک دولت تمہارے متمنی سے بڑھ کر ہے کیونکہ محبت میں تمنا یہ ہوتی ہے کہ محبوب پاس بیٹھے اور اگر بہت زیادہ ہوس ہوئی تو یہ تمنا ہوتی ہے کہ محبوب میری بغل اور میرے احاطہ میں آجائے تمہیں ان سب سے بڑھ کر ایک ایسی حالت میسر ہے جس کی تمنا کا کبھی احتمال بھی نہ ہوا ہوگا۔ وہ یہ کہ محبوب تمہیں اپنی بغل میں لئے ہوئے ہے کیونکہ فرماتے ہیں اَلَاۤ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ (وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے) اگر کوئی معشوق اپنے عاشق سے یہ کہے کہ کہو تم مجھے گود میں لیتے ہو یا میں تمہیں گود میں لے لوں۔ تو واللہ اگر کچھ سلامتی فہم ہے تو کہے گا کہ میری ایسی قسمت کہاں کہ تو مجھے بغل میں لے کے بیٹھے اس لئے کہ بغل میں لینے والا تو محب ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اگر کسی کو تمنا ہوتی ہے تو محیط ہونے کی ہوتی ہے خدا کی عنایت ہے

کہ وہ تمہیں بغیر تمہاری تمنا کے آغوش رحمت میں ایسا گھیرے ہوئے ہے کہ تم کسی آن میں اس سے باہر نہیں ہو سکتے۔ اس سے بڑھ کر اب اور مجالست کیا ہوگی؟

اتنی بڑی دولت کے ہوتے ہوئے تم یہ چاہتے ہو کہ ثمرات ہوں احوال ہوں۔ ذوق ملے شوق ملے اس کی ایسی مثال ہے کہ ۔

دست بوسی چوں رسید از دست شاہ   پائے بوسی اندریں دم شد گناہ

ترجمہ: بادشاہ اگر دست بوسی کے واسطے کسی کو ہاتھ دیدے تو اس وقت میں قدم چومنا جرم ہے۔)

وزارت ملتی ہے مگر یہ کہتا ہے کہ نہیں مجھے تو جالی کھرپا دو۔ میں وزیر نہیں بنوں گا۔ میں گھسیارہ ہی رہوں گا جسے ذکر کی توفیق ہو جائے یہی بڑی دولت ہے۔ ہمارے حضرت پڑھا کرتے تھے ۔

یابم اورا نیابم جستجوئے میکنم   حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم

(اس کو پاؤں یا نہ پاؤں اس کی جستجو کرتا ہوں ملے یا نہ ملے آرزو کرتا ہوں۔

یا نیابم بناءً علیٰ ظاہرہ ہے یعنی جسے میں یابم سمجھتا ہوں اس کے اعتبار سے نیابم کیونکہ یہاں تو جستجو ہی یابم ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے اگر چہ بے سمجھے کہنا کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کہنے والے کا ذہن وہاں تک نہیں پہنچتا جہاں سننے والے کا پہنچ جاتا ہے۔ حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی غزل کسی کو سنائی اس نے ایک معمولی سے شعر کو مکرر پڑھوا کر سنا اور بڑی دیر تک مزے لیتا رہا۔ مولانا نے پوچھا اس میں ایسی کونسی بات ہے جس سے تمہیں لطف آ رہا ہے۔ اس نے ایک ایسے معنی بیان کئے کہ مولانا کے ذہن میں بھی نہ تھے۔ خیر وہ قول یہ ہے ۔

تلاش یار میں رہنا مجاہدہ ہے یہی   تصور قد جاناں مشاہدہ ہے یہی

سچی بات ہے ذکر و فکر ہی مشاہدہ ہے اور ارشاد ہے فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (تم ذکر کرو میرا میں ذکر کروں تمہارا) یہ خدا کو یاد کرتا ہے اور خدا اس کو یاد کرتا ہے۔ پھر اتنی بڑی دولت کے ہوتے اور کیا چاہیے۔ غرض بعض ذاکرین ذکر خالی عن الثمرات (ذکر سے خالی) کو ضائع سمجھتے ہیں۔ تو اس کا بھی جواب یہی ہے جیسا کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں سمجھ لینا چاہیے کہ پہلی مرتبہ کا ذکر بیکار نہیں گیا اس سے بھی نفع ہوا مگر محسوس نہیں ہوا۔ اخیر میں جو نفع محسوس ہوا ہے وہ مجموعہ مدت کا نفع ہے۔

شیوۂ رندان

میں نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ علماء کو سلوک میں مجاہدہ بہت کم کرنا پڑتا

ہے۔فرمایا کہ سب سے زیادہ مجاہدہ کرتے ہیں جب تک طالب علمی کرتے ہیں وہ سب مجاہدہ ہی ہے۔سبحان اللہ کیسی اچھی بات فرمائی۔جس دیا سلائی کو برسوں دھوپ دے چکے ہیں وہ ذرا سی گرمی پاتے ہی فوراً روشن ہو جائے گی۔اور جس نے کبھی دھوپ نہ دیکھی ہو ہمیشہ نمی میں رہی ہو وہ بہت دقت سے جلے گی۔ بس وہ برسوں کی دھوپ اسی طرح طلب علم کی دوڑ دھوپ ضائع نہیں ہے۔آج اس کا اثر ظاہر ہو رہا ہے اور اگر اس کو ضائع سمجھ کر بطالت اختیار کی تو محرومی رہی خوب فرمایا ہے۔

ناز پرورد و تنعم نبرد راہ بدوست　　　عاشقی شیوۂ رندان بلاکش باشد

ترجمہ: (عیش وعشرت ناز ونعمت میں پلا ہوا راہ سلوک نہیں طے کرسکتا عاشقی محنت وجفاکش لوگوں کا کام ہے۔

جو ناز ونعمت عیش وعشرت میں رہتے ہیں انہیں کچھ نہیں ملتا طالب علموں ہی میں دیکھ لو جو تنعم میں رہتے ہیں ان میں خاک بھی استعداد نہیں ہوتی۔

غیر محسوس نفع

غرض کام کرتے رہو اگر شروع میں نفع محسوس نہ ہو تو ناامید ہو کر یہ نہ سمجھو کہ نفع نہیں ہوا بلکہ نفع جمع ہو رہا ہے سب ایک دم سے مل جائے گا۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کو ایک قیمتی حلوا خریدنا ہے۔ پانچ روپے کی ضرورت ہے۔اور دو آنے کی آمدنی ہے کسی صاحب بصیرۃ نے بتلا دیا کہ ایک ایک پیسہ گھڑے میں ڈالتے رہو۔ جب پانچ روپے پورے ہو جائیں گے تو حلوا آجائے گا۔اب اگر وہ پانچ روپے جمع ہونے سے پہلے چاہے کہ حلوا آجائے تو کیسے آسکتا ہے اے ذاکرین تمہاری روزانہ کی بارہ تسبیحیں بھی ایک ایک پیسہ ہیں۔اگر جمع نہ کرو گے تو جو شے خریدنا چاہتے ہو تو کیسے خریدو گے۔ ہاں جب پانچ روپے ہو جائیں گے حلوے کی قاب مل جائے گی۔غرض دیر ہوتی ہے ہونے دو کیونکہ دیر بھی حکمت حق سے ہوتی ہے۔اس کی ایک حکمت حق تعالیٰ نے مولانا کی مثنوی سے مجھے منکشف کی۔

میتوانم ہم کہ بے ایں انتظار　　　رہ نمایم داد ہم راہ گزار

ترجمہ: یعنی مجھ کو قدرت ہے کہ بغیر انتظار کے راستہ دکھلاؤں اور راہ گزار کو ظاہر کر دوں۔

ناز ایں طوفان دوراں وارہی　　　برسر گنج وصالم پانہی

ترجمہ: تاکہ زمانہ کے رنج والم کے طوفان سے چھٹکارا پاوے میرے وصل کے خزانہ کو حاصل کرلے۔

لیک شیرینی و لذات مقر — ہست بر اندازۂ رنج و سفر

ترجمہ: لیکن وطن کی لذت ولطف سفر کے رنج ومحن برداشت کرنے کی مقدار پر ہے۔

آنگہ از فرزند و خویشاں برخوری — کز غریبی رنج و محنتہا بری

ترجمہ: اس وقت خویش واقارب اہل وعیال کی صحبت کا لطف حاصل ہوسکتا ہے کہ مسافرت میں بہت سی تکلیفیں اور محنتیں اٹھائی ہوں۔

مبارک تقلید

خصوص جس کا شیخ پاس ہو اور پھر اسے وسوسہ ہو تو تعجب ہے کیونکہ وہ شیخ تسلی کرسکتا ہے پھر اپنی رائے سے کیوں کام لے۔ ایک شیخ مولانا گنگوہی صاحبؒ سے بیعت تھے انہوں نے ایک بار اپنا کچھ حال مجھ سے کہا میں نے اس کے متعلق تحقیق بیان کی کہنے لگے حضرت مولانا نے بھی یہی فرمادیا تھا۔ میرا یہ خیال تھا کہ یوں ہی تسلی کردی۔ میں نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ آپ مولانا کو جھوٹا سمجھتے ہیں مولانا کو کیا غرض کہ وہ تمہاری خوشامد کریں۔ اب تو ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ پھر انہیں اس بدگمانی سے توبہ کرائی اس کے بعد خدا کے فضل سے انہیں نفع ہونا شروع ہوگیا۔ جو شخص شیخ کے بتانے کے بعد بھی وسوسہ کرے یہ سمجھو کہ وہ اسے شیخ نہیں سمجھتا بلکہ اپنے نفس کو شیخ سمجھتا ہے اور اسی کا اتباع کرتا ہے۔ رہبروں پر اعتماد نہ کرنے کی ایسی مثال ہے کہ اندھے حافظ جی کہیں دعوت میں گئے تھے جب وہاں سے لوٹے تو شاگرد کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے اس نے کہا حافظ جی کھائی' حافظ جی کہنے لگے ہاں خوب کھائی اس نے پھر کہا کھائی انہوں نے پھر کہا خوب کھائی یہاں تک کہ اس کے روکنے سے نہ رکے اور قدم بڑھا کر خندق میں گر پڑے۔ تو کہنے لگے کہ کمبخت یوں نہ کہا کہ حافظ جی خندق اندھے کو چاہیے کہ جس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے اس کی تقلید کرے تحقیق کے درپے نہ ہو۔ ہاں اگر کسی معقول عذر سے اس پر اعتماد نہ رہے دوسرے کو ڈھونڈے۔ مریض اگر طبیب سے محاجہ کرنے لگے تو طبیب بیزار ہو کر کبھی علاج نہ کرے گا۔ ہاں تھوڑے دنوں کی تقلید کے بعد خود بخود محقق بن جاؤ گے۔ مبارک ہے وہ تقلید جو کامیاب کردے اور منحوس ہے وہ تحقیق جو ناکام رکھے۔

منحوس تحقیق

اس پر ایک مثل یاد آئی ایک احمق کے اونٹ پر گون بھری ہوئی تھی۔ ایک عاقل پیدل چلا جا رہا تھا۔ اس نے کہا گون میں کیا ہے احمق نے کہا ایک طرف گیہوں ہے اور ایک طرف ریگ۔ پوچھا ریگ کیوں بھرا ہے۔ اس نے کہا تا کہ دونوں طرف کا وزن برابر رہے۔ عاقل نے کہا ریگ نکال ڈالو اور آدھے آدھے گیہوں دونوں طرف بھر دو تب بھی یہ مقصود حاصل ہو جائے گا اور اونٹ کو راحت رہے گی۔ احمق کی سمجھ میں آ گیا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد خوش ہو کر عاقل سے کہا تم بھی میرے اونٹ پر بیٹھ جاؤ۔ بہت اصرار سے وہ عاقل اونٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس احمق کو خیال آیا کہ جب میں باوجود احمق ہونے کے ایک اونٹ کا مالک ہوں تو یہ عقلمند ہے خدا جانے اس کے پاس کس قدر مویشی ہوں گے اس عاقل سے پوچھا تمہارے پاس کتنے اونٹ ہیں۔ کہا ایک بھی نہیں پوچھا کتنی گائیں ہیں کہا ایک بھی نہیں۔ پوچھا کتنی بکریاں ہیں کہا ایک بھی نہیں پوچھا آخر کچھ بھی ہے کہا کچھ بھی نہیں۔ کہا مہربانی کر کے آپ میرے اونٹ سے اتر جایئے اور میں آپ کے اس مشورے سے باز آیا۔ آپ کی عقل نہایت منحوس ہے کہ جس نے آپ کو ورطہ افلاس (تنگدستی کے بھنور) سے نہ نکالا۔ کہیں ایسا نہ ہو اس کی نحوست سے میں بھی مفلس ہو جاؤں۔ آپ جیسے عقلمندوں سے تو میں احمق ہزار درجے اچھا کہ ایک اونٹ کا مالک تو ہوں۔ اور یہ کہہ کر پھر اسی طرح ایک طرف گیہوں اور ایک طرف ریگ بھر لیا۔

حقیقی عقل

حقیقت میں جو کم عقلی موصل الی اللہ (اللہ کی طرف پہنچانے والی) ہو وہ مبارک ہے اس عقل سے جو مانع ہو۔ بھولے بھالے اولیاء اللہ مقصود تک پہنچ گئے اور فلاسفہ یونان ٹھوکریں کھاتے پھرے عقل حقیقت میں وہ ہے جو رہبر ہو اور جو مانع ہو تو اس کو تو یہ کہا جائے گا کہ ۔

آزمودم عقل دور اندیش را　　　　بعد ازاں دیوانہ سازم خویش را

ترجمہ: عقل دور اندیش کو بارہا آزمایا اس کے بعد اپنے کو دیوانہ بنایا۔

یعنی جب عقل سے کام نہ چلا تو اپنے کو دیوانہ بنا دیا یہ مطلب نہیں کہ عقل سے بالکل کام نہیں لیا کیونکہ یہ بھی تو عقل ہی کا کام تھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ عقل سے کام لینے میں غلو نہیں کیا۔

کفر طریقت

اسی کو کہا ہے۔

فکر خود ورائے خود در عالم رندی نیست　　　کفر است دریں مذہب خود بینی وخود رائی

ترجمہ (اپنی رائے اور فکر کو راہ سلوک میں کچھ دخل نہیں ہے اس طریق میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے۔

تکیہ بر تقویٰ ودانش در طریقت کافری است　　　راہر وگر صد ہنر دارد توکل بایدش

ترجمہ: طریقت میں عقل وتقویٰ پر بھروسہ کرنا کفر ہے راہ سلوک طے کرنے والا اگر سینکڑوں ہنر جانتا ہو پھر بھی اس کو توکل یعنی اپنے کو اہل اللہ کے سپرد کرنا چاہیے۔

توکل کے معنی سپردن خود بخدا۔ (اپنے کو خدائے تعالیٰ کے سپرد کرنا) ہیں اور اپنے کو اہل اللہ کے سپرد کرنا یہ بھی خدا ہی کے سپرد کرنا ہے۔ پس اپنے کو اہل اللہ کے سپرد کر دینا چاہیے اپنی عقل ورائے سے کام نہیں چل سکتا کیونکہ یہ طریق وصول فن ہی دوسرا ہے۔ اگر کوئی محاسب اعلیٰ درجہ کا دریا میں قدم رکھے تو وہاں اس کی محاسبی کیا کام آ سکتی ہے۔ وہاں تو غواصی (تیراکی) کی ضرورت ہے۔

بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست　　　آنجا جز آنکہ جاں بسپارند چارہ نیست

ترجمہ:۔ دریائے عشق ایسا دریا ہے کہ اس کا کوئی کنارہ نہیں ہے اس جگہ جان سونپنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہاں جان سپردن کے معنی ہلاک نمودن (ہلاک کرنا) کے نہیں ہیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ جان رابدست کسے سپردن تا از ہلاک محفوظ ماند (جان کو کسی کے ہاتھ میں دینا تا کہ ہلاکت سے محفوظ رہے) اگر تم نے اپنے کو کشتی والے کے سپرد نہ کیا تو اس بنئے کی سی مثال ہوگی جو ایک بہلی پر مع اہل و عیال سفر کو چلا راستہ میں ایک دریا پڑا آپ نے بہلی کنارے رکوا دی اور خود دریا کے پانی کو بانس سے ناپنے لگے تو پانی کہیں پر گھٹنوں گھٹنوں تھا کہیں پر کمر کمر کہیں آدمی ڈوباؤ کہیں دو آدمی ڈوباؤ کہیں اس سے کم اور کہیں اس سے زیادہ' آپ نے سلیٹ پنسل لے کر حساب لگا کر پانی کی اوسط نکالی کہ کمر کمر ہے۔ اس میں سے بہلی جا سکتی ہے۔ آپ نے بہلیان سے کہا کہ بہلی لے چل۔ اب جو بیچ میں بہلی پہنچی تو لگی غوطے کھانے۔ سمجھے کہ حساب میں غلطی ہوگئی۔ جھٹ نکال کر پھر دیکھا تو حساب صحیح تھا کہنے لگے "لیکھا جوں کا توں' کنبہ ڈوبا کیوں" حضرت خوب سمجھ لو کہ سلوک میں اپنی رائے سے دریا میں بہلی کو ڈالنا اور اپنے کو ہلاک کرنا ہے۔ ہر جگہ اسی ہنر کی ضرورت ہے جو اس جگہ کے موافق ہو۔

ضرورت تقلید

مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک نحوی کشتی میں سوار ہوئے فن میں ایسے کامل نہ تھے مگر چھچھورپن کا جوش تھا۔ جب تک آدمی کامل نہیں ہوتا تو چھچھورپن کا جوش ہوتا ہے چنانچہ ایک اور نحوی نماز پڑھ رہے تھے چند عورتیں آئیں اور انہوں نے کہا السلام علیکم۔ انہوں نے کچھ خیال نہ کیا اور عادت کے موافق جواب میں وعلیکم السلام کہا اور نماز میں مشغول ہو گئے۔ نماز پڑھنے میں خیال آیا کہ میں اتنا بڑا نحوی مشہور ہوں مجھ سے ایسی صریح غلطی ہوئی اس کی تلافی کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی۔ نیت توڑ کر ان عورتوں کے پیچھے دوڑے اور ان کے پاس پہنچ کر کہنے لگے وعلیکن السلام وعلیکن السلام۔ یوں تو چاہے ان عورتوں نے خیال نہ کیا ہو مگر ان کے بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہونے سے ضرور خیال کیا ہوگا یہی چھچھوراپن ہے۔

خیر وہ نحوی کشتی میں سوار ہوئے تو ملاح سے کہنے لگے تمہیں کچھ نحو بھی آتی ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے کہا افسوس تم نے اپنی آدھی عمر کھوئی۔ جب کشتی چلی تو اتفاق سے ایک گرداب (بھنور) میں آ گئی۔ ملاح نے پوچھا حضرت آپ کچھ تیرنا بھی جانتے ہیں۔ انہوں نے کہا نہیں ملاح نے کہا افسوس آپ نے اپنی ساری عمر کھوئی۔ کشتی گرداب میں ہے اس کے ساتھ آپ بھی ڈوبیں گے میں تو تیرتا ہوا نکل جاؤں گا۔ یہاں نحو کام نہیں دے سکتی۔ یہاں محو کی ضرورت ہے۔ اگر تم بھی میری طرح فنافی البحر (دریا میں فنا) ہوتے تو دریا تم کو نہ ڈبوتا۔ تو ہر جگہ اپنی تحقیق کام نہیں آتی۔ بلکہ دوسرے کی تقلید کی ضرورت ہے۔

ہم اتنا پڑھ چکے ہیں بہت سی کتابیں دیکھ چکے ہیں مگر ہمیں اب تک نہیں معلوم کہ ربیع میں کیا بوتے ہیں اور خریف میں کیا بوتے ہیں۔ یہاں ہمارا علم اور ہماری تحقیق کام نہیں دے سکتی۔ بلکہ یہاں جاہل کاشتکاروں کی تقلید کام آ سکتی ہے اور اپنی تحقیق کے بھروسے اناج بونے لگیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مشقت بھی ہوگی اناج بھی جائے گا اور کچھ بھی ہاتھ نہ لگے گا۔ بہر حال ہر فن کا اس کے جاننے والوں کو امام بناؤ اور انہیں کی تقلید کرو۔ جب تقلید کرو گے تو تعجیل بھی نہ ہوگی کہ ہمیں پانچ دن ذکر کرتے ہوئے اب تک احوال طاری نہیں۔ نہ کچھ کیفیات وارد ہوئیں اور دس دن گزر گئے ابھی تک ثمرات حاصل نہیں ہوئے کیونکہ وہ رہبر تعجیل سے روکے گا اور اس کی تقلید کرنا پڑے گی۔

ایک مرتبہ ہم پر بھی وسوسہ غالب ہوا کہ کیا بات ہے مقصود جلدی سے کیوں نہیں حاصل ہو

جاتا خدا کو ہماری طلب کا علم بھی ہے ہم پر رحمت بھی ہے ہم کو مقصود تک پہنچا دینے کی قدرت بھی ہے باوجود ان دواعی کے پھر کیوں دیر لگتی ہے۔ اسی پریشانی میں مثنوی شریف جو کھول کر دیکھی تو سر صفحہ پر یہ شعر نکلے یہ بھی نہیں کہ دو چار ورق الٹنا پڑے ہوں۔

چارہ مے جوید پئے من درد تو　　　　مے شنودم دوش آہ سرد تو

ترجمہ:۔ ترا درد میرے وصال کی چارہ جوئی کر رہا تھا اور کل گذشتہ رات میں تیری آہ سرد کو بھی سنتا تھا۔)

اس میں اس کے درد و طلب کو بھی مان لیا اور علم اور رحمت کو بھی مان لیا

مے توانم ہم کہ بے ایں انتظار　　　　راہ نمایم دادہم راہ گزار

اس میں یہ بھی مان لیا کہ مجھے قدرت بھی ہے کہ بے انتظار پہنچا دوں۔

تا ازیں طوفان دوراں وارہی　　　　برسر گنج وصالم پانہی

ترجمہ: تا کہ رنج وغم کے طوفان سے چھٹکارا پا کر میرے وصال میں کامیاب ہو)

لیک شیرینی و لذات مقر　　　　ہست براندازۂ گنج سفر

ترجمہ: لیکن وطن کا لطف یا وصل کی لذت مجاہدہ رنج والم برداشت کرنے پر ہے۔ حاصل جواب کا یہ ہے کہ تجھ میں طلب بھی ہے ہم میں رحمت بھی ہے۔ علم بھی ہے قدرت بھی ہے جس کے مجموعہ سے شبہ پیدا ہو لیکن اس سب کے ساتھ حکمت بھی ہے یہی جواب ہے۔

آنکہ از فرزند و خویشاں برخوری　　　　کز غریبی رنج و محنتہا بری

یعنی سفر میں جتنی زحمت ہوگی اسی قدر وطن کی قدر ہوگی۔ ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میاں پانی تو نعمت ہے ہی پیاس بھی نعمت ہے کیونکہ اسی سے پانی کی لذت ہے اگر بے پیاس پانی پیو تو ناگوار ہوگا۔

حدیث شریف میں ہے کہ جنت جب خالی رہ جائے گی تو حق تعالیٰ سے عرض کرے گی کہ آپ نے مجھے بھرنے کا وعدہ کیا تھا۔ حق تعالیٰ اپنا وعدہ پورا کرنے کے لئے اسی وقت ایک مخلوق پیدا کر کے اس سے جنت کو بھر دے گا۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے اس قوم کو جنت کا اتنا مزا نہیں آئے گا جتنا ہمیں آئے گا۔ کیونکہ انہوں نے کبھی تکلیف نہیں اٹھائی اور ہم دنیا کی مصیبتیں جھیل چکیں گے۔ اس لئے ہمیں اس راحت کی پوری پوری قدر ہوگی۔ سچ ہے لذت انگور میوہ داند

نہ خداوند میوہ (انگور کی لذت میوہ جانتا ہے نہ مالک میوہ) مولانا فیض الحسن صاحبؒ کو دہلی کے ایک شاہزادہ نے اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھلایا۔ اس کے بعد مولانا سے داد چاہی۔ مولانا نے فرمایا کہ ایک مرتبہ کے کھانے سے کیونکر اندازہ ہوسکتا ہے کہ کیسا ہے ممکن ہے کہ اپنی نوع کے لحاظ سے اچھا ہو۔ ممکن کہ برا ہو۔ کئی بار پکا کر کھلاؤ تو اندازہ ہوسکتا ہے۔ واقعی

ع وبضدها تتبين الاشياء

(چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں) اسی طرح سالک جب کسی مقام پر مشقت کے بعد پہنچتا ہے تو اس کی قدر ہوتی ہے اور آنکھیں کھلتی ہیں اور بزبان حال یہ قال کہتا ہے۔

دوش از وقت سحر از غصہ نجاتم دادند　　　　واندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

ترجمہ: کل رات صبح کے وقت غصہ وغم سے مجھ کو نجات دی شب کی ظلمت میں مجھ کو آب حیات بخشی)

اور پھر اس وقت پیر کی بھی قدر ہوگی اور کہے گا۔

کیمیائیست عجیب بندگی پیر مغاں　　　　خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند

ترجمہ: پیر کامل کی اطاعت عجیب کیمیا ہے اس کے قدموں میں رہا اتنے درجات پائے۔

اور یہ درجات تو شروع ہی میں مل جاتے ہیں مگر اطلاع نہیں ہوتی۔ خلاصہ یہ کہ ذکر و شغل کے بعد تعجیل نفع کا انتظار نہ کرنا چاہیے۔ اسی طرح اگر ایک مرتبہ کے وعظ سے نفع نہ محسوس ہو تو اسے بیکار نہ سمجھنا چاہیے۔ الحاصل یہ تقریر تو اس کو مقتضی ہے کہ اگر کسی مکرر مضمون کا بھی بیان کروں تو محل شبہ نہ ہونا چاہیے۔ مگر میں ان شاء اللہ ایک نئی بات بیان کروں گا۔ بیان کئے ہوئے مضمون کو مکرر نہیں بیان کروں گا۔ اور نئی باعتبار اپنی ہیئت ترکیبیہ کے ہوگی ورنہ فی نفسہ تمام مضامین پرانے ہیں اس اعتبار سے کہ کتاب وسنت ہی سے مستنبط ہوتے ہیں لیکن تاہم اپنی ہیئت ترکیبیہ کے اعتبار سے نیا ہوگا۔ پس اس مضمون کے فرسودہ ہونے کا شبہ بھی جاتا رہا۔

قوۃ علم وعمل

اور واقع میں تو وہ فرسودہ کسی حالت میں نہیں ہوتا۔ بلکہ جس قدر اس کی کہنگی بڑھتی جاتی ہے بجائے فرسودگی وضعف کے اس میں جدت وحدت بھی بڑھتی جاتی ہے جس کی ایسی مثال ہے۔

خود قوی تر مے شود خمر کہن　　　　خاصہ آن خمرے کہ باشد من لدن

(پرانی شراب میں خود تیزی بڑھتی جاتی ہے خاص کر وہ شراب جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے

عطا ہوئی ہو۔) شراب جوں جوں پرانی ہوتی جاتی ہے تیزی بڑھتی جاتی ہے۔اسی طرح اس خمر لدنی کا پینے والا بھی کما قیل۔

ہرچند پیر و خستہ و بس ناتواں شدم　　　ہرگاہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

ترجمہ: ہرچند بوڑھا اور بہت ناتواں ہوگیا ہوں جس وقت تیرے چہرہ پر نظر ڈالتا ہوں جوان ہوجاتا ہوں۔

یہاں پرانا ہونے سے فتور و ملال کچھ نہیں آتا۔ حضرت حاجی صاحبؒ باوجود ضعف کے جب حقائق ومعارف بیان فرماتے اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے اور جب بیان فرما چکتے تو ضعف سے آہ آہ کرتے تھے۔ آخر یہ کیا چیز تھی جو تھوڑی دیر کے لئے تو قوت پیدا کردیتی تھی وہ یہی فرسودہ (پرانے) مضامین تھے۔اسی طرح علوم میں تو ہماری بھی یہی حالت ہوجاتی ہے مگر اعمال میں نہیں ہوتی۔ وہاں اعمال میں بھی یہ حالت تھی کہ تراویح میں ایک شب کے اندر پورا پورا قرآن کھڑے کھڑے سنا ہے۔ کچھ عجیب بات تھی۔ یوں تو یہ حالت تھی کہ بات کرنا بھی ضعف کی وجہ سے دشوار تھا مگر ادھر نیت باندھی اور اللہ اکبر کہا نہ معلوم پھر وہ ضعف کہاں چلا جاتا تھا۔ حضرت اکیلے اخیر تک کھڑے رہتے تھے اور حافظ برابر بدلتے رہتے تھے۔ بات یہ ہے کہ ان حضرات کو اعمال میں تازگی اور شگفتگی ہوتی تھی اور ہمیں اعمال میں تو لطف آتا نہیں مگر علمی باتوں میں مزہ ہوتا ہے اس لئے اس میں ہم میں بھی قوت آجاتی ہے۔ بہرحال خدائی شراب گھستی نہیں فرسودہ نہیں ہوتی اور تعجب ہے کہ پرانا روپیہ تو کالا ہونے کی وجہ سے کبھی نہیں چھوڑتے ہو اور اللہ کے مضامین پرانے ہونے کی وجہ سے چھوڑتے ہو کیا اس پرانے روپیہ کے برابر بھی نہیں؟

علوم وجدیہ

خیر یہاں ظاہراً بھی یہ شبہ نہ کرو میں ایک نیا ہی مضمون بیان کروں گا جو اس آیت سے مستنبط ہوتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا' جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔ (اس توقع پر کہ تم متقی بن جاؤ) اس تشبیہ میں اس کی رعایت کی ہے کہ سہل ہوجائے کیونکہ ایک تو سابقت میں رغبت ہوتی ہے اور ایک مرتبہ جوش ہوتا ہے کہ ہم بھی کریں۔ دوسرے یہ کہ جب ہماری شان

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ (تم بہتر امت ہو) ہے تو غیرت بھی ہوتی ہے کہ ہم باوجود افضل ہونے کے حق تعالیٰ کا وہ کام نہ کریں۔ جو ہم سے مفضول (گھٹیا لوگ) کر گئے تو گویا پہلی قومیں ایک ایسی چیز لے گئیں جو تمہیں اب تک نہیں دی گئی۔ انہیں ہم نے ایک بائیسکل دی تھی جس سے وہ بہت جلد اپنا راستہ قطع کر سکتے تھے۔ تمہیں بھی دیدی تا کہ تم ان سے پیچھے نہ رہ جاؤ اسی لئے فرمایا كُتِبَ عَلَيْكُمْ (تم پر فرض کیا گیا) یہ خدا کی بڑی رحمت ہے کہ فرض کر دیا جس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی شفیق باپ اپنے بیٹے کو زبردستی مسہل پلائے واقعی بڑی رحمت ہے کہ فرض کر دیا کیونکہ جانتے تھے کہ بغیر اس کے نہیں کریں گے ہمارے والد صاحب نے بچپن میں مجھے مسہل پلانا چاہا میں نے انکار کیا مجھ سے کہا کہ پی لو تو ایک روپیہ دیں گے میں جانتا تھا کہ اب اگر انکار کروں گا تو دھمکی دے کر پلائیں گے پھر روپیہ بھی جائے گا اور پینا پڑے گا اس لئے پی لیا۔

حق تعالیٰ نے بھی ہماری ہی ضرورت اور ہماری ہی مصلحت کے لئے مسہل تجویز فرمایا۔ اور اس کے پی لینے پر انعام کا وعدہ فرمایا اور نہ پینے پر دھمکی بھی دی۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے اس عنایت وشفقت کا۔ واللہ وجد کے قابل ہے۔ لوگ ستار کی تن تن اور سارنگی کی روں روں پر کودتے ناچتے ہیں افسوس انہیں حس نہیں۔ وجد کی چیزیں یہ علوم ہیں۔

گرمی اور رمضان

بہر حال خدا نے ہم پر روزہ اس لئے فرض کیا تا کہ ہم اسے کریں اور لوگوں کی یہ حالت ہے کہ کہتے ہیں کہ اب کے بڑی شدت کی گرمی ہے روزہ کیسے رکھا جائے گا نہایت تپش وحبس ہے دن کیسے کٹے گا۔ خدا سے کیسے بدگمانی ہے۔ کیا خدا نے تمہیں ایسی بات کا حکم دیا ہے جو تم سے نہ ہو سکے گا۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کی طاقت واختیار میں ہو) وہاں تو یہ رحمت ہے کہ اگر بارش وابر نہ ہوگا تو صبر ہوگا۔ بہر حال تمہیں اس کی کیا فکر۔ جب وہ اپنا کام لینا چاہیں گے تو اس کے لئے ویسے ہی سامان بھی پیدا کر دیں گے۔ گو تمہاری بدگمانی کا مقتضا تو یہی تھا کہ خوب تپش ہوتی اور شدت سے گرمی پڑتی کیونکہ حدیث قدسی میں ہے انا عند ظن عبدی بی (میں اپنے بندے کے گمان کے موافق ہوں) خدا کے ساتھ جیسا گمان کر لو خدا ویسا ہی کر دیتا ہے۔ مگر کیا رحمت ہے سبحان اللہ کہ رمضان شروع ہوتے ہی نہ گرمی رہی نہ وہ پیاس رہی نہ وہ حبس رہا نہ وہ تپش رہی۔ اور ایک دن پیشتر ہی اس قدر گرمی تھی کہ بغیر پنکھے کے قرار نہ تھا اور بغیر بار بار

پانی پے چین نہ تھا (ابھی پانی پی کے بیٹھے اور ابھی پھر پیاس موجود سبحان اللہ رمضان کی بھی بڑی عجیب برکت ہے کہ شروع ہوتے ہی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں۔ کونین کیسی مثال ہوگئی ہے کہ ہے تو نہایت کڑوی مگر اس کی گولی پر شکر لپیٹ لی گئی ہے کہ کونین معلوم نہ ہو اور اس کا نفع حاصل ہو جائے۔ اگر کڑوی رکھی جاتی تب بھی کھانا پڑتی مگر یہ نہ سمجھ لینا کہ جب تیز ہوائیں چلیں گی تو روزہ رکھیں گے۔ نہیں تو نہیں رکھیں گے۔ یہ تو تمہیں راہ پر لگا دیا اب برابر رکھتے رہو اگر ہوا نہ بھی چلے تب بھی رحمت ہے تا کہ ضراء (سختی) میں سراء (راحت) کی قدر رہو اور صبر بھی ہو۔

اس کو یوں سمجھو کہ بعضے کھانے سرد اچھے ہوتے ہیں مثلاً فیرینی وغیرہ اور بعضے کھانے گرم اچھے ہوتے ہیں مثلاً پلاؤ قورمہ وغیرہ۔ بہرحال جو کچھ عطا کریں سب رحمت ہے۔ خواہ وہ سردی ہو یا گرمی۔

تراویح اور پنکھا

مجھ سے سوال کیا گیا کہ تراویح کے اندر گرمی بہت لگتی ہے پنکھا باندھنا جائز ہے یا نہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ابتداء عمر میں اسے ناجائز لکھا تھا۔ مگر اب لوگوں کی حالت پر نظر کر کے لکھ دیتا ہوں کہ جائز ہے۔ مگر خلاف ادب ہے کیونکہ اس کی تو ایسی ہی مثال ہے کہ صاحب کلکٹر کے اجلاس پر کھڑے ہو کر اپنی عرضی سنا رہے ہیں اور پیچھے سے نوکر کھڑا پنکھا جھل رہا ہے۔ اگر سررشتہ دار منع کرے اور یہ پوچھے کہ کیوں صاحب آپ منع کیوں کرتے ہیں کیا خلاف قانون ہے۔ وہ یہی کہے گا کہ خلاف قانون تو نہیں ہے مگر خلاف ادب ہے۔ اسی طرح نماز کو بھی حق تعالیٰ کے دربار کی حاضری خاص تجویز کیا گیا ہے اور حاضری کا حق یہ ہے کہ

حضوری گر ہمی خواہی ازو غافل مشو حافظ متی ماتلق من تہوی دع الدنیا واہملہا

(اگر محبوب حقیقی کے دربار کی حضوری اور قرب چاہتے ہو تو اس سے غافل مت ہو بلکہ اس کی طرف متوجہ رہو اور جب اپنے محبوب سے ملاقات کرو یعنی عبادت میں اس کی مشغول ہو تو دنیا و مافیہا کی طرف التفات مت کیا کرو)

تو جب محبوب کے سامنے کھڑے ہو گئے تو پنکھا کیسا وہاں تو اپنا بھی ہوش نہ رہنا چاہیے اور اگر اس طرح سمجھ میں نہ آوے تو یوں سمجھو کہ تم سے پہلے بہت سے لوگ گزرے جن میں امراء بھی تھے رؤسا بھی تھے۔ نواب بھی تھے بادشاہ بھی تھے۔ مگر ان کی بنوائی ہوئی مساجد میں کہیں پنکھے کا نشان نہیں۔ شاہجہاں نے اتنی بڑی دہلی کی مسجد تعمیر کرائی اور خود بھی نماز کو آتے تھے مگر کبھی پنکھا

نہیں لگوایا۔ عالمگیر نے ہزاروں مسجدیں بنوائیں اور خود بھی جماعت کے پابند تھے مگر کسی مسجد میں کبھی پنکھے کا انتظام نہیں کیا ورنہ ان کی مساجد میں ضرور پنکھے کے نشانات پائے جاتے۔ پھر پنکھے لگانا اعلیٰ درجہ کی صورت تکبر کی ہے کہ جہاں بادشاہ متواضع ہوئے یہ وہاں بھی نہیں ہوتے۔ یہ مسجد سنا ہے کہ عہد عالمگیر کی ہے۔ اس میں پنکھے تو پنکھے کہیں ہوا آنے کے لئے جھروکے تک نہیں۔ اب تو میں خود کہہ دیتا ہوں کہ بھئی مسجد بناؤ تو اس میں جھروکے اور کھڑکیاں رکھنا تا کہ نمازیوں کو راحت رہے اور مسجد میں آنے سے نفس حیلے بہانے نہ کرے۔ جیسا کانپور میں ایک بھولے بھالے شخص بیچارے بھوپال سے آئے تھے کہنے لگے اب کے جمعہ کی نماز ہم پڑھائیں گے۔ اور وہ خطبہ پڑھیں گے جو اول قدوم مدینہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا تھا۔ چنانچہ جمعہ آیا۔ نماز پڑھانے کھڑے ہوئے اول تو وہ خطبہ ہی ایسے طویل لہجہ سے پڑھا کہ لوگ اس میں اکتا گئے تھے۔ اس پر غضب یہ کہ پہلی رکعت میں سورۂ قاف شروع کر دی گرمی بہت تھی ایک شخص بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ایک شخص کو قے آنے لگی اور ایک شخص جس کو زبردستی کر کے کچھ لوگ اتفاق سے اسی روز مسجد میں نماز پڑھنے لائے تھے نیت توڑی اور یہ کہتا ہوا کہ ہم اسی سے تو نماز نہیں پڑھتے یہ جا اور وہ جا اور شہر بھر میں ہلچل مچ گئی کہ اگر وہی نماز پڑھائیں گے تو ہم کہیں اور نماز پڑھ لیں گے۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ جھروکے رکھو تا کہ ہوا آتی رہے مگر اس ہوا میں اور اس پنکھے میں فرق ہے کیونکہ یہ قدرتی پنکھا ہے جو عبدیت کے منافی نہیں ہے۔ بخلاف اس کے کہ اس میں مخدومیت کی شان پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ کوئی خادم جھلتا ہے البتہ بجلی کے پنکھے میں مجھے اب تک تردد ہے اور غالباً وہ بھی خلاف ادب معلوم ہوتا ہے۔ کہ شروع حرکت تو انسان کے فعل سے ہوتی ہے اور اگر بہت ہی جی چاہتا ہے تو خیر بجلی کا پنکھا لگاؤ البتہ ہے بڑی خطرناک چیز۔ اگر ٹوٹ جاتا ہے تو کتنوں ہی کو زخمی کر دیتا ہے۔ اچھا ہوا کہ یہاں نہیں ہے میں تو بمبئی کلکتہ بھی گیا تو پنکھے کے محاذاۃ (مقابل) سے بچ کر مسجد میں کھڑا ہوتا تھا کہ اگر امام کے محاذاۃ (مقابلہ) میں کھڑے ہونے کا ثواب نہ ملے گا تو اس کے ٹوٹنے کے عذاب سے تو بچا رہوں گا۔ اجی سیدھی بات تو یہی ہے کہ بلا اہتمام پنکھے کی نیت باندھ کر کھڑے ہو جائیں۔ واقعی جسے ذرا بھی حق تعالیٰ کی محبت کا چسکہ ہوا سے سردی گرمی کی کیا پرواہ ۔

از محبت تلخہا شیریں شود

ترجمہ: محبت سے تلخیاں بھی گوارا ہو جاتی ہیں۔

اور اہل محبت کی یہ حالت ہوتی ہے ۔

خوشا وقت شوریدگان غمش اگر ریش بنیند وگو مرہمش

ترجمہ: اس کے غم کے پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگر زخم دیکھتے ہیں اور اس پر مرہم رکھتے ہیں۔

گدایا نے از بادشاہی نفور بامیدش اندر گدائی صبور

ترجمہ: ایسے فقیر کہ بادشاہی سے نفرت کرنے والے اس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے

دمادم شراب الم درکشند وگر تلخ بنیند دم درکشند

ترجمہ: ہردم رنج کی شراب پیتے ہیں اور جب اس میں رنج کی کڑواہٹ دیکھتے ہیں تو خاموش رہتے ہیں۔ بس نماز میں تھوڑی مشقت اٹھالی ادھر السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا اور پنکھا لے لیا۔ غرض خدا کا دونوں طرح مشاہدہ کرلیا۔ شان جلالی میں بھی شان جمالی میں بھی۔

از دست ہجر یار شکایت نمے کنم گر نیست غیبتے نہ دہد لذتے حضور

ترجمہ: محبوب سے جدائی کی شکایت نہیں اگر جدائی نہ ہوتی تو وصل میں لطف ولذت نہ ہوتی۔ حضرت اولیاء اللہ کی تو شان یہ ہوتی ہے کہ اگر انہیں تکلیف ہوتی ہے تو وہ اس میں بھی شکر کرتے ہیں کہ اس سے زیادہ تکلیف نہیں ہوئی۔ مولانا فرماتے ہیں۔

چونکہ قبض آمد تو دروے بسط بیں تازہ باش وچیں میفگن برجبیں

ترجمہ: جب قبض پیش آئے تو اس میں بسط کا ملاحظہ کرو خوش وخرم رہو۔ پیشانی پر بل نہ ڈالو۔ وہ قبض سے نہیں گھبراتے کیونکہ قبض عین بسط ہے۔ غرض یہ سب خدا کی رحمت ہے۔ اگر کوئی طبیب کہہ دے کہ آج پانی نہ پینا ورنہ استسقاء ہوجائے گا اس نے تو ایک ہی دن کو کہا تھا مگر یہ احتیاط کے مارے دودن چھوڑ دیں گے۔ افسوس طبیب کے کہے کی یہ وقعت اور خدا کے ارشاد کی یہ قدر۔ خدا نے علاج میں جو سہولت برتی ہے ایسا تو کوئی طبیب کر بھی نہیں سکتا۔ طبیب اگر کسی چیز سے پرہیز کراتا ہے تو یہ نہیں کرسکتا کہ عین ضرورت کے وقت پرہیز کرائے۔ اور ضرورت سے پہلے نہ کرائے بلکہ وہ حفظ ماتقدم کے لئے چھ مہینے پہلے سے پرہیز شروع کرادیتے ہیں اور پھر بعد تک جاری رکھتے ہیں یہاں یہ ہے کہ جب عین ضرر کا وقت ہوا سی وقت حکم دے دیا پرہیز کا۔

پھراس سے بڑھ کر لطف یہ کہ زمانہ پرہیز میں بد پرہیزی کی اجازت دے دی یعنی رمضان کی راتوں میں ان ہی مفطرات کی اجازت دے دی کہ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (تم رات تک

روزہ کو پورا کیا کرو) اور اس چیز کی خاصیت ہی بدل دی صرف اتنی دیر کے لئے اب وہ مضر نہیں ہو سکتی۔ حکمائے یونان کے باپ سے بھی ایسا نہیں ہوسکتا کہ مریض کی مصلحت کی رعایت کر کے اس چیز کی خاصیت بدل دیں پھر جب تک اس کی خاصیت بدلی رہی اس وقت تو اس کے استعمال کی اجازت دے دی اور جب اس میں باذن (اجازت) حق اصلی خاصیت عود کر آئی یعنی دن قریب ہوا تو پھر روک دیا اور صوموا (روزہ رکھو) فرمادیا کہ اب نہ کھاؤ نہ پیو۔

ادراک اوامر

شاید کوئی یہ شبہ کرے کہ قرآن مجید نازل ہوئے سینکڑوں برس ہو گئے جو کچھ حکم ہونا تھا ایک بار ہو چکا روز روز صوموا (تم روزہ رکھو) کہا جاتا ہے فقہاء حقیقت میں بڑے عارف تھے وہ اس کی حقیقت کو خوب سمجھے۔ وہ کہتے ہیں کہ صوم کا سبب وجوب شہود شہر (مہینہ کا حاضر ہونا) ہے لہذا جب شہود شہر ہوگا تو تقدیراً ہمیں امر ہوگا کہ صوموا (تم روزہ رکھو) جس طرح جب ظہر کا وقت ہو گا تو ہمیں تقدیراً امر ہوگا کہ صلوا (تم نماز پڑھو) کیونکہ وقت ظہر وجوب ہے ہاں حج کا سبب بیت اللہ ہے اور وہ چونکہ مکرر نہیں اس لئے حج بھی مکرر نہیں اور یہاں چونکہ یہ اسباب مکرر ہوتے رہتے ہیں اس لئے ان کے مسببات بھی مکرر ہوں گے۔ مگر تمہیں ادراک نہیں ہوتا۔ ان کے جیسے کان پیدا کرو تو تمہیں بھی ہر ظہر کے وقت صلوا (نماز پڑھو) اور رمضان کے ہر دن میں صوموا سنائی دینے لگے۔ اسی کو عارف رومیؒ فرماتے ہیں۔

پنبہ اندر گوش حس دوں کنید تا خطاب ارجعی رابشنوید

ترجمہ: ان ظاہری کانوں میں جو ادنیٰ درجہ کے حواس سے ہیں روئی رکھ کر گوش باطن کو درست کرو جب اس قابل ہوگے کہ ارجعی کا خطاب سنو)

اور عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

الست از ازل ہمچناں شان بگوش بفریاد قالوا بلےٰ در خروش

ترجمہ: الست بربکم کی ندا ان عشاق صادق کے کانوں میں ہنوز ویسی ہی ہے قالوا بلیٰ کی فریاد سے شور کر رہے ہیں۔

کہ جو اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) ناز ل میں کہا گیا تھا وہ منقطع نہیں ہوا اسی طرح وہ صلوا و صوموا (نماز پڑھو اور روزہ رکھو) منقطع نہیں ہوا آج بھی موجود ہے اور

برابر رہے گا۔ اہل ادراک ہی اس کو ادراک کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ جب یہ ثابت ہو گیا وہ شبہ جاتا رہا کہ کہاں برابر حکم پرہیز کا ہوتا ہے۔

محکمہ نفع وضرر

الغرض حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ کس قدر شفقت ہے کہ پرہیز کرایا مگر تھوڑی دیر کہ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (تم رات تک روزہ کو پورا کیا کرو) اس سہولت پر طبیعت اس لئے قادر نہیں کہ وہ مظہر نفع وضرر ہے اور حق تعالیٰ محدث ہے۔ نفع وضرر کا کہ جب تک چاہا ایک شئے کو نافع رکھا اور جب چاہا اسے ضار بنا دیا۔ حق تعالیٰ کو کس قدر تمہاری رعایت منظور ہے کہ ایک محکمہ نفع وضرر کا قائم کیا کہ ایک ہی شے رات بھر نافع رہتی ہے اور صبح کو ضار ہو جاتی ہے دن بھر مضر رہتی ہے رات سے پھر مفید ہو جاتی ہے ایک یہ رحمت دوسری یہ شفقت کہ جب مضر ہوا تو اس سے بچنا فرض کر دیا اور یہی نکتہ ہے كُتِبَ عَلَيْكُمْ میں آگے فرماتے ہیں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ روزہ تم پر فرض کیوں ہوا اس امید پر کہ تم متقی ہو جاؤ۔

مقصود روزہ

اس ترجمہ سے یہ اشکال رفع ہو گیا ہوگا کہ لعل تو تردد و ترجی کے لئے ہے جب باری تعالیٰ کو تمام اشیاء کا علم ہے تو تردد کا کلمہ کیوں استعمال کیا۔ مطلب یہ ہے کہ روزہ فرض ہوا ہے تمہاری اس امید پر کہ تم متقی ہو جاؤ گے یعنی روزہ رکھ کر یہ امید رکھو کہ متقی ہو جاؤ گے۔ یہاں بھی امید وبیم میں رکھا کہ تمہیں روزہ رکھ کر متقی بن جانے کی امید رکھنا چاہیے یقین نہ رکھنا چاہیے یہ بھی خدا کا لطف ہے کیونکہ اگر یہ فرما دیتے کہ تم متقی ہونے کا یقین رکھو تو روزہ رکھنے کے بعد تو متقی ہونے کا ناز ہی ہو جاتا جو بالکل خدا سے بعید کر دیتا کیونکہ ناز و نیاز جمع نہیں ہوتے جیسے صحابہ کے بارے میں ارشاد ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا وعدہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے ان سے مغفرت اور ثواب عظیم کا (یہاں بھی منھم فرمایا اگر منھم نہ فرماتے تو اس لفظ سے جو نیاز اب پیدا ہوتا ہے۔ وہ پیدا نہ ہوتا۔ ایک ذرا سا لفظ بڑھایا اور سارے جہان کو ہلا دیا۔

غلبۂ نیاز

اسی واسطے بزرگوں کو ناز پسند نہیں نیاز پسند ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اس قدر نیاز کا

غلبہ تھا کہ باوجودیکہ **عمر فی الجنة (مسند احمد ۱:۱۸۷، تاریخ تهذیب دمشق لابن عساکر ۶:۱۰۲)** (عمر جنت میں ہے) فرمادیا گیا مگر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے جو صاحب سر (راز) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشہور تھے پوچھتے ہیں کہ سچ بتاؤ کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے منافقین میں تو نہیں بتایا۔ سچ ہے۔

عشق است و ہزار بدگمانی باسایہ ترا نمی پسندم

(عشق میں ہزاروں بدگمانیاں ہوتی ہیں اس لئے محبوب کے سایہ کے ساتھ رہنا بھی عشاق پسند نہیں کرتے)

جو مرتا تھا تو اس کے جنازے پر جب شریک ہوتے جب یہ دیکھ لیتے کہ حذیفہؓ بھی شریک ہیں بات یہ ہے کہ محبوب کون ہے۔ اس کی شان یہ ہے لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ (جو کچھ کرتا ہے اس سے کوئی باز پرس نہیں کرسکتا اور اوروں سے باز پرس کی جاسکتی ہے) تو **منهم** اس واسطے بڑھایا کہ صحابہ کو یہ کیفیت بھی میسر ہو کیونکہ ناز والوں کو قرب نہیں ہوتا۔ قرب اہل نیاز کو ہوتا ہے اسی واسطے تمام انبیاء اہل نیاز ہوئے۔ البتہ ناقصین ناز بھی کرنے لگتے ہیں۔ سہارنپور میں ایک دفعہ شدت کی بارش ہورہی تھی۔ ایک مجذوب کہنے لگے "بس کر بس کر کیا مار ڈالے گا" یہ کہتے ہی بس فوراً بارش رک گئی۔ وہ صاحب حال تھا غیر صاحب حال کو ایسا نہ چاہیے۔

چوں نداری گرد بدخوئی مگرد ناز راوئے بباید ہمچو ورد

ترجمہ: ناز کرنے کے لئے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے جب تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے بدخوئی کے پاس بھی نہ جاؤ۔

سو یہ وہ کلمہ تھا جسے انبیاء بھی نہیں کہہ سکتے مگر دونوں کے مرتبہ میں بہت فرق ہے مجذوبوں کی تو ایک ناسمجھ چھوٹے بچے کی سی مثال ہے اگر وہ باپ کی داڑھی بھی نوچے تو نہ باپ کو ناگوار ہوتا ہے نہ عرفاً بے ادبی سمجھی جاتی ہے اور انبیاء کی سمجھدار بڑے بیٹے کی سی مثال ہے کہ اس کی مجال نہیں کہ باپ کی داڑھی میں ہاتھ ڈال سکے۔ مگر جو قرب اسے ہے اپنے باپ سے وہ اسے چھوٹے بیٹے کو ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ جوان لڑکا باپ کا مشیر ہے۔ اسی طرح مجذوب کو ہرگز وہ قرب نہیں جو سالک کو ہے۔

غرض تمام انبیاء اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جو باوجود بشارتوں کے پھر بھی چین نہیں اور یہی نکتہ ہے **منهم** کے بڑھانے میں کہ نیاز کی صورت دیکھنا چاہتے ہیں اور ناز کو پسند نہیں کرتے۔

اسی طرح یہاں بھی **لعلكم** فرمایا تاکہ کوئی خدا کو مقروض نہ سمجھنے لگے۔ اہل سنت کا یہ مذہب

ہے کہ **لایجب علی اللہ شی** (اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں مگر معتزلہ پھسل گئے اور اس کے قائل ہوئے کہ حق تعالیٰ پر واجب ہے کہ طاعت پر ثواب دے اور معصیت پر عذاب۔ ہمارے نزدیک خدا پر کچھ بھی واجب نہیں اور جہاں کہیں نصوص میں **حق علیٰ اللہ** (اللہ تعالیٰ پر حق ہے) آیا ہے اس کے معنی مشابہ حق کے ہیں یعنی حق تعالیٰ اس طور پر اسے پورا فرما دیں گے جیسے کوئی واجب کو ادا کرتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ تمام مخلوق کو دوزخ میں ڈال دیں تب بھی وہ غیر ظالم ہوں گے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ظلم ملک غیر میں تصرف کرنے کو کہتے ہیں اور یہ سب انہیں کی ملک ہیں وہ جس طرح چاہیں تصرف کریں غرض وہ جو بھی کریں حسن ہے۔

کفر ہم نسبت بخالق حکمت است وربما نسبت کنی کفر آفت است

(کفر خالق کے اعتبار سے حکمت ہے اور اگر ہماری طرف نسبت کرو تو کفر آفت ہے یعنی کفر بھی انہیں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ کیونکہ کفر کا پیدا کرنا تو حسن ہی ہے ہاں صدور اس کا قبیح ہے۔ کیونکہ کفر کے پیدا کرنے میں حکمتیں ہیں اور کفر کے صدور میں کوئی حکمت نہیں۔

درکار خانہ عشق از کفر ناگزیر است آتش کرا بسوزد گر بو لہب نباشد

ترجمہ: عشق کے کارخانہ میں کفر کا ہونا ضروری ہے۔ دوزخ میں کون جلتا اگر ابولہب نہ ہوتا۔ اگر کفر نہ ہوتا تو عالم ناقص رہ جاتا۔ جس طرح کوئی اعلیٰ درجہ کی کوٹھی ہو مگر اس میں پاخانہ کی جگہ نہ ہو تو وہ ناقص ہے۔ یہاں سے یہ بھی سمجھ لو کہ جب دوسرے کے افعال پیدا کرنے میں حکمتیں ہیں تو خود اپنے افعال میں تو بدرجہ اولیٰ اور بیشمار حکمتیں ہوں گی۔ بہرحال یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ حق تعالیٰ پر کسی کا حق نہیں۔ **لعل** بڑھایا ہے تو اب معنی یہ ہو گئے کہ تم امیدوار تقویٰ کے رہو یہ تو تمہید تھی بلاقصد طویل ہو گئی خیر اس میں بھی بہت سے ضروری اور مفید مضامین آ گئے۔

احکام اسرار

اب میں اس مضمون کو شروع کرتا ہوں جو مقصود البیان ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ اس کا مفعول محذوف ہے یا تو النار (آگ) اس کا مفعول ہوگا **المعاصی** (گناہ) مگر دونوں کا حاصل ایک ہے کیونکہ نار سے بچنے کے لئے اولاً معاصی سے بچنا ضروری ہے۔ اسی طرح معاصی سے بچ کر نار سے بچ سکتے ہیں لیکن یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ معاصی سے بچنے میں روزہ کو کیا دخل ہوا۔ اطباء

جانتے ہیں کہ اشیاء کی تاثیر دوطرح پر ہوتی ہے کوئی شئے موثر بالکیف ہوتی ہے اور کوئی شئے موثر بالخاصیت بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ تمام اشیاء موثر بالخاصیت ہی ہیں کیونکہ اگر موثر بالکیفیت ہوتیں تو ایک ہی درجہ کی تمام اشیاء ایک ہی اثر کرتیں یعنی جو اشیاء پہلے درجہ میں گرم ہیں ان سب کا ایک ہی اثر ہونا چاہیے تھا اور جو دوسرے درجہ میں سرد ہیں ان سب کا بھی ایک ہی اثر ہونا چاہیے اور جو اشیاء تیسرے درجہ میں خشک ہیں ان کا ایک اثر ہوتا اور جو چوتھے درجہ میں تر ہیں ان کا ایک اثر ہوتا ہے۔ جب ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ ایک ہی درجہ کی اشیاء اثر میں مختلف ہو جاتی ہیں تو معلوم ہوا کہ ان کی تاثیر بالخاصیت ہے اور یہ کوئی طب کے خلاف نہیں بلکہ یہ مسئلہ تو فلسفہ کا ہے اس میں کوئی امر خلاف لازم نہیں آتا سو ہم سے یہ سوال کہ معاصی سے بچنے میں روزہ کو کیا دخل۔ اس وقت ہوسکتا ہے جب ہم یہ کہیں کہ روزہ موثر بالکیفیت ہے اور اگر ہم موثر بالخاصیۃ کہیں تو یہ سوال ہی نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح جس قدر عبادات کے آثار بیان کئے گئے ہیں سب ان عبادات کے آثار بالخاصہ ہیں۔ مجھے ان لوگوں کے حال پر زیادہ افسوس ہے جو موافقین سنت ہیں اور پھر سلامت روی کو چھوڑ کر کجروی اختیار کرتے ہیں کہ ہر چیز کے حکم واسرار (حکمتیں ۱۲) اپنی طرف سے بیان کرتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ یہ طریقہ نہایت خطرناک ہے اس میں آدمی بہت گمراہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ تم نے جماعت کی یہ حکمتیں بیان کی کہ اس میں مسلمان اتفاق سے ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ آپس میں محبت بڑھتی ہے۔ فرض کرو کہ محبت واتفاق آپس میں پیدا نہ ہو یا بدون جماعت کے کسی دوسری تدبیر سے پیدا ہو جاوے تو کیا جماعت کو چھوڑ دیں گے اس شخص سے البتہ اندیشہ ہے جس نے جماعت کو اس حکمت پر مبنی کیا ہے کہ یہ چھوڑ بیٹھے گا۔ خلاصہ یہ کہ تمام احکام کا مبنیٰ حکمت تو ضرور ہے لیکن تمہاری سوچی ہوئی حکمتوں پر مبنی نہیں کیونکہ یہ سب ظنی ہیں۔ اگر کسی شخص کی سمجھ میں حکمتیں آنے لگیں تو مبارک ہے۔ مگر ان حکمتوں پر احکام کو مبنیٰ کرنا خطرناک ہے اور ان کو ظنی وتخمینی سمجھنا ضروری ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہمیں تو تمام احکام کا مبنیٰ یہ سمجھنا چاہیے کہ قال اللہ تعالیٰ (یہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے) اس میں یہ فائدہ ہے کہ اگر حکمت سمجھ میں نہ آئے گی تو یہ تو سمجھے گا کہ۔

زندہ کنی عطائے تو، ور بہ کشی فدائے تو　　دل شدہ مبتلائے تو، ہر چہ کنی رضائے تو

ترجمہ: زندہ کریں یہ آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر فدا ہوں۔ دل آپ پر مبتلا ہے جو کچھ کریں میں آپ سے راضی ہوں۔

خدا کے احکام تو ہمیں ہر صورت میں ماننا چاہئیں خواہ حکمت سمجھ میں آئے یا نہ آئے ادنیٰ سی کسی عورت پر اگر کوئی عاشق ہو جائے اور وہ کہے کہ دس دفعہ ننگے ہو کر ناچو تو یہ بیس دفعہ ناچنے پر تیار ہو جائے گا اور اس کے دل میں وسوسہ بھی نہ گزرے گا کہ اس خبط کی لم (علت) دریافت کرے۔ تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ ایک بازاری عورت کی تو اس قدر محبت اور خدا کی ذرا بھی محبت نہیں۔ خدا کے ساتھ تو یہ برتاؤ ہونا چاہیے ۔

زبان تازہ کردن باقرار تو   نینگیختن علت از کار تو

ترجمہ: آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپ کے کاموں میں علتیں نکالنے کو مانع ہے ۱۲)

اور اگر علتیں نکالو گے تو کہاں تک نکالو گے۔ خلاصہ یہ کہ اصل وجہ فرضیت صوم کی یہ ہے کہ خدا کا حکم ہے۔

تاثیر روزہ

اس کے بعد ہمیں کسی علت کے دریافت کرنے کا حق نہیں رہا مگر تبرعاً آگے خود ہی فرمایا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (اب اگر کوئی کہے صوم پر تقویٰ کیونکر مرتب ہوا تو ہم کہہ دیں گے کہ نار سے بچانا تو بواسطہ تقویٰ عن المعاصی (گناہوں سے بچنے والا) کے ہے مگر معاصی سے بچنے میں روزہ کو کیا دخل ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ روزہ کی خاصیت ہے۔ چنانچہ تجربہ کرلو اور مشاہدہ کرلو جو لوگ رمضان سے پہلے کیسے ہی فسق و فجور میں مبتلا ہوں مگر رمضان میں ضرور کمی کر دیتے ہیں۔ نماز بھی پڑھ لیتے ہیں۔ تلاوت بھی کرنے لگتے ہیں تو جتنی دیر ان عبادات میں لگے رہتے ہیں معاصی سے بچے رہتے ہیں۔ ایک جواب تو اس سوال کا یہ ہوا کہ معاصی سے بچنے میں روزہ کو کیا دخل؟ دوسرا جواب اور ایک ہے جس کی ایک تو مشہور تقریر ہے اور ایک حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے میرے قلب پر وارد کی ہے مشہور تقریر تو یہ ہے کہ جسے امام غزالیؒ وغیرہ سب نے لکھا ہے کہ روزہ سے قوت بہیمیہ گھٹ جاتی ہے کیونکہ لذات وشہوات کو چھوڑنا پڑتا ہے اور یہی چیزیں گناہ کا باعث تھیں۔ میرے قلب پر جو تقریر وارد ہوئی ہے وہ بالکل بے غبار ہے اور اس پر ایک غبار ہے وہ یہ ہے کہ شہوات اور لذات میں کیا کمی ہوئی ہم پوچھتے ہیں کہ رات کو پیٹ بھر کھانا بیوی سے مشغول ہونا جائز ہے یا ناجائز۔ اگر جائز ہے تو قوت بہیمیہ کچھ بھی نہیں گھٹی کیونکہ رات کو بہت سے لوگ اس قدر کھاتے ہیں کہ ایک دن کیا ڈیڑھ دن کی فرصت ہو جائے۔ اس تقریر پر تو روزہ کا نفع جب ہوتا کہ

دن کی طرح رات کو بھی منہ بند ہوتا اور اگر نا جائز کہو تو نص کے خلاف لازم آتا ہے۔

سو اس پر یہ غبار ہے جس کے لئے بڑے بڑے لوگوں کو ایک نئی اور بے دلیل بات کا قائل ہونا پڑا اور وہ یہ کہ رات کو بھی کم کھاوے۔ کیونکہ اگر کمی نہ کی تو غایت صوم حاصل نہ ہوگی۔ بظاہر یہ توجیہ رنگین اور اقرب ہے مگر حقیقت میں ابعد ہے کیونکہ سوال یہ ہے کہ کہیں روزہ میں تقلیل طعام کی ترغیب دی گئی ہے یا نہیں۔ اگر دی گئی ہے تو کہاں ہے۔ ہم نے تو باوجود یکہ بہت تلاش کیا کہیں نہ پایا بلکہ پایا تو اس کے خلاف۔ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ الخ۔ (کھاؤ پیو بھی اس وقت تک کہ تم کو سفید خط یعنی نور صبح (صادق) سے متمیز ہو جائے ۱۲) اور جن احادیث میں تقلیل طعام کی فضیلت آئی ہے وہ عام ہے اور روزہ کے ساتھ اس کی تخصیص نہیں ہو سکتی۔ سوال تو یہ ہے کہ روزہ کے اندر تقلیل طعام کی خصوصیت کے ساتھ کیا دلیل ہے۔ لامحالہ کہنا پڑے گا کہ نص میں ترغیب نہیں دی گئی۔ یہ محض قیاس ہے تو اب اس پر تعلیم نبوی پر شبہ ہوگا کہ اتنی بڑی بات آپ نے نہیں فرمائی۔ ہاں اس طور پر جمہور کی تقریر سے یہ شبہ رفع ہو سکتا ہے کہ کاسر (توڑنے والا ۱۲) قوت بہیمیہ کم کھانا نہیں بلکہ کاسر قوت بہیمیہ مجاہدہ یعنی ترک عادت ہے کہ جس وقت طبیعت خوگر تھی غذا سے اخلاط بنانے کی اس وقت اس کو غذا نہیں پہنچے گی تو لامحالہ قوت بہیمیہ منکسر ہوگی۔

یہ البتہ صواب معلوم ہوتی ہے چنانچہ مشاہدہ بھی ہے کہ باوجود شب کو توسع ہونے کے آخر رمضان میں کسی قدر ضعف ہو جاتا ہے اور اسی پر عاجز عن النکاح (نکاح سے عاجز ۱۲) کے لئے صوم کا معالجہ تجویز فرمایا گیا ہے پھر اس پر اس کا قائل ہونا پڑے گا کہ رمضان میں رات کو کم کھاوے ورنہ غایت حاصل نہ ہوگی بلکہ اس کا قائل ہونا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

دوسری تقریر حق تعالیٰ نے انہیں حضرات کی برکت سے میرے قلب پر وارد کی ہے۔ اس

ے کما فی حجة الله البالغه من ابواب الصوم ثم ان تقليل الاكل والشرب له طريقان احدهما ان لايتناول منهما الاقدر ايسيراً والثانی ان يكون المدة المتخللة بين الاكلات زائدة على قدر المتعاد والمعتبر فی الشرائع هو الاول لاالثانی الخ (صفحہ ۲۴۲) (چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں ابواب الصوم کے تحت میں مذکور ہے کھانے پینے میں تقلیل کرنے کے دو طریقے ہیں ایک یہ کہ کھانے پینے کی قلیل مقدار تناول کرے دوسرے یہ کہ دو کھانوں کے درمیان مقدار معتاد سے زیادہ ہو اول طریقہ شریعت میں معتبر ہے دوسرا نہیں ۱۲)

میں ایک دوسری مبنیٰ بھی ہے کہ صوم کو گناہوں سے بچنے میں دخل اور طرح سے بھی ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح شرک وکفر سے بچانے کے لئے جا بجا عذاب کا ذکر ہے مگر اس شرک وکفر سے بچنے میں وقوع عذاب کو دخل نہیں۔ تصور عذاب کو دخل ہے کہ یہ سوچنا کہ عذاب ایسا ہوگا سبب بن جاتا ہے ترک کفر و شرک کا۔ اسی طرح تصور حقیقت صوم کو بھی معاصی سے بچنے میں دخل ہے۔ مشہور تقریر کا حاصل تو یہ تھا کہ صوم ایسی ہئیت ہے کہ اس کا وقوع معاصی سے روکتا ہے اور اس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ صوم ایک ایسی شئے ہے کہ جس کی ہیئت کا تصور معاصی سے روکتا ہے۔ کسی کو عقل سلیم ہو تو روزہ کی حقیقت میں غور کرے کہ کیا ہے۔ روزہ کی حقیقت ہے نہ کھانا نہ پینا' بیوی سے مشغول نہ ہونا' اس سے یہ سمجھے گا کہ یہ چیزیں حلال تھیں جب یہ حرام کردی گئیں تو جو چیزیں پہلے سے حرام ہیں ان کا کیا درجہ ہوگا۔ پھر یہ خیال کرے گا کہ غیرت کی بات ہے کہ جو چیزیں حلال تھیں انہیں چھوڑ دیں اور حرام میں مبتلا ہوں۔

نفع روزہ

اب اگر رات کو خوب کھائے تو روزہ کا نفع کہیں نہیں جا سکتا۔ کیونکہ جس قدر جی چاہے کھائے مگر اس تصور اور غیرت کو کون مٹادے گا کہ جب حلال چیزیں حرام کردی گئیں تو حرام کا کیا حال ہوگا۔ بلکہ رات کا کھانا بھی حکماً نہ کھانا ہے کیونکہ رات کو کھاتا ہے تو اس لئے کہ دن کو نہ کھائے۔ پیتا ہے تو اس لئے کہ دن کو نہ پئے۔ بیوی سے مشغول ہوتا ہے تو اس لئے کہ دن کو نہ مشغول ہو۔ غرض جب اس کا اکل (کھانا) ترک کے لئے ہے۔ تو حکماً وہ اکل بھی ترک اکل ہے تو رات میں بھی تارک ہے (حکماً) اور دن میں بھی تارک ہے (حقیقۃً) اب وہ شبہ جاتا رہا کہ رات کو جب پیٹ اناڑی کی سی بندوق کی طرح بھر لیا تو صوم کا کیا نفع ہوا۔ حاصل یہ ہوا کہ یہ وہ زمانہ ہے کہ اس میں جو چیزیں باوجودیکہ حلال تھیں حرام کردی گئیں۔ دن کو حقیقۃً رات کو حکماً تو یہ تصور ہوگا کہ اے نفس حرام چیزوں کا کیا حال ہوگا۔ اور اس سے غیرت آئے گی اور اس سے رمضان بھر گناہ چھوڑے رہے گا۔ پھر گناہوں کے چھوڑنے کا عادی اور قادر ہو جائے گا۔

چلہ رمضان

کیونکہ ایک مہینہ معتد بہ مقدار ہے خاص کر اخیر کے دس دن کہ ان میں صیام وقیام کی عبادت کے علاوہ اور بھی مزید عبادت ہے دن کو تو اعتکاف ہے اور رات کو بھی بہ نسبت دوسرے لیالی (راتوں) کے کچھ عبادت زیادہ کی جاتی ہے۔ بخیال عشرہ اخیرہ کے خصوص لیالی قدر میں پس اس میں افعال مباحہ

کی اور بھی تقلیل ہے تو یہ دس دن بجائے بیس دن کے ہوں گے تو گویا اس لطافت کے ساتھ چلہ پورا کیا گیا ہے کہ رہیں تو تیس دن اور کام ہو جاوے چالیس دن کا سبحان اللہ کیا رحمت ہے۔ اگر کوئی طبیب ایسا کرے کہ دو مسہلوں کی دوا ایک دن میں پلا دے تو وہ بجائے نفع کے سخت نقصان کرے گی بلکہ جان کو خطرہ میں ڈال دے گی۔ یہاں یہ ہے کہ چالیس دن کی دوا تیس دن میں اس طور سے پوری کر دی کہ تمہیں خبر بھی نہیں ہوئی۔ بہرحال چالیس دن پورے کر دیئے اور چلہ وہ چیز ہے جس کے بارے میں حدیث میں ہے من اخلص لله اربعین یوماً الحدیث (الترغیب والترهیب ۱:۵۶، کنز العمال: ۵۲۷۱، اتحاف السادة المتقین ۶:۷) کہ جس نے چالیس دن اللہ کے لئے خلوص کیا حق تعالیٰ اس کے قلب سے حکمت کے چشمے جاری کر دیں گے۔

بعض بزرگوں نے شعبان کے دس دن ملا کر چالیس دن پورے کئے ہیں۔ مگر یہ اہل ہمت کا کام ہے۔ مگر یہ چلہ اس وقت مفید ہوگا جبکہ اس میں خلوص ہو ورنہ اس کی یہ کیفیت ہوگی کہ ایک شخص نے کسی سے کہا کہ تم نماز پڑھا کرو اس نے کہا کیا دو گے کہا جب تم چالیس دن تک برابر پڑھتے رہو گے تو ایک بھینس دیں گے وہ راضی ہو گیا اور نماز پڑھنی شروع کر دی۔ ان حضرت نے تو اس خیال سے کہہ دیا تھا کہ چالیس دن کے بعد اسے نماز کی عادت ہو جائے گی پھر یہ بھینس بھول جائے گا اور نمازی بن جائے گا۔ جب چالیس دن پورے ہو گئے اس نے کہا لاؤ بھینس، انہوں نے کہا کیسی بھینس میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا۔ کہنے لگا کہ جاؤ پھر میں نے بھی بے وضو ہی ٹرخائی ہے تو اگر خلوص نہیں تو یہ کیفیت ہوگی اور اگر ہے تو یہ کیفیت ہوگی کہ ؎

شنیدم کہ رہروے در سرزمینے ہمی گفت ایں معمہ باقرینے

یعنی کوئی سالک یہ معما کہہ رہا تھا (اپنے ہمنشیں سے ۱۲)

کہ اے صوفی شراب آنگہ شود صاف کہ در شیشہ بماند اربعینے

کہ شراب تو اس وقت صاف ہوگی جب چالیس دن شیشے میں رہے۔ شراب سے مراد محبت ہے اور شیشہ سے مراد قلب۔

تاثیر چلہ

میرٹھ میں موتمر الانصار کے جلسہ میں بہت سے نو تعلیم یافتہ جمع تھے میں نے کہا کہ آپ لوگوں نے اپنے شبہات کو حل کرنے کا برا وطیرہ اختیار کیا ہے۔ اس طرح شبہات حل نہیں ہوا

کرتے اگر واقعی آپ شبہات کو حل کرنا چاہتے ہیں تو چالیس دن کے لئے کسی محقق کے پاس جس پر آپ کو اطمینان ہو چلے جایئے اور اپنے تمام شبہات کی ایک فہرست لکھ کر اس کی خدمت میں پیش کر دیجئے۔ اس اثناء میں اگر کوئی جدید شبہ پیش آوے اسے بھی اسی فہرست میں لکھ دیجئے مگر زبان سے کچھ نہ کہیے اور چالیس دن تک اس کی صحبت میں بیٹھ کر برابر اس کی باتیں سنتے رہیے میں توکلا علی اللہ (اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے ۱۲) دعوے سے کہتا ہوں کہ اس کے بغیر جواب دیئے آپ کے تمام شبہات حل ہو جائیں گے کہ پھر کبھی آپ کو اس قسم کا کوئی شبہ نہ ہوگا۔ اور اگر کوئی شبہ رہے گا بھی تو پوچھتے ہی فوراً دفع ہوگا۔

ایک ایڈیٹر اخبار کے بھی اس مجمع میں شریک تھے مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ کہو اب کیا کہتے ہو۔ اس پر کوئی شبہ کرو۔ تو کہنے لگے اس پر شبہ تو جب کریں جب تجربے سے اس کے خلاف ثابت ہو اور تجربے سے پہلے کہنا تو محض اپنی حماقت کا اظہار کرنا ہے۔ پھر پوچھا کہ اچھا یہ بتلاؤ کہ بات تمہارے دل کو بھی لگتی ہے یا نہیں۔ کہنے لگے ہاں دل کو تو لگتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سچی ہے۔ حد ہوگئی۔ اب حجۃ اللہ ختم ہوگئی اگر اب بھی کوئی اپنے شبہات رفع نہ کرے تو ہم پر کوئی الزام نہیں۔ اگر ڈاکٹر کہہ دے کہ دو مہینے تمہیں شملہ میں رہنا ہوگا یہاں کی آب و ہوا تمہارے لئے مضر ہے تو بجائے دو مہینے کے چار مہینے کے لئے تیار ہو جائیں گے اور یہاں چالیس دن کے لئے فرصت نہیں ملتی۔ بات یہ ہے کہ مرض کا دفع کرنا ہی مقصود نہیں باتیں ہی ہیں بلکہ دفع مرض کے اسباب سے تو بھاگتے ہیں۔ میرے ایک دوست مولوی عیسیٰ صاحب بی اے الہ آباد میں پڑھتے تھے میرے وعظ میں شریک ہوتے تھے خدا نے ایسا فضل کیا کہ ان پر وعظ کا اثر بہت پڑا ان کے ساتھ چند طالب علم بھی آیا کرتے تھے وہ ان کی حالت دیکھ کر کہنے لگے کہ وعظ میں شریک نہ ہونا چاہیے ورنہ یہ ان کی طرح ہمیں بھی بیکار کر دیں گے۔ اللہ اکبر یہ عیسیٰ بننے کو بیکاری سمجھتے ہیں اور دجال بننا پسند کرتے ہیں۔ خبر بھی ہے یہ بیکاری کیسی ہے یہ وہ ہے ؎

تابدانی ہر کہ یزداں بخواند   از ہمہ کار جہاں بیکار ماند

(جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنا بنا لیتے ہیں اس کو تمام دنیا کے کاروبار سے بیکار کر دیتے ہیں ۱۲)

یعنی یہ کام کا نہ ہونا اور ترقی سے محروم ہو جانا ایسا ہوگا کہ آپ کا پانچ روپیہ ماہوار کا ایک باورچی ہے جو نہایت اعلیٰ درجہ کا کھانا پکانا جانتا ہے اور وہ اتفاق سے آپ پر عاشق ہو گیا آپ کا

کوئی دوست مہمان آیا آپ نے اسی کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا اسے کھلایا اس نے بہت پسند کیا بہت خوش ہوا اور پوچھا کہ کس نے پکایا ہے آپ نے اپنے باورچی کا نام بتا دیا۔ اس دوست نے علیحدہ اس باورچی سے کہا کہ ہمارے ساتھ چلو ہم دس روپے مہینہ دیا کریں گے اس باورچی نے انکار کر دیا کہ مجھے تو یہ پانچ اچھے ہیں آپ کے دس سے۔ اس کے بعد آپ کو معلوم ہوا کہ اس نے دس روپے کی نوکری سے انکار کر کے ہمارے پانچ پر پڑا رہنا پسند کیا تو انصاف سے بتلایئے کہ آپ اس باورچی کی وفاداری سے خوش ہوں گے یا ناخوش ہوں گے کہ یہ ترقی کیوں نہیں کرتا۔ آپ کی تحقیق یعنی مشورہ ترقی کے موافق تو اسے دس روپے کی نوکری کر لینا چاہیے اور آپ کے پانچ روپے پر لات مار دینا چاہیے مگر یہاں پر آپ بھی اس کے اس ترقی نہ کرنے کی قدر کریں گے اور جی چاہے گا کہ اس کو خوب انعام و اکرام دو۔ بس ملانے بھی یہی کہتے ہیں کہ اس باورچی کی طرح ساری دنیا پر لات مار دو پھر دیکھو کیسی ترقی ہوتی ہے۔

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد — آنچہ در و ہمت نیاید آں دہد

ترجمہ: نیم جاں یعنی ضعیف وحقیر و فانی جان لیتے ہیں جان باقی دیتے ہیں جو تمہارے وہم وگمان میں نہیں آسکتا وہ دیتے ہیں ۱۲)

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را — کہ بیک گل میخری گلزار را

ترجمہ: ایسا بازار کہاں مل سکتا ہے کہ ایک پھول کے بدلہ میں چمن ہی کو خرید لے ۱۲)

اور اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ سب کچھ تو دیں گے وہ خود بھی تمہارے ہو جائیں گے تو صاحب ایسے بیکار ہو جائیں گے میرے ایک اور دوست بھی بی اے اور ڈپٹی کلکٹر ہیں وہ اللہ والے ہو گئے تو ان کے ایک عزیز کہنے لگے کہ اس کا مواخذہ قیامت میں ان سے (یعنی مجھ سے) ہوگا کہ یہ قوم کو ترقی معکوس سے روک رہے ہیں۔ میں نے کہا جب میں آپ سے مدد چاہوں گا تو آپ میری مدد نہ کیجئے گا۔ غرض اس چالیس دن کے اندر عجیب خاصیت ہے تو یہ سمجھئے کہ اس نے چالیس دن تک گناہ چھوڑے دوسری توجیہ اس چلہ کے پورا ہونے کی یہ ہو سکتی ہے کہ رمضان میں ہر شخص سحری کے وقت ضرور اٹھتا ہے اور عموماً یہ بھی عادت ہے کہ اس وقت نفلیں پڑھنے کی توفیق ہو جاتی ہے تو تقریباً اس بیداری میں ثلث لیل صرف ہوتی ہے تیس ثلث کے دس دن ہوتے ہیں تو دس یہ اور تیس یہ مل کر چالیس پورے ہو گئے یا یوں کہیے کہ یہ دس بھی حکمی ہیں اور مذکورہ بالا بھی حکمی تھے اگر حقیقی دس کے برابر نہ ہوں

گے تو اس کے نصف تو ضرور ہوں گے۔ یعنی پانچ ہوں گے۔ تو پانچ عشرہ اخیرہ کے اور پانچ ہر روز کی اخیر شب کے دس ہوئے اور تیس دن حقیقی غرض مجموعہ چالیس ہوئے اور ہر طرح چلہ پورا ہو گیا۔ چونکہ چالیس دن ایک معتد بہ مقدار ہے اور اس میں خاصیت یہی ہے کہ جو فعل اس میں کیا جاتا ہے وہ پھر سہل ہو جاتا ہے۔ نیز معتد بہ مقدار ہونے کی وجہ سے اس کی عادت اور اس پر قدرت بھی ہو جاتی ہے لہٰذا اب بے تکلف صوم پر لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (امید کہ تم متقی بن جاؤ) مرتب ہو گیا۔

روح صوم

تو راز اس تقویٰ عن المعاصی (گناہوں سے بچنے ۱۲) کا دونوں تقریروں پر مجاہدہ ہوا۔ خواہ اس حیثیت سے کہ صوم سبب ہے کسر قوت بہیمیہ کا اور وہ سبب ہے ترک معاصی کا خواہ اس حیثیت سے کہ صوم مرتبہ تصور میں سبب ہے ترک معاصی کا اس طرح کہ جب مباحات حرام کر دیئے گئے تو جو غیر مباح ہیں ان کا کیا حال ہوگا۔ بہر حال مجاہدہ سبب ہے ترک معاصی کا تو گو روزہ اس لئے سبب ہوا ترک معاصی کا کہ یہ مجاہدہ ہے۔

تو یہ خاصیت ایسی ہے کہ اس کو روح الصوم (روزہ کی روح ۱۲) کہا جاوے مجھے آج روح الصوم ہی کا بیان کرنا ہے۔ پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہر شئی کی ایک صورت ہے اور ایک روح ہے اسی طرح صوم کی ایک روح ہے ایک صورت یہاں پر ممکن ہے کہ کوئی یہ کہے کہ ہم روزہ رکھ کر کیا کریں فقط اس کی روح کو جو کہ مجاہدہ ہے حاصل کر لیں گے۔

بات یہ ہے کہ ہر عمل کی ایک صورت ہے اور ایک روح ہے۔ مثلاً نماز کہ اس کی ایک صورت ہے اور ایک روح ہے۔ مثلاً خشوع و خضوع و حضور قلب اس کی روح ہے۔ اسی طرح روزہ کی ایک صورت ہے اور ایک روح ہے اور اس کی روح مجاہدہ ہے۔

صورت صوم

اور ان ارواح میں عقلی احتمال دو ہیں کہ ان کے خواص کی تحقیق کیلئے صور خاصہ شرط ہیں یا نہیں ہیں۔ مگر ہم کو نصوص سے جن میں ان عبادات خاصہ کے فرضیت کا امر ہے معلوم ہو گیا کہ صور خاصہ شرط ہیں اور جہلائے صوفیہ کو بھی دھوکہ ہوا کہ وہ سمجھ گئے کہ اعمال کی روح کے لئے صور خاصہ شرط نہیں اور انہیں غیر مقصود سمجھ کر چھوڑ بیٹھے۔ مثلاً انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ نماز کی روح ذکر ہے۔ بس یہ ہر وقت ہونا چاہیے

اوراس ہیئت خاصہ کی کوئی ضرورت نہیں اوراپنے اس زعم فاسد کی تائید میں مولانا کا یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

پنج وقت آمد نماز اے رہنموں عاشقاں ھم فی صلوۃ دائموں

ترجمہ: (نماز تو پانچ ہی وقت آئی ہے عاشق ہمیشہ نماز میں رہتے ہیں ۱۲)

انہوں نے اس کے کیا معنی گھڑے کہ پانچ وقت نماز کی ضرورت نہیں ہر وقت نماز ہونا چاہیے حالانکہ اس سے تو اور کثرت نماز کی ثابت ہوتی ہے۔

بہرحال ان جہلاء نے نماز کا ست نکالا کہ ذکر ہے۔ تو بس ذکر کر لینا کافی ہے۔ اب پانچ وقت نماز پڑھنے کی کیا ضرورت رہی۔ خوب سمجھ لو کہ جتنے اعمال ہیں ان کی روح کے خواص کے لئے ان اعمال کی صور خاصہ شرط ہیں تو اب جو ذکر روح نماز کی ہوگی وہی ذکر ہے جو نماز کے ساتھ پایا جاوے نہ کہ مطلق ذکر اور اس کی دلیل کہ نماز کی روح وہی ذکر ہے جو نماز میں پایا جاوے یہ حدیث ہے۔

من ترک الصلوۃ متعمداً فقد کفر (اتحاف السادۃ المتقین ۳:۱۰، کنز العمال: ۵۰۰۸) (جس شخص نے نماز کو جان بوجھ کر چھوڑ دیا وہ کافر ہوگیا)

جس سے فرضیہ صورت صلوۃ کی معلوم ہوتی ہے۔ اگر اسے ظاہر معنی پر بھی نہ رکھا جائے تب بھی سخت وعید ہے تو اگر روح نماز مطلق ذکر میں حاصل ہو جاتی تو نماز کے ترک پر وعید نہ ہوتی بس صرف ذکر کے ترک پر وعید ہوتی اسی طرح نصوص کے تتبع (تلاش کرنے) سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اعمال کو ان کی صورت خاصہ کے ساتھ ادا کرنا ضروری ہے۔ ورنہ ترک پر وعید کیوں آتی۔ اب جو ان جہلائے صوفیہ نے یہ مانا کہ نماز کی روح ذکر میں آسکتی ہے تو یہ گویا ہندوؤں کا مسلک اختیار کر لیا کہ ارواح انسان میں اواگون (تناسخ) کے قائل تھے یہ ارواح عبادات میں آواگون کے قائل ہوئے کہ ایک عبادت کی روح دوسری عبادت میں جاسکتی ہے۔ اس تقریر سے ان کی غلطی بھی معلوم ہوگئی ہوگی۔

نیز یہ معلوم ہوا کہ باطن کے لئے علوم ظاہرہ کی بھی ضرورت ہے جب ثابت ہوگیا کہ ارواح کے لئے صور خاصہ شرط ہیں تو اب وہ شبہ جاتا رہا کہ نرا مجاہدہ بھی کافی ہو جائے گا۔ پس معلوم ہوا کہ روح صوم بدون صورت صوم نہ پایا جاوے گا۔ البتہ روزہ کی سے ہمیں یہ ضرور پتہ لگا کہ مطلق مجاہدہ بھی عظیم الشان ہے کیونکہ صوم اسی کا ایک فرد ہے پس جس زمانہ میں روزہ فرض نہ ہوا اس وقت مطلق مجاہدہ کہ اس مجاہدہ کا مماثل (مثل) ہے وہ تم کو عطا فرما دیا۔

چونکہ شد خورشید مارا کرد داغ چارہ نبود در مقامش از چراغ

یعنی آفتاب چھپ جائے تو چراغ ہی کافی ہے روزے ختم ہو جاتے ہیں مگر انکا قائم مقام مجاہدہ موجود ہے اور ایک بزرگ کے کلام میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔

اے خواجہ چہ پرسی زشب قدر نشانی ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

ترجمہ (اے خواجہ شب قدر کی نشانی کو کیا دریافت کرتا ہے اگر قدر جانے تو ہر رات شب قدر ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر رات میں شب قدر واقع ہوتی ہے معنی یہ ہیں روح شب قدر قرب ہے اور وہ ہر رات میں موجود ہے۔ الغرض مجھے اس وقت مقصود بیان سے دو ہیں۔

مصداق اعظم روزہ

ایک یہ کہ روزہ کا مقصود روح مجاہدہ ہے کہ جس کا مصداق اعظم ترک معاصی ہے اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس نے روزہ میں جھوٹ نہ چھوڑا بری اور بیہودہ باتیں نہ چھوڑیں خدا کو اس کے روزہ کی کچھ حاجت نہیں یوں تو خدا کو کسی کے روزہ کی بھی حاجت نہیں مطلب یہ ہے روزہ کا جو مقصود ترک معاصی جب وہ اسے نہ ہوا تو پھر روزہ کس کام کا ہوا۔ یہی مجاہدہ ہے جس کے حق تعالیٰ نے فضائل بیان فرمائے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

ترجمہ: اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے قرب وثواب یعنی جنت کے راستے ضرور دکھادیں گے ۱۲)

اور اس کا امر بھی فرمایا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ

ترجمہ:۔ اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اللہ تعالیٰ کا قرب ڈھونڈو اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو ۱۲) اور اس کی حقیقت بھی فرمائی ہے۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۔

ترجمہ: جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور اس نے نفس کو حرام خواہش سے روکا ۱۲) یعنی حقیقت مجاہدہ کی کیا ہے۔

نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى (نفس کو حرام خواہش سے روکا ۱۲)

اوراس کے حاصل ہونے کی تدبیر یہ ہے اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اگر یہ کہو کہ آیات مجاہدہ میں مجاہدہ سے مراد تو مجاہدہ مع الکفار (کافروں کے ساتھ جہاد کرنا ۱۲) ہے تو جناب حدیث شریف میں آیا ہے کہ شاید اس کی آپ کو خبر نہیں کہ **المجاهد من جاهد نفسه (سنن الترمذی:۱۶۲۱، مسند احمد ۶:۲۰، کنز العمال: ۱۱۲۶۱، مشکوٰۃ المصابیح:۳۴)** (مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرے ۱۲) مجاہدہ ظاہری میں مشغول ہونا تو بہت سہل (آسان) ہے۔

اے شہاں کشتیم ما خصم بروں ماند زو خصمے بتر دراندروں

(اے بزرگو ہم نے ظاہری دشمن کو تو ہلاک کر دیا مگر ایک دشمن جو اس سے بھی بدتر اور ضرر رساں تر ہے باطن میں رہ گیا ہے جس کو نفس کہتے ہیں ۱۲)

کشتن ایں کار عقل و ہوش نیست شیر باطن سخرہ خرگوش نیست

(اس دشمن باطنی کا ہلاک کرنا محض عقل وہوشیاری کا کام نہیں کیونکہ شیر باطن خرگوش کے قابو کا نہیں ۱۲)

ہم نے باہر کے دشمن کو مار دیا ہے اور اندر کے دشمن کی بالکل پرواہ ہی نہیں۔ حقیقت میں مجاہدہ نفس جہاد اکبر ہے اور مجاہدہ اہل نفس جہاد اصغر کیونکہ نفس کو معاصی سے روکنا اور اس میں اس کی مخالفت کرنا ذرا سخت کام ہے۔

تفصیل مجاہدہ

اور جاننا چاہیے کہ نفس کی مخالفت کے تین درجے ہیں مخالفت فی المعاصی (گناہوں میں مخالفت کرنا) مخالفت فی الحظوظ (حظوظ میں مخالفت کرنا ۱۲) مخالفت فی الحقوق (حقوق میں مخالفت کرنا ۱۲) معاصی میں مخالفت تو فرض وواجب ہے اور مخالفت فی الحقوق معصیت ہے جیسا کہ عنقریب آتا ہے البتہ مخالفت فی الحظوظ میں تفصیل ہے۔ بالکل چھوڑ دینا مذموم ہے البتہ تقلیل اولیٰ ہے۔ کیونکہ بالکل چھوڑ دینے میں تنگ اور دق ہو کر تمام کام چھوٹ جانے کا اندیشہ ہے بس نہ اسے بہت دق کرو نہ بالکل توسع کرو اوسط کی چال رکھو۔

اور بالکلیہ حظوظ کے نہ چھوڑنے میں ایک دوسرا راز بھی ہے کہ اس سے خدا سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ دیکھو اگر گرم پانی پیو گے تو مری ہوئی زبان سے الحمد للہ نکلے گا اور اگر ٹھنڈا پانی پیو گے تو نفس کو راحت ہوگی تو روئیں روئیں سے الحمد للہ نکلے گا ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ یہی راز ہے کہ سفر حج میں زاد راہ لے جانے کی ضرورت ہے تاکہ نفس تنگ نہ ہو۔ حضرت مولانا گنگوہی کو

اسی وجہ سے ٹھنڈے پانی کا بڑا اہتمام تھا۔ ایک شخص نے مرزا مظہر جان جاناںؒ سے عرض کیا کہ ایک شخص خالص شوربا نہیں کھاتا پانی ملا کر کھاتا ہے۔ فرمایا کہ وہ ناقص ہے جو خدا کی خاص تجلی خالص میں ہے وہ اس پانی ملے میں کہاں ہے۔

تجلی فی النعمت

راز اس میں یہ ہے کہ خالص شوربا کھا کر جی خوش ہوگا تو روئیں روئیں سے شکر پیدا ہوگا۔ اور تجلی سے مراد رویت نہیں ہے معرفت ہے۔ یہی تجلی ہے جس سے حق تعالیٰ اپنے کلام میں متجلی ہیں۔ یہی تجلی ہے جس سے وہ اپنی نعمتوں میں متجلی ہے کلام میں اس کا مشاہدہ کرو۔ نعمتوں میں اس کا مشاہدہ کرو ایک حکایت یاد آئی زیب النساء مخفی تخلص کرتی تھی اور بڑی شاعرہ تھی۔ ایران کے بادشاہ کے ایک مصرعہ پر مصرعہ لگایا وہ مصرعہ ایسا تھا کہ اس پر کوئی مصرعہ لگا نہ سکتا تھا۔ بس بادشاہ نے دہلی عالمگیر کو لکھا اس شاعر کو ہمارے پاس بھیج دو جس کا یہ مصرعہ ہے۔ بادشاہ کو بڑی تشویش ہوئی۔ زیب النساء سے کہا اور مصرعہ لگاؤ دیکھو یہ ہے اس کا نتیجہ۔ زیب النساء نے یہ قطعہ لکھ دیا کہ اسے جواب میں لکھ دیجئے

بلبل از گل بگذرد گر در چمن بیند مرا　　　بت پرستی کے کند گر برہمن بیند مرا

ترجمہ:۔ بلبل اگر مجھ کو چمن میں دیکھ لے تو پھول کا عشق چھوڑ دے اور اگر برہمن مجھ کو دیکھ لے تو وہ بھی بت پرستی ترک کر دے۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل　　　ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

ترجمہ: میں سخن میں مخفی ہوں جس طرح تو برگ گل میں مخفی ہے جس شخص کو میرے دیکھنے کی خواہش ہے وہ مجھ کو کلام میں دیکھ لے۔

بادشاہ سمجھ گیا کہ یہ کسی عورت کا مصرعہ ہے۔ اسی طرح اگر خدا کو دیکھنا چاہتے ہو تو اس کے کلام میں دیکھو

چیست قرآں اے کلام حق شناس　　　رونمائے رب ناس آمد بناس

ترجمہ: اے کلام حق کے پہچاننے والے قرآن پاک کیا ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں کی طرف لوگوں کے رب کا رونما ہے ۱۲)

اسی طرح خدا کا مشاہدہ اس کی نعمتوں میں ہے۔

الحاصل لذات کو بالکل نہ چھوڑے تیسرے مخالفت فی الحقوق۔ اس میں نفس کی مخالفت حرام ہے۔ مثلاً اتنا کھلانا ضروری ہے کہ ضعف نہ ہو اور اتنا سلانا ضروری ہے کہ کسل نہ ہو۔ میں اپنے دوستوں کو بتلایا کرتا ہوں کہ آٹھ گھنٹے سویا کرو اگر اتنا نہ سوؤ تو کم از کم چھ گھنٹہ تو ضرور سویا کرو۔ ورنہ اس سے کم سونے میں دماغ میں یبوست (خشکی) پیدا ہوگی۔ پھر رفتہ رفتہ اس سے جنون وغیرہ ہو جائے گا پھر جتنا کام کر لیتے تھے اس سے بھی جاتے رہو گے۔ بس مجاہدہ کی یہ تفصیل ہے۔

ارکان مجاہدہ

اور مجاہدہ اصل میں چار چیزوں کا نام تھا۔ قلت الطعام (کم کھانا) قلت المنام (کم سونا) قلت الکلام (کم بولنا) قلت الاختلاط مع الانام (لوگوں سے کم میل جول رکھنا) مگر اب دو اول حذف ہوگئیں اور دو اخیر کی رہ گئیں۔ ایک قلت الکلام دوسرے قلت الاختلاط مع الانام یعنی لوگوں سے کم ملنا۔ آج کل لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ بیٹھکوں اور چوپالوں میں بیٹھ کر ادھر ادھر کی گپیں لگایا کرتے ہیں کہیں اخبار پڑھتے ہیں کہیں شطرنج کھیلتے ہیں افسوس یہ لوگ اپنے فراغ کی قدر نہیں کرتے حالانکہ ان کو یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ ۔

خوشا روز گارے کہ دارد کسے　　　کہ بازارحرصش نباشد بسے

ترجمہ: (فراغت عجب چیز ہے اگر کسی کو حاصل ہو۔ زیادہ کی اس کو طمع نہ ہو)

بقدر ضرورت یسارے بود　　　کند کارے ازمرد کارے بود

ترجمہ: ۔ضرورت کے موافق اس کے پاس مال بھی ہو تو اس کو کچھ کرنا چاہیے اپنے اوقات کو ضائع نہ کرنا چاہیے۔

غرض اس طرح سے لوگ اپنے (اوقات) ضائع کرتے پھرتے ہیں۔ اور جو دو متروک ہو گئیں وہ یہ ہیں۔ قلت الطعام۔ قلت المنام یعنی کم کھانا اور کم سونا۔ یعنی اس کی بالکل اجازت ہے کہ پیٹ بھر کھاؤ کم نہ کھاؤ لیکن جی بھر کے یعنی نیت بھر کر نہ کھاؤ۔ کیونکہ اس کا مرتبہ پیٹ بھرنے کے بعد بہت بعد ہے۔ ایک ہے پیٹ بھرنا ایک ہے نیت بھرنا تو نیت تو بھرو نہیں کہ اس سے کچھ فائدہ نہیں کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ دوسرے وقت بھوک نہیں لگتی طبیعت پر ثقل (گرانی) رہتا ہے۔ غذا جزو بدن نہیں بنتی۔

بسیار خوری

بعض لوگ تو اس قدر کھا لیتے ہیں کہ پیٹ میں سانس لینے کی بھی جگہ نہیں رہتی۔ مولانا فیض

الحسن صاحبؒ کے پاس کہ طبیب بھی تھے۔ایک شخص آیا کہ نسخہ لکھ دیجئے میرے پیٹ میں درد ہے۔مولانا نے کوئی دوا پینے کی لکھ دی کہنے لگا حضرت اگر اتنی ہی گنجائش ہوتی تو میں ایک لقمہ اور نہ کھاتا۔ایک اور بخیل کی حکایت ہے کہ وہ بھی عمدہ کھانوں کے لالچ میں بہت کھا گیا تھا۔ پیٹ میں درد ہوا طبیب کے پاس گیا۔طبیب نے کہا کہ انگلی ڈال کر نکال ڈالو۔ کہنے لگا ایسا عمدہ پلاؤ جس میں اس قدر گھی اور ایسا نفیس مزعفرا سے کیونکر نکال ڈالوں۔ بہرحال پیٹ بھر کر کھاؤ اس کے بعد چھوڑ دو۔ ہاں اگر ایک آدھ لقمہ کم کھاؤ تو بہتر ہے کیونکہ اس میں نفع یہ ہے کہ دوسرے وقت بھوک لگے گی۔ اور جو کچھ کھاؤ گے وہ جز و بدن بنے گا اور اس میں مشورہ کرنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ کھاؤں یا نہ کھاؤں۔ امراء کیا کرتے ہیں کہ ایک وقت کھانا زیادہ کھا گئے۔ اب دوسرے وقت کھانا پاس آیا تو مصاحبین سے پاس کراتے ہیں کہ کھاؤں یا نہ کھاؤں۔ وہ خوشامدی اپنے کھانے کے لالچ میں کہہ دیتے ہیں کہ نہیں حضور کچھ تو کھا لیجئے۔ یہ خودغرض لوگ اپنی مصلحت کو دوسرے کی مصلحت پر مقدم کرتے ہیں۔ جیسے مشہور ہے کہ ایک شخص سرائے میں ایک لیموں لے کر جایا کرتا تھا جس خوشحال مسافر کو کھانا کھاتے دیکھتا تھا کھڑا ہو جاتا تھا۔لوگ خواہ مخواہ شرما شرمی اس کی صلاح کرتے تو بیٹھ جاتا اور اگر کسی نے صلاح نہ کی تو جھٹ لیموں کاٹ کر اسکے آگے نچوڑ دیتا تھا۔ اور لیموں کی بڑی تعریف کرتا تھا لوگ اب تو ضرور اسے کھانے میں شریک کر لیتے تھے تو جس طرح یہ اپنی غرض کے لئے لیموں کی تعریف کرتا تھا اسی طرح مصاحبین بھی اپنے کھانے کے لئے حضور کو اصرار کر کے تھوڑا بہت کھلا ہی دیتے ہیں کیونکہ اگر حضور کھائیں تو انہیں ویسے کھانے کو کھلائے تو اگر ایک آدھ لقمہ کی کسر رکھو گے تو جب کھانا پاس آوے گا اسے پاس کرانے کی ضرورت نہ ہوگی بہرحال نہ خوب تنکر کھانا چاہیے نہ بھوکا رہنا چاہیے کہ آج کل کے قویٰ بہت ضعیف ہیں۔

اسباب ضعف

جس کی زیادہ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ آج کل شادی کم عمری میں ہوتی ہے اعضاء میں پورا نمو نہیں ہونے پاتا اتنی جلدی شادی کرنے کی وجہ یا تو چو چلا ہے کہ چھوٹے چھوٹے دولہا دلہن دیکھنے کا ارمان ہے اور کہیں حوصلہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ مر جائیں اور بیٹے کی شادی نہ دیکھ سکیں اور کہیں ماں باپ کا قصور نہیں ہوتا بلکہ خود بچے ہی ماں باپ کے پیٹ سے نکلتے ہی مستیاں شروع کر دیتے ہیں جس سے ماں باپ کو ان کی شادی کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ پھر پہلی صورتوں میں کبھی تو

صرف نکاح کر دیتے ہیں اور رخصتی بعد میں کرتے ہیں بعضے رخصتی کر کے بھی دولہا کو تاکید کرتے ہیں کہ چندے علیحدہ رہنا مگر اس میں نکاح کے بعد ذرا بیوی سے الگ رہنا دشوار ہوتا ہے۔ مگر جدا رہنے کا یہ اہتمام ایسا ہی ہے جیسے کسی کا قول ہے۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہٗ　　　باز میگوئی کہ داماں ترمکن ہشیار باش

(دریا میں تختہ میں باندھ کر ڈال دیا پھر کہتے ہیں خبردار کہ داماں تر نہ ہو ۱۲)

لڑکوں کی اس میں کیا شکایت کبھی تم نے بھی ایسا کیا تھا کہ ایسی حالت کے بعد علیحدہ رہتے۔ بہرحال شادی کم عمری میں ہوتی ہے کہ ماں باپ ہی چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے بچے بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر ایسا ہی ہوتا رہا تو وہ جو مشہور ہے کہ قیامت کے قریب بالشتیوں کی آبادی ہوگی تھوڑے دنوں میں بالکل سچ ہو جائے گا۔ اگلے زمانے کے لوگ بڑے قوی ہوتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ شادی سن نمو ختم ہونے کے بعد ہوتی تھی۔ اسی سے ان کی عمریں زیادہ ہوتی تھیں۔ تو یہ وجہ ہے ضعف کی۔ اب ضعف کی حالت میں کم کھانا کم پینا تو محض نفس کو مارنا ہے ہمارے بعض دوستوں نے اپنی رائے سے کم کھانا شروع کیا تھا جب اس کا نقصان دیکھا تو توبہ کی تو یہ قسم مجاہدہ کی چھوڑ دو۔ ہاں کم ملنے کم بولنے کی عادت اختیار کرو۔

طریق حصول نسبت

تو حاصل اس تقریر سے یہ نکلا کہ گناہوں کا چھوڑنا اور خلوت کا اختیار کرنا جس میں تقلیل طعام بھی میسر ہو جاوے گی۔ یہ بڑی چیز ہے چنانچہ تجربہ کر لو کہ صرف خلوت اور ترک کلام پر اکتفا کرے اور معاصی بھی ترک کر دے تو ان شاء اللہ نسبت باطنی حاصل ہو جائے گی۔ چاہے ذکر بہت ہی کم کرے اور اگر اتنا ہی زیادہ ذکر کرے مگر خلوت و تقلیل کلام نہیں تو نسبت کبھی نہیں حاصل ہو سکتی۔ ایک بزرگ نے خلوت کا عجیب طریقہ اختیار کیا تھا کہ بس ہر وقت نوافل پڑھتے رہتے تھے اگر کوئی آیا بیٹھا رہا سلام پھیر کے صرف معمولی مزاج پرسی کر کے پھر نماز میں مشغول ہو جاتے تھے۔ اس طرح کرنے سے خود بخود لوگ کم آتے تھے اور کوئی برا بھی نہ مانتا تھا۔ اور شہرت بھی نہ ہوتی تھی کہ خلوت نشین ہیں۔ ایک بزرگ نے یہ کیا تھا کہ جب کوئی کچھ کہتا فرماتے لکھ کر دو مجھے سنائی نہیں دیتا۔ فضول باتیں کون لکھ کر لاتا بس اس طرح حکایت شکایت غیبت سننے سے بچے رہتے تھے۔ ایک اور بزرگ کا طریقہ یہ تھا کہ دن کو بالکل نہیں بولتے تھے اس میں یہ تھا کہ فضول

بکواس والے اپنا آرام چھوڑ کر رات کو نہیں آتے۔ غرض خلوت کے بہت طریقے ہو سکتے ہیں اگر صاحب کمال ہے تو خود تجویز کرے۔ ورنہ شیخ سے مشورہ کر لے اور زیادہ بولنے سے بڑی بڑی خرابیاں بھی ہو جاتی ہیں۔ کہیں زبان سے کسی کی حکایت نکلتی ہے کسی کی شکایت نکلتی ہے کسی کی غیبت ہو جاتی ہے۔

دل زپر گفتن بمیرد در بدن　　　گرچہ گفتارش بود در عدن

ترجمہ: دل میں فضول کلام سے کدورت پیدا ہوتی ہے اگرچہ وہ کلام نہایت عمدہ ہو ۱۲)

کیسی ہی اچھی باتیں ہوں مگر ہوں غیر ضروری تو اس سے بھی قلب میں کدورت پیدا ہوگی حتیٰ کہ وعظ بھی اگر غیر ضروری مضامین پر مشتمل ہوگا وہاں بھی یہی ہوگا اور اگر کم ملنا اختیار کرلو تو مستقلاً کم گوئی کے حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ وہ خود بخود حاصل ہو جائے گی۔

مجاہدہ معتدلہ

غرض یہ ہے کہ مجاہدہ اس زمانہ کے مناسب صرف یہ ہے کہ کم ملو کم بولو اور قدرے لذات میں بھی تقلیل کر دو اور اتنا مبالغہ مت کرو جیسا ایک درویش نے میرے سامنے ایک خربوزہ کھایا تو کہنے لگے آج سترہ برس کے بعد کھایا ہے۔ ہمارے حضرت سب کچھ کھاتے تھے ایک مرتبہ کہیں سے انگور آئے سب کو تقسیم کئے گئے اور فرمایا کہ یہ حب فی اللہ کے سبب آیا ہے اس کے کھانے سے قلب میں نور پیدا ہوتا ہے حدیث شریف میں ہے کہ جو چاہے پئے جب تک حرام سے بچتا رہے تو سب کچھ کھاؤ پیو مگر حرام سے بچے رہو یہ ہے مجاہدہ معتدلہ۔

تجویز مجاہدہ

بہر حال مجاہدہ روح ہے روزہ کی اور رمضان کے بعد اور دونوں میں بھی وہ مجاہدہ اختیار کرو جو اس مجاہدہ سے اتحاد بالنوع کا علاقہ رکھتا ہے مگر اس میں ذرا تدقیق سے کام لو کیونکہ احیاناً شیطان طاعت کے بہانے معصیت میں مبتلا کر دیتا ہے مثلاً ایک وہ شخص ہے کہ جس پر حج فرض نہیں اسے حج کے لئے ورغلاتا ہے کہ یہ مجاہدہ ہے اس کے بعد جب یہ حج کو چلتا ہے تو سب سے پہلے یہ خرابی ہوتی ہے کہ جماعت ترک ہوتی ہے پھر نماز ترک ہونے لگتی ہے پھر سفر کے مصائب سے قلب میں خدا کی شکایت پیدا ہوتی ہے یہاں تک کہ کفر تک نوبت پہنچ جاتی ہے ایسے ہی حجاج کے بارے میں شیخ مسعود رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید   معشوق دریں جا است بیائید بیائید

ترجمہ: (اے لوگو حج کو کہاں جاتے ہو محبوب یہاں ہے ادھر آؤ ۱۲)

یہی وہ لوگ ہیں جنہیں حج میں معشوق نہیں ملتا کیونکہ ان کا معشوق تو یہیں ہے اس لئے مناسب ہے کہ شیخ سے پوچھے۔ شیخ اس کے مکائد کو خوب جانتا ہے۔

فان فقیھا واحداً متورعا   اشد علی الشیطان من الف عابد

ترجمہ: ایک پرہیزگار عالم شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ سخت ہے ۱۲)

اور یہ اشدیت اس لئے ہے کہ شیطان نے پہلے ایک بات دل میں ڈالی پھر بڑی مشکل سے اسے جمایا۔ شیخ نے اس کی شرارت کو سمجھ کر ظاہر کر دیا تو شیطان اپنا سر پیٹ لے گا کہ برسوں کا منصوبہ خاک میں ملا دیا۔ اور ایسوں سے تو یہ پہلے ہی سے ناامید تھا۔ اسی واسطے اس نے عرض کیا تھا۔

لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝

ترجمہ: اور ان سب کو گمراہ کروں گا بجز آپ کے ان بندوں کے جو ان میں منتخب کئے گئے ہیں ۱۲

اور اشدیت سے خلجان نہ ہو کہ جب شیطان ان کا دشمن ہے تو خدا جانے ان کو کیا کیا ضرر پہنچا دے۔ بات یہ ہے کہ اگر شیطان ان کا دشمن بھی ہوگا تو بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کی مثال خربوزہ کی ہے اور وہ مثل چھری کے ہیں کہ اگر خربوزہ چھری پر گرے تب بھی خربوزہ ہی کٹے گا اور چھری خربوزہ پر گرے تب بھی وہ ہی کٹے گا۔ اسی طرح اگر یہ اہل اللہ کا دشمن ہو تب بھی اسی کا نقصان اور اگر وہ دشمن ہوں تب بھی اسی کا نقصان۔ بہرحال مجاہدہ کا طریقہ بڑا باریک ہے اس لئے کسی جاننے والے سے پوچھو۔

دائمی روزہ

مجھے اس وقت دو باتیں بتلانا تھیں کہ ایک تو رمضان میں معاصی ترک کرو خلوت اختیار کرو۔ لوگوں سے کم ملو۔ کم بولو۔ دوسرے رمضان کے بعد مجاہدہ کرتے رہو۔ صرف رمضان ہی پر اکتفانہ کرو تو گویا بعد ماہ صیام (رمضان ۱۲) بھی صیام میں مشغولی رہے گی۔ اور اس کی تائید بزرگوں کے کلام سے ہوتی ہے کہ انہوں نے غیر صوم کو بھی صوم اعتبار کیا ہے۔ چنانچہ نماز کو جو مجموعۂ عبادات ومجاہدات کہا ہے تو اس میں نہ کھانے نہ پینے کو صوم کے حکم میں قرار دیا ہے اور حدیث مرفوع ہے سیاحة ھذہ الامة الصیام (تفسیر القرطبی ۸:۲۷۰) (کذااخرج ابن مردویہ) (اس امت کی سیاحت یعنی سفر ہجرت روزہ ہے ۱۲) حالانکہ سیاحت کے معنی سفر کے ہیں چنانچہ سائحین کی تفسیر

مہاجرین سے وارد ہے لیکن تشبیہاً روزہ سفر ہجرت قرار دیا گیا اور ظاہر ہے کہ وجہ تشبیہ یہی مشقت ومجاہدہ ہے پس اس سے مجاہدہ کا روح صوم ہونا ظاہر ہوگیا چنانچہ ابن عیینہ سے منقول ہے۔

انما سمی الصائم سائحا لترکه اللذات کلها من المطعم والمشرب والنکاح (کھانے پینے اور جماع کی تمام لذتوں کے چھوڑنے کی وجہ سے روزہ دار کا نام سائح رکھا گیا ہے۱۲) اور ایک حدیث مرفوع میں ہے **سیاحة امتی الجهاد فی سبیل الله رواه الحاکم (اتحاف السادة المتقین ۷:۲۹۵، المغنی عن حمل الأسفار ۱:۲۶۷)** (میری امت کی سیاحت اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرنا ہے۱۲) اور ظاہر ہے کہ دو مرفوع حدیثوں میں تطابق ضروری ہے پس اس سے صوم اور مجاہدہ کا اتحاد اور اظہر ہوگیا اور مجاہدہ کا روح صوم ہونا اور اظہر ہوگیا۔ سیاحت کے متعلق روایات کمالین سے لے لیں۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ میں اسی روح کی طرف اشارہ ہے۔

علاج مشقت

تو صاحبو نہ یہ روح بلا جسد متحقق ہے اور نہ جسد بلا روح معتبر ہے۔ تو اگر روزہ رکھو تو معاصی کو بھی چھوڑ دو بعضے روزہ رکھ کر کیا کرتے ہیں کہ کہیں شطرنج کھیلتے ہیں کہیں تاش کھیلتے ہیں اور کہیں ہارمونیم بجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ روزہ بہلاتے ہیں۔ تمہیں روزہ بہلانے کی کیا ضرورت۔ یہ تو خود بہلانے والی چیز ہے اسے بہلانے کی کیا ضرورت۔ گر ایسا ہی بہلانا ہے تو بہلانے کی چیز ایک دوسری ہے۔ یعنی وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ خدا کا ذکر کرو۔ قرآن پڑھو۔ نماز پڑھو۔ نماز ایسی دل بہلانے کی چیز ہے کہ جب یہود نے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کے متعلق یہ گستاخی کی کہ اس سے فارغ ہو کر اللہ تعالیٰ لیٹ گئے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سخت آزردہ ہوئے جس پر یہ آیت نازل ہوئی وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ یعنی ہم نے آسمان اور زمین پیدا کیا اور ہم تھکے نہیں۔ تو آگے اس آرزو کی تدبیر فرماتے ہیں۔ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ آپ ان کے کہنے پر توجہ نہ کیجئے صبر کیجئے بھلا اتنی بڑی بات سنیں صبر کیسے کریں اس کا طریقہ بتلاتے ہیں وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ اور اپنے رب کی تسبیح وتحمید کرتے رہیے (اس میں نماز بھی داخل ہے) سورج نکلنے سے پہلے (مثلاً صبح کی نماز) اور چھپنے سے پہلے مثلاً ظہر وعصر ۱۲) یعنی نماز میں لگ جاؤ۔ پھر کسی کی پرواہ ہی نہ ہوگی کیونکہ جب محبوب کی طرف توجہ ہوگی تو کسی اور طرف دھیان نہ ہوگا کیونکہ خدا کی یاد وہ چیز ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی مشقت کا پتہ

نہ لگے گا۔ اور دوسری مشقتیں تو کیا خود موت کی مشقت جسے حق تعالیٰ نے بھی مصیبت کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اور کسی مشقت کا نام لے کر اس کو مصیبت نہیں فرمایا کوئی چیز نہیں معلوم ہوتی چنانچہ عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

خرم آنروز کزیں منزل ویراں بروم　　راحت جاں طلبم و زپئے جاناں بردم

(جس دن دنیا سے کوچ کروں وہ بہت اچھا راحت جاں طلب کروں اور محبوب حقیقی کے پاس جاؤں ۱۲)

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے　　تا درمیکدہ شاداں و غزل خواں بردم

ترجمہ: میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو جائے تو خوش و خرم اور غزلیں پڑھتا ہوا جاؤں۔

برکت ذکر

یہ ذکر اللہ ہی کی برکت ہے کہ موت کی تمنا کر رہے ہیں اور فرماتے ہیں مبارک ہے وہ دن جس میں اس ویران بستی سے گزر ہوگا۔ شاید کوئی یہ کہے کہ یہ تو مرنے سے پہلے ہے عین مرنے کے وقت اگر ایسی حالت ہو تو جانیں۔ تو لیجئے مرنے کے وقت بھی ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم　　جسم بگذارم سراسر جاں شوم

ترجمہ: اب وہ وقت آ گیا کہ میں عریاں ہوں جسم کو چھوڑ کر سراسر جان بن جاؤں ۱۲)

چیست توحید آنکہ از غیر خدا　　فرد آئی در خلا و در ملا

توحید یہ ہے کہ خلوت و جلوت میں غیر اللہ سے قطع تعلقات کرو ۱۲)

ابن الفارض رحمۃ اللہ علیہ کا جب وصال ہونے لگا تو آٹھوں جنتیں منکشف ہوئیں فرمانے لگے۔

ان كان منزلتى فى الحب عندكم　　ماقد رأيت فقد ضيعت ايامى

یعنی اگر یہی میری محبت کی قدر ہوئی تو میری ساری محنت برباد گئی پھر جنتیں مستور ہو گئیں اور تجلی مطلوب ہوئی۔ اس کے بعد آپ کی روح پرواز کر گئی اور وہی مضمون صادق آ گیا کہ۔

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد　　تا نہ بینم رخ تو روح و میدن نہ دہم

(اگر ملک الموت میری جان لینے کو آئے تو میں جب تک آپ کی تجلی نہ دیکھ لوں جان نہ دوں گا)

یہ حالت عین موت کے وقت کی تھی۔ اب بعد وقوع موت کے ان حضرات کی حالت جو دنیا

میں ظاہر ہوتی ہے سنئے۔ایک بزرگ نے وصیت کی تھی کہ ہمارا فلاں مرید ہمارے جنازے کے ساتھ یہ پڑھتا جائے ہماری روح خوش ہوگی۔

مفلسا نیم آمده در کوئی تو   شئی للہ از جمال روئے تو

آپ کے دربار میں مفلس ہو کر آئے ہیں اپنے جمال کے صدقہ میں کچھ عنایت کیجئے)

دست بکشا جانب زنبیل ما   آفریں بردست و بر بازوئے تو

(ہماری زنبیل کی طرف ہاتھ بڑھایئے۔آپ کے دست و بازو پر آفریں ہے۱۲)

چنانچہ وصیت پر عمل کیا گیا جب آثار سے ان کا صدق معلوم ہے تو یہ سمجھا جاوے گا کہ اس سے ان کی روح کو فرح (خوشی) ہوا جس کا وقوع اس عالم میں ہوا۔اور فرح آخرت جدا ہے۔

سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ (اللہ تعالیٰ کی آپ پر رحمت نازل ہو۱۲) کی حکایت ہے کہ جب آپ کا جنازہ لے چلے تو آپ کے ایک مرید شدت غم کی حالت میں یہ پڑھنے لگے۔

سرو سیمینا بصحرائے مے روی   سخت بے مہری کہ بے ما میروی

ترجمہ:اے محبوب آپ جنگل میں جارہے ہیں سخت بے مہری ہے کہ بغیر ہمارے جارہے ہیں)

اے تماشا گاه عالم روئے تو   تو کجا بہر تماشا میروی

ترجمہ:(اے محبوب آپ کا رخ انور جہان کا تماشا گاہ ہے۔آپ تماشا کے لئے کہاں جارہے ہیں

کتاب میں لکھا ہے کہ کفن سے باہر آپ کا ہاتھ نکل آیا۔اس کے بعد انہیں اشعار پڑھنے سے روک دیا گیا۔پھر ہاتھ اسی طرح کفن میں برابر ہوگیا۔اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے ایسے شخص کے اطمینان کا۔

کوئے نو میدی مرد کامید ہاست   سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست

(ناامیدی کی راہ نہ جاؤ بہت سی امیدیں ہیں۔تاریکی کی طرف نہ چلو بہت سے آفتاب ہیں۔یعنی ناامید اللہ تعالیٰ سے نہ ہو بلکہ امیدیں رکھو۱۲)

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زنده شد بعشق   ثبت است برجریده عالم دوام ما

ترجمہ:(جس کو عشق حقیقی سے روحانی حیات حاصل ہوگئی وہ اگر مر بھی جاوے تو واقع میں بوجہ اس کے کہ اس کو لذت قرب علی وجہ الکمال حاصل ہو جاتی ہے اس لئے اس کو زندہ رکھنا چاہیے۱۲)

وہاں نہ حزن ہے نہ غم ہے یہ فقط اس نام پاک کی برکت ہے۔

اللہ اللہ ایں چہ شیریں است نام   شیر و شکر مے شود جانم تمام

(اللہ اللہ کیا شیریں نام ہے میری تمام جان شیر وشکر ہوئی جاتی ہے ۱۲)

تو صاحب یہ نام تھوڑا ہے دل کے بہلانے کو اس میں دل بہلاؤ اس کے بعد تمہیں کسی اور چیز کی کیا حاجت ہے۔

آنکس[1] کہ ترا شناخت جاں را چہ کند   فرزند و عزیز و خانماں راچہ کند

مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ اب حق تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ وہ فہم اور توفیق عمل کی عطا فرماویں۔ آمین

تمت بالخیر

---

[1] جس شخص کو آپ کی معرفت حاصل ہوگئی اس کو جان اور فرزند واسباب کی پرواہ نہیں ۱۲)

ہفت اختر کا چوتھا وعظ

روح الافطار

وعظ ہذا ۲۳؍ رمضان المبارک ۱۳۳۳ھ کو جمعہ کے روز جامع مسجد تھانہ بھون میں روح الافطار کے موضوع پر تین گھنٹہ تک بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً پانچ سو تھی۔ مولانا عبدالحلیم صاحب مرحوم نے اسے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہ' و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتو کل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ' و نشھد ان سیدنا و مولانا محمد اً عبدہٗ ورسولہ صلی اللّٰہ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم'

امابعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم'

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم o

قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ○ (المائدہ:۱۱۴)

ترجمہ: (عیسیٰ ابن مریمؑ نے دعا کی کہ اے اللہ اے ہمارے پروردگار ہم پر آسمان سے کھانا نازل فرمایئے کہ وہ ہمارے لئے یعنی ہم میں جو اول ہیں اور بعد ہیں سب کے لئے ایک خوشی کی بات ہو جائے اور آپ کی طرف سے ایک نشان ہو جائے آپ ہم کو عطا فرمایئے اور آپ سب عطا کرنے والوں سے اچھے ہیں ۱۲)

تمہید

یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ یہ رمضان کا مہینہ ہے جس کے متعلق اب تک ہر جمعہ میں کچھ مضامین بیان کئے گئے ہیں کہ جن کا حاصل ان عبادات کی ارواح واسرار تھا جو مخصوص ہیں اس ماہ مبارک کے ساتھ۔ اگر اس جمعہ کے بعد دوسرے جمعہ کا آنا متیقن ہوتا تو جو مضمون اس وقت بیان کرنا مقصود ہے اسی جمعہ میں بیان کیا جاتا۔ یعنی عید کے متعلق بیان کرنا ہے اور عید کا ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔ ہمارے یہاں چونکہ تیس کا چاند دیکھا گیا اس لئے جمعہ کا آنا بھی محتمل ہے اور جہاں انتیس کا چاند دیکھا گیا وہاں تو یقیناً اب کا جمعہ رمضان کا نہ ہوگا۔ اس لئے عید کے متعلق آج ہی بیان کئے دیتا ہوں۔ اب تک ان طاعات کی روح ذکر کی گئی ہے جو رمضان کے اندر ہیں۔ اب چونکہ رمضان ختم ہونے کو ہے۔ لہذا آج اس عبادت کے متعلق بیان ہوگا جو اس کے بعد ہے اور لہذا اسی طرز پر عید کی روح کے متعلق بیان ہوگا تا کہ جو غایت ان طاعات کی روح معلوم کرنے سے ہے اسی غایت کا لحاظ عید میں بھی کر لیں اور احکام فرعیہ عید کے اس وقت بیان نہیں کئے جائیں گے کہ بارہا بیان ہو چکے ہیں۔ اب بھی اگر کسی کو یاد نہ رہے ہوں اور ضرورت ہو تو پوچھ لے۔ ہاں چاہے تبعاً وضمناً بیان ہو جائیں تو مضائقہ نہیں۔

افطار اکبر

اور مطلب اس غایت کے لحاظ کرنے کا یہ ہے کہ عید صرف کھانے پینے ہی کا نام نہ سمجھیں بلکہ اس میں علاوہ فرحت حسیہ صوریہ کے جو ایک فرحت روحانیہ شرعیہ الہیہ بھی ہے اس کا بھی لحاظ کر لیں کہ جس طرف جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے **للصائم فرحتان فرحة عند الافطار و فرحة عندلقاء الرحمن (سنن النسائی کتاب الصیام باب:۴۱، مسند احمد ۲: ۲۵۷' کنز العمال: ۲۳۵۹۳)** جس کا بیان آتا ہے یعنی روزہ دار کو دو فرحتیں ہوتی ہیں ایک افطار کے وقت دوسری فرحت لقاء رب کے وقت جو آخرت میں ہوگی اور اس حدیث میں گو ظاہراً روزمرہ کے افطار کا ذکر ہے لیکن قیاس کہیے یا دلالۃ النص کے اعتبار سے سمجھئے لفظ کا عموم لیجئے اس میں دوسرے افطار پر بھی دلالت ہے یعنی افطار اکبر۔ سو اسکا بھی یہی حکم ہے اس اعتبار سے اس افطار اکبر کے باب میں یہ بھی ارشاد ہوگا کہ اس افطار کے وقت بھی ایک فرحت ہوتی ہے۔

فرحت روحانیہ

باقی یہ کہ افطار کے وقت کس بات کی خوشی ہوتی ہے سو ایک خوشی تو اہل ظاہر کو ہے کہ کھانا پینا

ملااور ایک خوشی افطار کے وقت اہل حقیقت کو ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ کی توفیق سے عبادت تام ہوئی۔ یہ ہے وہ فرحت روحانیہ جس کا لحاظ فطرا کبر یعنی عید کے روز بھی کرنا چاہیے۔ اور اسی پر کیا منحصر ہے شریعت میں تو تمام احکام کے متعلق مصالحہ دنیویہ واخرویہ دونوں موتوع (امانت رکھا گیا ۱۲) ہیں تا کہ جو جس کا مذاق ہے اپنے مذاق کے موافق خواہ دینی یا دنیوی مصلحت سمجھ کر ہر طرح اس کا امتثال کر ہی لے۔ اہل صورت کا خیال صورت کی طرف جاتا ہے اہل معنی کا ذہن کی طرف منتقل ہوتا ہے اور جو جامع ہیں ان کو دونوں کا لحاظ ہوتا ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت رابہ بوار باب معنی را

(اس کے عالم حسن کی بہار ظاہر پرست لوگوں کے دل و جان کو اپنے حسن صوری سے اور حقیقت پرست لوگوں کے دل وجان کو اپنے حسن معنوی سے تروتازہ رکھتی ہے ۱۲)

یہی شریعت مقدسہ کی کیفیت ہے کہ صورت و معنیٰ دونوں کی جامع ہے یعنی مصالح دینیہ ومصالح دنیویہ دونوں کی رعایت ہے لیکن اصل مقصود ان میں مصالح دینیہ ہیں۔ ہاں مصالح دنیویہ بھی اس پر مرتب ہوجاتے ہیں۔

مثال دنیاوآخرت

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دنیاوآخرت کی خوب مثال بیان فرمائی۔ فرمایا کہ دنیاوآخرت مثل شخص اوراس کے ظل کے ہیں کوئی سایہ کو پکڑنا چاہے ہاتھ نہیں آسکتا۔ اس کی یہی صورت ہے کہ اس شخص کو پکڑلو جس کا یہ سایہ ہے۔ پھر دیکھو اگر تم اس سایہ کو دھکے بھی دو تب بھی نہ جائے گا اور یوں تو ساری عمر برباد کردو گے کبھی ہاتھ نہ آئے گا اور اسی ظلیت سے ناشی ہے وہ واقعہ یہ کہ سیدنا حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ تیز اور لطیف المزاج بزرگ جو لطیف ولذیذ کھانے کھایا کرتے تھے اور نہایت نفیس لباس پہنا کرتے تھے۔ مگر اس کا اہتمام نہ تھا خود بخود حق تعالیٰ دے تو انکار بھی نہ تھا۔ ؏ ہرچہ از دست میرسد نیکوست

(جو کچھ محبوب حقیقی عطا کریں وہ اچھا ہے ۱۲) کیونکہ وہ حضرات مکمبل یعنی کمبل اوڑھنے والے نہ تھے وہ مکمل تھے یہ بات بھی کمال کے خلاف نہیں تھی تو نکتہ اس میں حضرت نے یہ فرمایا کہ نعمائے دنیا ظل (سایہ) ہیں نعمائے اخریٰ کا اور نعمائے اخریٰ (آخرت کی نعمتیں ۱۲) کے متعلق ارشاد ہے وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ اور حرص کرنے والوں کو ایسی چیز کی حرص کرنا چاہیے ۱۲) ان

حضرات کونعمائے دنیا(دنیا کی نعمتیں ۱۲) میں عکس نظر آتا تھا۔ نعمائے آخرت کا اور وہ لطف آتا تھا جو نعمائے آخرت میں ہوگا۔ان لذتوں کے حاصل کرنے کے لئے یہاں کی لذت اختیار کرتے تھے ہمارے فقہاء بھی مثل صوفیہ کے حکماء ہیں بلکہ حقیقت میں بھی دوگروہ حکماء ہیں ایک صوفیہ دوسرے فقہاء تو صوفیہ نے بھی اس کو سمجھا کہ وہاں کی لذتوں کا نمونہ ہے اور فقہاء نے بھی اس کو سمجھا چنانچہ صاحب ہدایہؒ جن کی عادت ہے کہ ہر مسئلہ کی ایک دلیل نقلی بیان فرماتے ہیں اور ایک عقلی جہاں یہ مسئلہ تحریر فرماتے ہیں کہ حریر چار انگل تو جائز ہے اس سے زیادہ جائز نہیں۔ چار انگل اس طور پر کہ سنجاف یا بیل عمامہ یا ٹوپی یا اور کسی کپڑے میں لگالے تو کچھ حرج نہیں۔اول اس کی دلیل نقلی ارشاد فرمائی اس کے بعد حکمت عقلیہ یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ نمونہ ہے۔ لباس اہل جنت کا کیونکہ لِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ (جنت میں ان کا لباس ریشمی ہوگا ۱۲) تا کہ تھوڑا دیکھ کر وہ یاد آوے اور اس کے حاصل کرنے کی رغبت ہو اور اس کا حصول موقوف ہے۔ اعمال صالحہ پر لہذا جب اس کی رغبت ہوگی تو اعمال صالحہ کی بھی رغبت ہوگی۔ سبحان اللہ حریر پہن رہے ہیں اور سلوک طے کر رہے ہیں۔غرض یہاں کی نعمتیں ظل ہیں نعمائے آخرت کا حضرت فرماتے تھے کہ اگر کسی شخص کا سایہ اچھا معلوم ہوتا ہے تو اس شخص پر قبضہ کرلو تو پھر وہ سایہ ایسا ہے کہ دھکے دینے سے بھی نہیں جائے گا۔

طریق حصول دنیا

اسی طرح اگر دنیا چاہتے ہو تو آخرت اختیار کرلو۔ آخرت کے ساتھ دنیا کی یہ حالت ہے کہ **اتته الدنیا وھی راغمة** (دنیا کا ناک رگڑتی ہوئی آنا) دنیا خاک میں ملتی ہوئی اور ناک رگڑتی ہوئی آوے گی۔

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے **اتته الدنیا وھی راغمة** کا مصداق دیکھا۔مولانا محمد قاسم صاحبؒ حجرہ میں تشریف رکھتے تھے بڑے بڑے معزز لوگ نواب ورؤسا زیارت کو حاضر ہوتے تھے وہاں کسی سے پوچھا کب تشریف لائیں گے۔اس نے کہا اب تھوڑی دیر میں نکلیں گے۔حجرہ کے آگے ایک چٹائی بچھی تھی۔جس پر کبھی جھاڑو نہیں ہوئی تھی۔سیروں گرد پڑی ہوئی تھی۔ وہاں بھلا کیوں جھاڑو ہوتی جن کا مذاق یہ تھا کہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے کہ جو مسجد میں بہت دبا دبا کے جھاڑو دیتے ہیں ہمیں بھلا نہیں معلوم ہوتا۔اتنا تو کرے کہ خدا کے سامنے خاکساری کی شکل تو بنالے وہ سجدہ ہی کیا ہوا جس میں ماتھے اور ناک میں مٹی نہ بھرے۔بس کچی زمین ہو مٹی ناک کو ماتھے کو ہاتھوں کو اور تمام مواضع سجدہ کو لگتی ہو۔

ہمارا تو اسی میں جی بھلا ہوتا ہے تو جن کا یہ مذاق ہو ان کی چٹائی پر کون جھاڑو دے وہ رؤسا اسی چٹائی پر بیٹھ جاتے تھے اور کھلی آنکھوں نظر آتا تھا کہ اتته الدنیا و هی راغمة (اس کے پاس دنیا ناک رگڑتی ہوئی آتی ہے ۱۲) کہ اہل دنیا خاک آلودہ ہوتے تھے۔ حقیقت میں اسی حدیث سے معلوم ہوا کہ دھکیلنے سے بھی نہیں نکلتی۔

ع گرنستانی بہ ستم میرسد (اگر خوشی سے نہ لوتو زبردستی پہنچتی ۱۲)

دنیا کا آنا اہل دنیا کا آنا ہے بلکہ جو مجاذیب (مجذوب ۱۲) ہیں وہ تو دنیا کو ہاتھوں سے بھی نکالتے ہیں زبان سے بھی نکالتے ہیں دل سے بھی نکالتے ہیں ہاتھ سے تو اس طرح کہ کہیں گھونسے سے خبر لیتے ہیں۔ کبھی مارتے ہیں اور زبان سے یہ کہ برا بھلا کہتے ہیں۔ گالیاں دیتے ہیں۔ اور دل سے یہ کہ نفرت کرتے ہیں انہیں برا سمجھتے ہیں۔ لیکن لطف یہ ہے کہ جہاں زبان سے کسی کو برا بھلا کہا یا مارا پیٹا وہاں اس کا کام بن گیا۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ کے متعلق لوگوں کا خیال یہ تھا کہ جب تک تیزی سختی کرتے تھے تو لوگوں کا کام بن جاتا تھا۔ جب سے نرمی اور خوش اخلاقی برتنے لگے لوگوں کا کام ہونا بند ہو گیا۔ چنانچہ بعضے مجاذیب کے یہاں بھی کام ہو جانے کی یہ علامت ہے کہ دھکے دے دیئے کام ہو گیا اور باوجود اتنی بدمزاجیوں کے لوگ پھر بھی ان کے پاس جاتے ہیں۔ وہ دنیا کو نکالتے ہیں اور نہیں نکلتی اسی سے حضرت فرماتے تھے اگر کوئی طالب دنیا ہو تو تارک دنیا ہو جائے۔ کیونکہ اس کی وہ حالت ہے جو بے حیا فاحشہ عورتوں کی ہوتی ہے کہ اگر کوئی ان کے پیچھے پھرے تو نخرے کرتی ہیں اور اگر کوئی ان سے پھرے تو یہ اس کے پیچھے پھرتی ہیں کہ شکار نکلنے نہ پائے۔ یہی کیفیت دنیا کی ہے کہ اگر اس کے پیچھے پیچھے پھرو تو نخرے کرتی ہے اور ہاتھ نہیں لگتی اور اگر اسے چھوڑ دو پیچھے پیچھے آتی ہے۔

عارفے خواب رفت در فکرے دید دنیا بصورتے بکرے

ایک عارف نے دنیا کو کنواری لڑکی کی صورت میں خواب میں دیکھا۔

کرد ازوے سوال کائے دلبر بکر چونی بایں ہمہ شوہر

اس سے پوچھا کہ اتنے تو تیرے خصم اور تو اب تک باکرہ ہی رہی۔

گفت یک حرف باتو گویم راست کہ مرا ہر کہ بود مرد نہ خواست

وانکہ نامرد بود خواست مرا زاں بکارت ہمیں بجاست مرا

اس نے کہا بات یہ ہے جو مرد تھے انہوں نے منہ نہیں لگایا اور جنہوں نے منہ لگایا وہ نامرد تھے۔ اس لئے میں ویسی ہی ہوں۔ بہرحال جو اس سے بھاگتے ہیں یہ ان کے پیچھے پیچھے پھرتی ہے۔ لیکن للہ اس کو کوئی تجارت اور دنیا کمانے کا طریقہ نہ سمجھے کہ بہت سہل ترکیب معلوم ہوئی۔ بس دنیا کو چھوڑ دیں گے وہ خود حاصل ہو جائے گی۔ اس سے ہرگز دنیا حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ جب تم دنیا کو اس نیت سے چھوڑو گے تو تم طالب دنیا ہوئے تارک دنیا کہاں ہوئے یاد رکھو اگر ایسا کرو گے تو روٹی بھی نہیں ملے گی۔ یہ وہی بات ہوئی کہ ایک مولوی صاحب نے وعظ میں بیان کیا کہ ایک دو تو دس ملیں۔ ایک احمق کہنے لگا کہ مولوی صاحب آپ نے تو بڑی اچھی تجارت بتلائی کہ جس قدر اس میں نفع کہ نہ پانچ روپے سینکڑہ نہ دس روپے سینکڑہ نہ سو روپے سینکڑہ ایک دم سے ہزار روپے سینکڑہ بس اب سے یہی کریں گے۔ میاں کے پاس ایک روپیہ تھا جھٹ کسی فقیر کو دے دیا اور منتظر ہوئے کہ اب ملیں دس روپے اب ملیں۔ وہ نہ آج ملتے ہیں نہ کل اپنے دل میں خیال کرنے لگا کہ مولوی صاحب بڑے جھوٹے تھے۔ خواہ مخواہ میرا روپیہ بھی کھوایا۔ اسی غم میں بیچارے کو پیچش ہو گئی۔ ہر وقت دستوں کا سلسلہ۔ بیچارہ جنگل جاوے ہگ آوے ایک بار ایک کھیت کے کنارے بیٹھا ہگ رہا تھا۔ ہگ چکا تو استنجے کے لئے ڈھیلا اٹھایا ایک ڈھیلے کے نیچے سے ایک بٹوہ نکلا۔ کھول کر دیکھا تو پورے دس روپے تھے۔ بڑے خوش ہوئے مولوی صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ مولوی صاحب تم سچ کہتے تھے کہ ایک کے دس ملتے ہیں چنانچہ میں نے ایک روپیہ دیا تھا دس روپے مل گئے مگر بھئی مروڑے بڑے غضب کے ہیں۔ ان کی مجھے برداشت نہیں ہوتی۔ تم نے مجھ سے پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا کہ ایک کے دس ملتے ہیں اور ساتھ ہی اس کے مروڑے ہوتے ہیں تاکہ کبھی میں ایسا نہ کرتا میرا تو ناک میں دم ہو گیا۔ معاف رکھو میں ایسی تجارت سے باز آیا۔ تو حضرت اسے تو گو نیت بخیر نہ تھی مگر مل گیا۔ مگر یاد رکھو تمہیں سوائے مروڑوں کے کچھ نہیں ملے گا۔

حقیقت توکل

اسی طرح کسی اور احمق نے ایک مولوی صاحب سے وعظ میں سن لیا تھا کہ توکل میں سب کچھ ملتا ہے۔ بس سب چھوڑ چھاڑ جنگل میں سڑک کے کنارے جا بیٹھا۔ سڑک کے کنارے ایک کنواں بھی تھا۔ مسافر آتے تھے کنویں پر بیٹھ کر اس کی طرف سے منہ پھیر کر کھانا کھا کر یہ جا اور وہ جا یہ حضرت یونہی منہ تکتے رہ جاتے۔ اسی طرح تین چار دن گزر گئے۔ اب تو میاں کے دم پر بن گئی

کہ معلوم ہوتا ہے کہ میں یہیں اسی حالت میں مروں گا۔ اتفاقاً ایک اور شخص آیا وہ بھی اسی طرح کھا پی کر چلنے لگا آپ کہتے ہیں اوںھ اوںھ (کھنکار کی آواز) اس نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا رحم آ گیا جو روٹیاں بچی تھیں انہیں دیکر چلا گیا۔ انہوں نے کھائی جب ذرا جان آئی تو آئے مولوی صاحب کے پاس اور کہا کہ مولوی صاحب آپ نے یوں تو کہا کہ توکل میں اسباب ترک کرنا پڑتے ہیں مگر یہ کہنا شاید آپ بھول گئے کہ کھنکارنا بھی پڑتا ہے۔ وہ تو کہئے تین چار دن کے بعد میں نے اپنے اجتہاد سے معلوم کر لیا تھا ورنہ ہلاک ہی ہو جاتا۔ مہربانی فرما کر اب جہاں کہیں توکل کے متعلق بیان فرمائیے گا یاد کر کے ضرور ضرور یہ بھی بیان فرما دیا کیجئے کہ کھنکارنا بھی پڑتا ہے۔ تو بات یہ ہے کہ انہوں نے نکما بننے کو توکل سمجھا ہے۔ گنگوہ کا ذکر ہے کہ ایک بزرگ نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ کچھ کام کرو جس سے آئندہ گزر کی صورت ہو انہوں نے کہا کہ آپ حضرت مولانا کو نہیں دیکھتے کہ وہ کچھ بھی کام نہیں کرتے اور پھر کیسی چین سے بسر ہوتی ہے انہوں نے کہا کہ ان کا سا کمال بھی تو پیدا کرو۔ افسوس ان کے کمال کی حرص نہ ہوئی۔ پھر یہ کہ خدمت کرنے والوں کی حرص نہ ہوئی بڑے ہی کم ہمت ہو کہ بدون کمال مخدوم بننا چاہتے ہو اور ان کی مخدومیت تو منجانب اللہ ہے۔ یہ تدبیر تھوڑا ہی ہے مخدومیت کی۔ ورنہ اگر اس نیت سے کرے کہ یہ تدبیر ہے معاش کی تو وہ توکل نہیں ہے۔ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ کوئی ایسا تعویذ بتا دو جس سے امراء مسخر ہو جاویں جب میں نے سمجھایا تو کہنے لگے کہ پھر کوئی تدبیر بتا دو کہ توکل ہی پیدا ہو جاوے تاکہ دنیا سے بے فکری ہو جائے۔ غرض مطلوب تو دنیا ہی ہے خواہ تحصیل کے ذریعہ حاصل ہو یا ترک کے ذریعہ سے حضرت منصور کا مذاق تو یہ تھا کہ بعض مخلصین پر بھی گرفت کرتے تھے ایک مرتبہ کسی سالک سے انہوں نے پوچھا کیا کر رہے ہو انہوں نے کہا مقام توکل کی تصحیح کر رہا ہوں۔ فرمایا افسوس اب تک پیٹ ہی کی فکر میں ہو۔ کیونکہ پیٹ کی فکر نہ رہنے کی فکر بھی پیٹ ہی کی فکر ہے کیونکہ پیٹ کی فکر اطمینان کے لئے کرتے ہیں اور توکل سے بھی اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ بھی پیٹ ہی کی فکر ہے یہ تو بتلاؤ کہ اصلی کام یعنی مشاہدہ جمال میں کب لگو گے۔

عبداللہ

تو غرض دنیا کی نیت سے جو دین کا کام کرو گے تو وہ بھی دنیا ہی ہو جائے گی۔ پھر وہ برکت کہاں۔ برکت تو اللہ کے واسطے کرنے میں ہے جو لوگ اللہ واسطے دنیا کو چھوڑتے ہیں وہاں دنیا کی

نیت تو کیا ہوگی ثمرات باطنیہ کی بھی نیت نہیں ہوتی نہ کیفیات کا انتظار ہوتا ہے نہ احوال کی توقع ہوتی ہے اور اگر کسی کو ہے تو وہ عبدالحال ہے۔ عبدالثمرات ہے۔ عبدالکیفیات ہے وہ عبداللہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر حال نہ ہوتا وہ عبادت نہ کرتا۔ اور طلب حال کی دو صورتیں ہیں ایک تو دعا ہے کہ حال ہو اس کا کچھ حرج نہیں اور ایک یہ کہ اعمال ہی سے نیت یہ ہو کہ حال ہو یہ خلاف طریقت ہے چنانچہ اگر کوئی نماز پڑھ کے دعا کرے کہ سو روپے مل جاویں تو اس میں تو حرج نہیں اور واقعی یہ نماز اللہ ہی کے لئے ہے اور اگر خود نماز ہی سے یہ نیت ہو کہ سو روپے ملیں گے تو یہ نماز اللہ کے لئے نہیں ہے۔ یہ سو روپے کے لئے ہے۔ اسی طرح اگر اللہ کا نام اس نیت سے لیتا ہے کہ لذت ہو تو وہ عبداللذات ہے۔ خوب سمجھ لو۔ پس بعض لوگ تو طلب لذت کو مطلقاً برا نہیں سمجھتے اور بعضے مطلقاً برا سمجھتے ہیں۔ لیکن تحقیق یہ ہے کہ اعمال میں اس کی نیت رکھنا تو مذموم ہے لیکن مستقل طور پر دعا سے طلب کرنا جائز ہے۔ گو وہ خلاف مصلحت واقع میں ہو اگر ایسا ہوگا حق تعالیٰ خود ہی عطا نہ فرماویں گے جیسے عموماً دعاؤں میں یہی عادت ہے۔ لیکن مانگنے میں کچھ قبح نہیں۔ پس خدا کا نام تو خدا ہی کے لئے لینا چاہیے ؎

از خدا غیر خدا را خواستن　　　ظن افزونی است کلی کاستن

خدا کا نام دوسری چیز کے مانگنے کی نیت سے لینا تنزل ہے۔ اللہ کا نام تو اس واسطے ہے کہ اللہ راضی ہو۔

اعتبار ترک دنیا

خلاصہ یہ ہے کہ جب ذکر و عمل سے قصد ثمرات باطنہ بھی غیر محمود ہے تو قصد دنیا تو اس ذکر و عمل توکل وغیرہ سے کہاں محمود ہوگا۔ پس ترک دنیا وہ معتبر ہے جو واقع میں ترک ہو یہ نہیں کہ بظاہر ترک اور واقع میں طلب ایک بغدادی صاحب کانپور آئے تھے ان کے پاس غنا کا عمل تھا۔ ایک حکیم صاحب نے ان سے اس کے سکھانے کی درخواست کی اصرار کے بعد انہوں نے لکھا کر اس کی تعریف کی کہ اس سے اگر کبھی غنائے ظاہری بھی نہیں حاصل ہوا تو غنائے باطنی تو ضرور ہی حاصل ہو گیا ہے کبھی خالی نہیں گیا۔ وہ درود شریف کا عمل تھا۔ یہ سن کر بس حکیم صاحب پھیکے پڑ گئے کہ غنائے باطنی کا مطلب تو یہ ہے کہ دنیا نہ ملے گی۔ مگر جی میں ٹھنڈک پڑ جائے گی۔ ارے ظالم غنائے ظاہری تو غنائے باطنی ہی کے لئے مطلوب ہے۔ اگر وہ بغدادی صاحب یوں کہہ دیتے کہ

پہلے غنائے باطنی حاصل ہوگا پھر غنائے ظاہری بھی حاصل ہو جائے گا تو شاید حکیم صاحب کچھ وقعت کرتے۔ تو حاصل یہ ہے کہ وہ ترک دنیا معتبر نہیں جس میں مقصود طلب دنیا ہو۔ واقعی ترک دنیا وہ ہے جس سے مقصود بھی ترک دنیا ہو۔ پس ایسے ترک سے دنیا سایہ کی طرح ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ بہر حال ثابت ہو گیا کہ دنیا ظل ہے آخرت کا حدیث شریف میں ہے۔ **من جعل همومه هما واحدً اهم الأخرة كفاه الله همومه' كلها** (سنن ابن ماجة: ۲۵۷، **المستدرک للحاکم** ۲:۴۴۳، **مشكوة المصابيح**: ۲۶۳) یعنی جس نے اپنے تمام افکار کو ایک ہی فکر بنا لیا یعنی فکر آخرت اللہ تعالیٰ اس کے تمام افکار کو کفایت فرماتا ہے۔ **ومن تشعبت به هموم الدنيا** اور جس پر ہموم دنیا نے ہجوم کر دیا **لم يبال الله فى اى اودية هلک** خدا کو کچھ پرواہ نہیں کہ وہ اس کے کس جنگل میں ہلاک ہوگا۔ بہر حال حدیث سے بھی ثابت ہو گیا کہ ترک دنیا کے بعد دنیا خود حاصل ہو جاتی ہے اور قرآن سے بھی ثابت ہے فرماتے ہیں وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا جو اللہ سے ڈرتا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ ایک راستہ نکال دیتے ہیں مگر اس کے یہ معنی نہ سمجھنا کہ نوکری کی ضرورت نہیں رہے گی زراعت وتجارت کی حاجت نہیں رہے گی۔

حقیقت اسباب رزق

اس کے معنی ایک مثال سے واضح ہو جائیں گے زراعت وتجارت ملازمت کی مثال زنبیل گدائی کی سی ہے۔ حق تعالیٰ کا معاملہ اکثر یہ ہے کہ جو شخص جو زنبیل پھیلاتا ہے حق تعالیٰ اسی میں عطا کرتے ہیں۔ ہاں بعض کو بے زنبیل لائے بھی دیتے ہیں۔ دیکھو دنیا میں بھی دینے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ کھانا دے دیا مگر شرط یہ کہ اپنا برتن لاؤ۔ ایک یہ کہ کھانا مع برتن دے دیا۔ پس جس طرح زنبیل لانے پر کھانا ملنے میں معطی (عطا کرنے والا ۱۲) سب اس جواد ہی کو سمجھتے ہیں زنبیل کو کوئی موثر نہیں سمجھتا چنانچہ اس صورت میں اگر کوئی زنبیل سے کھانا نکال کر کہنے لگے کہ یہ تو خود بخود میرے برتن میں سے نکلا کسی نے اس میں ڈالا نہیں تو یہ اس کی حماقت ہے اور اسے کہا جائے گا ارے بیوقوف برتن میں کیا تھا۔ وہ تو محض ظرف ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے بھی کسی مصلحت سے قانون مقرر کر دیا ہے کہ اپنا برتن لاؤ اور لے جاؤ۔ تو یہ تجارت وملازمت وزراعت برتن ہیں۔ اب اگر کوئی کہنے لگے کہ خدا نے نہیں دیا وہ تو میری ملازمت یا تجارت یا زراعت سے پیدا ہوا تو جس طرح وہ بیوقوف ہے یہ بھی احمق ہے اور یہ تو قارون کا مذہب ہے۔ اور اس نے اپنے مال کو کہا تھا

کہ خدا نے نہیں دیا بلکہ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ میرے پاس ایک ہنر ہے اس کی بدولت مجھے یہ حاصل ہوا۔ بعضوں نے ہنر کی تفسیر میں کہا ہے کہ وہ کیمیا گر تھا۔ بعضوں نے کہا ہے کہ بہت بڑا تاجر تھا۔ بہرحال اپنے مال کو ہنر کی طرف منسوب کرتا تھا۔ تو یہ قارون کا مذہب ہے کہ علت حقیقیہ رزق کی نوکری یا زراعت یا تجارت کو قرار دے خوب سمجھ لو کہ یہ کاسہ گدائی ہیں خدا کی عادت غالبہ یہ ہے کہ برتن لاؤ تو دیں گے تجارت کر دیا نوکری یا زراعت وہی دیتے ہیں۔ اسباب تو نظر آتے ہیں اور وہ مسبب نظر نہیں آتا۔

عشق من پیداو معشوقم نہاں   یار بیروں فتنہ اودر جہاں

فتنہ غلبہ حال اور جوش میں کہہ گئے مراد تصوف اور جہاں (اس کا تصرف جہان میں ۱۲) ہے یار تو جہان سے باہر ہے مگر اس کا تصرف جہان کے اندر ہے اور وہ خود نظر آتا ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

ماہمہ شیراں ولے شیر علم   حملہ شاں از باد باشد دمبدم

(ہماری ایسی مثال ہے جیسے پرچم کا شیر ہوتا ہے ہوا چلنے سے حملہ کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے یعنی ہمارا تصرف تصرف حق کی وجہ سے ہے ۱۲)

علم یا پرچم پر اژدھے یا سانپ یا شیر کی تصویر بنا دیتے ہیں تاکہ جس وقت ہوا سے کپڑا ملے تو وہ حملہ کرتا ہوا معلوم ہو اور اچھا لگے۔

حملہ شاں پیدا و ناپیداست باد   آنکہ ناپیداست ہرگز کم مباد

ان کا حملہ نظر آتا ہے حملہ کرانے والی (یعنی ہوا) نظر نہیں آتی۔ (آگے بطور دعا کے فرماتے ہیں جو چیز نظر نہیں آتی یعنی موثریت حق۔ وہ ہمارے دل سے کبھی کم نہ ہو ۱۲) اسی طرح ہماری بھی حالت ہے کہ۔

رشتۂ درگردنم افگندہ دوست   مے برد ہر جا کہ خاطر خواہ است

انہوں ہی نے یہ حرکات پیدا کر رکھی ہیں (جس طرف چاہتے ہیں متحرک کر دیتے ہیں ۱۲) اس کی علت حقیقیہ دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں۔

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست   ور بجہل آئیم مازندان اوست

(یعنی اگر ہم جہل میں مبتلا رہیں تو یہ ان کا زندان ہے یعنی حق تعالیٰ کا تصرف ہے کہ مجلس جہل سے نہیں نکلے اور اگر علم تک ہماری رسائی ہو جاوے تو یہ بھی ان کا ہی ایوان ہے کہ درجہ علم ان

کے تصرف سے عطا ہوا۱۲)

گر بخواب آئیم مستان وئیم　　　　در بہ بیداری بدستان وئیم

(یعنی اگر سور ہیں تو ان ہی کے بیہوش کئے ہوئے ہیں اور اگر جاگ اٹھیں تو بھی ان ہی کی گفتگو میں ہیں یعنی یہ قوت بیانیہ ان ہی کی عطا فرمائی ہوئی ہے۱۲)

یہ تو متعلق حالات ہیں ایک حالت تردد وعدم تعین کسی شق کی ہے اسے بھی خود ہی فرماتے ہیں۔

درتردد ہر کہ او آشفتہ است　　　　حق بگوش آور معمہ گفتہ است

یعنی جو شخص کسی تردد میں پریشان ہو رہا ہے گویا حق تعالیٰ نے اس کے کان میں کوئی معمہ کہہ دیا ہے۱۲)

ایک اور بزرگ کہتے ہیں۔

بگوش گل چہ سخن گفتۂ کہ خندان است　　　　بعندلیب چہ فرمودۂ کہ نالان است

(گل سے کیا کہہ دیا کہ خنداں ہو رہا ہے اور بلبل سے کیا فرما دیا ہے کہ نالاں ہے۱۲)

وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى وہی ہنساتے ہیں اور وہی رلاتے ہیں۔اس کا ترجمہ عاشقانہ الفاظ میں یہ ہے۔

گوش گل چہ سخن گفتۂ کہ خندان است　　　　بعندلیب چہ فرمودۂ کہ نالاں ست

واقعی یہ سب انہیں کے تصرفات ہیں۔ہاں تو رزاق نظر نہیں آتا ہے رزق نظر آتا ہے۔یہ حضرت یوں ہی سمجھے کہ رزاق کوئی ہے ہی نہیں۔دیکھو مشین ٹکٹ کی ہے کہ دو پیسے ڈالنے سے پلیٹ فارم کا ٹکٹ نکل آتا ہے اب کوئی سمجھے کہ بغیر کسی کے ڈالے ہوئے مشین ہی سے ٹکٹ نکلتے ہیں۔تم دو تین دن ٹھہر جاؤ اور تمہارے اس غلط خیال کی اطلاع ٹکٹ کلکٹر کو ہو جاوے اور وہ تمہاری اس غلطی کے رفع کرنے کے لئے ٹکٹ نہ ڈالے پھر دیکھیں ٹکٹ کیسے نکلتے ہیں۔اگر یہی شجر الاٹکاٹ (ٹکٹوں کا درخت۱۲) تھا تو اب اس میں سے ٹکٹ کہاں گئے معلوم ہوتا ہے کسی کے ڈالنے سے نکلتے ہیں۔اسی طرح تم یہ سمجھتے ہو کہ آنکھوں سے دکھائی اس لئے دیتا ہے کہ مجمع النور سے نور آنکھوں میں آتا ہے بتلاؤ اگر وہ نور کی نہر خشک ہو جائے تو کہاں سے لاؤ گے نور۔فرماتے ہیں قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ یعنی تمہارا پانی اگر اتر جاوے تو کون اسے نکال سکتا ہے۔ایک ملحد کی حکایت ہے جب اس نے یہ آیت سنی تو براہ اعتراض کہا کہ ناتی به بالمعول والمعین یعنی ہم کدال اور مزدوروں کے ذریعہ سے نکال لیں گے لیکن عادات الہیہ ہے کہ۔

حلم[۱] حق باتو موا سابا کند　　　چونکہ ازبگذری رسوا کند

نہ معلوم کب کی گستاخیاں جمع تھیں دریائے انتقام جوش میں آ گیارات کو یہ حضرت سوئے ایک غیبی فرشتے نے آ کر ایک طمانچہ مارااور کہا **قد ذهبنا بماء عينك فات به بالمعول والمعين** ہم نے تمہاری آنکھوں کا پانی اتار دیا اسے تم لے آؤ کدال اور مزدوروں سے بڑے مغرور تھے مجمع النور پر یہ نہ دیکھا کہ خود اس مجمع النور میں پیدا کس نے کیا ہے۔

مشرب ابراہیمی

ان فلسفیین ودہرین ومنجمین کی ایسی مثال ہے کہ جیسی ایک چیونٹی کسی کاتب کے کاغذ پر چلی اس پر حرف بنتے دیکھ کر کہنے لگی کیسے اچھے نقوش بن رہے ہیں دوسری نے کہا یہ خود بخود نہیں بن رہے ہیں بلکہ ایک قلم ہے وہ بنا رہا ہے تیسری نے کہا نہیں قلم نہیں بنا رہا ہے بلکہ ایک ہاتھ میں ہے وہ بنا رہا ہے۔ چوتھی نے کہا نہیں نہیں وہ ہاتھ نہیں بناتا بلکہ وہ ہاتھ ایک کلائی میں لگا ہوا ہے وہ کلائی بنا رہی ہے۔ حتیٰ کہ ایک حقیقت تک پہنچ گئی کہ اس نے کہا کہ وہ ایک شخص کا ہاتھ ہے وہ شخص بنا رہا ہے۔ تو فلاسفہ میں پہلی چیونٹی کی طرح حقیقت سے بالکل دور اور سب سے بدتر دہریین اہل سائنس ہیں۔ اس کے بعد دوسری چیونٹی کی طرح نجومی ہیں کہ یہ افلاک ونجوم کو متصرف سمجھتے ہیں اور عاقل اور حقیقت شناس ابراہیمی المشرب لوگ ہیں یعنی اہل ایمان ہیں کہ وہ متبع ہیں ابراہیم علیہ السلام کے چنانچہ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا اتباع کیجئے اور ابراہیم علیہ السلام کا مشرب یہ تھا کہ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا جب رات ہوئی ایک ستارہ کو دیکھا قَالَ هٰذَا رَبِّیْ تو کہا میں نے فرض کیا کہ یہ رب ہے یہ بطور مجازات خصم کے فرمایا۔ فَلَمَّآ اَفَلَ جب وہ چھپ گیا قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ وہ خدا کیسا جس کو زوال ہو میں ایسے خدا کو پسند نہیں کرتا فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّیْ جب چاند کو دیکھا تو کہا فرض کرو کہ شاید یہ ہو رب۔ فَلَمَّآ اَفَلَ جب وہ بھی ڈھل گیا فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ (فرمایا کہ اگر مجھ کو میرا رب ہدایت نہ کرتا رہے تو میں گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاؤں ۱۲) معلوم ہوا یہ بھی خدا نہیں فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ جب سورج کو دیکھا تو کہا یہ سب سے بڑا ہے اگر اس کی

---

[۱] اللہ تعالیٰ کی بردباری تمہارے ساتھ مواسات یعنی رعایت کرتی ہے جب تمہاری گستاخیاں حد سے بڑھ جاتی ہیں تو رسوا کرتے ہیں ۱۲)

خدائی باطل کردی تو سب کو پکڑ لیا۔ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ بَرِىْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (سو جب وہ بھی غروب ہو گیا آپ نے فرمایا اے قوم! بے شک میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں میں اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنیوالوں میں سے نہیں ہوں ۱۲) حضرت اسی طرح ہر مومن کی نظر مصداق اس قول کا ہے ''اول ما آخر ہر منتہی است'' (ہر منتہیٰ کا آخر ہماری ابتداء ہے ۱۲) یعنی اول ہی قدم میں لا الہ الا اللہ لا موجود الا اللہ. لا قادر الا اللہ . لا خالق الا اللہ (بجز اللہ کے کوئی معبود نہیں بجز اللہ کے کوئی موجود نہیں۔ بجز اللہ کے کوئی قادر نہیں۔ بجز اللہ کے کوئی خالق نہیں ۱۲) حاصل ہو جاتا ہے ہمیں پہلے ہی قدم میں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا جہاں تک یہ لوگ سینکڑوں ٹھوکروں میں بھی نہیں پہنچے۔ اب اہل ایمان سے زیادہ محقق کون ہو سکتا ہے۔

تاثیر تدبیر

سو یہ مذہب دہریین کا ہے کہ ہمارے کسب قوت ہے ہم تو کہتے ہیں کہ اگر کسب ہی علت تامہ (سبب کامل ۱۲) ہے تو ہم ایک ایسے شخص کی سوانح عمری پیش کر سکتے ہیں جو چھ پیسے روز کی مزدوری کرتا تھا۔ اپلے ڈھوتا تھا۔ ایک حالت اس پر آئی کہ وہ لکھ پتی ہو گیا۔ ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ تم نے کیونکر ترقی کی اس نے اپنی تمام سوانح عمری بتانا شروع کی کہ پہلے چھ پیسے روز کا مزدور تھا۔ پھر ترقی کرتے کرتے چھ آنے روز کا ہوا۔ پھر آٹھ آنے کا ہوا پھر نوکری کر لی پھر ٹھیکے لینا شروع کئے۔ اس میں اس طرح کرنے سے بیس برس کے اندر لکھ پتی بن گیا اب اس کی تمام سوانح عمری لکھ لو اور کسی ایسے شخص کو جو اس سے دونا کماتا ہو اسی طرح عمل کرا کے تم چالیس برس میں ہزار پتی ہی بنا کے دکھلا دو۔ ہرگز نہیں بنے گا کیوں صاحب اگر تدبیر علت تامہ ہے تو معلول (وہ چیز جس کا کوئی سبب ہو ۱۲) تو علت کے ساتھ دائر (پھرنے والا ۱۲) ہوتا ہے یہ کیا کہ یہاں معلوم متخلف (پیچھے رہنے والا ۱۲) ہو گیا اپنی علت سے حقیقت میں معطی (عطا کرنے والا ۱۲) وہ ہیں مگر حکمت سے دیتے ہیں وہی دیتے ہیں وہی پکاتے ہیں تم سمجھتے ہو کہ آگ پکاتی ہے اگر آگ پکاتی ہے تو اس نے ابراہیم علیہ السلام کو کیوں نہ پکا دیا۔

ادراک عناصر

ایک بددین بادشاہ کی حکایت مولانا نے تحریر فرمائی ہے کہ وہ مسلمانوں کو بت کے سجدہ نہ

کرنے پر آگ میں ڈالتا تھا ایک عورت کو کہا کہ بت کو سجدہ کرو ورنہ تیرے بچے کو اس آگ میں ڈال دوں گا۔ اس نے سجدہ نہ کیا پھر اس کے بچے کو آگ میں ڈال دیا اور عورت لغزش کے قریب ہوگئی تو وہ بچہ آگ میں سے کہتا ہے۔

خواست تا او سجدہ آرد پیش بت　　　بانگ برزد طفل کانی لم امت

(اس عورت نے چاہا کہ بت کے روبرو سجدہ کرلوں فوراً لڑکے نے پکارا کہ میں مرا نہیں ہوں ۱۲)

اندر آ اسرار ابراہیم بین　　　گو درآتش یافت ورد و یاسمین

کہ اے ماں تو بھی اندر چلی آ اور دیکھ تو کہ یہ آگ نہیں گلزار ابراہیمی ہے وہ بھی اندر کود پڑی اور کہنے لگی۔

اندر آئید اے مسلمانان ہمہ　　　پیش عذب دیں عذاب است آں ہمہ

اے مسلمانو! اندر آ کر خدا کی رحمت کا تماشا دیکھو۔ پھر تو جوق جوق تمام مسلمان اس میں گرنے لگے۔ یا تو سپاہی دھکیلتے تھے۔ اب لوگوں کو پکڑتے ہیں روکتے ہیں کوئی رکتا نہیں۔ رعایا میں ایک جوش تھا بادشاہ ڈرا کہ سلطنت چلی پھر بادشاہ نے جھلا کے آگ سے کہا کہ کیا تو آگ نہیں رہی۔ آگ جواب دیتی ہے۔

گفت آتش من ہمانم آتشم　　　اندر آتا تو بہ بینی تابشم

آپ تشریف لائیے معلوم ہو جاوے گا کہ آگ ہوں یا نہیں۔ ہوں تو آگ مگر۔

تیغ حقم ہم بدستورے برم (اللہ تعالیٰ کی تلوار ہوں اجازت ہی سے کاٹ سکتی ہوں ۱۲)

مولانا اس سے نتیجہ نکالتے ہیں۔

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند　　　بامن وتو مردہ باحق زندہ اند

خاک، ہوا، پانی، آگ، یہ چاروں عنصر حق تعالیٰ کے بندے ہیں ہمارے تمہارے روبرو گو مردہ ہیں مگر حق تعالیٰ کے روبرو زندہ ہیں ۱۲

سب یہ حکم سنتے ہیں اسی کے موافق کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے آسمان و زمین سے فرمایا کہ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا خوشی سے آتے ہو۔ یا ہم زبردستی بلائیں۔ عرض کیا اَتَيْنَا طَائِعِيْنَ، خوشی سے حاضر ہو گئے تم سمجھتے ہو زمین میں جان نہیں زمین میں تو ایسی جان ہے کہ ہم میں تم میں بھی نہیں کہ کھودنے کھادنے کاٹنے سے دکھ ہو بعضے جہلا کہا کرتے ہیں کہ زمین پر آہستہ چلو نہیں تو یہ بدلہ لے

گی۔ یا تو یہ کہ بالکل جان نہیں یا ہے تو ایسی کہ وہ زور سے چلنے سے بدلہ لے گی۔ زمین میں جان اتنی ہے کہ جن چیزوں کا ادراک خدا نے اس کو دیا ہے ادراک کرتی ہے جن کا نہیں دیا نہیں کرتی۔ دیکھو مفلوج (جس کو فالج کی بیماری ہو۱۲) کے بدن میں جان ہوتی ہے ورنہ عضو مقطوع (کٹے ہوئے ۱۲) کی طرح سڑتا کیوں نہیں معلوم ہوا جان ہے مگر چاقو سے کاٹو تو تکلیف نہیں ہوتی۔ پس اگر زمین کے جان ہو اور تکلیف نہ ہو تو کوئی اشکال نہیں۔ بہرحال ان میں بھی اتنی جان ہے کہ خدا کو جانتی ہیں كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ (سب کو اپنی اپنی دعا اور تسبیح معلوم ہے۱۲) بلکہ انسانوں میں تو ذاکر بھی ہیں۔ غافل بھی ہیں اور ان میں سب ذاکر ہی ہیں۔ گو ذرا انسانوں کے برابر نہ سہی مگر غافل انسانوں سے تو بہتر ہیں تو آگ خود فعل نہیں کرتی یہ بھی حق تعالیٰ کا فعل ہے کہ کھانا پکا دیا اور آگ کا تلبس محض ایک ظاہری امارت (نشان ۱۲) ہے اس کی محققین کے نزدیک ایسی مثال ہے کہ جیسے جھنڈی ریل کے کھڑے ہونے کے اعتبار سے کہ سرخ جھنڈی دکھائی دی اور ریل کھڑی ہوگئی۔ کیا جھنڈی ریل کو روک سکتی ہے بلکہ آسانی کے واسطے ایک اصطلاح مقرر کی ہے کہ کہاں چیخیں گے کہ روکو۔ بلکہ یہ محض ایک علامت ہے باقی روکتا تو ڈرائیور ہے جو تمہیں نظر نہیں آتا۔

عشق من پیدا و معشوقم نہاں ‏ ‏ یار بیروں فتنہ او در جہاں

(یار تو جہان سے باہر مگر اس کا تصرف جہان کے اندر ہے اور وہ خود نظر نہیں آتا ۱۲)

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں ‏ ‏ کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں ‏ ‏ مصلحت را تہمتے برآ ہوئے چیں بستہ اند

(یعنی مشک افشانی محبوب کی زلف کا کام ہے لیکن عشاق نے مصلحت کی وجہ سے چین کے ہرنوں کے سر منڈھ دی ہے ۱۲)

کہاں میں اور کہاں وہ نکہت گل ‏ ‏ نسیم صبح تیری مہربانی

بہرحال جیسے وہاں جھنڈی میں اثر نہیں یہاں بھی آگ میں اثر نہیں۔ جیسے وہاں اصطلاح ہے یہاں بھی اصطلاح ہے۔ جس طرح وہ نشانی ہے کہ جب گاڑی رکوانا ہو دکھا دو ڈرائیور گاڑی روک دے گا۔

دعائے فعلی

اسی طرح یہ بھی ایک نشانی ہے جب کھانا پکوانا ہو آگ رکھ دو پس وہ پکا دیں گے یہ دعائے فعلی ہے دعائے قولی تو شاید ہر ایک سے نہ ہو سکتی اس لئے اپنی رحمت سے دعائے فعلی مقرر کی ہے

جس میں سب کافر بھی محتاج ہیں۔ مگر ان اسباب میں پھنس کر بہت سے لوگ اپنے کو خدا کا محتاج ہی نہیں سمجھتے۔ چنانچہ میرے ایک دوست نماز روزہ کے پابند تھے اور دعا مانگا کرتے تھے تو ان کے ایک عزیز صاحب کہتے ہیں ابے سہرے تو جو ہاتھ پسار پسار کر مانگے ہے کیا تجھے کچھ گھاٹا ہے۔ ''ہاں جب سب چیز گھر میں موجود ہے تو کیوں ناحق کا احسان خدا تعالیٰ کا لیتا ہے' یہ مسلمان ہیں خدا بچاوے ایسے جہل سے مگر سبحان اللہ وہ سب سنتے ہیں کیا رحمت ہے کہ پھر بھی کارکنوں کو حکم ہے کہ دو۔

خدائے راست مسلم بزرگواری وحلم　　　　که جرم بیند و نان برقرار میدارد

یعنی حق تعالیٰ کی ہی بزرگواری اور بردباری مسلم ہے کہ گناہ دیکھتے ہیں اور رزق بند نہیں فرماتے ۱۲)

مجھے ایک طالب علم کی حکایت یاد آئی کہ جب میں کانپور کے مدرسہ میں تھا تو میں نے کسی بات پر ان کی روٹی بند کر دی تھی تو مجھے انہوں نے ایک رقعہ لکھا اور اس میں یہ شعر لکھا۔

خدائے راست مسلم بزرگواری وحلم　　　　که جرم بیند و نان برقرار میدارد

میں نے لکھا کہ اس میں تو تم نے خود ہی جواب دے دیا۔ مجھے سوچنے کی بھی تکلیف نہیں ہوئی۔ کہ یہ تو خدا ہی کا کام ہے کہ باوجود جرم وقصور کے بھی رزق بند نہیں کرتا۔ خیر یہ تو ایک لطیفہ ہے مقصود یہ ہے کہ ان کی شان تو دیکھو کہ کیسی کیسی گستاخیاں سنتے ہیں مگر پھر بھی حکم ہے دو۔ بہر حال کوئی چیز موثر حقیقی نہیں۔

بنارد ہوا تا نہ گوئی ببار　　　　زمین ناورد تا نہ گوئی بیار

جب تک ہوا حق تعالیٰ کا حکم نہیں پاتی پانی نہیں برساتی اور جب تک زمین کو حکم نہیں کچھ نہیں اگاتی ۱۲)

پانی پیاس نہیں بجھاتا وہی بجھاتے ہیں ورنہ وہی پانی ہے مستسقی (جلندر ۱۲) کی پیاس کیوں نہیں بجھاتا۔ پس اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ موثر حقیقی حق تعالیٰ ہی ہیں۔ باقی ملازمت تجارت زراعت ذریعے ہیں حق تعالیٰ سے لینے کے اس واسطے توکل کے بھروسے نوکری مت چھوڑ دو۔ بلکہ یہ زنبیل رکھو اور خدا سے مانگو۔

مذاق العارفین

باقی یہ جو میں نے کہا تھا کہ جو تارک دنیا ہوتا ہے دنیا اس کے پیچھے پیچھے پھرتی ہے مطلب یہ ہے کہ جو خدا کی اطاعت کرتا ہے اسے دنیا ضرور ملتی ہے خواہ معہ برتن یا بلا برتن۔ چنانچہ اہل اسباب کو روزانہ برتن لے جانا پڑتا ہے اور اہل توکل کو بدون برتن لے جائے ہوئے ملتا ہے اور اگر تمہیں

بہت سے اہل اللہ کو دیکھ کر شبہ ہوتا ہو کہ ان کے پاس تو دنیا نہیں ہے تو بات یہ ہے کہ دنیا سے مقصود کیا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ پریشانی نہ ہو۔ سو اہل اللہ کو پریشانی نہیں ہوتی۔ یہ مشاہدہ بھی ہے اور ارشاد بھی ہے فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيٰوةً طَيِّبَةً (ہم اس کو بالطف زندگی عطا کریں گے ۱۲) پس ان کو پریشانی نہیں ہوتی خواہ روپیہ ہو یا نہ ہو ہر وقت اطمینان ہے۔ ان کا تو مذاق ہی دوسرا ہو جاتا ہے۔ وہ کیا مذاق ہے وہ مذاق یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت بہلولؒ قبرستان میں ایک قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے ہوئے تھے کسی نے عرض کیا حضرت اناج بہت مہنگا ہو گیا ہے۔ مخلوق بہت تکلیف میں ہے۔ فرمایا اس سے کہو جسے بانٹنا پڑتا ہے ہمیں تو جو کام بتلا رکھا ہے اس کا کر لینا ضروری ہے۔ یہ تو انہیں اطلاع کرو جنہیں بانٹنا پڑے گا۔ یہ مذاق ہے کہ ہمیں کیا فکر۔

ایک اور بزرگ سے ایک مرتبہ یہ بہلول خود سائل ہوئے کہ حضرت کیسا مزاج ہے فرمایا کیا پوچھتے اس شخص کے مزاج کو کہ کوئی واقعہ دنیا کا جس کی خواہش کے خلاف نہ ہوتا ہو۔ ہماری وہ شان ہے کہ ہر بات ہمارے چاہنے کے موافق ہوتی ہے عرض کیا حضرت یہ بات تو سمجھ میں نہیں آئی۔ بھلا فلاسفہ اسے حل تو کریں بڑا عقل کا دعویٰ ہے۔ انہوں نے فرمایا بڑی آسان بات ہے۔ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کی خواہش کے خلاف تو نہیں ہوتا۔ بس جس نے اپنی خواہش کو خدا کی خواہش میں فنا کر دیا ہو تو جیسا کوئی واقعہ خدا کی خواہش کے خلاف نہیں اس کی خواہش کے بھی خلاف نہیں۔

حضرت احمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے عالم ارواح میں سب سے فرمایا کہ مانگو کیا مانگتے ہو۔ جو جس کو مانگنا تھا اس نے مانگا جب میری باری آئی اور مجھ سے ارشاد ہوا کہ مانگ کیا مانگتا ہے تو میں نے عرض کیا **اريد ان لا اريد و اختار ان لا اختار** میں یہی مانگتا ہوں کہ کچھ نہ مانگوں۔ پھر فرماتے ہیں **فاعطانی مالا عين رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علىٰ قلب بشر من اهل هذاالعصر** پھر تو مجھے وہ کچھ دیا جو نہ آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا۔ نہ کسی بشر کے قلب میں گزرا اس عصر والوں میں سے سو حاصل یہ ہے کہ جن کا یہ مذاق ہوا نہیں پریشانی کیوں ہو۔

بزرگی کے معنی

اور پریشانی نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بیمار نہیں ہوتے یا ان پر مقدمہ نہیں ہوتا یا انہیں فاقہ نہیں ہوتا۔ اگر بزرگی کے یہ معنی ہوتے تو ساری دنیا تسبیح لے کر بیٹھ جاتی حضرت ایسا تو بڑے بڑے انبیاء کے لئے بھی نہیں ہوا۔ ان پر بڑی بڑی مصیبتیں آئیں۔ ایک فرعون تھا کہ ساری عمر کبھی

دردسر بھی نہیں ہوا۔ ایک جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں کہ دو دو مہینے چولہا نہیں گرم ہوا۔ ہنڈیا نہیں چڑھی۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ فرعون کو ظاہری تکلیف نہ ہونے سے فضیلت ہوگئی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ بیمار ہوتے ہیں تو انہیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہائے بیماری بڑھ جائے گی تو کیا ہوگی۔ ہائے مقدمہ اگر ہائی کورٹ سے بھی ہار گئے تو پھر کیا ہوگا۔ ہائے کل کھانے کو نہیں تو دن کیونکر کٹے گا۔ یہ حالت ان کی نہیں ہوتی انہیں ہر حال میں سکون واطمینان رہتا ہے۔ بخلاف دنیا داروں کے کہ ان کی کیفیت حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ؕ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝ۚ

(سوانسان کو جب اس کا پروردگار آزماتا ہے یعنی اس کو ظاہرا اکرام دیتا ہے تو وہ بطور فخر کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر بڑھا دی اور جب اس کو دوسری طرح آزماتا ہے یعنی اس کی روزی اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ بطور شکایت کے کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر گھٹا دی ۱۲) انسان بھی عجب چیز ہے جب کھانے کو دیدیا تو سمجھتا ہے میں مقرب ہو گیا اور جب تنگی ہو تو سمجھتا ہے میں مردود ہو گیا۔ میرے پاس ایک سکول کے مدرس کا خط آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ جتنی عبادت کرتا ہوں پریشانی بڑھتی جاتی ہے۔ تو گویا یہ عبادت روٹیاں ملنے کے لئے کرتے ہیں۔

نان از برائے کنج عبادت گرفتہ اند صاحبدلاں نہ کنج عبادت برائے نان

(اہل اللہ نے روٹی عبادت کی وجہ سے لی ہے نہ عبادت روٹی کے لئے کی ہے ۱۲)

یہ عبادت نہیں بلکہ بقول گاؤں والوں کے ابابت ہے۔ وہ لوگ عبادت کو ابابت کہتے ہیں تو ابابت کے کیا معنی کچھ بھی نہیں۔ لفظ مہمل ہے۔ تو اس کے معنی عبادت مہملہ ہوئے تو ان کی عبادت مہمل ہے روٹی کے واسطے کرتے ہیں۔ بہرحال یہ تقریر اس کی تائید میں بڑھی کہ دنیا ظل ہے آخرت کا اسی طرح مصالح دنیا تابع ہیں مصالح آخرت کے پس نماز جماعت کی یہ اصلی غرض نہیں کہ باہم اتفاق ہو یہ تو عرض ہے اصلی غرض تو یہ ہے کہ خدا راضی ہو۔

مصلحت احکام

اسی طرح تمام احکام میں بس ساری مصلحت تو یہی ہے کہ خدا راضی ہو۔ آج کل کے خیر خواہان قوم روشن دماغ حضرات کا عجیب مذاق ہے کہ جو صاحب علم مصالح احکام بیان کرے اس کو تو سمجھتے ہیں کہ یہ کچھ جانتے ہیں اور نہ بیان کرے تو کہتے ہیں یہ خشک اور ٹھوس ہیں کچھ نہیں

جانتے۔ یادرکھووہ جانتے سب کچھ ہیں مگرایک بات تو یہ ہے کہ ۔

آنراکہ خبر شد خبرش باز نیامد

(یعنی جن کواسرار وحکم کی خبر ہوگئی وہ کسی سے نہیں بیان کرتے ۱۲) دوسری بات یہ ہے کہ ع
فی طلعة الشمس ما یغنیک عن زحل (آفتاب کے دیکھنے میں زحل کی طرف دیکھنے سے بے پرواہ ہو ۱۲) اگر کوئی کہے تو آفتاب کو دیکھتا ہے زحل کونہیں دیکھتا تو اس سے یہی کہا جائے گا کہ ہم قصداً اس کونہیں دیکھتے۔ پس مصلحت رضائے حق کے ساتھ دوسرے مصالح کو وہ نسبت ہے جو آفتاب کے ساتھ زحل کو ورنہ ان حضرات کے علوم کے سامنے ان مصالح حکمیہ میں کون سا غموض ہے ان کے علوم کی تو یہ کیفیت ہے کہ ۔

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا

(یعنی ان کے قلوب پر انبیاء جیسے علوم بے کتاب واستاد کے قابض ہوتے ہیں ۱۲) جس کی یہ شان ہو اس سے یہ مصالح کیا مخفی رہیں گے مگر بیان کا اس لئے اہتمام نہیں کرتے کہ ۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

یعنی مصلحت نہیں ہے ظاہر کرنا ورنہ وہ ہر چیز کی مصلحت جانتے ہیں اور عدم اظہار میں یہ مصلحت ہے کہ لوگ اس کو مدار حکم سمجھ کر اس میں شبہ پیدا ہونے سے اصل حکم میں شک کرنے لگتے ہیں۔ پس اس نکتہ کے سبب وہ جوجدا جدا مصلحت نہیں بیان کرتے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ نہیں جانتے۔ جانتے سب کچھ ہیں مگر ان کی نظر ایسی چیز پر ہے جس میں یہ سب مصلحتیں کھپ گئیں جسے مصلحتاً کہنا چاہیے جیسے شیخ سعدی کا گالا مشہور ہے۔ یہ کہیں سفر میں گئے تھے سرائے میں جاکر بھٹیاری سے کھانا پکانے کو کہا اس نے کہا میاں مجھے فرصت نہیں ہے دوسری بھٹیاری کی گالیاں مجھ پر چڑھی ہوئی ہیں وہ اتارنا ہیں۔ انہوں نے کہا تم میری روٹی پکادو میں تمہاری طرف سے لڑلوں گا۔ وہ راضی ہوگئی اور اس سے جاکر کہا یہ میرا منیجر ہے میری طرف سے تیری گالیوں کے جواب یہی دے گا۔ اس نے بھی منظور کرلیا۔ باہم یہ شرط قرار پائی تھی کہ نئی گالیاں دینا ہوں گی۔ اس بھٹیاری کی باری تھی اس نے گالیاں دینا شروع کیں۔ انہوں نے کہا بکے جا جتنی تجھ سے ہوسکیں دیئے جا۔ میں اخیر میں سب کا جواب دوں گا۔ وہ گالیاں دیتی رہی۔ یہ تسبیح پڑھتے رہے۔ جب وہ گالیاں دیتے دیتے تھک گئی تو اب شیخ سعدی کی باری آئی۔ انہوں نے کہا سن جتنی گالیاں تو نے اس وقت دی ہیں یا اس سے

پہلے دے چکی ہے اور جتنی اور لوگ دنیا میں دے چکے ہیں یا آئندہ دیں گے سب کا ایک گالا بنا کر تیرے حوالے کیا۔ یہاں بھی طالب علمی سے کام لیا کہ تمام احتمالات عقلی پیش کر دیئے۔ اب جب وہ کوئی گالی دیتی تو کہہ دیتے کہ یہ اسی میں کی ہے اور لاؤ۔ یہ اول طے ہی تھا کہ نئی ہو۔ بس وہ عاجز ہو کر اپنا سامنہ لے کر چلی گئی۔ تو جیسا وہ گالا تھا کہ دنیا بھر کی گالیاں اس میں مدغم کئے ہوئے تھیں۔ اسی طرح ایک مصلحتا ہے کہ سارے جہان کی مصلحتیں اسمیں سمائی ہوئی ہیں اور وہ یہ ہے۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار　　بگزارند و خم طرۂ یارے گیرند

(مصلحت یہ ہے کہ سارے جہان کی مصلحتوں کو چھوڑ کر دوست محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہو جائیں ۱۲)

بس ایک کو لے لو ع یکے داں و یکے بیں و یکے گو (یعنی ایک ہی جانو ایک ہی دیکھو ایک ہی کہو ۱۲)

بس بڑی مصلحت یہ ہے کہ ان کا حکم ہے اس کے کرنے سے وہ راضی ہوں گے بس اس کے آگے ساری مصلحتیں گرد ہیں۔

عشق و حکمت

مسلمان کا تو وہ مذہب ہونا چاہیے کہ جیسا ایک غلام کو اس کے آقا نے خریدا تھا اور اس سے پوچھا تمہارا کیا نام ہے اس نے کہا جو حضور تجویز کریں۔ کیا کھاتے ہو جو حضور کھلائیں کیا پہنتے ہو جو حضور پہنائیں۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو　　دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(یعنی اگر زندہ رکھیں تو آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ کا عاشق ہوں دل آپ پر فریفتہ ہو گیا جو کچھ تصرف کریں ہر حال میں آپ سے راضی ہوں ۱۲)

بس عاشق کا یہ مذہب ہونا چاہیے۔ عشاق کی نظر مصلحت پر نہیں ہوتی۔ کوئی شخص کسی عورت پر عاشق ہو جائے۔ وہ کہے پاندان اٹھا لاؤ۔ اور ہم پان لگائیں گے۔ یہ اٹھا کر لے چلا کسی نے پوچھا پاندان کیوں لئے جاتے ہو۔ تو گو اسے مصلحت معلوم ہے کہ پان لگانے کیلئے منگایا ہے مگر یہی کہے گا کہ معشوقہ کا حکم۔ اس نے کہا لے جاؤ اب ہم لگا چکے لے چلا پوچھا کیوں لے چلے یہی کہے گا کہ حکم۔ اگر یہ نہ کہے اور مصلحت بیان کرے تو وہ عاشق نہیں حکیم ہے۔ مسلمان وہ ہے جس میں عشق و حکمت دونوں ہوں۔ ورنہ فلاسفۂ یونان اور ایک مسلمان میں کیا فرق۔

اگر عشق نہیں اور نری حکمت پر عملدر آمد ہے تو ایسے شخص کے ایمان کا بھروسہ نہیں۔ دیکھو

شیطان عابد تھا عاشق نہ تھا۔ آٹھ لاکھ برس کی عبادت ذراسی حرکت میں خاک میں مل گئی۔ اور ذرا سی اس معنی میں کہتا ہوں کہ نہایت سہولت سے اس سے صادر ہوگئی ورنہ فی نفسہ تو بہت بڑی حرکت تھی اور اتنی بڑی تھی کہ اتنی عبادت گئی اور ہمیشہ کے لئے شقی لعین جہنمی ہوا۔ وہ حرکت یہ تھی کہ حکم ہوا آدم کو سجدہ کرو تو کہتا ہے ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا میں ایسے کو سجدہ کروں...... جو خاک سے مخلوق ہے خدا کے سامنے کمبخت نے نیچریت بگھاری کہ عقل کے خلاف ہے میں اس کو سجدہ کروں حکمت سے کام لیا عشق سے کام نہ لیا برباد ہوا۔ اسی کو مولانا عراقی کہتے ہیں۔

صنمارہ قلندر سزدار بمن نمائی — کہ درازو دوریدم رہ و رسم پارسائی

نری پارسائی بدون محبت کے بڑی دور کا راستہ ہے عشق کا راستہ مجھے بتلا دیجئے ورنہ بدون اس کے اعمال کی تو یہ حالت ہے۔

بزمیں چو سجدہ کردم ززمیں ندا برآمد — کہ مرا خراب کر دی تو بسجدۂ ریائی

یعنی جب زمین پر میں نے سجدہ کیا تو زمین سے یہ ندا آئی کہ تو نے سجدہ ریائی کر کے مجھ کو بھی خراب کر دیا ۱۲)

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند — کہ برون درچہ کردی کہ درون خانہ آئی

(یعنی خانہ کعبہ کے طواف کے لئے گیا تو حرم کا راستہ مجھے نہ دیا تو نے دروازہ کے باہر کیا کیا ہے جو گھر کے اندر آتا ہے ۱۲)

مگر اس طریق میں لوہے کے چنے چبانا پڑتے ہیں ہلاکت پر آمادہ ہونا پڑتا ہے۔

اگر مرد عشقے کم خویش گیر — وگرنہ رہ عافیت پیش گیر

یعنی اگر عاشق ہے تو محبوب کے عشق میں اپنے آپ کو فنا کر ورنہ اپنی آسائش کی راہ اختیار کر ۱۲)

ایک موت کیا ہزار موت کی بھی پرواہ نہیں بلکہ اگر کسی اور پر بلا کو آتے دیکھتا ہے تو گھبرا کر کہتا ہے۔

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت — سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(یعنی دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ آپ کی تیغ کا کشتہ بنے دوستوں ہی کا سر سلامت رہے کہ ان پر آپ کے خنجر کے وار ہوں ۱۲)

سو یہ حالت ہوتی ہے طریق عشق میں۔ اگر یہ نہیں تو ایمان کا بھروسہ نہیں۔ خود جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں لایؤمن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من والدہ وولدہ

والناس اجمعین (الصحیح للبخاری ۱:۱۰، الصحیح لمسلم کتاب الایمان باب:۱۶، رقم: ۷۰، سنن النسائی ۸:۱۷، سنن ابن ماجۃ: ۶۷) یعنی اس وقت تک کوئی تم میں سے مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے باپ اس کے بیٹے اور تمام آدمیوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

روشن دماغی

اس زمانے میں جو عاقل ہیں عاقل تو کیا ہوتے نرے آکل ہیں (کھانے والے ۱۲) اس واسطے یہ عقل کی باتیں کبھی نہیں کرتے ہمیشہ اکل (کھانے ۱۲) کی باتیں کرتے ہیں۔ اور ہر وقت اسی کی دھن اسی کا چرچا اور اسی کا رونا ہے۔ پس اول تو وہاں عقل بھی نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو بدون محبت کس کام کی۔ اگر ان میں کچھ اعمال بھی ہیں تو صرف ظاہر تک باقی قلب پر ذرا اثر نہیں۔ بعضے ان میں قرآن بھی پڑھتے ہیں۔ تو لوگ کہتے ہیں کہ فلاں صاحب باوجودیکہ جنٹلمین ہیں مگر تلاوت کرتے ہیں۔ خود میرے پاس ایک صاحب کا خط آیا لکھا تھا کہ میں باوجودیکہ شکل میں عیسائی ہوں مگر میں نماز بھی پڑھتا ہوں قرآن بھی پڑھتا ہوں۔ اپنی شکل پر فخر بھی ہے یہ تو ایسا ہی ہے کہ باوجودیکہ میں زنانہ ہوں مگر میں رستم کے ساتھ لڑتا ہوں۔ باوجودیکہ میں ہیجڑا ہوں مگر تلوار ہاتھ میں لے لیتا ہوں۔ خدا جانے مجھ سے اس واہیات خرافات کے جتلانے سے کیا فائدہ۔ اگر تم شکل میں عیسائی ہو تو میں کیا کروں۔ تو غرض بہت لوگ اس پر فخر کرتے ہیں کہ ہم نماز پڑھتے ہیں تلاوت کرتے ہیں اور یہی دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ قرآن پڑھتے ہیں تو قلب میں بھی کچھ دین کا اثر ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کی نسبت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں **یقروٴن القران لایجاور حنا جرھم** کہ قرآن پڑھتے ہیں مگر اس طرح کہ ان کے گلوں سے نہیں اترتا یعنی قلب پر اثر نہیں کرتا۔ اب ایسے شخص کا بددین ہو جانا کیا مشکل ہے اور وہ ایسے تو اب بھی ہیں کہ ع از مذہب من گبرو مسلمان گلہ دارند

(میرے مذہب کے مسلمان اور آتش پرست دونوں شاکی ہیں ۱۲) اور ان کا دین خیالات کے بدلنے سے روزانہ اب بھی بدلتا رہتا ہے۔ بقول کسی کے ۔

بیزارم ازاں کہنہ خدائیکہ تو داری ہر روز مرا تازہ خدائے دگری ہست

(تمہارے پرانے خدا سے بیزار ہوں ہر دم مجھے دوسرے تازہ خدا کی ضرورت ہے ۱۲)

حضرت اس روشن دماغ کو لے کر کیا کریں جس کا یہ انجام ہو۔

سادہ لوحی

اس سے تو وہ سادہ لوحی اچھی جس کا انجام نیک ہو۔ کسی معقول نے توحید پر سو دلیلیں قائم کی تھیں اور ہر ایک سے اپنے اظہار علم کے لئے توحید پر دلائل پوچھتا تھا۔ ایک مرتبہ گاؤں میں کسی چودھری سے پوچھا کہ توحید کی کیا دلیل ہے۔ وہ ایک لٹھ لے کر پیچھے ہوا کہ یہ ہے دلیل۔ اور واقعی ایسوں کے لئے ہے بھی یہی دلیل توحید کی تو صاحبو! وہ تاریک دماغ متعصب تنگ خیال جس کو خدا کی محبت سے ہزار درجہ افضل ہے اس روشن دماغ سے جسے خدا کی محبت نہ ہو کیونکہ قیامت کے دن اس متعصب کو کہا جاوے گا کہ جنت میں لے جاؤ۔ اور اس روشن دماغ کو دوزخ میں لے جاؤ۔ اس کا نمونہ دنیا ہی میں دیکھ لو۔ ایک بہت بڑا قابل گریجویٹ ایم اے پاس ہے مگر شورش برپا کرتا ہے اور ملک میں باغیانہ خیالات پیدا کرتا ہے اور ایک گنوار گاؤں کا چودھری بالکل جاہل مگر گورنمنٹ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتا ہے ان دونوں کی پیشی ہوئی کسی حاکم کے اجلاس پر تو حاکم بعد تحقیقات کیا فیصلہ کرے گا یہی فیصلہ کرے گا کہ لے جاؤ اس نالائق گریجوایٹ کو جیل خانہ میں اور اس گنوار کے لئے عجب نہیں کہ جاگیر ہو جائے تو جب گورنمنٹ کے یہاں اطاعت وعدم اطاعت میں فرق ہے تو خدا کے یہاں کیوں نہ ہوگا۔ ان باغیوں کو تو خردمند کہنا بھی جرم ہے ۔

مبادا دل آں فرومایہ شاد　　　که از بہر دنیا دہد دیں بباد

یعنی اس کمینہ کو کبھی خوشی نصیب نہ ہو جو دنیا کے لئے اپنا دین برباد کردے ۱۲)

وہ لائق فائق خدا سے دور ہے اور یہ جاہل گنوار تاریک خیال خدا کے نزدیک ہے

قانون اسلام

تو اے مسلمانو! عشقی اسلام اختیار کرو قانونی اسلام کام نہیں آسکتا۔ اپنے دل میں خدا کی محبت جماؤ۔ محبت میز کرسی کانٹے چھری کوٹ پتلون بوٹ سوٹ سے پیدا نہیں ہوتی یہ کاہے سے پیدا ہوتی ہے یہ اس سے پیدا ہوتی ہے ۔

قال را بگذار مرد حال شو　　　پیش مردے کاملے پامال شو

(یعنی قال کو چھوڑ کر حال پیدا کرو۔ یہ اس وقت پیدا ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں جا کر پڑ جاؤ ۱۲)

کسی کی جوتیاں سیدھی کرو اور آگ لگا دو اپنی وہمی تحقیقات کو۔

جملہ اوراق و کتب در نار کن　　　سینہ را از نور حق گلزار کن

(تمام اوراق اور کتابوں کو آگ لگا کر اپنے سینہ کو اللہ تعالیٰ کے نور سے گلزار کرو ۱۲)

اے صاحبو! وہ کبوتر جسے ہوائی بندوق کے چھرہ سے آسانی سے شکار کر لیا بہتر ہے اس سؤر سے کہ جس کے شکار میں تمام کارتوس خالی ہو گئے۔ اور پھر جب گھر میں آئے تو بال بچے فاقہ سے پڑے ہیں اور وہ اس قابل بھی نہیں کہ اسے بال بچوں کو کھلا سکیں۔ اے صاحب! دین کے علوم کبوتر اور آپ کی تحقیقات سؤر کا شکار ہیں۔ جس وقت آپ اس بازار میں جائیں گے جہاں دوسرا سکہ چلتا ہے تو اس وقت آپ کو معلوم ہوگا کہ افسوس یہ ٹھیکرے ہم ناحق لائے۔ میں ڈگریاں حاصل کرنے اور پاس کو منع نہیں کرتا پاس کرو مگر خدا سے دور نہ ہو۔ نماز روزہ ہی پر اکتفا نہ کرو اور آگے بڑھو۔ عشق و محبت پیدا کرو۔ ایک مقام پر جلسہ ہوا۔ نو تعلیم یافتہ جمع تھے۔ نماز کا وقت آیا۔ نماز کا اہتمام کیا گیا ایک مہمان بھی تھے ان سے کہا گیا کہ آپ بھی نماز پڑھ لیجئے۔ انہوں نے کہا میں نماز کو لغو سمجھتا ہوں۔ لوگوں نے کہا اس کی تو اسلام نے تعلیم دی ہے کہا میں اسلام کو بھی لغو سمجھتا ہوں۔ معاذ اللہ منہا۔ یہ مسلمان ہیں اس کے بعد ان میں کمیٹی ہوئی کہ اس خبیث کو چھوڑ دینا چاہیے تو ایک صاحب نے کہا کہ اس نے قصور خدا کا کیا ہے۔ خدا آپ انتقام لے لے گا۔ ہم اپنے تعلقات کیوں قطع کریں۔ اس خبیث کی تو شکایت نہیں مگر اس بے غیرت کی شکایت ہے کہ اسے جوش کیوں نہیں آیا۔ اگر اس کی ماں کو کوئی یوں کہہ دے کہ میں نے اسے چکلے میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا تو اس قدر جوش ہوگا کہ مارنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ افسوس دین کی اتنی بھی محبت نہیں جتنی ماں کی ہے۔ اگر یہی اسلام ہے تو سلام ہے ایسے اسلام کو قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهِ إِيمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (کہہ دو کہ یہ افعال بہت برے ہیں جن کی تعلیم تمہارا ایمان کر رہا ہے اگر تم ایمان والے ہو ۱۲) کم از کم اتنا تو ہوتا کہ آگ ہو جاتے پھر چاہے ضبط کر لیتے زبان سے اسے کچھ نہ کہتے مگر اس سے تعلقات کو قطع کر دیتے۔

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد　　　فدائے یک تن بیگانہ کاشنا باشد

(یعنی ہزار رشتہ دار جو خدا تعالیٰ سے بیگانہ ہوں اس ایک بیگانہ شخص پر قربان ہیں جو خدا تعالیٰ کا عارف ہے ۱۲)

یوں کیوں نہ کہا گیا کہ اس بے ایمان کی صورت بھی نہ دیکھو۔ بات یہ ہے کہ انکا اسلام عشقی نہیں ہے قانونی ہے جو کسی کام کا نہیں خدا سے محبت ہونی چاہیے اسی کو عراقی کہتے ہیں۔

صنمارہ قلندر سزدار بمن نمائی   کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(نری پارسائی بدون محبت کے بڑی دور کا راستہ ہے عشق کا راستہ مجھے بتلا دیجئے ۱۲)

مذہب عشاق

جب یہ مذاق ہو جائے گا کہ اسلام عشقی ہو جائے گا تو پھر یہ کیفیت ہوگی کہ پاندان کیوں اٹھایا حکم۔ پانی کا گھڑا کیوں بھرا۔ حکم خط کیوں بنوایا۔ حکم حالانکہ معشوقہ نے مصلحت بھی ظاہر کر دی تھی کہ لبیں بڑھی ہوئی بری معلوم ہوتی ہیں۔ مگر پھر بھی بجائے اس حکم کے بیان کرنے کے یہی کہتا ہے حکم۔ مرضی۔ کیوں کہ عاشق کا یہی مذہب ہوتا ہے۔ بس مسلمان کا یہی مذہب ہونا چاہیے کہ نماز کیوں پڑھتے ہو حکم۔ مرضی۔ بکری کیوں کھاتے ہو۔ سؤر کیوں نہیں کھاتے حکم۔ مرضی۔ یہ بڑے درجہ کا شخص ہے یہی حکیم ہے۔ اور وہ حکیم نہیں جو یہ کہے کہ نماز جماعت سے کیوں پڑھتے ہیں تا کہ اتفاق ہو کیونکہ ایسا شخص ہر وقت شیطان کے ہاتھ میں ہے۔ جب جی چاہے وہ اپنی راہ پر لا سکتا ہے۔ مثلاً کسی وقت اس کو یہ سمجھا دیا کہ یہ قاعدہ ہے کہ جب مقصود حاصل ہو جاتا ہے تو ذریعہ متروک ہو جاتا ہے۔ تو بہت قریب ہے یہ بات کہ جس روز ان کی کوشش سے قوم میں اتفاق پیدا ہو گیا اسی روز سے یہ جماعت کی نماز چھوڑ دیں گے کہ اب ضرورت باقی نہیں رہی۔ تو یہ لوگ ہر وقت عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ ہیں یعنی آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے ہیں۔ شیطان کے ذرا سے دھکے میں گر جائیں گے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ احکام میں مصلحتیں نہیں ہیں مصلحتیں ہیں اور اس قدر ہیں کہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتیں مگر وہ سب تابع ہیں اور رضا حق متبوع ہے بہر حال اس پر میں کہتا تھا کہ احکام میں مصالح دنیویہ واخرویہ دونوں ہیں مگر دنیویہ تابع ہیں اور اخرویہ متبوع۔

روح افطار

اسی طرح جتنے احکام ہیں اگر ان میں کوئی لطیفہ بیان کیا جاوے تو لطیفہ طبعاً ہے اور مقصود رضائے حق ہے ورنہ درجۂ اصالت میں ہمیں ضرورت نہیں کہ ہم احکام کی روح تلاش کریں مگر تبعاً محض تنشیط (خوش ہونا ۱۲) کے لئے عرض کیا جاتا ہے نہ کہ بطور مدار حکم کے یہ تقریر اس لئے عرض کی کہ

غلطی نہ ہو۔ بہر حال رمضان کے خاتمہ پر عید جو مقرر ہے اس کی بھی ایک صورت ہے اور ایک روح۔ تو اس کی روح کیا ہے۔ ابھی اس حدیث کو میں نے مع ترجمہ بیان کیا تھا۔ **للصائم فرحتان فرحة عندالافطار و فرحة عند لقاء ربه** (سنن النسائی کتاب الصیام باب:۴۱، مسند احمد ۲:۲۵۷، کنز العمال ۲۳۵۹۳) کہ ایک فرحت افطار کے وقت ہوتی ہے ایک فرحت لقاء رب کے وقت قیامت میں ہوگی۔ پھر افطار کے وقت جو فرحت ہوتی ہے اس کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک کو اہل معنی نے سمجھا ایک کو اہل ظاہر نے سمجھا۔ اسی پر یہ مضمون چلا تھا پس اہل ظاہر کو کھانے پینے کی فرحت ہوتی ہے۔ اہل معنی کو روزہ پورا ہونے کی فرحت ہوتی ہے اور اس فرحت معنویہ سے اس دوسری فرحت کا نمونہ جو **فرحة عند لقاء ربه** (لقاء رب کے وقت فرحت ۱۲) آخرت میں ہوگی ان کے پیش نظر ہو جاتا ہے کیونکہ جب یہ فرحت ہوتی ہے عمل پورا ہونے سے اور جس وقت عمل پورا ہوتا ہے تو کیا ہوتا ہے وہ ہوتا ہے جو حدیثوں میں درباب فضیلت عید کے آیا ہے کہ حق تعالیٰ فرشتوں کو جمع کر کے فرماتا ہے کہ اے فرشتو کیا جزا ہے اس اجیر کی جس نے اپنا عمل پورا کر لیا ہو۔ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اس کی جزاء یہی ہے کہ اسے اجرت پوری دی جائے حق تعالیٰ فرماتا ہے پس انہوں نے روزے رکھے جو ہمارے یہاں مقبول ہو گئے تو تم گواہ رہنا کہ ہم نے سب کی مغفرت کر دی پس ایک حدیث سے افطار کے فرحت اور ایک حدیث سے تمام عمل کے وقت مغفرت ثابت ہوئی۔ اور یہ مقدمہ ظاہر اور اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ افطار کا وقت تمام عمل کا وقت ہے تو اس افطار کے وقت مغفرت کا ہونا ثابت ہوا اور یہی مغفرت ہے جس کو خواہ جزاء کہیے خواہ لقاء رب کہیے تو ہر افطار کے وقت فرحت لقاء رب بھی معناً حاصل ہے جس کا ظہور اتم کو آخرت میں ہوگا۔ اسی لئے اس کو پہلے فرحت پر عطف کیا۔ پس باعتبار حصول کے یہ معطوف نقد ہے اور باعتبار ظہور کے ادھار ہے۔ پس یہی لقاء یا مشاہدہ روح ہے اور اس افطار کی اور ہر روز افطار صغیر ہے اور عید افطار کبیر ہے۔ پس عید کی روح بھی مشاہدۂ حق ہوا اور گو ظاہراً یہ ادھار ہے مگر حقیقت میں نقد ہے اور یہ ذوقی بات ہے کہ نقد ہے البتہ اگر ذوق نہ ہو تو خیر ادھار ہی سمجھو گے کہ جب وہاں جائیں گے تو لقاء رب یا مغفرت میسر ہوگی۔

ذوق قرب

اور اگر ذوق ہے تو سب نقد ہے اور اگر ذوق پیدا کرنا ہو تو ذوق پیدا ہوتا ہے محبت اور اہل محبت کی صحبت سے اور ان کی خدمت میں رہنے سے جب ذوق پیدا ہوگا اس سے یہ بات معلوم ہوگی کہ وہ

جزاء نقد ہے اور وہ نقد کس طرح ہے۔ بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ جل علیٰ شانہ نے دو آنکھیں پیدا کی ہیں ایک ظاہر کی ایک باطن کی۔ انہیں باطن کی آنکھ سے ان آیات کے معنی معلوم ہوتے ہیں وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ اور ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ ہیں ۱۲) اِنَّ اللهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (بلاشبہ حق تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ رہتے ہیں ۱۲)

اِنَّ اللهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (بلاشبہ حق تعالیٰ نیکی کرنیوالوں کے نزدیک ہیں ۱۲)
اس معیت وقرب کے صاف معنی معلوم ہوتے ہیں کہ لقاء رب یہاں بھی حاصل ہے اور یہ کیسے یقین دلاؤں کہ انہیں یہ بات حاصل ہے۔ یہ ذوقی بات ہے اس کے بھی علامات ہیں ان سے معلوم ہو جاتا ہے دیکھو اگر کسی نے شراب نہ پی ہو اور بناوٹ سے جھومتا ہو تو جھومے گا مگر ویسا نہیں جھومے گا جیسا واقعی شارب (پینے والا ۱۲) جھومتا ہے اسی طرح حق تعالیٰ کے قرب ولقاء مشاہد کا بھی ایک خاصہ ہے کہ اور جن لوگوں نے یہ شراب پی ہے ان کی بھی ایک علامت ہے اور وہ کیا ہے قلب کا سکون اطمینان۔ ماسوا سے ذہول اور قاعدہ عقلی ہے کہ بغیر مقصود کے حاصل کئے سکون نہیں ہوتا۔ اگر انہیں قرب حق نہ ہوتا تو ان کو یہ سکون کیسے ہوتا۔ پس معلوم ہوا کہ انہوں نے کچھ دیکھا ہے کچھ پایا ہے۔ وہ خالی نہیں ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ وہ سکون کیسا ہے اور اطمینان کیا ہے سو دیکھ لو سب کو نظر آتا ہے۔

موحد چہ برپائے ریزی زرش   چہ فولاد ہندی نہی برسرش
موحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ زر بکھیریں یا اس کے سر پر تلوار رکھیں ۱۲)
امید و ہراسش نباشد زکس   ہمیں است بنیاد و توحید و بس
(امید وخوف اس کو بجز خدا کے کسی سے نہیں ہوتا توحید کی بنیاد بس اسی پر ہے ۱۲) کسی چیز سے انہیں پریشانی نہیں ہوتی اور یہ مطلب نہیں کہ پریشانی طبعی نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ پریشانی عقلی نہیں ہوتی کیونکہ پریشانی طبعی تو انبیاء تک کو ہوتی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام باوجودیکہ نبی ہیں مگر جس وقت کوہ طور پر تشریف لے گئے اور حق تعالیٰ نے پوچھا وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى اے موسیٰ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔ قَالَ هِيَ عَصَايَ انہوں نے عرض کیا عصا ہے۔ آگے قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى یعنی حکم ہوا کہ اچھا اسے ڈال دو فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى اور انہوں نے ڈال دیا تو وہ سانپ بن گیا۔ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى جب سانپ کی شکل

دیکھی تو بھاگے۔ فرماتے ہیں لَا تَخَفْ اے موسیٰ تم ڈرومت۔ ہاتھ ڈالو یہ ویسا ہی ہوجائے گا۔ سو سانپ سے طبعاً ڈر گئے پس پریشانی طبعی کا مضائقہ نہیں۔

راضی برضا

ایک اور بزرگ کی حکایت ہے کہ ایک بادشاہ نے ان کے دھمکانے کو کہا تھا کوئی ہے۔ تو انہوں نے بھی بادشاہ کے دھمکانے کو کہا کوئی ہے۔ ان کی کرامت سے ایک شیر نکل آیا۔ بادشاہ اس شیر کو دیکھ کر بھاگا یہ بزرگ بھی اس کے ساتھ بھاگے تو یہ طبعی بات ہے میں اس کی نفی نہیں کرتا۔ میں اس کی نفی کرتا ہوں جس میں ادھیڑ بن ہو جس میں حواس باختہ ہو جائیں جس میں سوچ ہو کہ اب کیا ہوگا۔ یہ مقدمہ قائم ہوگیا ہے اب کیا ہوگا میرے بچوں کا کیا حال ہوگا۔ میری بیوی کیسی پریشان ہوگی۔ بس ان حضرات میں یہ نہیں ہوتا۔ وہ راضی برضائے حق رہتے ہیں۔ جو کچھ ہوگا ان کے نزدیک بہتر ہے ان کا خیال تو یہ ہے۔ ؎ ہرچہ آں خسرو کند شیریں بود۔ جو کچھ محبوب حقیقی کرتے ہیں وہ بہتر ہے ۱۲) ہم تو سرکاری گھنٹے ہیں اگر بڑھا دیا تو کیا گھٹا دیا تو کیا۔ ہماری جاں کیوں نکلتی ہے اگر گھڑی شکایت کرے کہ مجھے کوکتے ہیں۔ تو یہی جواب ہے کہ ہم مالک ہیں۔ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں تو ہے کون بھلا پس جس طرح یہ گھڑی ہے وہ گھڑا ہے۔ کوکنے والے نے کوک دیا ہے۔ چل پھر رہے ہیں۔ اب سمجھ گئے جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ ان کو کنے سے کرتے ہیں۔ کوک اگر ہمیں میں ہو تو فرماتے ہیں۔ فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ۝ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ (الی) تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ جس وقت روح حلقوم تک پہنچ جاتی ہے اور تم دیکھتے ہوتے ہو تو تم اس روح کو لوٹا کیوں نہیں لیتے۔ تم اتنا تو کر ہی نہیں سکتے کہ نکلنے کے بعد تو کیا جس وقت نکلنے کے لئے حلقوم تک آئے تو اسے لوٹا لو۔ بعض دفعہ گلے میں کھانا اٹک جاتا ہے تو یہاں تک نوبت پہنچتی ہے کہ دوسروں کے تصرف سے تو نکلتا ہے۔ تو بھلا ہم کون ہیں ایک مشین ہیں صانع کے ہاتھ میں اور وہ صانع رحیم وحکیم ہیں۔ پس ہرچہ آں خسرو کند شیریں بود (جو کچھ بادشاہ حقیقی کرتے ہیں وہ بہتر ہے ۱۲) اور یہ بات محبت کی وجہ سے ان حضرات کو مستحضر رہتی ہے اس واسطے پریشانی نہیں۔

آثار قرب

حتیٰ کہ اہل سلوک جس کو بعد فراق سمجھتے ہیں وہ اس کی نسبت بھی یہ مذاق رکھتے ہیں۔

ارید وصاله و یرید هجری　　　فاترک ماارید لما یرید

(میں محبوب کے وصال کا خواہاں ہوں وہ ہجر کے خواہاں سو میں نے اپنی خواہش کو ان کی خواہش کی وجہ سے ترک کر دیا ۱۲)

اور اس سب کا سبب محبت ہے پس یہ ہے لقاء رب و رضائے حق جو اصلی مقصود ہے اور یہ سکون اس کی علامت ہے جس سے ہم بھی اہل قرب کو پہچان سکتے ہیں جیسے فرض کرو کہ ہم نے کسی کو شراب پیتے نہ دیکھا ہو مگر بو سے تو معلوم کر لیتے ہیں کہ اس نے شراب پی ہے تو انہوں نے بھی شراب وصل پی ہے اور ان آثار سے ہمیں بھی معلوم ہو سکتا ہے دوسرے آثار قرب کے ان میں اور بھی ہیں وہ یہ کہ جنت میں جو قرب ہوگا تو اس وقت کیا ہوگا کہ ان اہل قرب کو کسی سے کینہ نہ ہوگا سو ان اہل اللہ کو دنیا ہی میں دیکھ لو کہ انہیں بھی یہ بات حاصل ہے۔ چنانچہ ان کا مشرب یہ ہے ؎

کفر است درطریقت ماکینہ داشتن　　　آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

(یعنی ہمارے طریق میں کسی سے کینہ رکھنا کفر ہے سینہ کو آئینہ کی طرح حسد و کینہ سے صاف رکھنا ہمارا دستور ہے ۱۲)

اور جنت میں کیا ہوگا بے تکلف جس طرح سانس آتی ہے اس طرح ذکر اللہ جاری ہوگا۔ حدیث میں ہے **یلھمون التسبیح کما تلھمون النفس** (الہام کیا جائے گا ان کو تسبیح کا سانس کی طرح ۱۲)

دیکھ لیجئے یہ بھی ذکر اللہ میں اسی طرح مشغول ہوتے ہیں کہ نہ تکان ہے نہ پریشانی ہے یہ سب علامات ہیں اہل جنت کے۔ بس معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے اندر ان کو لقاء رب حاصل ہے مگر اتنا فرق ہے کہ یہ لقاء ضعیف ہے جنت میں جو ہوگی وہ قوی ہے یہ خفی ہے وہ جلی ہے یہ معنوی ہے وہ صوری ہے مگر عاشق کے لئے یہی بہت ہے۔

مرا از زلف تو موئے بسنداست　　　ہوس رارہ مدہ بوئے بسنداست

اگر محبوب نہ ملے تو اس کا ایک بال ہی بہت اگر بال نہ سہی تو خوشبو ہی سہی بلکہ اگر خوشبو نہ سہی تو نام ہی سہی۔

دید مجنوں را یکے صحرا نورد　　　دربیاباں غمش بنشستہ فرد

ریگ کاغذ بود انگشتاں قلم　　　مے نمودے بہرکس نامہ رقم

گفت اے مجنوں شیدا چیست ایں　　　می نویسی نامہ بہر کیست ایں

مجنوں کو کسی نے جنگل میں دیکھا کہ تنہا بیٹھا ہوا اپنی انگلی سے ریت پر کچھ لکھ رہا ہے۔ پوچھا کسے خط لکھ رہے ہو کہا کہ۔

گفت مشق نام لیلیٰ می کنم　　　　خاطرخود را تسلی می دہم

میں اپنی محبوبہ کے نام کی مشق کر رہا ہوں۔

(اپنے دل کو تسلی دیتا ہوں ۱۲)

مرا از زلف تو موئے بسند است　　　　ہوس را رہ مدہ بوئے بسند است

(یعنی اگر محبوب نہ ملے تو اس کا ایک بال ہی کافی ہے اگر بال بھی نہ ملے تو خوشبو ہی بہت ہے ۱۲)

لطف بے کلی

اجی ایک تو وصال عریاں ہے کہ معشوق بالکل ہی ہم آغوش ہے اور ایک یہ کہ صرف انگلی پکڑ لی یہ بھی تو بہت بڑی بات ہے۔ گو بیکلی بڑھ جاتی ہے اگر یہ کہو کہ بیکلی کیسے یہ تو سکون کے منافی ہے تو بات یہ ہے کہ سکون سے مطلق سکون مراد نہیں بلکہ سکون عن غیر اللہ (غیر اللہ سے سکون ۱۲) مراد ہے سو سکون عن غیر اللہ ہو جاتا ہے۔ باقی سکون عن اللہ (اللہ تعالیٰ سے سکون ۱۲) تو کبھی نہیں ہوتا وہ تو جوں جوں آگے بڑھتے ہیں طلب بڑھتی جاتی ہے اور بیکلی سوار ہوتی جاتی ہے مگر اس میں انہیں وہ لطف ہے کہ اس بے کلی پر ہزاروں سکون قربان۔ میں نے بچپن میں ایک مثنوی لکھی تھی اس کا مصرع یاد آ گیا ع

عشق معشوق است مر عشاق را عاشق کو جیسے معشوق سے محبت ہوتی۔ محبت سے بھی محبت ہوتی ہے اگر عاشق سے کہا جائے کہ لاؤ ایسی ترکیب کریں کہ تمہاری محبت زائل ہو جائے۔ تو مرے گا جان دینا گوارا کریگا مگر اسے کبھی گوارا نہیں کرے گا۔ مجنوں کو جب اس کے باپ نے دیکھا کہ لیلیٰ کی محبت میں اس کی بری حالت ہے تو خانہ کعبہ لے کر آیا اور کہا کہ اے قیس دعا کر اللھم ازلنی حب لیلیٰ (یارب میرے دل سے لیلیٰ کی محبت زائل کر دے ۱۲) باپ تو یہ کہے اور وہ کہتا ہے اللھم زدنی حب لیلیٰ (یارب مجھے لیلیٰ کی محبت زیادہ دے ۱۲) باپ نے کہا اس سے توبہ کر اس نے جوش میں آ کر یہ شعر پڑھا۔

الھی تبت من کل المعاصی　　　　ولکن حب لیلیٰ لا اتوب

سارے گناہوں سے توبہ ہے مگر اے اللہ میں لیلیٰ کی محبت سے توبہ نہ کروں گا اور لا اتوب

(توبہ نہیں کرتا ۱۲) یا تو غلبہ سکر میں کہا اور یا اس لئے کہ وہ سچی محبت تھی اس میں لوث (ملونی) معصیت کا نہ تھا۔ یہ لوگ مسلمان تھے اور تمہ اس کے قصہ کا یہ ہے کہ اس کے باپ نے جب اس کی حالت زیادہ خراب دیکھی تو لیلیٰ کے باپ کو جو اس کا حقیقی چچا ہے پیغام نکاح بھیجا تو لیلیٰ کے باپ نے جواب دیا کہ مجھے عذر نہیں اس سے زیادہ لیلیٰ کا اور کون حق دار ہوگا لیکن نکاح ہوتے ہی فوراً مر جائے گا اس لئے بہتر ہے کہ اسے یوں ہی رہنے دو کیونکہ اس کی وہ حالت تھی۔

من شمع جانگدازم و تو صبح دلکشائی — سوزم گرت نہ بینم میرم چو رخ نمائی

میں شمع ہوں تو صبح ہے اگر تجھے دیکھ لوں تب بھی موت ہے کہ لوگ بجھا دیں گے اور اگر نہ دیکھوں تب بھی ہلاکت ہے کہ جل جاؤں گا۔

نزدیک آں چنانم و دور آں چنانکہ گفتم — نے تاب وصل دارم و نے طاقت جدائی

(اس محبوب کی نزدیکی ایسی ہے اور جدائی ایسی جیسا اوپر کے شعر میں ذکر کیا ۱۲)

نہ جدائی کی طاقت نہ وصل کی تاب۔ یہ حالت ہوتی ہے عشاق کی۔ الغرض نکاح نہیں ہوا۔ اس کے بعد اتفاق سے لیلیٰ پہلے مرگئی اس کو بھی علم ہوا اس کی قبر معلوم کرنا چاہی لوگوں نے اس کی ہلاکت کے خیال سے نہیں بتائی۔ اس نے خود جا بجا کی قبروں کی مٹی سونگھ کر پتا لگا ہی لیا اور یہ شعر کہا اور اسی کو بار بار پڑھ پڑھ کر جان دے دی۔

ارادوا لیخفوا قبرھا عن محبھا — و طیب تراب القبر دل علی القبر

کہ لوگوں نے تو یہ چاہا تھا کہ لیلیٰ کی قبر کو اس کے عاشق سے مخفی رکھیں۔ لیکن اس کی خاک قبر نے اس کو راستہ بتا ہی دیا ۱۲ جامع) یہ ادنیٰ سا شخص تھا ادنیٰ سی محبت تھی۔ مگر کیا رنگ دکھایا اور مجنوں نے اس محبت کی ترقی ہی چاہی۔ تو وجہ اس کی یہ ہے کہ محبت خود بھی محبوب ہو جاتی اس لئے اس بیکلی میں بھی لطف آتا ہے۔

اور اس بیکلی میں اور سکون میں منافات نہیں ہوتی کیونکہ جہاں سکون کا حکم کیا وہاں سکون عن غیر الحق (غیر اللہ سے سکون ۱۲) مراد ہے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے کہ تین طلاق رجعی کسی عورت کو دے کر دوسری سے نکاح کرنے کا ارادہ ہے اور ابھی نکاح نہیں ہوا اس سے تو سکون ہے جسے طلاق دیدی اور اس کے لئے بے چینی ہے جس سے نکاح چاہتا ہے یہی جنت میں بھی ہوگا۔

الہامات

اور جنت میں کہ مقام قرب ہے یہ ہوگا حق تعالیٰ سے فرداً فرداً باتیں ہوں گی۔ گو حق تعالیٰ سے یہاں بھی باتیں ہوتی ہیں چونکہ قرآن کی تلاوت حق تعالیٰ سے باتیں ہی ہیں مگر یہ مجموعاً ہیں کیونکہ اس کے خطاب عام ہیں اور جنت میں خاص خطاب ہوگا۔ سو اہل اللہ کو دنیا میں یہ بھی ہونے لگتا ہے یعنی ان کے قلب میں الہامات جو ہوتے ہیں۔ وہ حق تعالیٰ کا خطاب خاص ہیں۔ جاننے والے کہتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا کوئی بول رہا ہے مگر شرط یہ ہے کہ یہ کلیات شرعیہ کے خلاف نہ ہو ورنہ وہ الہام رحمانی والقاء ربانی نہیں بلکہ حدیث النفس و وسوسہ شیطانی ہے ان کا الہام یہاں تک بڑھ جاتا ہے کہ ہر وقت الہام ہوتا ہے حتیٰ کہ کھانے پینے اور ہدیہ لینے میں بھی کہ یہ مت کھاؤ یہ مت پیو یہ ہدیہ مت قبول کرو پھر وہ انکار کرتا ہے ہدیہ کے قبول کرنے سے لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ فلاں کا لے لیا فلاں کا کیوں نہ لیا مگر ؎

درنیابد حال پختہ ہیچ خام　　　　پس سخن کوتاہ باید والسلام

(یعنی ناقص کامل کی حالت کو نہیں سمجھ سکتا پس کلام کو تاہ کرنا چاہیے ۱۲)

اس رتبہ کے شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں **استفت قلبک ولو افتاک المفتون** (اتحاف السادة المتقين ۱:۱۳۱، المغني عن حمل الاسفار ۱:۲۰) (اپنے دل سے بھی فتویٰ لو اگرچہ مفتیوں نے تمہیں فتویٰ دے دیا ہے ۱۲) المفتون فرمایا مفتون نہیں فرمایا۔ یعنی مفتون دنیا۔ سو اس کو فرماتے ہیں دل سے پوچھے کیونکہ خدا کا نور اسے عطا ہوتا ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

پنبہ اندر گوش حس دوں کنید　　　　تا خطاب ارجعی رابشنوید

(یہ کان خوانی درجہ کے حواس میں سے ہے اس میں روئی رکھ لو۔ تاکہ خطاب ارجعی کو سننے کے قابل ہو جاؤ یعنی گوش ظاہری سے کام مت لو اور اس کو تعلقات دنیا کی طرف متوجہ مت کرو ۱۲)

چشم بند ولب بہ بند و گوش بند　　　　گر نہ بینی نور حق برمن بخند

(ظاہری چشم ولب اور کان کو بند کر و اس پر بھی اگر خدا کا نور نہ دیکھو تو مجھ پر ہنسنا ۱۲)

تو بات کیا ہے جتنا ذہول ادھر سے ہوتا جاتا ہے اتنی ہی بیداری ادھر سے بڑھتی جاتی ہے پھر اپنی استعداد کے موافق مکالمتہ بھی ہوتی ہے تو واقعی ان سب سے سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ غرض جب تک وہ زندہ ہیں ان کو دنیا میں بھی وہ عیش ہے کہ کسی بادشاہ کو بھی نصیب نہیں۔

ملک نیم شب

ایک بادشاہ نے بطور اعتراض کسی کو اپنی اور ان کی معاشرت کا موازنہ لکھ کر بھیجا تھا۔ وہ بزرگ اسے جواب دیتے ہیں۔

خوردن تو مرغ مسمن دمے　　خوردن ما نانک جویں ما
(تمہارا فربہ مرغ کھانا اور ہمارا جو کی روٹی کھانا ایک دم کے لئے ہے ۱۲)
پوشش[1] تو اطلس و دیبا حریر　　بخیہ زدہ خرقہ پشمین ما
ہم سب نے کمایا' آگے فرماتے ہیں۔
لیکن ہمیں است کہ می بگذرد　　راحت تو محنت دوشین ما
مگر ذرا ٹھہرے رہو کل اس کا حال معلوم ہوگا کہ تمہاری راحت اچھی تھی یا ہماری محنت۔
باش کہ تا طبل قیامت زنند　　آں تو نیک آید ویا ایں ما
(یعنی ذرا صبر کرو قیامت میں معلوم ہو جائے گا کہ وہ تمہاری راحت اچھی تھی یا یہ ہماری راحت ۱۲)

تو ان حضرات کو کچھ تو حاصل ہے جس کی بدولت دولت وسلطنت کی بھی پرواہ نہیں۔ ایک مقدمہ تو یہ ملایئے کہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا انسان ضعیف البنیان ہے۔ دوسرا مقدمہ یہ ملایئے کہ امر طبعی ہے کہ انسان نسیہ (ادھار ۱۲) پر کبھی راضی نہیں ہوتا اگر چہ کتنا ہی زیادہ ہو اور ہمیشہ نقد کو ترجیح دیتا ہے اگر چہ کتنا ہی کم ہو۔ تو ان دونوں کو ملانے سے یہ نکلتا ہے کہ انہیں کچھ نقد ملا ضرور ہے ورنہ یہ راضی کیونکر ہوئے انہیں وہ چیز ملی ہے کہ میں نام نہیں بتا سکتا وہ ذوقی چیز ہے۔

بفراغ دل زمانے نظرے بما ہروئے　　بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوئے

ایک ساعت ایک لحہ محبوب کو اطمینان سے دیکھنا دن بھر کی داد و گیر شاہی سے بہتر ہے تو یہ ہے وہ دولت جس کی بدولت اس قدر مستغنی ہیں۔ سیدنا حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو ملک سنجر والی نیمروز نے عریضہ لکھا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو کچھ معافی و جاگیر دیدوں تا کہ آپ بھی میری طرح عیش وعشرت کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ حضرت نے اس کے جواب میں یہ قطعہ فرمایا۔

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد　　دردل اگر بود ہوس ملک سنجرم
چتر سنجری کی طرح میرا منہ کالا ہو اگر میرے دل میں ملک سنجر کا وسوسہ بھی ہو اور وسوسہ کیوں

---

[1] تیرا لباس ریشم واطلس کا ہے ہمارا خرقہ پشمین بخیہ زدہ ہے ۱۲)

نہیں اس لئے نہیں ہے کہ۔

زانگہ کہ یافتم خبراز ملک نیم شب　　　　من ملک نیمروز بیک جونمی خرم

مجھے جب سے نیم شب کی سلطنت حاصل ہے نیمروز کی سلطنت میری نظر میں ایک جو کے برابر بھی نہیں۔ سبحان اللہ کیا رعایت ہے کہ وہ ملک نیمروز تھا (یہ فارس کے ملک کا نام ہے) تو آپ نے اپنے ملک کو نیم شب لکھا اور وہ نیم شب کی سلطنت کیا ہے۔

چہ خوش وقتے و خرم روز گارے　　　　کہ یارے برخورد از وصل یارے

(وہ کیا اچھا وقت اور اچھا زمانہ ہے کہ اس میں کوئی محبّ کے وصل سے متمتع ہو۱۲)

اور ضرور خلوت میں برخوردان کو حاصل ہے۔

وصال مطلوب

اس واسطے کہ اہل اللہ کو دیکھا ہے کہ اس وقت اگر کوئی ان کی خدمت بھی کرے تو ناک منہ چڑھاتے ہیں اس وقت یہ بھی گوارا نہیں ہوتا کہ کوئی استنجے کے لئے ڈھیلے یا وضو کے لئے پانی بھی دے سب کام اپنے ہاتھ سے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ بعضے بے ذوق اس وقت بھی خدمت لینے سے باز نہیں آتے۔ اور بغیر ارے' فلانے پانی لا' ڈھیلے لا' کے چین نہیں آتا۔ اس وقت تو یہ حالت ہوتی ہے کہ یہ کون ہوتا ہے دخل دینے والا اگر انہیں کسی کے ساتھ خلوت نہیں تو غیر کا آنا ناگوار کیوں ہے۔ یہ غیرت دلیل اس کی ہے کہ کسی کو آغوش میں لے لیا ہے۔ ضرور کسی سے راز کی باتیں ہورہی ہیں پس غیرت آتی ہے اور اس قدر آتی ہے کہ اپنی آنکھوں سے بھی آنے لگتی ہے کیونکہ آنکھیں جزو ہیں اور جزو کل کے مغائر ہے (غیر ۱۲) پس غیر سے غیرت کا آنا طبعی بات ہے۔ یہیں عارف شیرازی کے اس شعر کے معنی بھی حل ہوگئے ورنہ پہلے شاعری معلوم ہوتی تھی۔

بخدا کہ رشکم آیدز دوچشم روشن خود　　　　کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روئے

(بخدا مجھ کو اپنی دونوں آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ وہ محبوب کے چہرۂ انور کو دیکھتی ہیں۱۲) یہ شعر اب سمجھ میں آگیا اور قلندر صاحبؒ کا شعر بھی حل ہوگیا۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم　　　　گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

(یعنی مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے چہرہ انور کو نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی اس کی باتیں نہ سننے دوں۱۲)

کان کے سننے اور آنکھوں کے دیکھنے سے بھی غیرت آتی ہے۔

اگر کوئی کہے کہ جنت میں تو اسی آنکھ سے خدا کا دیدار ہوگا۔ صوفیہ نے کوئی بات ایسی نہیں چھوڑی جسے حل نہ کیا ہو وہ بعض امور پر دلیل نہ قائم کرلیں مگر اطمینان تو ہو جاتا ہے انہوں نے اس اشکال کو بھی حل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ قیامت میں بصیرت و بصارت میں مغائرت نہیں رہے گی۔ دونوں ایک ہو جائیں گے اسی آنکھ میں بصیرت و بصارت دونوں جمع ہو جائیں گی۔ پس ظاہر میں نورانی (دیکھنے والا ۱۲) یہ عین ظاہرہ ہے جو کہ جزو ہے۔ اور باطناً رای عین باطنہ ہے جو کہ اس شخص کا عین ہے اور جزو نہیں۔

اور غیرت مغائر سے تھی سو یہ مغائر نہیں۔ واقعی صوفیہ خوب سمجھتے ہیں بہر حال وہ وقت خلوت کا ہے غیر سے کیوں نہ غیرت آوے اور ان آنکھوں کو بھی غیر کیوں نہ سمجھا جاوے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان آنکھوں کے جانے کی پرواہ بھی نہیں کی۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی اخیر میں نگاہ جاتی رہی تھی۔ لوگوں نے بہت اصرار کیا کہ حضرت آنکھیں بنوالیں۔ مولانا نے لوگوں کے سمجھانے کے لئے فرمایا بھئی آنکھ بنے گی تو ڈاکٹر کہے گا کہ پڑے رہو۔ میری جماعت جاتی رہے گی۔ میں نہیں بنواتا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت آپ تو معذور ہیں فرمایا بتلاؤ میرا کون سا کام اٹکا ہوا ہے۔ چلتا بھی ہوں پھرتا بھی ہوں۔ اٹھتا بھی ہوں بیٹھتا بھی ہوں۔ میں کہاں سے معذور ہوں۔ بلکہ وہ تو آنکھ کو حاجب سمجھتے ہیں کیونکہ اگر آنکھ ہوگی کوئی آئے گا تو دیکھ کر لحاظ ہوگا۔ خواہ مخواہ کھڑا بھی ہونا پڑے گا پھر چاروں طرف نگاہ بھی پڑتی ہے۔ دل بٹا رہتا ہے۔ اگر آنکھ نہیں تو دل یکسو رہتا ہے۔ اور ایک زاہد کی حکایت مولانا نے تحریر فرمائی ہے۔

زاہدے را گفت یارے درعمل کم گری تا چشم را ناید خلل

کہ کسی نے ایک زاہد سے کہا کہ کم رویا کرو تاکہ آنکھیں نہ جاتی رہیں۔

گفت زاہد از دو بیروں نیست حال چشم بیند یا نہ بیند آں جمال

زاہد نے کہا سنو! آنکھ یا تو وہ جمال دیکھے گی یا نہیں دیکھے گی اور دونوں کا مقتضا یہ ہے کہ ان کی پراوہ نہ کی جاوے کیونکہ۔

گر بہ بیند نور حق راچہ غم است در وصال حق دو دیدہ کے کم است

اگر وہ جمال دیکھے گی تو دو آنکھوں کی کیا پرواہ

ع متاع جان جاناں جان دینے پر بھی سستی ہے

ورنہ بیند نور حق را گو برد — ایں چنیں چشم شقی گو کور شو

اور اگر جمال نہ نظر آوے تو ایسی کم بخت آنکھوں کو لے کر کیا کروں گا۔ ان کا اندھا ہونا بہتر ہے غرض آنکھوں کی پرواہ نہ کرنا یہ بھی کسی بہت بڑی چیز کے ملنے کی وجہ سے ہے۔ ورنہ یہ حالت ہوتی ہے کہ پانی بھی اترنے لگتا ہے تو ہائے ہائے کرنے لگتے ہیں۔ بہر حال لوگوں نے حضرت سے عرض کیا کہ بنوا لیجئے مگر حضرت کا ایک ذوق تھا نہ بنوائیں۔ عرض کیا کہ حضرت دانت بنوا لیجئے فرمایا بھائی اب تو نرم بوٹیاں گرم روٹیاں ملتی ہیں۔ دانت بننے کے بعد یہ نہیں ملیں گی تو میں دانت بنوا کر کیوں اپنا نقصان کروں۔ سبحان اللہ کتنا خوش ہیں۔ ورنہ یہ ظرافت بدون بڑی خوشی کے کبھی نہیں سوجھ سکتی۔ حضرت وہی بات ہے کہ کچھ مل گیا ہے جس پر آنکھ دانت سب قربان ہیں جس کی جیب سے پیسہ گر کے اشرفی آ گئی ہو ایسے پیسہ کا کیا غم۔ اسی طرح اگر ادھر کی آنکھیں جاتی رہیں۔ ادھر کی صحت حاصل ہو جائے تو کیا غم۔ اگر کسی کے پاس ایک ہی پیسہ ہو تو وہ ہائے ہائے ضرور کریگا۔ اشرفی والے کو ایک کیا سو پیسوں کی بھی پراوہ نہ ہوگی۔ حضرت یہ فرحت یہ انشراح یہ بشاشت (خوش طبعی ۱۲) یہ سکون واطمینان نعم البدل (اچھا بدلہ ۱۲) ملنے ہی کی علامت ہے غرض جو لقاء رب وہاں ہوگا وہ انہیں یہیں حاصل ہے۔

حقیقت عید

بہر حال ان دونوں حدیثوں سے جیسا کہ اس کی تقریر مذکور ہوئی معلوم ہوتا ہے کہ کمال عمل یعنی افطار کے وقت قرب ہوتا ہے اور افطار دو ہیں صغیر و کبیر۔ افطار صغیر تو یہی ہے جو روزمرہ مغرب کے وقت ہوتا ہے۔ افطار کبیرہ وہ ہے جو رمضان کے خاتمہ پر آتا ہے۔ یہ ایک دن کا افطار ہے وہ تیس دن کا ہے۔ اور حدیث میں افطار صغیر کا ذکر صراحتاً ہے اور افطار کبیر کا اشارۃً اگر صغیر پر جزا صغیر ہے تو کبیر پر کبیر ہونی چاہیے۔ غرض ان دونوں حدیثوں کے مجموعہ نے بتلا دیا کہ عید کی کیا حقیقت ہے مشاہدہ گو حدیث میں لقاء رب کا لفظ ہے۔ مگر مشاہدہ و لقاء رب ایک ہی ہیں اور اس لفظ کے اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان عبادات کی روح کا لقب جو کہ روزہ کے متعلق نہیں مجاہدہ تھا اس لئے لفظ مشاہدہ اختیار کیا تا کہ مجاہدہ کا قافیہ بھی ہو جاوے ورنہ حاصل دونوں کا ایک ہی ہے اسی روح کو ایک عارف سمجھ کر کہتے ہیں۔

روزہ یکسو شد و عید آمد و دلہا برخاست　　　　مے بہ میخانہ بجوش آمد و مے باید خواست

روزہ سے مراد اصلاح میں مجاہدہ ہے اور عید سے مراد مشاہدہ ہے اس عنوان سے تعبیر کرنا اس طرف مشیر ہے یعنی اب مشاہد کا وقت آیا ہے اب تک مرجھائے ہوئے تھے اب سب کے دل شاداں ہیں۔ اب کھڑے ہوئے ہیں شراب پینے کو آج ان کا عمل پورا ہوگیا ہے وہ اس شکر کے جوش میں بزبان حال کہتے ہیں کہ ۔

شکر للہ کہ نمردیم و رسیدیم بدوست　　　　آفریں باد بریں ہمت مردانہ ما

(اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم خیریت سے دوست تک پہنچ گئے ہماری اس ہمت مردانہ پر آفرین ہے۱۲) آج اپنی ہمت پر آفریں کررہے ہیں کہ خیریت سے دوست تک پہنچ گئے۔ سبحان اللہ یہ معنی ہیں دلہا برخاست کے اور کہتے ہیں مے بمیخانہ بجوش آمد۔ شراب جوش میں آرہی ہے وہ شراب نجس نہیں ہے شراب صرف طاہر بھی نہیں بلکہ شراب طہور ہے یعنی صرف پاک شراب نہیں بلکہ ناپاک کو پاک کرنے والی شراب ہے اسی لئے قرآن مجید میں شراب طاہر نہیں فرمایا۔ شراب طہور فرمایا کیا رحمت ہے۔ دیکھئے یہاں تو نہ کھانا نہ پینا۔ جیسے روزہ مطہر ہے (پاک کرنے والا۱۲) اور وہاں کا کھانا پانی بھی مطہر ہے۔ وہ شراب جوش میں آرہی ہے وہ جوش میں کیسی آرہی ہے۔ ایک حدیث میں ہے چار شخصوں کے لئے جنت مشتاق ہے الحدیث یعنی اس میں جوش ہے اس کا تقاضا ہے کہ مجھے فلاں شخص کو دیدیا جاوے۔ جب ایسا انعام ہے تو پھر مانگنا چاہیے یہ معنی ہیں مے باید خواست کے۔ تو عارف شیرازی نے پہلے مصرعہ میں بتلا دیا کہ عید کی حقیقت مشاہدہ ہے اور دوسرے مصرعہ میں بتلا دیا کہ رحمت کا جوش ہے مانگنا چاہیے رحمت صوری کا بھی اور رحمت معنوی کا بھی۔ پس عید میں دونوں طرح کی دعوت ہے ظاہری بھی باطنی بھی۔ جیسے فرحت عندالافطار (افطار کے وقت فرحت۱۲) کے دو پہلو تھے۔ اس فرحت عندالافطار الاکبر (افطار اکبر کے وقت فرحت۱۲) میں بھی دو ہی ہیں۔ ایک تو دعوت ظاہری یعنی چھوہارے سویاں اور سویاں تخصیص کے ساتھ نہیں۔ بلا تخصیص اگر ہوں تو مضائقہ نہیں۔ حدیث سے صرف تمر کے کھانے کا استحباب ثابت ہے۔ بس یہ ضیافت حق کا دن ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ دعوت کا قبول نہ کرنا گناہ ہے یہ دعوت اس کا پورا مصداق ہے چنانچہ اس دن اگر کوئی روزہ رکھے گا تو گنہگار ہوگا۔ بھلا خدا دعوت کرے اور قبول نہ کرو۔ نہیں کھانا پڑے گا۔ یہ افطار اکبر کا دن ہے۔

ع گرنستانی بستم میرسد (اگر خوشی سے نہ مانگو گے زبردستی ماننا پڑے گی ۱۲)
اورایک باطنی دعوت ہے وہ باطنی دعوت کیا ہے جسے مانگنا چاہیے وہ یہ ہے۔
شربت الخمر کأساً بعد کاس فلا نفد الشراب ولا رویت
(میں شراب کے پیالے پر پیالے چڑھا گیا ۱۲) نہ شراب ہی ختم ہوئی نہ جی ہی بھرا کاس اصل میں شراب کے پیالے کو کہتے ہیں اور وہ شراب غیر منقطع کیا ہے وہ یہ ہے۔
نہ حسنش غایتے دارنہ سعدی راسخن پایاں بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی
(یعنی نہ محبوب کے حسن کی انتہا ہے نہ سعدی کے کلام کی جیسے جلندر والا مرجاتا ہے اور دریا باقی رہ جاتا ہے۔ایسے محبوب کے حسن کا باقی رہ گیا ۱۲)
یعنی وہ حسن شراب ہے اس میں کہاں غایت ہے کہاں انتہا ہے اس میں تو یہ ہے کہ جتنا آگے بڑھئے اور طلب بڑھتی جاتی ہے۔
اے برادر بے نہایت درگہست ہرچہ بروئے میرسی بروئے مائیست
(اے برادر بے نہایت درگاہ ہے جس درجہ پر پہنچو اس پر مت ٹھہرو بلکہ آگے کو ترقی کرو ۱۲)
اور اس کو سیر فی اللہ کہتے ہیں یہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔
نہ گردد قطع ہرگز جادہ عشق از دویدنہا کہ مے بالانجود ایں راہ جوں تاک از بدیدہا
عشق کا راستہ دوڑنے سے قطع نہیں ہوتا جس طرح درخت انگور کہ جتنا قطع کرو اور بڑھتا ہے یہ سیر فی اللہ کہلاتی ہے جیسا ابھی مذکور بھی ہوا تھا سیر الی اللہ البتہ ختم ہو جاتی اور یہ ختم نہیں ہوتی ورنہ اس کلام میں اور کسی پر واصل کا حکم کرنے میں تعارض ہوگا کیونکہ واصل کے تو معنی یہی ہیں کہ اس کو وصول ہو گیا اور سیر ختم ہوگئی اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ واصل کی بھی سیر ختم نہیں ہوئی سو بعد اس تقسیم کے ان میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ جو سیر ختم ہوئی ہے وہ الی اللہ ہے اور جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ وہ فی اللہ ہے۔ بہرحال یہ شراب تجلیات حق ہیں جو کبھی علم کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں کبھی کسی اور صورت میں ظاہر ہوتی ہیں اسی کی نسبت کہتے ہیں۔
روزہ یک شو وعید آمد و دلہا برخاست مے بمیخانہ بجوش آمد و مے باید خواست
(یعنی مجاہدہ پورا ہو گیا اب مشاہدہ کا وقت آیا سب کے دل شاداں ہیں رحمت کا جوش مانگنا چاہیے ۱۲) تو یہ ہے عید کی حقیقت یعنی مشاہدہ حق جس میں دعوت حسینہ بھی ہے اور دعوت حسیہ بھی

پس اگر ہماری عید مشاہدہ سے خالی ہے تو عید بے روح ہے۔

روح عید

یہ تقریر تو حدیث سے مستنبط تھی اور اسی کے قریب یہ آیت بھی جس کو میں نے اول میں تلاوت کیا تھا یعنی رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا (الایۃ اے اللہ ہم پر مائدہ نازل کر کہ وہ ہمارے لئے عید ہو جاوے اور اس آیت سے بعض نے عید میلاد النبی پر بھی استدلال کیا ہے مگر چونکہ اس کا جواب وعظ السرور میں بیان ہو چکا ہے اس لئے اس وقت اس کے متعلق بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ اس وقت اس سے صرف یہ استنباط کرنا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے عید کو نزول مائدہ پر مرتب کیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ عید کا مقتضا ایک درجہ میں اقتران ہے۔ عید اور نزول مائدہ کا چنانچہ امت عیسیٰ علیہ السلام کو مائدہ کے نزول پر عید ملی۔ پس اس امت کو عید عطا ہونے سے بھی باقتضائے مذکور معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بھی ایک مائدہ ملا ہے جس کی ایک صورت ہے کھانا پینا خوشی کرنا اور ایک معنی ہے مشاہدہ پس اس طرح سے یہ آیت دال ہے روح عید پر مگر بنی اسرائیل کے مائدہ میں اور ہمارے مائدہ میں یہ فرق ہے کہ ان کو محض مائدہ صوری ملا تھا جس میں احتمال ردو نکس (لوٹنا ۱۲) کا تھا اور چونکہ ہمارا مائدہ مقرون ہے مائدہ معنوی کے ساتھ اس لئے اس میں کوئی ردو نکس رجوع وسقوط وحور نہیں ہو سکتا چنانچہ بنی اسرائیل کو اسی لئے ارشاد ہوا تھا قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ کہ ہم مائدہ نازل تو کر دیں گے لیکن اس کے بعد جو کوئی ناشکری کرے گا اس کو ایسا سخت عذاب ہوگا کہ کبھی کسی کو نہ ہوا ہوگا اور نہ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے ناشکری کی اور عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے۔ الحمد للہ ہم کو دو مائدے عطا ہوئے ایک جسمانی ایک روحانی۔ یا ایک صوری ایک معنوی یا ایک ظاہری ایک باطنی تا کہ اگر مائدہ جسمانی سے کم ناشکری کرنا چاہیں تو روحانی ہم کو سنبھالے رہے اور ناشکری نہ کرنے دے۔ اور وہ روحانی مائدہ کیا چیز ہے وہ محبت و معرفت ہے حق تعالیٰ کی جس کا دوسرا عنوان مشاہدہ ہے جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔

عطیہ شاہی

اور جو کہا گیا ہے کہ یہ ظاہری نعمت کی بھی ناشکری نہ کرنے دے گی بیان اس کا یہ ہے کہ محبت

کا خاصہ ہے کہ محبوب کے ادنیٰ احسان کی بھی محبّ کی نظر میں بڑی قدر ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے احسانات تو سب اعلیٰ و اعظم ہی ہیں پس یہ ایسی چیز ہے کہ وہ اس مائدہ کے شکر کو اس قدر بڑھوا دے گی کہ جو عبدالدرہم (دنیا دار ۱۲) سے لاکھوں روپے پر بھی نہ ہوگا۔ اور اس قدر قدر ہوگی کہ عبدالدینار کو ایک لاکھ دینار کی بھی نہ ہوگی۔ واللہ۔ اللہ کے بندوں کو اگر کوئی ایک پیسہ بھی محبت سے دے تو انہیں اس قدر حظ ہوگا کہ جو روپے پیسہ کے پرستاروں کو سو روپے میں بھی نہ ہوگا۔ اس ایک پیسہ کی نذر کسی سے محبت ہو تو جانو۔ فرض کرو کہ ایک شخص آیا اس نے آ کر ایک پیسہ دیا کہ یہ تمہاری محبوبہ نے دیا ہے تو کس قدر حظ ہوگا۔ ایک پیسہ تو کوئی بڑی چیز نہیں وہ حظ اس بات سے ہوگا کہ مجھے یاد تو کیا۔ اور بڑی وفادار اور بے تکلف ہے کہ ایک پیسہ بھیجنے سے شرمائی نہیں۔ تو جو اہل اللہ ہیں انہیں اسی بات کا حظ ہوتا ہے کہ یہ محبوب کا بھیجا ہوا ہے۔ اگرچہ ایک پیسہ ہے۔ میں کہتا ہوں بادشاہ جارج پنجم اگر آپ کو کوئی چیز دیں جو اتنی قیمتی ہو کہ (اشرفی کے برابر ہو کہ کھالو تو آپ کو کھا کر نہایت حظ ہوگا اور آپ فخر کریں گے اس کے بعد پھر کوئی چیز جو اس قدر ارزاں ہو کہ دھیلے کی چار تولہ آتی ہو تب بھی آپ کو حظ ویسا ہی ہوگا۔ اس لئے کہ عطیہ شاہی ہونے میں تو دونوں یکساں ہیں۔ اسی طرح اہل اللہ کو ایک پیسہ سو روپے میں اس حیثیت سے برابر حظ ہوتا ہے۔ تو جسے خدا کی نعمت کی قدر نہیں وہ ایک پیسہ کی ناقدری کرتا ہے۔ اسی طرح کھانوں میں وہ شخص تین پانچ کرتا ہے جسے خدا کی نعمت کی قدر نہیں۔ اگر جارج پنجم کے سامنے کسی معمولی سی چیز سے تین پانچ کرو تو میں جانوں کہ بھئی تمہاری فطرت ہی ایسی ہے مگر وہاں تو تم سر آنکھوں پر رکھ کر کھالو گے۔ تو بات یہ ہے کہ جارج پنجم کی نسبت سمجھتے کہ وہ دیکھ رہے ہیں اگر ذرا بھی رکے تو ان کو بے رغبتی کی اطلاع ہوگی تو صاحبو! کیا خدا نہیں دیکھتا۔ افسوس جارج پنجم کے یہاں کے کھانے کی تو یہ قدر اور خدا کے یہاں کے کھانے کی کچھ بھی قدر نہیں۔

یہاں سے اس کا بھی راز معلوم ہو گیا ہوگا کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم گری ہوئی چیز اٹھا کر کھا لیتے تھے اگر جارج پنجم کا دیا ہوا امرود تھوڑا کھانے کے بعد گر پڑے تو آپ اٹھا کر مٹی بھی نہیں پونچھیں گے مع مٹی کے فوراً کھا جائیں گے۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی کھانا بادشاہ کے سامنے کھاتے تھے ہم اندھے ہیں ہمیں نظر نہیں آتا تو اس وجہ سے آپ گری ہوئی چیز اٹھا کر کھا لیتے تھے کہ بادشاہ کی دی ہوئی ہے۔

جناب ملا محمود صاحب مدرس دیوبند کو میں نے خواب میں دیکھا۔ پوچھا کیا گزری انہوں نے فرمایا بہت اچھی گزری مغفرت ہوگئی۔ میں نے پوچھا انہوں نے کیوں بخش دیا کہا کہ ایک دن کھچڑی میں نمک پھیکا تھا میں نے سر جھکا کر چپکے سے کھالی کچھ اس کے عیب نہیں بیان کئے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم کو یہ بات پسند آئی اور بخش دیا۔ سبحان اللہ بخشش ہوئی تو اس واسطے کہ کھچڑ کھالی تھی۔ ہاں ہاں کچھ تعجب نہ کرو وہاں ایسا ہی ہے۔ اب تم یہ نہ کرنا کہ یہ تو بڑی سہل بات ہے بس ہم بھی ایسی ہی کھچڑی ایک دفعہ کھالیں گے ہماری بھی مغفرت ہو جائے گی۔ بھئی سب کام کرو کھچڑی بھی کھاؤ نماز بھی پڑھو روزہ بھی رکھو۔ پھر چاہے وہ کھچڑی سے مغفرت کردیں۔ چاہے نماز روزہ سے کردیں غرض اہل محبت کو تھوڑی سی چیز میں بھی اس لئے لطف آتا ہے کہ خدا کی دی ہوئی ہے۔

کثافت طبع

اور جو پیٹ کے کتے ہیں وہ تو اسی سے خوش ہوں گے کہ بہت سا پلاؤ ملے یہ کثیف الطبع ہیں کہ انہیں پیٹ ہی کی فکر رہتی ہے کثیف الطبع پر ایک لطیفہ یاد آ گیا کہ ایک بادشاہ نے سنا کہ دکن کی عورتیں بڑی بدتمیز ہوتی ہیں چار عورتیں چار سمت کی جمع کیں ان میں ایک دکن کی تھی صبح کے بالکل اول وقت میں بادشاہ نے سب سے پوچھا کہ کیا وقت ہے چاروں نے کہا کہ صبح ہوگئی۔ بادشاہ نے ہر ایک سے پوچھا کیسے معلوم ہوا۔ ایک نے کہا کہ صبح کے وقت نسیم چلتی ہے اس کی ٹھنڈک سے میری نتھ کے موتی ٹھنڈے ہوگئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صبح ہوگئی۔ دوسری نے کہا کہ صبح کے وقت شمع کی روشنی میں تغیر آجاتا ہے۔ اس وقت شمع کی روشنی متغیر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صبح ہوگئی تیسری نے کہا کہ صبح کے وقت منہ کے پان کا مزہ بدل جاتا ہے اس وقت میرے منہ کے پان کا مزہ بدل گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صبح ہوگئی۔ دکن کی عورت سے پوچھا کہ تم کو کیسے معلوم ہوا کہ صبح ہوگئی تو آپ کہتی ہیں کہ گوہ آ رہا ہے اس سے معلوم ہوا کہ صبح ہوگئی۔ واقعی وہ تینوں بڑی لطیف المزاج تھیں۔ اور یہ نہایت کثیف المزاج تھی کہ استدلال بھی کیا تو گوہ سے تو بعضے لوگ ایسے پیٹ کے بندے ہوتے ہیں کہ ہر موقع پر کھانے اور ہگنے ہی کا خیال رہتا ہے باقی جو پیٹ کے بندے نہیں ہوتے وہ تھوڑی چیز بھی ملے گی تو قدر کریں گے کہ خدا کی دی ہوئی ہے۔

کمال ہمتی

اور اس کا مقتضٰی یہ بھی تھا کہ جو چیز بھی ملے کھانا پڑے۔ مگر کیا ٹھکانا ہے حضرت حق تعالیٰ کی

رحمت کا کہ اس کے متعلق حکم شرعی نہایت سہل فرمایا جس کو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے فعل سے ظاہر فرمادیا کہ **ان اشتھی شیئًا اکلہ و ان لم یشتہ ترکہ** جی چاہا کھالیا نہ جی چاہا نہ کھایا مگر کبھی مذمت نہیں کی اور بادشاہ اگر ایک چیز دے تو آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ جی چاہا کھالیا نہ جی چاہا نہ کھایا۔ وہ تو کھانا پڑے گا۔ پس یہ کتنی بڑی رحمت ہے قدر دانی نعمت پر ایک حکایت یاد آ گئی۔ حضرت لقمان علیہ السلام کے آقا نے ان سے کہا کہ کھیت سے ککڑی توڑ کر لاؤ۔ یہ لائے اس نے کاٹ کر ایک قاش انہیں دی یہ کھا گئے اس نے یہ سمجھا کہ اچھی ہوگی جب تو کھا گئے۔ اس نے بھی کھائی جیسے ہی منہ پر رکھی تو معلوم ہوا کہ کڑوی زہر ہے کہا تم نے کہا کیوں نہیں۔ کہا جس کے ہاتھ سے ہزاروں شیرینیاں کھائی ہیں ایک تلخی کو کیا زبان پر لاتا اور ان شیرینوں کو بھول جاتا۔ یہ حالت ہوتی ہے محبین کی کہ تلخ کو بھی شیرینی سمجھتے ہیں مگر اس طرف سے اس کی تکلیف نہیں وہ دنیا کے بادشاہوں کی طرح نہیں کہ اگر کسی بادشاہ نے آپ کو امرود دیا آپ نے پھینک دیا۔ کہ مجھے تو اچھا نہیں معلوم ہوتا حکم ہوگا ابھی کھاؤ بڑے گستاخ ہو تو حق تعالیٰ کا یہ حق بدرجہ اولیٰ تھا کہ وہ ایسے قانون مقرر کر دیتے مگر نہیں ایسا نہیں کیا سبحان اللہ کیا رحمت ہے کہ اگر جی چاہے کھالو نہ جی چاہے نہ کھاؤ۔ مگر مذمت نہ کرو۔ اور اس میں سب سے بڑھ کر جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمت پر تعجب ہے کہ **ان اشتھی شیئًا اکلہ و ان لم یشتہ ترکہ** (جی چاہا کھالیا نہ جی چاہا نہ کھایا ۱۲) آپ باوجود غلبہ عشق کے کہ مقتضی اکل تو ہر حال میں تھا ضعفاء کی رعایت کے لئے ترک پر کیسے قادر ہوئے۔ اللہ اکبر کیا شفقت ہے آپ اپنے عشق کو مغلوب کر کے مصلحت امت کو غالب کیا کہ عمل کر کے دکھلا دیا۔

برکف جام شریعت برکف سندان عشق ہر ہوسنا کے نداند جام و سنداں باختن

(یعنی ہر طرف شریعت کا خیال ہے دوسری طرف عشق کا۔ شریعت و عشق دونوں کے مقتضی پر عمل کرنا ہر ہوسناک کا کام نہیں ۱۲)

اور آپ کی تو بڑی شان ہے' آپ کے اولیاء امت بکثرت اس ہمت کے گزرے ہیں۔

حضرت عبدالحق ردولویؒ فرماتے ہیں کہ منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد آمد اینجا مردان اند کہ دریاہا فرو برند و آروغ نزنند' منصور بچہ تھا کہ ایک قطرہ میں چیخ اٹھا یہاں تو مرد ہیں کہ دریا کے دریا پی جائیں اور ڈکار تک نہ لیں۔ واقعی یہ حضرات سمندر کے سمندر پی جائیں اور اف نہ

کریں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خدام کی یہ حالت ہے تو آپ کے اندر تو دریائے عشق موجزن تھا اور کیسا دریا۔

بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست — آنجا جز اینکہ جان بسپارند چارہ نیست

یعنی بحر عشق ایک ایسا بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں اس میں بجز جان دیئے چارہ نہیں ۱۲)

اتنے بڑے دریا کو ضبط کر کے ہماری مصلحت کا خیال۔ مگر افسوس ہماری یہ حالت کہ صرف اتنا ہی نہیں کہ نہ کھائیں نہیں اس سے اس قدر آگے بڑھے کہ ہانڈی اٹھا کر پھینک دی بھلا احمق سے پوچھے ہانڈی کا کیا قصور؟ کیا اس نے سالن پکایا تھا۔ اگر پھینکنا تھا تو بیگم صاحب کو پھینکا ہوتا جنہوں نے سالن پکایا ہے۔ اس قسم کی حرکتیں ہم لوگوں کی ہیں۔ مگر جو مائدہ باطنی پائے گا وہ مائدہ ظاہری پر کفران نہ کرے گا۔ جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی امت نے مائدہ باطنی نہ پانے کی وجہ سے کفران کیا تھا۔ پس اصلی عید اس مائدہ باطنی یعنی مشاہدہ کا عطا ہونا ہے۔

عارف کی عید

اسی کو ہمارے حضرت حاجی صاحب نے ایک قطعہ میں ظاہر بھی کر دیا ہے۔ قطعہ

عید گاہ ماغریباں کوئے تو — انبساط عید دیدن روئے تو

(ہم غریبوں کی عیدگاہ اے محبوب آپ کا کوچہ ہے اور عید کی خوشی آپ کا مشاہدہ ہے ۱۲)

صد ہلال عید قربانت کنم — اے ہلال عید ما ابروئے تو

(عید کے سو چاند آپ پر قربان کریں اے محبوب آپ کا چہرہ انور ہمارا عید کا چاند ہے ۱۲)

گویا یہ قطعہ سارے وعظ کا میزان الکل ہے۔ اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ عید حقیقی بھی ہمیں میسر ہو اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اب دو چار روزے رہ گئے ہیں اب بھی کچھ مجاہدہ کرلو۔ ان شاء اللہ مشاہدہ کی قابلیت کہ عید حقیقی ہے میسر ہو سکتی ہے اور جب معلوم ہو گیا کہ عید یہ ہے تو آپ اس شاعر کی بھی تکذیب کر سکتے ہیں جس کا یہ مصرع مشہور ہے۔

ہر روز عید نیست کہ حلوہ خورد کسے

(ہر روز عید نہیں ہوتی کہ کوئی شخص حلوہ کھایا کرے ۱۲)

اور آپ ہر روز عید منا سکتے ہیں کیونکہ وہ عید حقیقی کیا ہے حق تعالیٰ کی محبت اور وہ ہر وقت میسر

ہوسکتی ہے اوراس سے آپ دوسرے ایک مصرعہ کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

ہر شب شب برات ہے ہر روز روز عید

خوب سمجھ لواوراس سے یہ نہیں نکلتا کہ آپ اپنی طرف سے کسی روز عید کرلیں۔ بلکہ اس سے تو اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے کیونکہ جب ہر روز عید ہے تو ہمیں تخصیص کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہی تخصیص بدعت اور بے دلیل ہے **وعظ السرور** میں اس کے متعلق مفصل بحث ہے اور راز اس تخصیص کے اختیاری نہ ہونے کا یہ ہے کہ گو ہر یوم محبت وطاعت کا عید اور وقت تجلی ہے مگر جو عیدین شارع کی جانب سے مقرر ہیں انہیں تجلی اعظم ہے پس اگر آپ کے پاس کوئی دلیل ہو کسی دن میں تجلی اعظم ہونے کی تب آپ بھی مقرر کر سکتے ہیں۔ اور یوں بے دلیل تو محض واہیات خرافات بدعت وضلالت ہے۔ مگر بالمعنی الاعم ہر روز عید ہے بلکہ ہر وقت عید ہے حتیٰ کہ مرنے کا وقت جو اوروں کے لئے وعید ہے اس میں بھی آپ کیلئے عید ہے۔ چنانچہ عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

خرم آں روز کزیں منزل ویران بردم راحت جاں طلبم و ازپے جاناں بردم

(یعنی وہ دن مبارک ہے جس روز ہم اس دنیا فانی سے کوچ کریں۔ راحت جاں طلب کریں اور محبوب حقیقی کے لئے ہم جائیں ۱۲)

نذر کردم کہ گر ایں غم بسر آید روزے تادر میکدہ شاداں و غزل خواں بردم

میں نے نذر کی ہے کہ جس دن یہ غم تمام ہو جائے یعنی موت کا وقت آئے تو محبوب کے دربار تک خوش وخرم اور شعر پڑھتا ہوا جاؤں ۱۲)

تو عارف وعاشق خوشی مناتا ہے کہ وہ دن کب آئے گا جب میں زندان سے نجات پاؤں گا۔ یہ مضامین فوائد ہوئے عید کے متعلق۔ اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ فہم وعمل کی توفیق عطا فرمائیں آمین

تمت

عرضداشت

مضمون ذیل قبل جمعہ حضرت مولانا قدس سرہٗ نے حسب معمول قدیم جلسۂ سالانہ مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون میں (جو عرصہ سے زیر تربیت حضور ممدوح جاری ہے۔ بیان فرمایا تھا۔ چونکہ قرآن مجید کی ترغیب میں نہایت مفید اور موثر اور اپنے طرز میں نیا مضمون ہے اس لئے غائبین اخوان ملت کے استفادہ کے لئے مثل مواعظ ضبط کر کے اسے بھی شائع کیا جاتا ہے گو تنگی وقت کے سبب ناتمام بیان ہو سکا۔ امید ہے کہ قارئین کے نفع ودلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ (جامع کان اللہ لہٗ)

نور الصدور

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

رسم دستار بندی:

صاحبو! بیان مقصود تو بعد نماز کے ہوگا۔ اس وقت ایک ضرورت سے ایک مختصر بیان پر اکتفا کروں گا۔ سب کو معلوم ہوگا کہ مدرسہ میں یہ معمول ہے کہ جو بچے حفظ قرآن سے فارغ ہوتے ہیں انہیں ایک چھوٹا سا عمامہ دیا جاتا ہے تا کہ برکت بھی ہو اور انہیں اس سند کا لحاظ بھی رہے اور کوئی کام خلاف وضع نہ کریں۔ نیز دوسرے بچوں کو بھی ترغیب ہو کہ ہم بھی اس شرف کو حاصل کریں۔ بحمد اللہ تین بچے اس سال بھی فارغ ہوئے ہیں۔ سو اس وقت وہ تھوڑا سا قرآن مجید بھی سنا دیں گے اور ان کی حسب معمول رسم دستار بندی بھی ادا کی جائے گی۔ خیر یہ تو تمہید تھی۔

قرآن حکیم کی ناقدری

اس وقت کہنا یہ ہے کہ قرآن مجید ایسی ہی چیز ہے کہ اس کے لئے اس قدر اہتمام کیا جائے اور یہی ضرورت ہے اس رسم و عادت کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ نئی تعلیم سے متاثر ہیں وہ تو قرآن مجید سے بالکل غیر متاثر ہیں۔ ان کے نزدیک تو قرآن مجید کی تعلیم میں وقت صرف کرنا اضاعت (ضائع کرنا ۱۲) اوقات ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ ہمارے پاس اتنی بڑی دولت موجود ہے اور ہمیں اس کی قدر نہیں۔ اہل یورپ سے کوئی پوچھے کہ ان کے نزدیک قرآن مجید کی کتنی عظمت ہے اور مسلمانوں کے قلب پر اس کا کچھ بھی اثر نہیں۔ اہل یورپ کا یہ قول ہے کہ قرآن مجید جب تک مسلمانوں کے پاس ہے ان کی ہستی دنیا سے مٹ نہیں سکتی۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید میں کیا ہے؟ واقعی **الفضل ماشهدت به الاعداء** (فضیلت وہی ہے کہ جس کی دشمن بھی گواہی دیں ۱۲) دوسری قومیں تو اسے مسلمانوں کی روح تسلیم کرتی ہیں اور حیرت ہے کہ تم جسم بلکہ ناخن بلکہ پرانے کپڑے بھی نہ سمجھو۔ افسوس اتنی بھی قدر نہیں۔ تمہیں تو اپنی روح سمجھ کر اس کی بڑی حفاظت کرنا چاہیے تھی۔ اور یہ کوئی حفاظت نہیں کہ اسے چوم لیا یا سر پر رکھ لیا یا مضبوط جلدیں بندھوا کر نفیس جزدانوں میں رکھ دیا۔ یہ حفاظت نہیں اس کی حفاظت یہی ہے کہ جس کام کے لئے ہے اس کے واسطے حفاظت کرو۔ کسی کے پاس ایک دوشالہ تھا اور ایک روپیہ کا سوختہ خریدا ہوا کوٹھڑی میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے دوشالہ بھی اسی میں ڈال دیا تا کہ کوئی چرا نہ لے جاوے اور چولہے میں رکھنے کے واسطے کام آوے۔ حفاظت تو یہ بھی ہے مگر رکھا کہاں ہے سوختہ میں اور کیوں رکھا ہے جلانے کے لئے صاحبو! اسے حفاظت کہو گے۔ حفاظت کے معنی تو یہ ہیں کہ ایسی حفاظت کرنا چاہیے کہ اس حفاظت کو اس کام میں دخل ہو جس کے لئے وہ موضوع ہے کیا قرآن کی یہی حفاظت ہے اور کیا قرآن اسی واسطے تھا کہ کسی کو بیماری ہو تو اس کے ورقوں کی ہوا دے دو یا تیجے میں رسم کے طور پر پڑھوا لو۔ یا فال دیکھو۔ بچوں کا نام نکالو۔

سبب نزول

جانتے بھی ہو قرآن مجید کیوں نازل ہوا۔ خود جناب باری ارشاد فرماتے ہیں كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ہم نے قرآن کو اس واسطے نازل کیا ہے کہ فکر کریں

اور ذکر کریں۔ فکر سے مراد علم ہے اور ذکر سے مراد عمل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ قرآن علم و عمل کے لئے نازل ہوا ہے۔ اب بتاؤ تم نے قرآن سے کیا کام لیا۔ خیر عمل تو کٹھن ہے علم میں بھی دو درجے ہیں ایک الفاظ کا دوسرے معانی کا۔ معانی کا مرتبہ بھی جانے دیجئے کہ وہ دشوار ہے مگر الفاظ قرآن میں تو کوئی مسلمان ایسا نہ ہوتا کہ نہ جانتا ہو سب کو پورا قرآن یاد ہونا چاہیے تھا۔ پاؤ پاؤ پارہ بھی تو یاد نہیں اور جو الحمد قل ہواللہ یاد بھی ہے تو وہ بھی صحیح یاد نہیں اگر کہو کہ بھئی صحیح کر لو تو کہتے ہیں کہ ہم بوڑھے اب کیا پڑھیں گے اور کیا صحیح کریں گے۔ ابھی اگر منادی ہو جائے کہ جو قرآن کے حروف صحیح کرے گا اسے فی حرف پانچ روپے ملیں گے تو پھر دیکھو یہی بوڑھے طوطے سب سے پہلے انہیں کی زبان ٹوٹنے لگے گی۔ اور اس امید پر کوشش کریں گے کہ ص ض صحیح کر لیں کہ شاید پانچ روپے مل جاویں۔

اور یہاں تو یہ ہے کہ اس منادی کے بعد اگر تم نے کوشش کی مگر تم سے حروف صحیح نہیں ہو سکے تو وہ منادی کرنے والا کبھی انعام نہ دے گا۔ مگر خدا کے یہاں کوشش کرنے والوں کو بھی وہی انعام واکرام مل جاتا ہے جو کوشش میں کامیاب ہونے والوں کو ملتا ہے تو یہ فرق بھی ہے کہ حروف نہ بھی صحیح ہوں تب بھی انعام مل جاتا ہے تو حیرت کی بات ہے کہ آپ کو اس پر بھی قرآن مجید کے حروف صحیح کرنے کی طرف رغبت نہ ہو۔

مدح حفاظ

اور اول تو یہی کوشش کرنی چاہیے کہ قرآن حفظ ہو اس واسطے کہ یہ قرآن مجید کے لئے بڑی حفاظت کی صورت ہے اور یہ امتیاز ہے۔ بفضلہ تعالیٰ اس قوم کا دیگر اقوام سے۔ اور قوموں کی کتابیں اول تو اصلی حالت پر ہیں نہیں اور جیسی کچھ ہیں بھی ان کا کوئی حافظ نہیں۔ اگر ایک دم سے تمام نسخے ان کے تلف ہو جائیں تو کوئی ان کے جمع کرنے کی صورت نہیں۔ بخلاف قرآن مجید کے کہ۔ اس کی ایسی حفاظت کی گئی ہے کہ اگر اس کے تمام نسخے بھی خدانخواستہ مسلمانوں سے علیحدہ کر لئے جائیں تو بھی اس کے لاکھوں نسخے چھوٹے چھوٹے بچے لکھوا سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک آیت میں اس پر دلالت بھی ہے ارشاد ہے۔ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ کی ضمیر قرآن مجید کی طرف راجع ہے۔ یعنی قرآن مجید آیات بینات ہیں باوجود یہ کہ قرآن ایک چیز ہے مگر خبر

میں فرمایا آیات بینات یعنی بہت سی نشانیاں ہیں۔ پس جمع کے صیغے سے تعبیر فرمانا یا تو اس وجہ سے ہے کہ قرآن مجید مشتمل ہے بہت سی آیتوں کو اور یا اس لئے کہ وہ بہت سے معجزوں کو مشتمل ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے اسے حفظ کر لیتے ہیں تو اس واسطے آیات بینات فرمایا کہ کئی نشانیاں ہیں اور ہیں کہاں فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جن کو علم عطا ہوا ہے چونکہ علم کے دو مرتبے ہیں۔ علم الفاظ۔ علم معانی۔ اسی لئے اس کی بھی دو تفسیریں ہیں۔ ایک تفسیر پر علماء مراد ہیں دوسری تفسیر پر حفاظ۔ تو میں اس وقت وہ تفسیر کرتا ہوں جس میں حفاظ کی مدح ہے کہ انہیں اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (وہ لوگ ہیں جن کو علم عطا ہوا ہے ۱۲) کے لقب سے یاد فرمایا ہے تو اس میں اس تفسیر کے موافق اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے انہیں اہل علم فرمایا ہے۔ تو جیسے علماء کی دستار بندی ہوتی ہے ایک تفسیر پر یہ بھی علماء ہیں۔ ان کی بھی ہونی چاہیے۔ تو اے مسلمانو اس فضیلت کو حاصل کرنا چاہیے۔ اسی فضیلت کی رغبت کے واسطے ہر سال یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔ اور حفاظ سے بھی کہتا ہوں کہ الذین اوتوا الجھل (وہ لوگ ہیں جن کو جہل عطا ہوا ہے ۱۲) نہ بن جانا۔ اس کو اتنی محنت سے حاصل کیا ہے تو چھوڑنا نہ چاہیے۔ اس کے صفات ومخارج کی درستی کا بھی لحاظ رکھو اور برابر تلاوت کرتے رہو۔

فضیلت تلاوۃ

تلاوت سب عباتوں سے افضل ہے بہت سی حدیثیں اس باب میں وارد ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ اس کے ایک ایک حرف پر دس دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ فقط الحمد کہہ لو پچاس نیکیاں مل گئیں۔ تو دیکھئے قرآن میں کس قدر حرف ہیں۔ اگر پورے قرآن کی تلاوت کریں گے تو کس قدر نیکیاں ملیں گی۔ اور فرماتے ہیں کہ خدا کسی کی طرف اس قدر متوجہ نہیں ہوتا جتنا قرآن پڑھنے والے نبی کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور نبی میں یہ قید لگانا دال ہے علت توجہ کی طرف کہ وہ قرآن کا پڑھنا ہوا گرچہ تالی امتی ہو۔ اسی واسطے میں جس ذاکر کو دیکھتا ہوں کہ تلاوت سے رغبت ہے تو اور اذکار چھڑا دیتا ہوں یا کم کرا دیتا ہوں اور تلاوت کی تعلیم کرتا ہوں۔

اہتمام ذکر اللہ

یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ جب قرآن کی تلاوت اس قدر افضل ہے تو پھر اس کو چھوڑ کر ذکر وشغل

کی تعلیم کیوں دی جاتی ہے۔ کیونکہ بات یہ ہے کہ جو تلاوت قرآن کے شرائط ہیں بعض اوقات ان میں کمی ہوتی ہے تو ذکر وشغل میں اسی لئے لگاتے ہیں تا کہ تلاوت کے قابل ہو جائے۔ دیکھو تم کھانے سے پہلے ہاتھ دھوتے ہو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کھانا چھوڑ کے ہاتھ کیوں دھوتے ہو۔ ارے نادان کھانا چھوڑتے کب ہیں یہ تو کھانا ہی کھانے کے لئے ہے۔ گو ضروری نہیں کھانا اس پر موقوف نہیں مگر کھانے کا لطف بغیر اس کے نہیں آتا۔ تو قرآن کے واسطے جیسے قلب کی ضرورت ہے ویسا قلب بنانے کے لئے مجاہدات کی ضرورت ہے اسی واسطے صحابہ میں تلاوت و نماز کی کثرت تھی ذکر وشغل وہاں نہ تھا۔ اس واسطے کہ فیض صحبت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کے قلب نہایت شفاف تھے مگر ذکر وشغل اس زمانہ میں ضروری ہے تا کہ قابلیت پیدا ہو جائے۔

اس کو نہایت واضح مثال سے سمجھئے۔ ایک شخص مسجد میں آیا۔ جھٹ کھڑا ہو کر اللہ اکبر کہا اور نماز کی نیت باندھ لی۔ ارے بھائی وضو کر کیا وضو نماز سے زیادہ ضروری ہے۔ اگر وضو ایسی ہی اچھی چیز ہے کہ نماز چھڑا کے اس کے کرنے کا حکم دیا جاتا ہے تو بس پھر وضو ہی کثرت سے کرلیا کریں گے۔ ارے احمق جب وضو کر لینا تو نماز میں لگ جانا۔ لیکن نماز سے پہلے نماز کے صحیح ہونے کے لئے تو وضو ضروری ہے۔ اسی طرح آپ کو بھی جب وہ درجہ حاصل ہو جائے تو ذکر میں کمی کر کے تلاوت میں لگ جائے گا۔ میں ذکر سے بہت ضروری تلاوت کو سمجھتا ہوں۔ مگر تلاوت کی درستی کے لئے پہلے ذکر وشغل تعلیم کرتا ہوں جس طرح نماز سے پہلے وضو کی تعلیم کی جاتی ہے اور جہاں کہیں دیکھتا ہوں اب قلب اس درجہ کا ہو گیا بس ذکر میں کمی کرا کے تلاوت کی تاکید کرتا ہوں۔

افضل الوظائف

میں نے ایک دوست کو لکھا تھا کہ ذکر وشغل کم کر دو۔ رمضان میں تلاوت زیادہ بہتر ہے۔ غرض یہ سب وظائف سے بہتر ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا دریافت کیا کہ سب سے زیادہ کون سی عبادت موجب قرب ہے۔ ارشاد ہوا تلاوۃ القرآن (قرآن پاک کا پڑھنا ۱۲) عرض کیا بفھم او بلا فھم سمجھ کر یا بے سمجھے۔ ارشاد ہوا بفھم او بلا فھم (خواہ سمجھ کر ہو یا بلا سمجھے۔ دونوں طرح موجب قرب ہے اے صاحب کسی شاعر کا دیوان کوئی پڑھتا ہو اس شاعر سے پوچھو کہ اس کے دل میں اس شخص کی نسبت کیا خیال پیدا ہوگا سمجھے گا کہ اس کو مجھ سے

بڑی محبت ہے۔ جو میرا کلام پڑھ رہا ہے سمجھ کر پڑھنے والے پر تو شبہ خود غرضی کا بھی ہے کہ اپنے مزہ کے لئے پڑھ رہا ہے اور بے سمجھے پڑھنے والا نری محبت سے پڑھتا ہے کیونکہ اسے مضمون کا مزہ تو آتا ہی نہیں۔

ترغیب قولی وعملی

میں کہتا ہوں شاید ان بے سمجھے پڑھنے والوں پر حق تعالیٰ کی نظر عنایت اس حیثیت سے زیادہ ہو۔ گو سمجھ کر پڑھنے والوں کے لئے اور بہت سی حیثیتیں ہیں۔ حق تعالیٰ کی نظر عنایت کی۔ غرض خود بھی پڑھو اور اپنے بچوں کو بھی پڑھاؤ۔ یہ تو قولی ترغیب تھی عملی ترغیب یہ ہے کہ بچوں سے پڑھوا کر سنوایا جاتا ہے اور ان کی دستار بندی بھی کی جاتی ہے تا کہ اور بچوں کو بھی حرص ہو اور ان کے ماں باپ کو بھی اس اعزاز کی وجہ سے توجہ ہو کیونکہ اعزاز کے خیال سے بھی آدمی بہت سے کام کرتا ہے اب حق تعالیٰ سے دعا کرو کہ ایسی رغبت وفہم اور اپنے کلام کے حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

روح الجوار

ہفت اختر کا تیسرا وعظ

۱۶ رمضان المبارک ۱۳۳۳ھ جمعۃ المبارک کو جامع مسجد تھانہ بھون میں یہ وعظ ارشاد فرمایا جس میں روح اعتکاف اور اس کے متعلقات کا تفصیل سے ذکر فرمایا۔

ساڑھے تین گھنٹے تک وعظ جاری رہا۔

سامعین کی تخمینی تعداد ۲۰۰ سو تھی۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

خطبہ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہ، و نستعینہ، و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ، و نشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہ، و رسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم، امابعد ...... فاعوذ باللہ من الشیطان الرحیم .

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَلَا تُبَاشِرُوۡهُنَّ وَاَنۡتُمۡ عٰكِفُوۡنَ فِى الۡمَسٰجِدِ ؕ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَقۡرَبُوۡهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ○ (البقرہ:۱۸۷)

ترجمہ: اوران بیبیوں سے اپنا بدن بھی نہ ملنے دو جس زمانہ میں تم لوگ مسجدوں میں اعتکاف کرنے والے ہو یہ خداوندی ضابطے ہیں سوان سے نکلنے کے نزدیک بھی نہ ہونا اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے اوراحکام بھی لوگوں کی اصلاح کے واسطے بیان فرمایا کرتے ہیں اس امید پر کہ وہ لوگ مطلع ہوکر خلاف کرنے سے پرہیز کریں ۱۲)

تمہید

اس کے قبل دونوں جمعوں میں یہ امر مشترک طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ ان عبادات کے متعلق بیان کرنا مقصود ہے جن کو خصوصیت ہے ان ایام مبارکہ کے ساتھ چنانچہ ان عبادات کی مختصر فہرست میں سے دو کے متعلق ذکر کر دیا گیا ہے۔ ایک روزہ دوسرے نماز تراویح۔ اور تراویح کے واسطے سے قرآن کی خصوصیت ان ایام کے ساتھ اور اس کے ساتھ ان کی روح اور ان کا جوہر بھی بیان کر دیا گیا تھا۔ بس یہ حاصل تھا۔ ان دونوں جمعوں کے بیان کا۔

مشروعیت اعتکاف

ان کے علاوہ ایک اور عبادت ہے جو مخصوص ہے ان ایام کے ساتھ آج اسی کی روح و جوہر کے متعلق بیان کرنا ہے جس کا نام اعتکاف ہے۔ اور ان ایام کے ساتھ اعتکاف کے مخصوص ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اور ایام میں مشروع نہ ہو اور ایام میں بھی مشروع ہے لیکن تاکد کے ساتھ ابتداءً مامور بہ نہیں اگر ہے تو بواسطہ نذر کے یا مثل نذر کے اور میری مثل نذر کی یہ صورت ہے کہ مثلاً کسی کا اعتکاف باطل ہو گیا تھا تو اور ایام میں اس کی قضا کرنا ہوگی کہ وہ بھی مثل نذر کے واجب ہے بلکہ نذر کے لفظ کو چھوڑ یئے تاکہ سمجھنے میں سہولت ہو یوں سمجھئے کہ اور ایام میں التزام کا واسطہ ہے اب اس میں قضا و نذر دونوں داخل ہو گئے۔ مثلاً رمضان میں اعتکاف کیا تھا۔ دس دن کی نیت کی تھی۔ اس میں سے ایک دن یا دو دن یا چار دن یا دسوں دن کا جاتا رہا تو اس کے عوض میں اور ایام میں قضا کرنا پڑیگا یا یہ کہ نذر معلق کی کہ اگر میری فلاں حاجت پوری ہو جائے گی تو میں پانچ دن کا اعتکاف کروں گا یا نذر غیر معلق کی مثلاً یوں کہا کہ فلاں روز اللہ واسطے اعتکاف کروں گا۔ یہ صورتیں تو التزام عبد کی تھیں۔ اور ایک التزام شارع کی جانب سے متاخر درجہ میں ابتداءً ہوا ہے۔ میں اس متاخر کی قید کا فائدہ بھی بیان کر دوں گا[1]۔ تو اس اعتبار سے کہ ابتداءً شارع کی جانب سے اس کا التزام صرف اسی ماہ میں ہوا ہے اس معنی کو یہ مخصوص ہے اس ماہ کے ساتھ۔ گو بالتزام عبد اور ایام میں بھی لزوم کے ساتھ مشروع ہے چونکہ یہ بھی انہیں طاعات کی فہرستمیں سے ہے جن کو خصوصیت ہے اس ماہ کے ساتھ لہٰذا

---

[1] پھر تقریر دور چلی گئی یاد نہ رہا۔ اس لئے اس حاشیہ میں اس کی شرح کئے دیتا ہوں۔ مراد اس سے درجہ ہے۔ سنت کا جو کہ متاخر ہے فرض و واجب ہے یعنی التزام درجہ ایجاب میں نہیں ہے بلکہ درجہ سنت موکدہ میں ہے اسی تاکد کو التزام کہہ دیا گیا ہے لیکن یہ تاکد علی العین نہیں ہے بلکہ علی الکفایہ ہے ۱۲ منہ

جس طرح گذشتہ جمعوں میں ان طاعات کے مسائل فرعیہ نہیں ذکر کئے گئے بلکہ ان کی روح کا ذکر کیا گیا ہے اسی طرح یہاں بھی فروع ذکر نہ کئے جاویں گے ہاں اگر ضمناً یا تبعاً آ جائیں تو مضائقہ نہیں۔ جس طرح ان میں بعض فرعی مسائل آ گئے ہوں گے بلکہ پہلے جمعوں کی طرح کہ ان میں مقصود بالبیان روح صوم وروح صلوٰۃ تھی۔ آج بھی روح اعتکاف کا ذکر کرنا مقصود ہے۔

صورت اعتکاف

سو اعتکاف کی بھی ایک صورت ہے۔ ایک روح ہے۔ صورت تو یہ ہے کہ مسجد میں جا کر بیٹھ جانا اس کے درجات مختلف ہیں۔ اگر پوری فضیلت حاصل کرنا ہو تو دس دن کا اعتکاف کرنا چاہیے۔ یوں تو ایک دن کا بلکہ ایک گھنٹہ کا بھی ہو سکتا ہے۔ دس دن تک اعتکاف کرنے کے یہ معنی ہیں کہ رویت ہلال تک اب کہیں دس ہوں گے اور کبھی نو ہی دن ہوں گے۔ اگر تیس کا چاند ہے تو دس دن ہوں گے اور اگر انتیس کا ہے تو نو ہی دن کے ہوں گے مگر شارع کی کیا رحمت ہے کہ دونوں صورتوں میں خواہ دس دن ہوں یا نو دن عشرۂ اخیرہ رکھا اور فقط نام ہی نہیں رکھا بلکہ ثواب بھی دس دن کا دیا۔

وصل محبوب

حدیث میں آیا ہے کہ **شهرا عيد لا ينقصان (الصحيح لمسلم كتاب الصيام:۳۱، سنن ابی داؤد:۲۳۲۳، سنن الترمذی:۶۹۲)** (عید کے دونوں مہینے کم نہیں ہوتے ۱۲) اس کی تفسیر بھی خود حدیث میں آئی ہے کہ وہ رمضان و ذی الحجہ ہیں۔ ذی الحجہ کا شہر عید فرمانا تو ظاہر ہے کہ اس میں عید کا دن ہے۔ لیکن رمضان کو اس وجہ سے عید فرمایا کہ یہ فرحت کا مہینہ ہے کہ ہر روز افطار کے وقت اس میں فرحت ہوتی ہے اور یا یہ وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جس معنی کو تم اسے عید کا مقابل سمجھتے ہو یعنی امساک عن الغذاء (غذا سے باز رکھنا ۱۲) سو اس معنی کے اعتبار سے بھی یہ عید ہی کا مہینہ ہے یعنی اس میں روحانی غذائیں ملتی ہیں۔ بلکہ جو حقیقی غذائیں اس ماہ میں ملتی ہیں وہ عید میں میسر بھی نہیں آتیں۔

وذكرك للمشتاق خير شراب　　وكل شراب دونه كسراب

اے محبوب آپ کا ذکر سب سے اچھی غذا ہے (اور ماسوا ذکر کے جو بھی غذا ہے وہ مثل سراب کے دھوکہ ہے ۱۲) اور حقیقت میں تو کچھ تعجب بھی نہیں کسی پر عاشق ہو جاؤ۔ محبوب یہ کہے کہ

دوشقیں ہیں اور پلاؤ قورمہ فیرینی مزعفر لیتے ہوتو ہم سے ملاقات نہ ہوگی۔ اور اگر ہمارے پاس بیٹھنا چاہتے ہوتو یہ بھی نہ ملے گا بلکہ فاقہ سے پڑا رہنا ہوگا۔ تم خود دیکھ لو کہ تمہارا ذہن کیا حکم کرے گا۔ اس پر تو تنبیہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ محبوب کو اختیار کرے گا۔ لیکن پوچھنے کی بات یہ ہے کہ تم یہ بتاؤ کہ اس وقت بھوک بھی ہوگی سو واقعی اس وقت بھوک بھی نہیں ہوگی۔ اور یہ مسلم ہے کہ عادۃً بغیر غذا کے بھوک نہیں بند ہوتی اور اس وقت بغیر کسی ظاہری غذا کے بند ہوگئی۔ یہ تو ہے نہیں کہ یہ مقدمہ مسلمہ غلط ہو۔ بلکہ یہ کہنا پڑے گا کہ یہاں بھی غذا سے بھوک بند ہوئی اور وہ کون سی غذا ہے کہ وہ غذا وصل محبوب ہے۔ اور اگر یہ غذا نہیں تو روح میں اس قدر تازگی کیوں کر ہوئی۔ آپ سمجھتے ہیں کہ وہ غذا صرف روٹی کا نام ہے۔ غذا صرف روٹی ہی کا نام نہیں ہے اگر کسی کی قوت ہاضمہ صحیح نہ ہو وہ جب کھائے گا وہ غذا فوراً نکل جائے گی۔ اور اس کھانے سے بھوک کا تقاضا دفع نہ ہوگا بلکہ وہ بحالہ باقی رہے گا۔ مستسقی پانی پیے تو پیاس کا تقاضا دفع نہ ہوگا بلکہ وہ اور بڑھ جائے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ غذا جو غذا ہے وہ قوت کی وجہ سے ہے۔ بس اصل میں قوت ہی غذا ہے۔ پس اگر اور کسی وجہ سے قوت حاصل ہو جائے تو اب غذا کی کیا ضرورت ہے تو تعجب ہے کہ روٹی کو غذا کہو اور وصل محبوب کو جو کہ روح کی غذا ہے غذا نہ کہو۔ یہ تو بدرجہ اکمل غذا ہے۔

روزہ کی غذا

اور اسی وجہ سے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہی لفظ ارشاد فرمائے کہ **یطعمنی ربی و یسقینی** کہ (حالت صوم میں) میرا رب مجھے کھلا پلا دیتا ہے۔ تو سقی واطعام (پلانا اور کھلانا ۱۲) جسمانی غذا ہے اور محبت کے لئے بڑی غذا محبوب کا ذکر ہے۔ بس جب یہ بات ہے تو اسے آپ بھوک کا مہینہ نہیں کہہ سکتے بلکہ واقع میں تم دن بھر کھاتے پیتے ہو اور اس کی ایک موٹی سی دلیل ہے کہ تم ایک دن بدون روزہ کے فاقہ کر کے دیکھو ضعف ہوگا بے چینی رہے گی..... صبر نہ ہوگا۔

اور ایک دن روزہ رکھ کر دیکھو نہ ضعف ہوگا۔ نہ بھوک لگے گی نہ بے صبری ہوگی نہ بے چینی، اب بتلاؤ کہ فاقہ کی حالت میں قوت کہاں گئی۔ معلوم ہوا کہ اس وقت غذا نہیں ہوئی تھی اور آج روزہ کی حالت میں قوت کہاں سے آ گئی۔ معلوم ہوا کہ غذا ملی ہے۔

حال بد از نال بد

اور اگر کوئی کہے کہ ہمیں تو روزہ میں بھی بھوک لگتی ہے ضعف بھی ہوتا ہے پیاس بھی لگتی ہے

بے چینی بھی ہوتی ہے تو حضرت بھوک پیاس خود نہیں لگتی تم جزع وفزع (بے صبری اور گھبراہٹ ۱۲) کر کے لگاتے ہو۔ تم دو روزہ رکھو ایک میں کہتے پھرو کہ ہائے بھوک ہائے پیاس دیکھو کس شدت کی بھوک پیاس لگے گی کہ دن کاٹنا دشوار ہو جائے گا اور دوسرے دن روزہ رکھ کر بالکل خاموش رہو۔ منہ سے کچھ نہ بولو دیکھو کیسی سہولت سے دن کٹ جائے گا۔ زمین آسمان کا فرق ان دونوں دنوں میں تم کو خود نظر آئے گا اور جب تم ساری دنیا سر پر اٹھا لو گے تو نہ بھی لگتی ہو گی تو لگے گی

ع مزن فال بدکاور و حال بد

(بری فال حال بد پیدا کرتی ہے ۱۲) جب صبح سے تم غل مچاؤ گے تم نے فال بد شروع کی۔ لوگ ایسا محض شیخی کی وجہ سے کرتے ہیں کہ لوگ یہ سمجھیں کہ بڑے عالی ہمت جو اس قدر بھوک اور پیاس کو برداشت کرتے ہیں۔ تو جب شیخی کی وجہ سے فال بد شروع کی تو پھر سچ مچ لگنے لگتی ہے۔

بدفالی ایسی چیز ہے۔ ایک شخص کو مدینہ میں بخار آیا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیادت کو تشریف لے گئے فرمایا۔ **لأباس طهور ان شاء الله (الصحيح للبخاري ۴:۲۴۶، المعجم الكبير للطبراني ۱۱:۳۴۲، مشكوٰة المصابيح:۱۵۲۹)** اس نے کہا **لا بل حمیٰ تفور على شيخ كبير تزيره القبور** تیز بخار ہے یہ قبرستان میں پہنچائے گا۔ آپ نے فرمایا بہتر ہے اب یوں ہی ہو گا۔ چنانچہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ کسی روایت میں ہے کہ وہ ٹہل گیا۔ اسی طرح صبح سے تم نے غل مچانا شروع کیا کہ ہائے پیاس ہائے بھوک تو کیونکر بھوک پیاس نہ لگے گی۔

روزہ میں غسل

اسی واسطے جو فعل کہ بے صبری پر دال (دلالت کرنے والا ۱۲) ہو شریعت کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ اسی سے امام صاحب فرماتے ہیں۔ روزہ کی حالت میں بار بار نہانا مکروہ ہے اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں جائز ہے مگر دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ ایک نہانا ایسا ہے کہ بے صبری سے پیدا ہوا ہے مثلاً گرمی پیاس کا صبر نہیں یا بے صبری سے تو ناشی نہیں مگر دال ہے بے صبری پر کہ دیکھنے والے اس کے طرز اور اس کی ہیئت سے یہ سمجھتے ہیں کہ اسے گرمی کی برداشت نہیں ایسا نہانا مکروہ ہے کیونکہ اس میں حق تعالیٰ کے فرض سے اظہار کراہیت ہے کہ خدا نے ایک عبادت فرض کی اور یہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ اس سے ثواب جاتا رہتا ہے۔ اس سے کیا فائدہ کہ کرنا تو پڑا ہی غل مچا مچا کے اس کا ثواب کیوں کھوتے ہو۔ یہی حال ہے ان کا جو پریشان کن واقعات میں گھبرایا

کرتے ہیں اور پھر طرح طرح کی شکایتیں کرتے ہیں دنیا کا تو نقصان ہوا ہی دین کا بھی نقصان کیا۔ خواہ مخواہ شکایت کرکے خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃَ (دنیا وآخرۃ دونوں کا نقصان ہوا ۱۲)

قضا دگر نشود در ہزار نالہ و آہ   بکفر یا بشکایت برآید از دہنے

(جامع)

(حکم الٰہی نہیں بدلتا اگرچہ ہزار آہ و نالہ کفر یا شکایت کے ساتھ منہ سے نکلیں ۱۲) جو چیز گئی وہ گئی پھر تو ملنے سے رہی۔ تم اپنا ثواب کیوں کھوتے ہو۔ کس قدر حماقت ہے کہ ایک نقصان تو ہوا ہی تھا دوسرا بھی کرلیا۔ واقعی ان دنیاداروں سے زیادہ نادان کون ہوگا۔ اگر راضی رہتے تو دو طرح سے اس کا تدارک ہو جاتا ایک تو ثواب ملتا۔ دوسرے پریشانی میں کمی ہو جاتی۔ عورتوں پر جو اس قدر غم کی شدت ہوتی ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ ہائے ہائے بہت کرتی ہیں۔ اگر نہ بھی کریں تو دوسری عورتیں آ کر کراتی ہیں۔ یہ رسم ہے کہ جب کوئی مرجاتا ہے تو اس گھر میں جب کوئی عورت آتی ہے گھر والی کے گلے لپٹ کر ضرور روتی ہے۔ اگر وہ بھول جائے تو اسے اس طرح سے یاد دلا دیتی ہیں اور مردوں کو اللہ تعالیٰ نے استقلال دیا ہے۔ اول اول کچھ غم رہا اس کے بعد بھول بھال گئے۔ تو ایک نہانا تو وہ تھا اور ایک نہانا اس لئے ہے کہ بے صبری سے نہیں ہوا بلکہ نفس کو تھوڑی سی مدد دیدی کہ عبادت آسان ہو جائے تا کہ اعانت ہو طاعت پر اس میں کچھ حرج نہیں۔ یہ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی (نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہو ۱۲) میں داخل ہے اور اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ کا مصداق ہے۔ یعنی صبر وصلوۃ کے ذریعہ سے اور عبادتوں پر استعانت کرو۔ غرض ایک عمل سے دوسرے عمل پر سہارا ڈھونڈنا مطلوب ہے۔

شان عبدیت

اور یہی حقیقت ابوداؤد کی روایت کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم روزہ میں کبھی کبھی غسل بھی فرماتے تھے۔ اور آپ کا مطلقاً بھی معمول تھا کہ آپ کو جب کبھی دو چیزوں میں اختیار دیا جاتا تھا آپ آسان کو اختیار فرماتے تھے۔ حالانکہ آپ کی ہمت عالیہ اس قدر بلند تھی کہ دو جہان کی مشقت بھی اس کے آگے ہیچ تھی۔ اور کیوں نہ ہو جس نے بوجھ اٹھالیا آثار وحی کا اور تبلیغ کا اور اس قوم کی مخالفت کا جس کے ساتھ کبھی برائی نہیں کی تھی۔ بلکہ پہلے سے آپ اپنی قوم کے محبوب تھے آپ کو خود بھی اپنی قوم سے یہ بہت بعید معلوم ہوتا تھا حتیٰ کہ ورقہ بن نوفل نے جب اپنی یہ تمنا ظاہر

کی کاش اس وقت میں جوان ہوتا جب آپ کی قوم آپ کو نکال دے گی۔ تو آپ نے تعجب سے فرمایا کہ کیا میری قوم مجھ کو نکال دے گی۔ نکال دینے کا یہ مطلب ہے کہ آپ کو پریشان کرے گی۔ اس سے آپ خود ہی علیحدہ ہو جائیں گے۔ اور یہ معنی نہیں کہ متبادر معنی کے اعتبار سے اخراج ہو گا کہ اس میں ظاہراً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت تھی۔ نعوذ باللہ منہ اور حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین ظاہری کو بھی گوارا نہیں فرمایا۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کو ظاہری شہادت نہیں ہوئی حالانکہ آپ نے تمنا بھی کی۔ **وددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احیی ثم اقتل ثم احیی ثم اقتل (تاریخ بغداد للخطیب البغدادی ۴:۷)** کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میں اللہ کے راستہ میں قتل کیا جاؤں اور پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔ گو معناً یہ تعاقب آپ کو (یکے بعد دیگرے آنا ۱۲) بلکہ آپ کے خدام کو عطا ہوا ہے۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جان دیگر است

(خنجر تسلیم کے کشتوں کو ہر زمانہ میں ایک اور جان عطا ہوتی ہے ۱۲) گو ظاہراً آپ کے لئے اس کا وقوع نہیں ہوا حالانکہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں دیکھتی ہوں آپ کے رب کو جیسی آپ کی خواہش ہوتی ہے ویسا ہی کر دیتے ہیں اور آپ کی تو بڑی شان تھی جب آپ کے غلاموں کی یہ شان ہے۔

میدہد یزداں مراد متقیں (اللہ تعالیٰ متقیوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں ۱۲)

اور اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ آپ کی ہر دعا مقبول ہوئی۔ چنانچہ آپ نے دعا کی تھی کہ امت میں نا اتفاقی نہ ہو۔ مقبول نہیں ہوئی تا کہ آپ کا بندہ ہونا اور الٰہ نہ ہونا ثابت ہو جائے۔ مگر افسوس ہے باوجود عبدیت کے ان آثار کے ظہور کے بھی بعض جہلاء نے حدیث گھڑ لی ہے کہ **انا عرب بلاعین** میں بلاعین عرب ہوں (یعنی رب ہوں نعوذ باللہ ۱۲) اس جاہل کو یہ خبر نہ ہوئی کہ اول تو عرب قوم کا نام ہے۔ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنے بڑے فصیح و بلیغ عربی کے بجائے عرب فرماتے؟ دوسرے عرب کی بے مشدد نہیں اور رب کی مشدد ہے۔ اگر عین کو حذف کر دیا جائے تو رب رہ جائے رب تھوڑا ہی ہو گا۔ سو یہ عبارت ہی خود اپنے مخترع ہونے پر دال ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے **سبوح لها منها علیها شواهد** (یعنی اس حدیث کے مخترع ہونے پر اس کی عبارت ہی سے دلائل قائم ہیں ۱۲) پس حدیث ہی خود بتا رہی ہے کہ میں موضوع

(گھڑی ہوئی ۱۲) ہوں اور وضاع (گھڑنے والا ۱۲) بھی کوئی بالکل ہی جاہل ہے۔اسی طرح اس کو بھی حدیث بنالیا انا احمد بلامیم (میں بلامیم کا احمد یعنی احد ہوں ۱۲) حالانکہ یہ حضرت احمد جام رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے جو سکر میں صادر ہوا ہے۔غرض اب بھی بندوں نے بدون خدا بنائے ہوئے نہ چھوڑا۔اور اگر ایک دعا بھی واپس نہ ہوتی تب تو خدا کی رجسٹری ہو جاتی۔پس اسی وجہ سے آپ کی بعض دعائیں قبول نہیں ہوئیں۔پس گو بعض ادعیہ (دعائیں ۱۲) اس مصلحت کی وجہ سے پوری نہ ہوئی ہوں۔

لیکن اس تمنا کا پورا ہونا تو اس مصلحت کے بھی خلاف نہ تھا مگر باوجود اس کے یہ تمنا آپ کی اس لئے پوری نہیں ہوئی کہ حق تعالیٰ کو اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت گوارا نہ ہوئی۔

ع آں منم کاندر میان خاک وخوں بینی سرے

(میں وہ ہوں کہ خاک اور خون میں میرا سر آلودہ دیکھو گے ۱۲) کہ سر مبارک گرد و غبار میں لوٹ رہا ہو اور کفار ٹھکراتے ہوئے جا رہے ہوں۔یہ صورت اہانت بھی گوارا نہ ہوئی۔

اسوہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

اسی طرح آپ کو فقر و فاقہ بھی دیا تو وہ بھی بادشاہت میں۔یہ نہ تھا کہ آپ کے پاس مال نہ آتا ہو کہ یہ بھی عرفاً اہانت کی صورت ہے بلکہ آتا تھا مگر آپ رکھتے نہ تھے۔ایک ایک جلسہ میں آپ نے سو سو اونٹ ایک ایک شخص کو دے دیئے اگر سو سو ہی روپے کا رکھو تب بھی دس ہزار روپے ہو گئے۔اگر آج کوئی دس روپے دیدے تو تعجب سے کہا جائے گا کہ اتنا انعام۔اسی طرح اگر کوئی امیر قربانی کرے گا تو بکرے یا گائے کے ایک حصہ سے بڑھے گا ایک دنبہ کر دے گا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں سو اونٹ ذبح کئے اور ان سو میں تریسٹھ اپنے ہاتھ سے ذبح کئے۔اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی بھی عادت تھی۔آج کل کے مولوی صاحب ہیں کہ انہیں اپنے ہاتھ سے کام کرنا دشوار ہے اور اگر کرنا بھی چاہیں تو لوگ نہیں کرنے دیتے۔مولوی صاحب ذرا لوٹا لے کر وضو کے لئے پانی لینے چلے بس لوگ دوڑے کہ حضرت میں لاؤں۔جوتا لے کر چلے چھین لیا کہ میں لے چلوں۔اگر ایسا ہی رہا تو یہ لوگ جب تک یہاں رہیں گے اس وقت تک تو مولوی صاحب کے کام کر دیں گے۔پھر مولوی صاحب کو یہی

عادت ہو جائے گی اور ہر کام کے لئے آدمی کی ضرورت ہوگی۔تو مولوی صاحب پر ایک مصیبت آ جائے گی۔اور ہر کام کے لئے فرمایا کریں گے کہ کوئی آدمی ہے۔

ایک بانوا فقیر کسی رئیس کے یہاں گئے انہوں نے پکارا کوئی آدمی ہے۔فقیر نے کہا تھوڑی دیر کے لئے آپ ہی نہ آدمی بن جایئے۔قنوج میں ایک رئیس کا لطیفہ ہے کہ ان کے کسی دوست نے پکارا کہ کوئی آدمی ہے اس رئیس صاحب نے کہا کہ میں ہوں آدمی کہیے انہوں نے کہا کہ آپ آدمی ہیں مع ریاست کے میں چاہتا ہوں بلا ریاست کے۔یعنی آپ بشرط شے (یعنی آپ مع کمال ریاست ۱۲) کے مرتبہ میں آدمی ہیں۔اور میں چاہتا ہوں بشرط لا شئے کے مرتبہ میں یعنی بشرط عدم الکمال فیہ سوی الانسانیت (یعنی اس میں بجز انسانیت کے اور کوئی کمال نہ ہو ۱۲) نہ لا بشرط شے (یعنی اس میں کوئی کمال نہ ہو انسانیت اور نہ ریاست وغیرہ ۱۲) کے مرتبہ میں چاہتا ہوں اور نہ بشرط شے کے مرتبہ میں۔یہ جواب تحقیقی تھا ورنہ ظاہر نظر میں لطیفہ تیز ہے۔بہر حال مولوی صاحب تو پھر کسی کام کے نہ رہیں گے میرے ایک دوست مولوی ہیں۔الہ آباد کی کچہری میں بندوق کے لائسنس کی درخواست دی تھی اس کے لئے کچہری گئے ہوئے تھے۔ایک وکیل کہنے لگے مولوی صاحب آپ اور بندوق۔انہوں نے کہا جی ہاں بندوق تو مرد رکھتے ہیں اور مولوی مرد نہیں ہوتے اس لئے بیشک ان کا بندوق رکھنا محل تعجب ہے۔وکیل صاحب چپ ہی تو ہو گئے۔تو یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ انہیں لوگ بھی بالکل اپاہج سمجھتے ہیں۔لوگوں نے انہیں حضور حضور کر کے واقعی بالکل ست بنا دیا۔ورنہ سنت یہ ہے کہ سب کام اپنے ہاتھ سے کرے اب تو ہماری یہ حالت ہے کہ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ لٹھا کتنے گز کا ہے۔اگر کبھی خریدنے جائیں تو بزاز اگر پانچ آنے گز کہہ دے تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ چار آنے کہ ایسا نہ ہو واقعی یہ اتنے گز کا ہو اور ہم کم کا کہیں تو ہماری نادانی پر ہنسے اس لئے چپکے سے خرید لیتے ہیں پھر اگر کہیں خریدا تو بزاز صاحب ہم سے پہلے جمع کا حساب کر چکتے ہیں مولوی صاحب کا حساب بعد میں ختم ہوتا ہے اور اکثر غلط ہوتا ہے بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ بالکل نکمے بن گئے۔لکھنؤ کے ایک شہزادہ کی حکایت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ محل میں سانپ نکل آیا۔بیگمات میں شور ہوا کہ ارے کسی مرد کو بلاؤ شہزادہ صاحب بھی ہم زبان ہو کر یہی کہنے لگے کسی ماما نے کہا حضور آپ بھی تو مرد ہیں کہنے لگے واللہ خوب یاد دلایا لاؤ لاٹھی۔بیچارے کو اپنا مرد ہونا بھی یاد نہ رہا۔یاد تو جب ہوتا کہ مردوں کا کوئی کام کرتے۔اسی طرح مولوی صاحب بھی اگر اپنے ہاتھ

سے کام کرتے رہتے تو انہیں حساب کتاب کی خبر ہوتی یہ کیا واہیات ہے کہ ایک دفعہ ہی سب جمع ہو گئے اور بلا کی طرح مولوی صاحب کو لپٹ گئے کوئی ہاتھ دبا تا ہے کوئی پاؤں دبا تا ہے کوئی کمر دبا تا ہے کوئی پنکھا جھلتا ہے اس کے بعد جب سب چلے گئے اب مولوی صاحب کی ہڈیاں کلکل کرتی ہیں اب وہاں نہ کل ہے نہ جز۔ مولوی صاحب پڑے کوس رہے ہیں ایک رئیس صاحب کے خدمت گاروں نے بہت ہاتھ پاؤں دبائے تھے وہ حج کو گئے وہاں بڑی تکلیف اٹھائی کیونکہ خدمت کے عادی ہو چکے تھے جب واپس ہوئے خدمت گاروں نے پوچھا حضور حرم میں ہمارے واسطے بھی دعا کی تھی انہوں نے کہا بلکہ خوب کوسا تھا کہ ایسی خراب عادتیں ڈال دیں جن سے بہت تکلیف ہوئی۔ بددعاء تو کیا کرتے مگر واقعی انہوں نے کام تو ایسا ہی کیا تھا۔ یہ بالکل واہیات ہے کہ اس طرح خدمت کرے کہ بالکل اپنا پابند بنالے۔ اصول واعتدال سے ہر کام اچھا ہوتا ہے۔
غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی نہایت سادہ تھی بکری کا دودھ اپنے ہاتھ سے نکال لیتے تھے۔ بچھونا خود جھاڑ لیتے تھے۔ حتیٰ کہ نعل مبارک اپنے دست مبارک سے سی لیتے تھے۔

قوۃ نبوی ﷺ کا عالم

اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قوت بھی دیکھئے کہ تریسٹھ اونٹ اپنے ہاتھ سے ذبح کئے حالانکہ اس کے ذبح کرنے میں نہایت دشواری ہے اور جانور کے ذبح میں تو سہولت ہے کہ لٹا کر ذبح کرلیا۔ اس کو اس طرح ذبح کرتے ہیں کہ پاؤں اس کا خاص طریقہ سے باندھ دیتے ہیں تا کہ بھاگ نہ سکے۔ پھر اس کے سینہ پر ایک خاص رگ ہے اس پر برچھا مارتے ہیں اسے نحر کہتے ہیں مشک کی طرح رگوں کا منہ کھل جاتا ہے۔ تمام خون بہہ کر وہ گر پڑتا ہے۔ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نشانہ میں بھی بڑے مشاق تھے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں قوت جسمانی بھی بہت تھی۔ چنانچہ ایک شخص رکانہ بہت بڑے پہلوان تھے کہ ہزاروں آدمیوں کا مقابلہ کرنے والے سمجھے جاتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کیا کہ اگر آپ مجھے کشتی میں پچھاڑ دیں تو میں مسلمان ہو جاؤں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آؤ۔ وہ آئے آپ نے انہیں پچھاڑ دیا۔ عرض کیا یہ تو اتفاقاً پچھاڑ دیا اب کے پچھاڑیئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا پھر سہی پھر آئے پھر اٹھا کر پھینک دیا۔ پھر وہ مسلمان ہو گئے۔ غرض سو اونٹوں کی قربانی اور اس میں سے تریسٹھ کے دست

مبارک سے نحر کرنے سے آپ کی ثروت قوت پر استدلال ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مفلس نہ تھے ہاں فقیر تھے کیونکہ مفلس تو وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو اور آپ کے پاس تھا سب کچھ مگر دے دیا کرتے تھے۔

اسی واقعہ قربانی میں حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ بھی آیا ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جانور ذابح (ذبح کرنے والے۱۲) کا چہرہ دیکھ کر بھاگتا ہے جان سب کو پیاری ہے۔ اہل کشف اس کی لم یہ بیان کرتے ہیں کہ جانوروں کو کشف ہوتا ہے۔ حدیث شریف سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ مردہ جو کچھ کہتا ہے یا عذاب سے چیختا ہے تو اس کی آواز تمام کائنات سنتی ہے الا الثقلین یعنی اس کی آواز سوائے جن وانس کے سب سنتے ہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کشف کوئی کمال نہیں جو لوگ کشف کے پیچھے پڑے رہتے ہیں وہ اس پر غور کریں کہاں ہیں۔ شاہ صاحب جو اسے بہت بڑی چیز سمجھتے ہیں اگر شاہ صاحب کو کشف بھی ہونے لگا تو بہت سے بہت شاہ صاحب ایک بہیمہ (چوپایہ۱۲) کے برابر ہو گئے۔ اصل کمال قرب ہے اور یہ عبدیت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے قائل ہوتے ہوئے کشف کی تمنا مصداق اس شعر کا ہے ۔

دست بوسی چوں رسید از دست شاہ ‏ ‏ ‏ پائے بوسی اندراں دم شد گناہ

یعنی بادشاہ کی حضوری ہوگئی وہاں بادشاہ نے ہاتھ چومنے کی اجازت دیدی یہ کہتا ہے نہیں میں تو جوتا چوموں گا۔ کمبخت پائے بوسی اندراں دم شد گناہ۔ جب ہاتھ چومنے کو مل گئے تو پھر پیر چومنا حماقت ہے۔ یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو کشف وکرامت ڈھونڈتے ہیں جو بہائم کو بھی ہوتا ہے بڑی چیز عبدیت ہے۔ کشف وکرامات کو لے کے کیا کرو گے۔ غرض قاعدہ ہے کہ جانور ذابح کی صورت دیکھ کر بھاگتا ہے مگر جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں ذبح کرنے چلے تو حدیث میں ہے **کلھن یز دلفن الیه** ہر ایک جانور آپ کی طرف بڑھتا تھا کہ ذبح کریں۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف ‏ ‏ ‏ بامید آنکہ روز بشکار خواہی آمد

(اس امید پر کہ آپ شکار کو آئیں گے جنگل کے سب ہرنوں نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ لیا ۱۲)

جس نے اپنے معشوق کی شان میں کہا ہے یہ شاعری محض ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان سچ مچ یہی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جانور اس طرح ذبح کئے خلاصہ مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تنگدست یا تہی دست نہیں بنایا تھا۔ آپ کا فقر وترک اختیاری تھا۔ اس کی وجہ بھی

یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صورت اہانت سے بھی بچایا۔

بیان سیرت میں احتیاط

اسی واسطے محققین نے مشورہ دیا ہے کہ عوام کم فہم جہلاء کے مجمع میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فاقہ وغیرہ کا بیان نہ کرے بلکہ ایسے عوام کے سامنے وہی مضامین بیان کرنا چاہئیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان و شوکت ظاہر ہوتی ہو۔ ان کے سامنے فقر و فاقہ کے مضامین نہ بیان کرنا چاہیے کیونکہ اس میں احتمال ہے ان کے قلوب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت نکل جائے میرے ایک دوست تھے۔ مولوی منت اللہ انہوں نے ایک قریہ (گاؤں۱۲) میں یہ بیان کر دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی کبھی مع نعلین مبارک نماز پڑھتے تھے ایک مرتبہ جبرئیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ نعلین مبارک میں نجاست بھری ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکال ڈالا۔ فی نفسہ واقعہ تو صحیح ہے مگر لوگ بگڑ گئے کہ تو کیسا بدعقیدہ ہے کہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعلین مبارک نجس ہو سکتی ہے خیر تھا تو ان کا جہل مگر ناشی تھا اعتقاد عظمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ مولوی صاحب نے مجھ سے شکایت کی۔ میں نے کہا ایسی جگہ آپ کو ایسی بات کہنا چاہیے نہ تھی۔ اس میں فتنہ کا احتمال ہے۔ غرض علماء محققین نے تصریح کی ہے کہ عوام کے مجمع میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فقر و فاقہ کو نہ بیان کرنا چاہیے تاکہ قلوب میں عظمت باقی رہے مگر جہاں فہیم ہوں کچھ مضائقہ نہیں۔

البتہ جہاں کے لوگ ایسے کم فہم ہوں جیسی حکائتیں سنی گئی ہیں۔ وہاں ہرگز نہ بیان کرنا چاہیے جیسے بعضے جہلاء کا قصہ سنا ہے کہ پورب کے کسی دیہات میں وہاں کے لوگوں سے پوچھا گیا تم کون قوم ہو کہا مسلمان۔ کس کی امت ہو کہا ایک راجہ پچھاں میں گجرو (یعنی گزرا ہے) ہم وا کی (یعنی اس کی) امت ہیں۔ ان لوگوں کو یہ بھی خبر نہیں تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مولد کونسا مقام ہے اور اسم گرامی کیا ہے۔ اجمالاً اتنا جانتے تھے کہ پچھاں میں راجہ ہوئے ہیں اگر ان نادانوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فقر و فاقہ کی حالت بیان کی جائے تو جو عظمت راجہ ہونے کے خیال سے ہے وہ بھی جاتی رہے اس لئے قوی احتمال ہے کہ اس قسم کے لوگ برائے نام اسلام سے بھی منحرف ہو جائیں۔

ایک اور روہیلن عورت کی حکایت ہے کہ وہ حج کو گئی۔ مکہ معظمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مولد شریف کی زیارت کو بھی گئی۔ وہاں جا کر جوش محبت میں بڑی دیر تک حضور صلی اللہ علیہ

وسلم کے اوصاف حمیدہ بیان کر کے میں جاؤں واری جاؤں کہتی رہی۔اس کے بعد کہنے لگی کہ بے عیب ذات خدا کی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب کچھ تھے۔مگر روہیلے نہ تھے کمبخت اپنے نزدیک روہیلوں کی قوم کو اشرف الاقوام سمجھتی تھی۔ایسوں کے سامنے صرف اتنا کہہ دے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر تھے۔ایسے نکتے نہ بیان کرے جو ان کم فہموں کی سمجھ سے باہر ہوں۔بعضے فطرۃً ایسے کم فہم ہوتے ہیں کہ اللہ میاں کو بھی نہیں جانتے ایک عورت نے مجھ سے پوچھا کہ اللہ میاں زندہ ہیں۔ میں نے کہا کہ پہلے یہ بتاؤ کہ رزق کون دیتا ہے کہا اللہ میاں۔بارش کون کرتا ہے اللہ میاں۔مارتا کون ہے اللہ میاں پیدا کون کرتا ہے۔اللہ۔میں نے کہا کہ سب کام تو اللہ میاں کرتے ہیں مردہ بھی کہیں کوئی کام کر سکتا ہے کہنے لگی ہاں بس اب سمجھ میں آ گیا کہ اللہ میاں زندہ ہیں۔(**ھو حی لایموت**) (وہ زندہ ہیں ان کو موت نہ آئے گی•

ایک اور بڑھیا بنت ضلع مظفر نگر میں تھی کہنے لگی جب سب مر جاویں گے تو اکیلے اللہ میاں کی جی نہیں گھبراوے گا۔ان بڑی بی کی تمنا یہ تھی کہ کم از کم ہنڈیا چولہے کے لئے انہیں اللہ میاں رکھ لیتے اور چاہے سب کو مار ڈالتے۔انہیں گناہ بھی نہیں ہوتا وہاں تو اس قدر وسعت رحمت ہے کہ ان کے یہی خیالات پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاویں گے۔

ایک اور محلہ نوگانوہ کی بڑھیا اپنے فقر و فاقہ کی شکایت مجھ سے کرنے لگی۔کہ فاقے ہوتے ہیں کپڑے پھٹ گئے ہیں۔پھر خاموش ہو کر ڈر کر کہنے لگی کہ میں زیادہ کہہ بھی نہیں سکتی کبھی اللہ میاں کہیں کہ میرے عیب کھولتی پھرے ہے۔

اہانت ظاہری سے حفاظت

اب ایسے لوگ جو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پورے طور پر جانتے بھی نہیں ان کے سامنے ایسے واقعات کا بیان نہ کرنا چاہیے کہ ان کے دل سے بالکل ہی قدر جاتی رہے۔بہر حال آپ کی تمنا **وددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احیی ثم اقتل (تاریخ بغداد للخطیب البغدادی ۴:۷)** (میں چاہتا ہوں کہ میں اللہ کے راستہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں ۱۲) پوری نہیں ہوئی کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی اور نیز عشاق کی دل شکنی کا اندیشہ تھا۔اس تقریر سے معلوم ہوا کہ اہانت کی صورت بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے نہیں ہوئی اس لئے اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس سے بچایا کہ آپ کے ہم قوم آپ کو نکال دیتے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا

رعب ان پر اتنا تھا کہ کسی کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی کہ آپ کے ساتھ گستاخی کرے۔

حدیث میں ایک قصہ آیا ہے کہ ایک دفعہ مکہ میں ایک اونٹ ذبح ہوا تھا آپس میں کفار کا مشورہ ہوا کہ کوئی شخص اس کی الایش آپ پر رکھ آوے۔ ایک بدبخت اٹھا اس وقت آپ نماز پڑھ رہے تھے۔ سجدہ میں تھے اس نے آپ پر وہ الایش رکھ دی کیونکہ یہ جانتے تھے کہ یہ ایسے رسول ہیں کہ نماز توڑ کے تھپڑ نہیں ماریں گے۔ اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْا رَسُوْلَہُمْ (یا یہ لوگ اپنے رسول سے واقف نہ تھے۱۲) حضرت فاطمہ کو علم ہوا آئیں۔ اور اس الائش کو ہٹایا اور خوب کوری سنائیں اور کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ کچھ منہ سے کہہ سکے۔ حدیث میں آیا ہے کہ فاقبلت فاطمة و هی جویریة حضرت فاطمہ (آئیں آپ۱۲) اس وقت بچی تھیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد بددعا کی۔ اس قصہ سے معلوم ہوا کہ مقابلہ میں آ کر کچھ نہ کر سکتے تھے۔ یہ تھا آپ کا رعب حتیٰ کہ بالمشافہ (روبرو۱۲) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گستاخانہ کلام کی بھی کسی کو جرأت نہ تھی آپ خود فرماتے ہیں نصرت بالرعب (رعب کے ذریعہ سے میری مدد کی گئی ہے۱۲) ورنہ آپ تو اکیلے تھے جو کچھ وہ چاہتے کر سکتے کمیٹیاں ہوتی تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نکال دیں مگر آپ کو خدا نے رعب اتنا دیا تھا کہ اس کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ الغرض جب ورقہ بن نوفل نے کہا کاش میں اس وقت جوان ہوتا جب آپ کی قوم آپ کو نکال دے گی آپ نے تعجب سے فرمایا کہ کیا میری قوم مجھے نکال دے گی میری اس قدر قدر اور اتنی وقعت میں اتنا محبوب ہوں میں نے کبھی کسی کے ساتھ برائی بھی نہیں کی۔ انہوں نے کہا کہ جتنے نبی آپ سے پہلے ہوئے ہیں وہ سب انہیں اوصاف سے موصوف تھے مگر جب انہوں نے تبلیغ شروع کی ان کے ساتھ یہی ہوا۔ اسی طرح آپ کے ساتھ بھی ہوگا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم نے آپ کی توقع کے خلاف آپ کو بہت پریشان کیا۔ آپ نے سب برداشت کیا۔

سہل پسندی کی حکمت

اتنی بڑی عالی ہمت ذات پاک کو اس کی کیا ضرورت تھی کہ دو شقوں (جانبوں۱۲) میں سے جب اختیار کیا آسان شق کو اختیار کیا۔ یعنی جہاں ایک مقصود کے دو طریق ہوں۔ ان میں آسان طریق کو لینا۔ اس میں دو راز ہیں۔ علم وسیع، حال، علم وسیع تو یہ ہے کہ مقصود کو غیر مقصود سے متمیز کرنا۔ کیونکہ اگر مشکل طریق کو اختیار کرتے تو طریق پر شبہ مقصود کا ہوتا اور خیال ہوتا کہ اگر یہ مقصود نہ ہوتا تو باوجود دشواری کے اس کو کیوں اختیار کیا جاتا۔ اور حال کیا ہے۔ معرفت ہے نعمت حق کی۔

آسان کو قبول نہ کرنا علامت ہے۔ اعراض عن النعمت (نعمت سے روگردانی کرنے ۱۲) کی کہ خدا نے تو سہولت برتی مگر یہ قبول نہیں کرتے۔

اور نیز اس میں ایک دلالت ہے حسن معاملہ پر بھی کیونکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ جو خود آسانی پسند ہوتا ہے وہ دوسروں کو بھی دشواری میں نہیں ڈالتا۔ آپ کو اس واسطے خدا تعالیٰ نے آسانی پسند بنایا تھا تاکہ آپ دوسروں کے لئے بھی آسانی ڈھونڈیں۔ آپ سب کے ساتھ آسانی کا برتاؤ کرتے تھے۔ بیوی ہو خواہ غلام ہو۔ غلام سے بھی جو فرمائش کی آسان کی۔ اگر فی نفسہ وہ کام دشوار ہوا سوچ کر آسان کر کے بتایا۔ غرض خود بھی کسی کو الجھن میں کبھی نہیں ڈالا اوروں کو بھی منع فرمایا۔

اتنی بات سے بھی منع فرمایا ایک مرتبہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے اجازت چاہی۔ آپ نے پوچھا کون ہے؟ کہنے لگے انا یعنی میں ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں میں کیا کر رہے ہو اس سے تو یہ معلوم ہوا کہ کون شخص ہے کیونکہ دو حال سے خالی نہیں یا تو اس کی آواز صاحب خانہ پہچانے گا یا نہیں پہچانے گا اگر آواز پہچانے گا تو یہ نہ پوچھے گا کہ کون ہے اور اگر آواز نہ پہچانے گا تو میں ہوں کہنے سے کیا فائدہ کیونکہ اس سے بھی آواز ہی معلوم ہوگی۔ اس واسطے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انا کہنا ناپسند فرمایا۔ اللہ اکبر آپ کی سہولت پسندی کس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ اوروں کو بھی اس بات کی تعلیم دی کہ ایسا نہ کریں جس سے لوگ الجھن میں پڑیں۔

اسی طرح صوم میں غسل بھی اسی آسانی کی غرض سے اختیار فرمایا تو امام ابوحنیفہ و امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے قول میں تعارض نہیں۔ دونوں جدا جدا حالت پر محمول ہیں۔

باطنی غذا

اس تقریر سے مقصود یہ ہے کہ روزہ ایسی چیز ہے کہ اگر نہ گھبرائے اور جزع وفزع نہ کرے تو پھر نہ بھوک لگے نہ پیاس معلوم ہو تو یہ غذا خدا کی جانب سے ملتی ہے جو نہ بھوک لگنے دیتی ہے نہ پیاس نہ ضعف ہونے دیتی ہے۔ نہ اضمحلال تم نے بزرگوں کی حکایتیں سنی ہوں گی۔ کہ بیس دن نہیں کھایا اور چالیس دن نہیں کھایا اور اپنی آنکھ سے دیکھا ہوگا کہ بزرگوں میں قوت زیادہ ہوتی ہے اور غذا بہت کم ہوتی ہے۔ اس میں راز یہ ہے کہ قوت ہوتی ہے نشاط سے اس سے زیادہ کون خوش ہوگا۔ ہر وقت جسے محبوب کی صحبت میسر ہو انا جلیس من ذکرنی (کشف الخفاء للعجلونی ۱:۲۳۲، اتحاف السادة المتقین ۶:۲۸۷) (جو میرا ذکر کرتا ہے میں اس کا ہمنشیں ہوں ۱۲) ہر وقت

اس کے رگ و پے میں نور رہتا ہے وہ بھوک نہیں لگنے دیتا۔ دلائل علمیہ سے تو ثابت ہے ہی عوام کی بھی زبان پر ہے کہ یہ کھانا کیا کھائیں گے الم (علم) سے پیٹ بھرا ہوا ہے۔ تو حقیقت میں انکا پیٹ نور سے بھرا ہوا ہے جسے عوام اپنی اصطلاح میں الم (علم) سے تعبیر کرتے ہیں وہ شاعر نہیں کہ گھڑ لیا ہوگا عامی ہیں ان کی زبان سے نکلتا ہے تو بیشک سچی بات ہے۔

بجا کہے جسے خلقت اسے بجا سمجھو زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

تو واقعی رمضان کا مہینہ عید کا مہینہ ہے کہ جس وقت تم نہیں کھاتے تو وہ کھلاتے ہیں۔ کھانا اور نہ کھانا دونوں جمع ہورہے ہیں۔ اور گو وہ غذائے روحانی فی نفسہ اس غذائے جسمانی سے مغنی (بے پرواہ کرنے والی ۱۲) ہے۔

روزہ دار کیلئے دو فرحتیں

مگر یہ بھی خدا کی رحمت ہے کہ اس غذا کی بھی خواہش ہم کو دی اس کا بیان یہ ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ صائم کو دو فرحتیں ہوتی ہیں کہ ایک افطار کے وقت کہ جی خوش ہوتا ہے کہ ٹھنڈا پانی پینے کو ملا پھلکیاں کھانے میں آئیں اور ایک خدا سے ملاقات کی تو اگر اس غذا کی خواہش نہ ہوتی تو یہ دو فرحتیں کیونکہ جمع ہوتیں اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ جب غذا ہمیں ملتی رہتی ہے تو ہمیں بھوک کیوں لگتی ہے یہی غذا کیوں نہیں کافی ہو جاتی سو بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کبھی اس غذائے روحانی کو من وجہ قطع بھی کر دیتے ہیں اس لئے اس وقت بھوک پیاس کا غلبہ ہوتا ہے اور منقطع اس لئے کر دیتے ہیں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہیں اس غذا کی قدر بھی نہ ہوتی۔

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم گر نیست غیبتے ندہد لذتے حضور

(میں ہجر کی شکایت نہیں کرتا کیونکہ اگر ہجر نہ ہوتا تو قرب میں لذت نہ معلوم ہوتی ۱۲) پس جس طرح ظاہری غذا کو منقطع کر دیتے ہیں تاکہ اس میں لطف آئے اسی طرح لطف ہی کے لئے باطنی غذا کو بھی کبھی منقطع کر دیتے ہیں تو کیا لطف کا زمانہ ہے دن کو روحانی غذا رات کو جسمانی غذا۔

غذا میں تبدیلی

پھر لطف در لطف یہ کہ ایک دن کو اور ایک رات کو اگر رات دن ایک ہی غذا ہوتی تو طبیعت اکتا جاتی۔ من و سلویٰ کیسی عمدہ غذا تھی مگر بنی اسرائیل اکتا کر کہہ ہی اٹھے لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا (الآیۃ) کہ ہم ایک ہی کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ آپ ہمارے لئے اپنے رب

سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں پیاز ککڑی مسور کی دال ساگ دے گنوار تو تھے ہی خدا کی نعمت کی قدر نہ کی وہی گاؤں کی چیزیں مانگنے لگے من کہتے ہیں ترنجبین کو اور وہ نہایت لطیف چیز ہے مگر کیسی ہی لطیف غذا ہو جب ایک ہی ہو تو طبیعت اکتا جاتی ہے ٹونک کے نوابوں میں سے شاید افضل الدولہ کا قصہ ہے کہ کبھی کبھی سپاہیوں کے خیمے میں آ جاتے تھے تو ان کے لئے قالین وغیرہ کا اہتمام کرتے تھے تو کہتے تھے کہ بھئی میں قالین چھوڑ کے تو تمہارے پاس آیا ہوں میں تو پرال ہی پر بیٹھوں گا۔ کھانے کا اہتمام کرتے تو کہتے بھئی میں تو موٹی روٹیاں کھاؤں گا۔ پلاؤ کھاتے کھاتے جی گھبرا گیا۔ سالک کے لئے یہ بڑا سبق ہے کہ اگر نور غائب ہو جاتا ہے تو انہیں تشویش ہوتی ہے کہ نور کہاں چلا گیا۔ ارے وہ تو اس واسطے چلا گیا کہ تو اس کی قدر کرے ورنہ علی الاتصال (پے در پے ۱۲) ان کے تو ارد (ایک جگہ اترنے ۱۲) سے ضرور اکتا جاتا۔ ایک حافظ جی اندھے تھے حریص بڑے تھے۔ انہوں نے کہیں سن لیا کہ خدا تعالیٰ نے جنت میں مومنین کے لئے حوریں پیدا کی ہیں۔ بس ہر وقت دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ حوریں بھیج، حوریں بھیج، بازاری عورتیں بڑی شریر ہوتی ہیں کہیں انہوں نے سن لیا۔ آپس میں مشورہ کیا کہ چلو حافظ جی سے حوروں سے توبہ کرا دیں۔ سب جمع ہو کے آئیں آپ نے کھٹکا سن کر پوچھا کون کہا حور۔ بڑے خوش ہوئے کہ بہت دنوں میں دعا قبول ہوئی۔ خیر منہ کالا کیا۔ دوسری آئی پوچھا کون کہا حور کہنے لگے پھر یہی اس سے بھی منہ کالا کیا۔ غرض بہت سی تھیں ان کا بھی کئی برس کا جوش تھا۔ آخر کہاں تک وہ پورا ہو چکا تو اور آئی پوچھا کون؟ کہا حور۔ گالی دے کر کہنے لگے سب حوریں میری قسمت میں آ گئیں۔ سو حضرت جس طرح وہ حور سے گھبرا گئے تھے اسی طرح تم نور سے گھبراتے ہو۔

لذت دیدار

تو یہ سمجھ لو کہ اگر مواجید مستیاں روز ہوتے تو لطف نہ ہوتا لطف تو جب ہی تک ہے کہ گاہے باشد و گاہے نباشد (کبھی ہو اور کبھی نہ ہو ۱۲)۔

از دست ہجر یار شکایت نے کنم — گر نیست غیبتے ندہد لذتے حضور

اگر غیبت نہ ہو تو حضور میں بھی لطف نہ ہو حدیث میں آیا ہے **یا اباھریرۃ زرنی غبا تزدد حبا (مجمع الزوائد: ۸:۱۷۵، کشف الخفاء للعجلونی ۱:۵۲۸)** (اے ابو ہریرہ تیسرے دن ملاقات کیا کرو تا کہ محبت میں زیادتی رہے ۱۲) تحقیق سے اس روایت کی صحت ثابت ہو گئی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تیسرے دن ملا کرو تا کہ اشتیاق رہے۔

بدیدار مردم شدن عیب نیست　　ولیکن نہ چنداں کہ گویند بس

لوگوں سے ملنے جانا کوئی عیب کی بات نہیں لیکن اتنا جاؤ کہ اکتا نہ جائیں ۱۲) باقی اگر کوئی کہے کہ جنت میں خدا کا دیدار بھی روز روز ہر وقت ہوگا تو لطف نہ ہوگا۔ نہیں وہاں لطف ہوگا کیونکہ وہاں کی لذات بھی غیر متناہی ہیں تھوڑی سی دیر میں ختم نہیں ہو جاتیں۔ اور یہاں کی لذات متناہی ہیں تھوڑی دیر میں جی اکتا جاتا ہے وہاں حسن بھی غیر متناہی ہے اور اس کا اشتیاق بھی غیر متناہی ہے۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں　　بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

(نہ ان کے حسن کی کوئی انتہا ہے نہ سعدی کے کلام کی کوئی انتہا ہے جیسے جلندھر والا پیاسا مر جاتا ہے اور دریا باقی رہ جاتا ہے ایسے محبوب کا بیان باقی رہ گیا ۱۲)

پس وہاں یہ حالت ہوگی۔

دلارام دربر دلارام جو　　لب از تشنگی خشک برطرف جو

(محبوب گود میں اور محبوب کو ڈھونڈ رہے ہو۔ نہر کے کنارے پر کھڑے ہیں اور ہونٹ پیاس سے خشک ہیں ۱۲)

نہ گویم کہ برآب قادر نیند　　کہ برساحل نیل مستسقی اند

(یہ تو ہم نہیں کہتے ہیں کہ پانی پر قادر نہیں بلکہ جلندھر والے کی طرح دریائے نیل کے کنارہ پر ہیں ۱۲) کہ عین وصل کے اندر اشتیاق ہوگا اور طلب ہوگی اس لئے وہاں جی نہ بھرے گا جس قدر مشاہدہ ہوگا اسی قدر اشتیاق ہوگا اور یہاں چاہے کیسی ہی کیفیت ہو جی اکتا جاتا ہے۔ اگر وہ کیفیت مقصود بالذات ہو تو وہ بھڑک نہیں رہتی انس وقرار ہو جاتا ہے اور جو کیفیات غیر مقصود ہیں ان سے جی بھر جاتا ہے۔ وہ تو چٹنی ہیں۔ چٹنی ہر وقت نہیں کھائی جاتی کبھی کبھی منہ کا مزا بدلنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے اور نماز روزہ اصل ہے ان سے جی نہیں اکتا تا مگر انس وقرار ہو جاتا ہے۔

ثواب ایام روزہ

تو غرض عید کا مہینہ ہونا سمجھ میں آ گیا کہ دن کو روحانی غذا اور رات کو جسمانی غذا ملتی ہے۔ اسی واسطے شہرا عید (الصحیح لمسلم کتاب الصیام:۳۱' سنن ابی داؤد: ۲۳۲۳، سنن الترمذی: ۶۹۲) (عید کے دونوں مہینے ۱۲) فرمایا۔ آگے فرماتے ہیں لاینقصان یعنی کم نہیں ہوتے کم نہ ہونے کے کیا معنی کہ انتیس روزے بھی ہوں گے تو ثواب تیس کا ملے گا۔ پس یہاں زر زر کشد (روپیہ روپے کو کھینچتا ہے ۱۲) صادق آتا ہے مولانا نظامی نے ایک شخص کی حکایت لکھی ہے کہ۔

شنیدہ ز پیران دینار سنج | کہ زر زر کشد در جہاں گنج گنج

کہ ایک بیوقوف نے کسی تجربہ کار کا یہ مقولہ سنا کہ زرزر کشد روپے کو روپیہ کھینچتا ہے یہ سن کر دل میں خیال کیا کہ بھئی یہ تو بڑی اچھی تجارت ہے اب یہی کریں گے ایک مقام پر ایک روپیہ لے کر صراف کے یہاں آیا دیکھا روپیوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے اس میں اپنا روپیہ پھینک کر کھڑا ہو گیا کہ اب یہ روپیہ دوسرے روپیوں کو گھسیٹ لائے گا۔ ان کے نزدیک وہ بیل ہے کہ بس تھیلی گھسیٹ لائے گا۔ تک رہے ہیں وہ کسی طرح لا نہیں چکتا۔ جب مایوس ہو گیا تو رونے لگا۔ صراف نے پوچھا کیا ہے کہا میں نے سنا تھا کہ زرزر کشد۔ اس لئے میں نے اپنا روپیہ پھینکا مگر وہ اب تک لایا نہیں صراف نے کہا۔ ارے بے وقوف تھوڑے روپے کو بہت روپیہ کھینچتا ہے بہت کو تھوڑا نہیں کھینچتا۔ جاؤ بس میرے روپیوں نے تمہارے روپے کو کھینچ تو لیا۔ اب کیوں کھڑے ہو۔ رو پیٹ کر بیچارے اپنا روپیہ بھی کھو کر چلے آئے۔ اس صراف کے نزدیک تو تھوڑے کو بہت کھینچتا ہے اور بہت کو تھوڑا نہیں کھینچتا۔ مگر خدا کے یہاں دونوں قاعدے ہیں تھوڑے کو بہت بھی کھینچتا ہے جیسا یہاں نو دن کے ثواب نے دسویں دن کے ثواب کو بھی کھینچ لیا۔ اور بہت کو تھوڑا بھی کھینچتا ہے جیسے اول پچاس نمازیں فرض ہوئی تھیں پھر اخیر میں ارشاد ہوا کہ ھی خمس و ھی خمسون یعنی پانچ کو پچاس کے برابر کر دیا گیا۔ پانچ رکعت کے تھوڑے ثواب نے پچاس رکعت کے بہت ثواب کو کھینچا۔

پھر اور رحمت دیکھئے کہ اصل میں یہ قانون خاص نماز کے لئے اس لئے مقرر کیا تھا کہ حسرت نہ ہو کہ ہائے نماز گھٹ گئی تو ثواب بھی گھٹا ہو گا۔ اس لئے بتلا دیا کہ ثواب ان پانچ میں بھی اتنا ہی ملے گا جتنا پچاس میں ملتا سو اصل میں تو یہ قاعدہ فقط نماز کے لئے مقرر کیا تھا مگر اس کے بعد عنایت دیکھے کہ فرماتے ہیں کہ ہم اس قاعدہ کو عام کئے دیتے ہیں کہ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا کہ ایک نیکی کرو ہم ثواب دس کا دیں گے۔ پانچ کو دس میں ضرب دو تو پچاس ہوتے ہیں کیا ٹھکانا ہے اس رحمت کا ایک پیسہ دو دس کا ثواب ملے گا۔ ایک قرآن پڑھو دس قرآن کا ثواب ملے گا۔ ایک ایک حرف پر دس دس نیکیاں ملیں گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک ایک حرف کو ایک ایک نیکی قرار دیا ہے پھر وہ دس کے برابر کی گئی۔ غرض پانچ تھوڑا عدد تھا۔ اس نے پچاس کو گھسیٹا اور اعتکاف میں نو نے دسویں کو کھینچا۔ اسی طرح دوسرے شہر عید کا حکم ہے کہ کسی نے ذوالحجہ کی نویں تاریخ تک روزہ رکھنا چاہا اور اول تاریخ سے شروع کیا بعد میں معلوم ہوا کہ چاند انتیس کا ہوا ہے اس لئے آٹھ ہی روزے رکھنے پایا مگر ثواب نو ہی کا ملے گا۔

روح اعتکاف

بہرحال یہ ہے عشرہ اخیرہ جس کو سنت کے طور پر معین کیا گیا ہے۔ پس رمضان کے متعلق ایک یہ عبادت ہے جو ابتداءً شارع کی جانب سے لازم کی گئی ہے اور اس اعتبار سے مخصوص ہے رمضان المبارک کے ساتھ موافق اسلوب سابق (پہلے طریقے کے موافق ۱۲) کے آج اس کی روح کا بیان کرنا مقصود ہے۔

یہ جو میں نے آیت پڑھی ہے اس میں غور کرنے سے اعتکاف کی روح کا پتہ لگتا ہے لیکن اگر ہم اس کے قبل یہ مضمون کہیں اور نہ دیکھ لیتے تو ہمارا منہ نہ تھا۔ آیت سے اس کے استنباط کرنے کا پس ہمارا کوئی کمال نہیں جیسے پکی روٹی کا چپڑنا کیا مشکل ہے کمال متقدمین کا ہے کہ انہوں نے ذخیرہ کر کے ہمارے لئے چھوڑ دیا۔ غرض اعتکاف کی روح کیا ہے اعتکاف کی روح جو مجاہدہ کا ایک جزو ہے کیونکہ مجاہدہ کی مجموعی حقیقت کیا تھی وہ یہ تھی قلت الطعام (کم کھانا) قلت المنام (کم سونا) قلت الکلام (کم بولنا) قلت الاختلاط مع الانام (لوگوں سے کم میل جول رکھنا ۱۲) تو یہ بیان گویا سابق سے تخصیص بعد تعمیم ہے۔ پہلے چار جزو مجاہدہ کے بیان کئے تھے۔ ان میں سے ایک جزو قلت الاختلاط مع الانام تھا۔ یعنی لوگوں سے کم ملنا نہ ملنا نہیں بلکہ کم ملنا یہ غلطی کی جوگیہ نے اور حکمائے اشراقین نے کہ وہ ترک اختلاط (ملنے کے چھوڑنے ۱۲) ہی کو مجاہدہ سمجھے اور اس کی مضرت انہیں یہ ہوئی کہ تعلیم و تعلم سے محروم ہو گئے۔ وہ خود مجاہدہ چاہتے تھے تجویز کر لیتے تھے اپنے کو کسی کا محتاج نہیں سمجھتے تھے۔ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ (اپنے علم پر اترا گئے جوان کو تھا ۱۲) بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کے عموم میں حکمائے یونان بھی داخل ہیں کہ انہیں اپنے علم پر ناز تھا اترا گئے تھے۔ اسی لئے ٹھوکریں کھائیں اور غلطی میں مبتلا رہے انہیں تو اپنے اتنے سے علم پر اس قدر ناز اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کس کا علم ہوگا مگر باوجود اس کے ایک مرتبہ ایک صحابی سے فرما رہے تھے کہ میں رات کو ایک آیت بھول گیا تھا۔ تمہارے پڑھنے سے یاد آ گئی۔ خدا تعالیٰ نے ایک گونہ آپ کی احتیاج ظاہر کر دی کہ ایک آیت بھلا دی تا کہ اور بندے انہیں خدا نہ سمجھیں؛ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاجت تھی تو اور کون وہ ہے جو کہے مجھے حاجت نہیں۔

خلوت در انجمن

افلاطون بڑا اشراقی (روشنی باطل) تھا کہ بالکل خلوت میں رہتا تھا کیا خاک اشراق تھا۔

اشراق تو اس امت کا ہے کہ خلوت درانجمن (محفل میں تنہائی ۱۲) کا مرتبہ حاصل ہے۔

گر باہمہٗ چو بامنی بے ہمہٗ　　　گر بے ہمہٗ چو بے منی باہمہٗ

(اگر تم مخلوق میں مشغول ہو مگر دل ہماری طرف متوجہ ہے تو تم خلوت نشین ہی ہو اور اگر خلوت نشیں ہو کر تمہارا دل مخلوق کی طرف متوجہ ہے تو خلوت نشین نہیں ہو ۱۲)

اسی کو زیادہ تفصیل سے عارف شیرازی کہتے ہیں۔

چو ہر ساعت از تو بجائے رود دل　　　بہ تنہائی اندر صفائی نہ بینی

(جب تمہارا دل ہر گھڑی ایک جگہ جاتا ہے تو تم تنہائی میں صفائی نہیں حاصل کر سکتے ۱۲)

ورت مال و جاہ است و زرع و تجارت　　　چو دل باخدا ایست خلوت نشینی

(اور اگر تمہارے پاس مال و دولت ہے اور تجارت و زراعت کرتے ہو جب دل خدا سے لگا رکھتا ہے تو خلوت نشین ہی ہو ۱۲)

یعنی اگر تم سب کے پاس بیٹھے ہو مگر قلب میری طرف متوجہ ہے تو میرے ساتھ ہو لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (انہیں بیع و شرا خدا کے ذکر سے باز نہیں رکھتی)

یہ ہے اس امت کی خلوت کہ جلوت میں خلوت ہے۔ غرض افلاطون ایک پہاڑ پر اکیلا رہتا تھا ایک مصور نوکر رکھا تھا کبھی کبھی اس سے تو ملاقات ہو جاتی اور کسی سے بہت کم ملتا تھا۔ اگر کوئی ملنے کا قصد کرتا تھا تو اس کی تصویر منگا کر اس کے اخلاق معلوم کر لیتا تھا اور اگر ملنے کے قابل ہوتا تھا ملتا تھا ورنہ جواب دیدیتا تھا ایک مرتبہ ایک شخص کی تصویر دیکھ کر کہا کہ یہ ملنے کے قابل نہیں اس نے کہلا بھیجا کہ افلاطون کی رائے صحیح ہے پہلے میں ایسا ہی تھا۔ مگر اب میں نے اپنے اخلاق درست کر لئے ہیں۔ فراست بھی ایک علم ہے۔ افلاطون علم فراست کا ماہر تھا۔ ممکن ہے کہ اصل میں علم صحیح ہو مگر اس کے قواعد بدلیل صحیح ثابت و منقول نہ ہونے سے غیر معتبر کہا جاوے گا جس طرح رمل بھی فی نفسہ ایک علم صحیح تھا چنانچہ حدیث میں ہے کہ بعض انبیاء اس کو جانتے تھے اسی طرح نجوم میں بھی احتمال ہے مگر چونکہ اس کے قواعد اب مندرس (نیست و نابود ۱۲) ہو گئے ہیں اس لئے شریعت نے اسے ناجائز قرار دیا۔ بس ایسے ہی علم فراست بھی شاید علوم ساویہ میں سے ہو بطور کشف کے بزرگوں کو اب بھی ہوتا ہے اسی طرح کتابوں میں جو اس کے متعلق لکھا ہے وہ بھی کبھی کبھی صحیح نکلتا ہے۔

حضرت امام زین العابدینؒ بھی علم فراست رکھتے تھے ایک مرتبہ سفر میں سر راہ آپ کو ایک

شخص ملا بہت ادب سے سلام کیا اور ہاتھ چومے اور اس نے درخواست کی کہ غریب خانہ پر چند روز قیام فرمائیں۔ آپ نے سراپا دیکھا علم فراست کی رو سے وہ شخص ملنے کے قابل نہ تھا۔ مگر اہل بیت کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ آپ نے منظور فرمالیا مگر اس شخص کی ظاہری مدارات سے بہت تعجب ہوا۔ اس کے مکان پر تشریف لے گئے بڑی خاطر کی دو تین روز کے بعد جب چلے اس نے ایک پرچہ حساب کا پیش کیا کہ آپ کی مہمانی میں اتنا خرچ ہوا۔ شرعاً تو آپ پر اس کو کچھ دینا واجب نہ تھا مگر وسعت اخلاق کی وجہ سے جواب گوارا نہ کیا۔ رقم پاس نہ تھی حساب کیا تو گھوڑا مع سامان اس کے برابر نکلا۔ گھوڑا سپرد کر کے چلے آئے۔ اہل بیت کے ساتھ یہ حرکت۔ یزید تھا بلکہ یزید علیٰ یزید (یعنی یزید سے بڑھا ہوا تھا ۱۲) تو غرض علم فراست بھی ایک علم ہے بزرگوں کو بکثرت ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے اخلاق کے موافق ہاتھ پاؤں پیدا کئے ہیں کہ دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے ایسے اخلاق ہیں چنانچہ افلاطون کو اس شخص کی تصویر سے پتہ اس کے اخلاق کا چل گیا۔ افلاطون کی فراست سے اس نے بھی تصدیق کی۔ اس کے بعد پھر افلاطون نے اسے اپنے پاس بلایا اور اس سے ملا۔

ضرر مضرت رساں خلوت

حاصل یہ کہ ضرر اسے ایسی خلوت سے یہ ہوا کہ اس کا نفع بھی منقطع ہو گیا۔ اور اس سے نفع بھی بند ہو گیا۔ حدیث شریف میں ہے **لاخیر من لا یالف ولا یولف (مسند احمد ۲:۴۰۰، مجمع الزوائد ۱:۵۸، اتحاف السادۃ المتقین ۶:۱۷۳)** یعنی اس شخص میں بالکل خیر نہیں جو نہ خود لوگوں سے مانوس ہو نہ اس سے لوگ مانوس ہوں۔ ایسی خلوت سے صرف قوت متخیلہ کامل ہو جاتی ہے وبس۔ چنانچہ افلاطون کی بھی ایک حکایت سنی ہے کہ ایک بادشاہ افلاطون کے پاس آیا اس نے کہا کہ آپ اس طرح سب سے علیحدہ رہتے ہیں آپ کو تکلیف ہوتی ہوگی آپ ہمارے یہاں تشریف لے چلئے۔ ہم آپ کی خدمت کے لئے عمدہ انتظام کر دیں گے۔ افلاطون نے معذرت کر کے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے اصرار کیا۔ افلاطون نے کہا اچھا پہلے آپ کی دعوت ہے بادشاہ نے اپنے جی میں کہا کہ اس کے دماغ میں خلل ہے یہ دعوت کریں گے بڑے افلاطون بنے ہیں۔ خیر قبول کیا اس کے بعد کہا کہ مع آپ کے لشکر کے بادشاہ کو بڑا ہی تعجب ہوا اور اب تو قریب یقین کے ہو گیا کہ یہ مجنون ہے۔ خیر یہ بھی منظور کیا۔ پوچھا کس دن کہا فلاں دن۔ جب وہ دن ہوا تو بادشاہ مع اپنے لشکر کے اس پہاڑ کی طرف چلا۔ دیکھا کئی میل سے بڑے سامان ہیں۔ نقیب اور چوبدار سب ہی کچھ ہیں۔ خیر یہاں پہنچا تو ایسا سامان دیکھا جو کبھی اس سے پہلے نہ

دیکھا تھا۔ خدام نہایت اکرام سے بادشاہ کو مع لشکر کے لے گئے۔ کھانا کھلایا گیا اس کے بعد ہر شخص کو ایک ایک کمرہ اس کے مرتبہ کے موافق آراستہ اور ایک ایک عورت شب باشی کے لئے دی گئی۔ بادشاہ کو یہ سب دیکھ کر تعجب بڑھتا گیا۔

این چہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب

(یہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں یارب یہ بیداری ہے یا خواب ہے یا خواب میں ۱۲) صبح کو آنکھ جو کھلی تو نہ وہ کمرہ ہے نہ وہ عورت۔ کپڑے گندے گھانس کا پولا بغل میں دبا ہوا۔ بھوک کے مارے اٹھا نہیں تھا۔ تو کیا تھا۔ افلاطون نے خیال کیا تھا کہ ان کے دماغ میں یہ ملنے سے بھی روک دیا کہ **لاخیر من لایالف ولا یولف** (یعنی اس شخص میں بالکل خیر نہیں جو نہ خود لوگوں سے مانوس ہو نہ اس سے لوگ مانوس ہوں ۱۲) دوسری حدیث میں ہے **الوحدة خير من جليس السوء والجليس الصالح خير من الوحدة** (برے ساتھی سے تنہائی بہتر ہے اور نیک ساتھی تنہائی سے بہتر ہے ۱۲)

اس حدیث نے دونوں جز وصاف کر دیئے۔ سبحان اللہ کیسا پاکیزہ فیصلہ ہے کسی نے خوب، کہا ہے جو شریعت پر بالکل صادق آتا ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامن دل میں کشد کہ جا اینجاست

(میرے پیر تک جس جگہ نظر کرتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوبیت کی ہے یعنی اس کا وہ حسن ہے کہ ہر پہلو سے محبوبیت برستی ہے ۱۲)

قصیدہ بانت سعاد میں اپنی معشوقہ کے اعتدال اعضاء کی نسبت کہا ہے خیر اس میں تو ایسا اعتدال ہو یا نہ ہو مگر شریعت پر وہ مضمون پورا صادق آتا ہے۔

صيفاء مقبلة عجزاء مدبرة   لايشتكى قصر منها ولا طول

کہ (وہ ہر وضع میں حسین اور ہر حال میں جمیل ہے۔ نہ تو وہ بہت ٹھگنی ہے نہ بہت لمبی ہے۔ ناسخ و آتش لکھنؤ کے بڑے شاعروں میں سے تھے کہیں ناچ میں گئے جو عورت اس وقت گا رہی تھی لمبی بہت تھی۔ شاعروں کی طبیعت شوخ ہوتی ہے ان میں سے ایک صاحب کہہ بیٹھے

ع   طول شب فرقت سے بھی دو ہاتھ بڑی ہے

اس بے حیا نے بھی سن لیا کچھ کہنے کے ارادہ سے کہا میاں پھر کہنا کیا کہا انہوں نے پھر پڑھ دیا۔

ع   طول شب فرقت سے بھی دو ہاتھ بڑی ہے

دوسرے نے فضیحت (رسوائی ۱۲) کے خیال سے جھٹ یہ مصرعہ لگا دیا۔ وہ زلف مسلسل جو ترے رخ پہ پڑی ہے۔ تو یہ دوست تھے جنہوں نے دوست کی آبرو بچائی۔

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست (دوست وہی ہے جو اپنے دوست کی امداد کرے ۱۲) تو انہوں نے دوست کا دست سنبھال لیا کہ بہنے نہ پائے۔ غرض شاعر کہتا ہے

ع لایشتکی قصر منھا ولا طول (نہ وہ بہت ٹھگنی ہے نہ بہت لمبی ۱۲)

اعتدال شریعت

ایسا اعتدال اوروں کے لئے تو فرضی ہے مگر شریعت کے لئے حقیقی صورتیں سما جاویں۔ سما گئیں۔ مسمریزم کی قوت تھی۔ لاکھوں آدمیوں کے دماغ میں ایک دم سے اتنا بڑا تصرف کر دیا۔

میرے ایک ماموں صاحب ذکر کرتے تھے کہ ایک انگریز رڑکی میں مسمریزم جانتا تھا۔ اس نے ایک بار بہت سے آدمیوں کے مجمع میں کہا کہ میں ہاتھ ہلاؤں گا مگر تم لوگ مت ہلانا۔ اس نے ہاتھ ہلانا شروع کیا۔ اس کے ہاتھ کے ساتھ سب کا ہاتھ ہلتا تھا۔ لوگ روکنا چاہتے تھے مگر رکتا نہ تھا۔ یہ سب قوت متخیلہ کا اثر ہے۔ اس نے اپنے دماغ میں یہ خیال کر لیا تھا کہ سب کا ہاتھ ہلے۔ گو زبان سے کہہ دیا تھا کہ نہ ہلے۔ وہ لوگ اس کے خیال کی مخالفت پر قادر نہ ہوئے۔ غرض حکماء کو خلوت میں بس یہ ملتا تھا کہ قوت متخیلہ اس قدر بڑھ جاتی تھی۔ ان کی یہ خلوت تھی جس میں افراط تھا۔ یہ ہے ترک الاختلاط۔ اس کا نتیجہ اخلاق کا خراب ہونا ہے۔ شریعت نے ایسی خلوت سے روکا اور اس کا نام تبتل رکھا ہے۔

کچھ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کی خلوت کی اجازت چاہی تھی مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجازت نہیں دی کہ اس میں سخت ضرر تھا۔ چنانچہ ایک مضرت تو خود ایک صحابی بیان کرتے ہیں ولو اذن له لاختصینا (یعنی اگر ان کو تبتل کی اجازت دیتے تو ہم تو خصی بن جاتے اور بھی اس کے علاوہ بڑی خرابی یہ ہے کہ اس سے عجب پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ اس میں ایک شان امتیاز کی ہے اوروں کی نظر میں بڑا ہو جاتا ہے یہ کتنی بڑی بلا ہے کہ لوگ تو اسے عظیم سمجھیں اور یہ سب کو حقیر جانے پھر جانبین سے نفع بند۔ اور یہ خرابیاں ملنے والے آدمی میں نہیں ہوتیں بلکہ وہ ان سے بھی نفع حاصل کر سکتا ہے ان کو بھی نفع پہنچا سکتا ہے۔ ان کی خدمت کر سکتا ہے۔

طریقت بجز خدمت خلق نیست ۔۔۔ بہ تسبیح و سجادۂ و دلق نیست

(طریقت خدمت خلق کا نام ہے تسبیح، مصلے اور گدڑی کو نہیں کہتے ۱۲)

خلوت صحیحہ

غرض ترک اختلاط (میل جول چھوڑنے ۱۲) میں تو یہ خرابیاں۔ اور زیادہ اختلاط میں بھی خرابیاں تھیں۔ شریعت نے یہ اعتدال کیا کہ خلوت صرف قلت الاختلاط مع الانام (مخلوق کے ساتھ ملنے ۱۲) کا نام رکھا بالکل نہ ملنے سے بھی منع کر دیا اور اطلاق کے ساتھ ہے کہ اس کی ہر بات افراط و تفریط کے درمیان وسط ہے اور وسط بھی بحرکت سین یعنی وسط حقیقی۔ کیونکہ ایک تو ہے وسط بسکون السین (سین کے جزم کے ساتھ ۱۲) یعنی وسط مطلق اور ایک وسط ہے بفتح السین۔ یہ ہے وسط حقیقی اسی واسطے مشہور ہے کہ **الوسط متحرک** (یعنی متعین نہیں کہ ادھر ادھر ہوسکتا ہے اور **الوسط ساکن** یعنی متعین ہے۔ میں نے اس سے بھی زیادہ لطیف کر دیا کہ **الساکن متحرک والمتحرک ساکن** (یعنی ساکن متحرک ہے اور متحرک ساکن ہے) اور وسط بسکون السین پر چلنا آسان ہوتا ہے اور جب اسے بدل دو یعنی سین کا فتح کر دو تو پھر مشکل ہوتا ہے کیونکہ وسط حقیقی ایک منقسم چیز ہے کیونکہ اگر اس کی تقسیم ہوگی تو پھر اس میں بھی طرفین اور وسط نکلے گا حالانکہ اس کو وسط حقیقی فرض کیا تھا۔ **هذا خلف** (یہ فرض کئے ہوئے کے خلاف ہے ۱۲) اور ظاہر ہے کہ غیر منقسم پر چلنا جیسا دشوار ہے چنانچہ اگر کوئی کہے کہ سڑک پر اس طرح چلو کہ جو بیچوں بیچ کا خط ہے اس سے ادھر ادھر نہ ہو تو بہت مشکل ہے ہاں اگر کسی نے وسط حقیقی میں ایک ڈورا کھینچ دیا تو اب اس کی سیدھ پر چلنا آسان ہے اور شریعت کی حقیقت ہے وسط حقیقی چنانچہ شریعت نے ہر چیز میں ایک وسط نکالا۔ جبن و تہور (بزدلی ۱۲) (قوت غضبی کی زیادتی ۱۲) میں شجاعت، خمود و فجور میں عفت وسط نکالا ہے۔ اسی طرح جزبرہ و بلاہت میں حکمت وسط نکالا ہے یعنی جزبرہ تو یہ ہے جیسا کہ کسی طالب علم نے تیلی سے پوچھا تھا کہ بیل کے گلے میں گھنٹی کیوں باندھی اس نے کہا کہ جب تک گھنٹی کی آواز آتی رہے یہ معلوم رہے کہ یہ چل رہا ہے۔ اس نے کہا اگر یہ کھڑا ہو کر خالی گردن ہلایا کرے۔ اور جیسے کسی طالب علم نے اپنے باپ سے کہا کہ میں دو انڈوں کے سوانڈے بنا سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا اچھا بناؤ۔ آپ نے کہا ایک یہ ایک یہ اور ایک ان کا مجموعہ یہ تین ہوئے پھر تین وہ اور ایک ان تینوں کا مجموعہ **وهلم جرا الى مالايتناهى** (اسی طرح غیر متناہی تک قیاس کرلو ۱۲) باپ نے ان کی معقول کو ماکول (کھایا ہوا ۱۲) کر دیا کہ ان دونوں میں سے ایک تو خود کھا لیا۔ ایک دوسرے بیٹے کو دے دیا اور ان سے کہا وہ اٹھانویں آپ نوش فرمادیں۔ وہ

انڈے کیسے تھے کہ ان سے یہ اندھے ہوگئے کہ اب انہیں نظر نہ آئے جیسے کسی استاد نے ایک بھینگے شاگرد سے کہا ذرا افلانی بوتل تو اٹھالاؤ۔ اس نے کہا وہاں تو دو ہیں۔ کون سی اٹھالاؤں۔ بھینگے کو ایک کے دو نظر آیا کرتے ہیں۔ استاد نے کہا نہیں ایک ہی ہے اس نے کہا دو ہیں۔ استاد نے کہا اچھا دوسری بوتل توڑ ڈال۔ اس نے ایک توڑی وہ دونوں ٹوٹ گئیں۔ اسی طرح ان کو بہت سے انڈے نظر آتے تھے کہ دو غائب ہوئے تو سب ہی غائب ہوگئے۔ یہ جز برہ کہلاتا ہے یہ عقل کا ہیضہ ہے ایک اکل کا ہیضہ ہوتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں ایک بلاہت ہے کہ کچھ خبر ہی نہ ہو بہت سے بزرگ ایسے ہوتے ہیں مگر یہ کمال نہیں چنانچہ کوئی نبی بھولا نہیں ہوا نہایت دانشمند اور بیدار مغز ہوئے ہیں۔ میرے ایک دوست نہایت بھولے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ تمہاری بیوی عورت ہے یا مرد کہنے لگے بظاہر عورت معلوم ہوتی ہے میں نے کہا کہ کیسے معلوم ہوا کہ عورت ہے۔ کہنے لگے وہ نتھ پہنے ہوئے تھی۔ اگر وہ نتھ نہ پہنے ہوئے ہوتی شاید اسے مرد سمجھتے۔ یا ان کو کوئی نتھ پہنا دیتا تو یہ بھی اپنے کو عورت سمجھنے لگتے۔ تو بعض ایسے بھولے ہوتے ہیں مگر کمال یہ ہے کہ نہ جز برہ ہو نہ بلاہت ہو۔ دونوں میں وسط ہو جس کا نام حکمت ہے۔ **خیر الامور[1] اوسطھا** اسی طرح باقی امور کو لے لو۔ غرض شریعت نام ہے اعتدال حقیقی کا اور اس کا مقتضا جیسا کہ مذکور ہوا یہ تھا کہ اس پر چلنا نہایت دشوار ہو مگر خدا نے آسان کرنے کے لئے اس وسط پر ایک ڈوری ڈال دی ہے جس کو وہ ڈوری نظر آ رہی ہے اس کو چلنا نہایت آسان ہو اور وہ ڈوری کیا ہے علم صحیح۔ صحبت صالحہ۔ یہ وہ چیز ہے کہ اس سے وسط حقیقی نظر آ جاتا ہے۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۙ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۚ (اس نے دریاؤں کو ملایا کہ ظاہر میں باہم ملے ہوئے ہیں اور حقیقت میں ان دونوں کے درمیان ایک قدرتی حجاب ہے کہ دونوں نہیں بڑھ سکتے ۱۲)۔

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں درمیان شان بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ

(بحر تلخ اور بحر شیریں دونوں برابر جاری ہیں مگر ان کے درمیان ایک ایسا پردہ حائل ہے جس کی وجہ سے باہم مختلط اور مشتبہ نہیں ہونے پاتے ۱۲)

تو شریعت بھی افراط و تفریط کے برزخ کا نام ہے

---

[1] (تمام امور میں جو امر اوسط ہے وہ بہتر ہے ۱۲)

مثال علم صحیح

میں علم صحیح کی ایک مثال دیتا ہوں ایک صفت ہے غضب النفس (نفسانی غرض سے غصہ کرنا۱۲) اور ایک ہے غضب للہ (اللہ کے لئے غصہ کرنا۱۲) ان دونوں میں خلط ہے یہاں پر امتیاز کی ضرورت ہے مثلاً ہم نے ایک مسئلہ لکھا اسے کسی نے رد کر دیا ہمیں غصہ آیا۔ اور فی نفسہ ہم نے وہ مسئلہ صحیح لکھا ہے اس غصہ میں خلط ہے کہ آیا اللہ ہے کہ اس نے حق کو رد کیا یا للنفس (نفس کی وجہ سے۱۲) ہے کہ اس نے ہم پر رد کیا۔ سوائمہ طریقت واقعی بڑے حاذق طبیب تھے۔ وہ اس کا فیصلہ کرتے ہیں کہ اے عزیز غور کر کے دیکھ اگر اسی امر میں تیرے کسی معاصر مولوی پر یہی رد کیا جاتا خاص کر وہ معاصر جس کی ذلت سے تمہارا نفس خوش ہو سوا گر ایسے شخص پر یہی رد ہوتا تو آیا اس وقت بھی تم کو ایسا ہی غصہ آتا یا نہ آتا۔ اگر سوچنے سے یہ معلوم ہو کہ آتا تب تو یہ غضب للہ ہے اور اگر غصہ کم آتا تو آمیزش ہے اور اگر بالکل نہ آتا تو اس وقت کا غصہ محض للنفس ہے نفس کی شرارت اور بدمعاشی ہے۔ اسی طرح دوسرے اخلاق رذیلہ واخلاق حمیدہ میں امتیاز کے واسطے علم صحیح کی ضرورت ہے۔

پل صراط کی حقیقت

اور چونکہ شریعت نام وسط حقیقی کا ہے اسی سے یہی صراط مستقیم بھی ہے کیونکہ خط مستقیم کے لئے اقصر خطوط واصلہ بین النقطتین اور اوسط خطوط واصلہ ہونا ضروری ہے یعنی دو نقطوں کے درمیان میں بہت سے خط کھینچو جو سیدھا ہوگا وہ سب سے چھوٹا بھی ہوگا اور وہی درمیان میں بھی ہو گا اور صراط مستقیم شریعت ہے جو قیامت میں بشکل صراط قائم ہوگا۔ پس وہ شریعت ہی کی صورت مثالیہ ہے اور یہی معنی ہیں اس کے بال سے باریک ہونے کے بال تو پھر متجزی ہے اور شریعت وسط حقیقی ہونے کی وجہ سے غیر متجزی (غیر منقسم۱۲) کیونکہ شریعت اتنا وسط ہے کہ اس میں پھر وسط نہیں اسی واسطے قیامت میں بال سے باریک نظر آوے گی۔

باقی تلوار سے تیز ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ چونکہ شریعت نام ہے وسط حقیقی کا اور وسط حقیقی پر چلنا اس سے بھی زیادہ دشوار ہے جیسا کہ تلوار کی دھار پر چلنا اس لئے وہ صراط دھار سے زیادہ تیز نظر آوے گا۔ البتہ جن کو یہاں وہ ڈوری امتیاز کی عطا ہونے سے چلنا آسان ہو گیا تھا چونکہ صراط وہی چیز ہوگی جس پر چلنے کے خوگر تھے اس لئے وہاں بھی اسی درجہ میں اس صراط پر چلنا آسان ہوگا۔ یعنی اگر یہاں برق کی طرح ہے تو وہاں بھی ہے اگر یہاں چلنے میں اٹکا تھا تو وہاں بھی اٹکے گا اور جہنم میں گرے گا۔

علم بلاصحبت

غرض شریعت کے اندر ہر امر میں اعتدال ہے چنانچہ اعتکاف کے اندر بھی نہایت اعتدال ہے اور اس پر چلنے کی ڈوریاں نظر آنے کے لئے علم صحیح اور صحبت محققین کی ضرورت ہے کیونکہ وہ ڈوریاں خود دقیق ہیں کہ عینک بلکہ خوردبین سے نظر آتی ہیں۔ایک شخص کہتے تھے کہ بال کو خوردبین سے دیکھا تو منارہ کے برابر معلوم ہوتا تھا اور اس پر جو کیڑے تھے معلوم ہوتا تھا کہ بھیڑیئے ہیں۔تو علم صحیح وصحبت محققین بھی خوردبین ہے پھر جب غیر منقسم ڈوری اتنی بڑی نظر آنے لگے گی تو پھر چلنا کیا مشکل ہے تو علم صحیح اور اس پر صحبت کی جلاء سے وہ ڈوری نظر آنے لگتی ہے اور نرا علم بغیر صحبت کے کافی نہیں ہوتا۔ دیکھو بلعم باعوراء اتنا بڑا عالم تھا کہ اس کے وقت میں اس جیسا نہ تھا مگر صحبت نہ ہونے سے ایسا بھٹکا کہ شیطان کی طرح مردود ہوا۔اسی کو کہتے ہیں۔

علم رسمی سربسر قیل ست و قال　　　نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال

(رسمی علم محض قیل وقال ہے نہ اس سے کوئی کیفیت حاصل ہو نہ حال ۱۲)

علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت　　　زنگ گمراہی زدل بزدایدت

علم وہی ہے کہ تم کو خدا کا راستہ دکھلا دے اور دل سے گمراہی کا زنگ دور کردے ۱۲)

ایں ہوسہا از سرت بیروں کند　　　خوف وخشیت در دلت افزوں کند

(حرص وہوا سے چھڑا کر تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف وخشیت پیدا کردے ۱۲)

تو ندانی جز یجوز ولا یجوز　　　خود ندانی کہ تو حوری یا عجوز

(بڑھیا ۱۲)

(تم کو یجوز یہ خبر جائز ہے) اور لا یجوز (یہ چیز ناجائز) کے سوا اپنی خبر نہیں کہ تم حور ہو یا عجوز یعنی مقبول ہو یا مردود ۱۲)

اسی علم لفظی کی نسبت کہتے ہیں۔

ایھا القوم الذی فی مدرسہ　　　کل ماحصلتموہ وسوسہ

(جو کچھ مدرسہ میں علم (لفظی) حاصل کیا وہ وسوسہ تھا ۱۲)

علم نبود غیر علم عاشقی　　　ماقبی تلبیس ابلیس شقی

(علم عاشقی کے علاوہ جو علم بھی ہے وہ ابلیس شقی کی تلبیس ہے ۱۲)

اور وہی معنوی ہے جس کی نسبت مولانا فرماتے ہیں ۔

بنی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا

(بے کتاب اور بے معین و استاد کے اپنے اندر انبیاء جیسے علوم پاؤ گے ۱۲) اور جس کی ضد کی نسبت فرماتے ہیں ۔

جملہ اوراق و کتب در نار کن سینہ را از نور حق گلزار کن

(تمام کتابوں اور اوراق کو آگ میں جھونکو سینہ کو حق تعالٰی شانہ کے نور سے گلزار کرو ۱۲)

امیر خسرو فرماتے ہیں ۔

در مصحف روئے او نظر کن خسرو غزل و کتاب تا کے

محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہو کتاب اور غزل میں کب تک مشغول رہو گے ۱۲)

تو یہ علوم بدون صحبت کے میسر نہیں ہوتے ہم نے دیکھا ہے کہ بہت زیادہ پڑھے ہوئے ہیں اور محققین کی صحبت میسر نہیں ہوئی تو معمولی سی باتوں میں ان سے غلطیاں ہوتی ہیں حدیث میں ہے کہ جس کو دیکھو زاہد ہے اور کم بولتا ہے اس کے پاس بیٹھا کرو اس کے قلب پر حکمت القا ہوتی ہے یعنی تم پر بھی اس کا انعکاس ہوگا کیونکہ ایک قلب دوسرے قلب کا آئینہ ہے جو چیز ایک آئینہ میں نظر آئے گی دوسرے میں بھی نظر آئے گی ۔

ربط وادی سینہ را باسینہ ربط ایں آئینہ باآئینہ

(اے خدا آپ کا ایک سینہ کو دوسرے سینہ کے ساتھ دینا ایسا ہے جیسا ایک آئینہ کو دوسرے آئینہ کے ساتھ ربط دینا ۱۲)

نقش ایں آئینہ دردیگر پدید کردی از صنع خود اے رب مجید

اے اللہ آپ نے اپنی صنعت سے اس آئینہ کا نقش دوسرے آئینہ میں ظاہر کیا یعنی ایک سینہ کی حکمت کا انعکاس دوسرے سینہ پر ہوا ۱۲)

لیکن شرط انعکاس کی یہ ہے کہ اپنے آئینہ کو جلا کرلو ورنہ زنگار خود مانع ہوگا ۔

روتو زنگار از رخ او پاک کن بعد ازاں آں نور را ادراک کن

قلب کو ماسوائے اللہ کے رنگ سے پاک وصاف کرو پھر نور الٰہی کا تم کو ادراک ہوگا ۱۲)

آئینہ ات دانی چرا غماز نیست زانکہ زنگار از رخش ممتاز نیست

(تمہارے دل کے آئینہ پر تعلق ماسوا اللہ کا زنگ چڑھا ہوا ہے اس لئے اس میں صفائی نہیں ہے ۱۲)

آئینہ کز زنگ الایش جداست　　پر شعاع نور خورشید است

(ایسے آئینہ قلب میں نورالٰہی تاباں ہوتے ہیں اور معارف واردات اس پر وارد ہوتے ہیں جو تعلق ماسوا اللہ کے رنگ سے پاک وصاف ہے ۱۲)

جلاءِ قلب کے آثار

مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ رومیوں اور چینیوں میں گفتگو ہوئی کہ صنعت میں کون بڑھا ہوا ہے بادشاہ کے پاس فیصلہ کے لئے گئے بادشاہ نے کہا دونوں اپنی اپنی صنعتیں دکھلاؤ ایک ایک برآمدہ آمنے سامنے دونوں کو دیدیا گیا اور درمیان میں پردہ حائل کر دیا کہ ایک دوسرے کو نہ دیکھے۔ چینیوں نے دیوار پر تمام نقش ونگار بنانا شروع کئے رومیوں نے تمام پلستر رگڑنا شروع کیا۔ عین وقت تک رومیوں کے یہاں کچھ نہ تھا اور چینیوں نے بہت کچھ صناعی کر لی تھی۔ رومیوں نے اتنا کیا تھا کہ پلستر پر صیقل کر کے مثل آئینہ کے چمکدار کر دیا تھا۔ جب امتحان ومقابلہ کی تاریخ آئی تو درمیانی پردہ اٹھا دیا گیا۔ چینیوں کے تمام نقش ونگار رومیوں کی دیوار پر ان کی دیوار سے اچھا نظر آتا تھا۔ بس رومی جیت گئے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ تم بھی نفس پر صیقل کرلو تو سب کچھ تمہارے نفس میں بھی نظر آنے لگے گا۔ بلکہ وہاں تو باہر سے انعکاس ہوا تھا اور یہاں تو علوم خود پہلے سے تمہارے اندر ہیں صحبت وتجلیہ سے ان کا ظہور ہو جاوے گا۔

اور دلیل اس کی کہ تمہارے اندر خود علوم پہلے سے موجود ہیں یہ ہے کہ دیکھو جب کبھی استاد کے سامنے بیٹھتے ہو اور وہ تقریر کرتا ہے تو کہتے ہو ٹھیک ہے اور طبیعت میں نشاط ہوتا ہے اور تصدیق ہوتی ہے پہلے علم سے چنانچہ ظاہر بھی ہے اور اس کا تائیدی مضمون ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے آپ سے کچھ سوالات کئے آپ نے جواب دیئے تو وہ تصدیق کرتا تھا صحابہ رضی اللہ عنہ کو اس کی تصدیق سے نہایت تعجب ہوا کیونکہ عجب اشکال ہے کہ اس کے سوال سے تو معلوم ہوتا تھا کہ جانتا نہیں ورنہ سوال کے کیا معنی۔ محض تحصیل حاصل ہے اور تصدیق سے معلوم ہوتا ہے کہ جانتا ہے ورنہ تصدیق کیسے کرتا کیونکہ تصدیق کے لئے پہلے سے جاننا ضروری ہے۔ خیر وہ تو جبرئیل علیہ السلام تھے کہ جانتے مگر ان کی تخصیص نہیں بلکہ اسی طرح جب استاد کی تقریر کسی مضمون کے متعلق ہوتی ہے تو اگر تقریر صحیح وعمدہ ہے تو کہتے ہو ٹھیک ہے اور

اگر کہیں غلط ہے تو فوراً طبیعت کھٹک جاتی ہے تو اگر آپ پہلے سے نہیں جانتے تو اس انقباض وانبساط کے کیا معنی معلوم ہوا علوم آپ کے اندر بھی فطری ہیں صرف استاد کی صحبت سے جلا ہوتا چلا گیا۔ جب پورا جلا ہو چکا تو ظاہر ہو گیا۔ تو اس بناء پر ہر شخص اپنی ماں کے پیٹ سے عالم ہی پیدا ہوتا ہے مگر وہ نقوش چھپے ہوئے ہیں جیسے ایک صفحہ کتاب کا ہے اس پر مہرہ رکھا ہوا ہے جونہی وہ مہرہ اٹھے گا تمام نقوش نظر آنے لگیں گے۔ اسی طرح آپ کا نفس بھی ایک صفحہ ہے آپ اس پر مہرہ رکھے ہوئے ہیں تو علوم آپ میں خارج نہیں آ گئے۔ بلکہ نظر آ گئے خدا نے لکھی لکھائی تختی دی ہے اگر لکھا نہ ہوتا تو کیا لکھتے اور تم کہاں لکھنے جاتے۔ تمہیں تو آج تک یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ علم کس مقولہ سے ہے۔ اگر تم علم حاصل کرتے تو کم از کم اس کا مقولہ تو معلوم ہوتا کوئی کہتا ہے مقولہ کیف سے ہے۔ کوئی کہتا ہے مقولۂ انفعال سے ہے۔ کوئی کہتا ہے مقولۂ اضافت سے ہے۔ کوئی کہتا ہے مختلف اعتبارات سے سب سے ہے بتاؤ اگر تمہارا حاصل کیا ہوا ہوتا تو تم واقف نہ ہوتے کہ کس مقولہ سے ہے۔ ع چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ روند (جب حقیقت نہ دیکھی افسانہ کی راہ تلاش کی)

ارے میاں تمہارا حاصل کیا ہوا ہی نہیں جو تم مقولہ ڈھونڈتے پھرتے ہو۔ بہت سی کتابیں اسی تحقیق میں ہیں کہ علم کون سے مقولہ سے ہے۔ تمہیں وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ اپنے کام سے کام رکھو۔ اس سے کیا نفع کہ کون سے توے کی پکی ہوئی ہے۔ کس خبط میں پڑے چھوڑو اگر یہ معلوم ہی ہو گیا تو کیا ہوا اسی کو کہتے ہیں۔

در مصحف روئے او نظر کن — خسرو غزل و کتاب تا کے

(محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہو کر کتابوں اور غزلوں سے کب تک شغل رکھو گے ۱۲)

اور عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

حدیث و مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو — کہ کس نکشود نکشاید بحکمت ایں معمارا

(محبوب حقیقی اور ان کی محبت و معرفت کی طرف التفات کرو مسائل حکمیہ و اسرار دہر کی تحقیق کو چھوڑو اس لئے یہ معمہ حکمت سے کسی سے حل ہوا نہ حل ہو سکے ۱۲) تو غرض یہ ہیں نقوش جو لوح نفس کے صیقل کرنے سے ظاہر ہوتے ہیں۔

ذہن انسانی کی وسعت

پھر جب وہ علوم ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں اس وقت اس لوح کی وہ شان معلوم ہوتی ہے

جس کو مولانا فرماتے ہیں ؏ لوح حافظ لوح محفوظے شود (یعنی وہ شخص کہ زمانہ طلب میں لوح حافظ تھا کہ علوم واسرار کو شیخ سے سن کر لوح قلب پر محفوظ رکھتا تھا بعد انکشاف علوم کشفیہ لدنیہ کے لوح محفوظ کے مثل ہو جاتا ہے کہ من جانب اللہ اس میں علوم حقیقیہ کا انکشاف ہونے لگتا ہے ۱۲) اور وہ لوح محفوظ خود تو نہیں ہوتا مگر غایت تشابہ کی وجہ سے متحد کہہ دیا۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

(میں آپ کا ہو گیا آپ میرے ہو گئے میں مثل تن کے ہو گیا آپ مثل جاں کے ہو گئے تا کہ اس کے بعد کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ میں غیر ہوں آپ غیر ہیں ۱۲) اور یہ تشابہ اس سے بھی ظاہر ہے کہ جس طرح لوح محفوظ حساً بھی وسیع ہے ذہن گو صورۃً چھوٹی چیز ہے مگر معنیً اس میں ایسی وسعت ہے کہ کبھی بھرتا ہی نہیں۔ غیر متناہی تو نہیں مگر لاتقف عندحد ہے (کسی حد پر قرار نہیں پکڑتا ہے ۱۲) قطعہ لکھو رباعی لکھو۔ جو کچھ لکھئے کبھی بھرتا ہی نہیں۔ تختی پہ لکھو تو کبھی تو بھر جائے گی۔ یہ کبھی بھرتا ہی نہیں۔ جب لکھ چکو پھر جگہ موجود۔ پس بالکل لوح محفوظ کی نظیر ہے ۔

دیکھو اللہ ہے چھوٹوں کو بڑائی دیتا آسمان آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

ایک دفعہ ایک منکر غیبیات نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے پوچھا کہ لوح محفوظ کتنی ہی بڑی مان لیجئے مگر کبھی تو ختم ہو جائے گی۔ ہزاروں لاکھوں برس ہو چکے۔ بیشمار چیزیں پیدا ہوئیں اور فنا ہوئیں۔ کہاں تک لوح محفوظ میں لکھا گیا ہوگا۔ مولانا نے فرمایا کہ تمہارا ذہن ہے یہ کبھی ختم نہیں ہوتا اس میں تم نے کتنی چیزیں بھری ہوں گی مگر وہ ابھی تک خالی ہے تو لوح محفوظ تو ذہن سے بہت بڑی ہے۔ ہاں واقعی اتنے سے ذہن میں کس قدر گنجائش ہے کہ دلی کلکتہ زمین وآسمان یا سب کچھ سمایا ہوا ہے۔ اگر حصول الاشیاء بانفسہا (چیزوں کا ہو بہو حاصل ہونا ذہن میں ۱۲) نہ مانئے باشباحہا (یعنی ان چیزوں کی اشباح کا حاصل ہونا ۱۲) کے قائل ہو جیئے تب بھی سج دلی کو دلی کے برابر ہوگی جیسا سوچنے سے صاف ہوتا ہے۔ اجی ذہن پھٹا نہ سہی کہ اشیا یا اشباح لطیف ہیں۔ تب بھی اتنا بڑا آسمان اتنی بڑی زمین اتنی بڑی دلی۔ ذہن اتنا بڑا کہاں سے ہو گیا تو لوح محفوظ میں تمام چیزوں کا سما جانا کیا مشکل ہے تو ذہن محض اس وسعت میں سب کا مشابہ لوح محفوظ کے ہے مگر علم صحیح سے خاص باعتبار علوم عالیہ کے بھی بالکل سچا نمونہ لوح محفوظ کا ہو جاتا ہے اور اسی شان کے بعد ڈوری نظر آنے لگے گی۔ غرض یہ تین

چیزیں ہوئیں جن سے اعتدال حقیقی پر چلنا آسان ہے۔صحبت محققین اتباع شریعت علم صحیح۔

وحدۃ وعزلت

الغرض شریعت نے جو خلوت تعلیم کی ہے اس میں عجیب اعتدال کی رعایت کی ہے اور شریعت نے اس کو خلوت؎ سے تعبیر نہیں کیا اور لفظ خلوت اصطلاح صوفیہ کی ہے بہر حال چاہے خلوت سمجھو یا وحدت کہو ایک ہی چیز ہے۔

عبارا تنا شتے و حسنک واحد وکل الی ذاک الجمال یشیر

(عنوانات مختلف ہیں معنون ایک ہی جمال محبوب ہے ہر ایک عنوان اسی جمال کی طرف اشارہ کرتا ہے ۱۲)

اوراس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے لفظی آداب کی بھی بڑی رعایت کی ہے حدیث میں آیا ہے اگر کسی کا جی متلائے تو قلست نفسی (میرا جی متلا رہا ہے ۱۲) کہے خبیث نفسی (میرا جی برا ہے ۱۲) نہ کہے کیونکہ خبث ذرا ادب کے خلاف ہے اسی واسطے شریعت نے خلوت نہیں؎ کہا کیونکہ اس وقت وہ خالی نہیں ہوتا۔اس میں تو نور بھرا جاتا ہے اور صوفیہ نے صرف یہ عنوان اصطلاح کے طور پر مقرر کیا ہے ورنہ معنی خلو کے وہ بھی قائل نہیں۔چنانچہ عنوان میں تو یہ کہا ہے۔

خلوت گزیدہ را بتماشہ چہ حاجت است چوں کوئے دوست ہست بصحرا چہ حاجت است

(خلوۃ نشین کو تماشہ کی کیا حاجت ہے جب محبوب کے دربار ہیں تو جنگل کی کیا ضرورت ہے یعنی تارکان تلعق ماسوائے اللہ کو کثرت کی طرف التفات نہ چاہئے اور اس بے التفاتی کے لئے اس کی ضرورت نہیں کہ بستی چھوڑ کر جنگل میں جارہے بلکہ توجہ الی الحق کافی ہے ۱۲)

اور معنوں کے درجہ میں پر ہونے کو اس طرح کہا ہے۔

ستم است گر ہوست کشد کہ بسیر سرد سمن ورآ تو زغنچہ کم نہ دمیدہ در دل کشا بہ چمن ورآ

؎ اس پر شبہ نہ کیا جائے کہ حدیث میں ہے ذکر اللہ خالیاً اور یہ مادہ خلوت سے ہے مطلب یہ ہے کہ جس معنی میں گفتگو ہے جس کو عزلت یعنی اکثر تنہا رہنا اس میں لفظ وحدت مستعمل ہوا ہے لفظ خلوت نہیں آیا اور اس حدیث میں غالباً اس معنی میں مستعمل نہیں ہوا بلکہ مطلق تنہائی کے معنی میں آیا ہے بدون اس کے کہ اس کی عادت ہو ۱۲۔منہ ؎اور خالیا کے استعمال سے شبہ نہ ہو وہاں ذکر اللہ خود نفی وخلو منفی کی کررہا ہے پس اس قرینہ کے ہوتے ہوئے شبہ نہیں ہوسکتا ۱۲ منہ)

تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کرلو۔
مولانا فرماتے ہیں۔

اے برادر عقل یک دم باخود آر — دمبدم در تو خزاں است و بہار

(اے بھائی تھوڑی دیر کے لئے ذرا عقل کو درست کر کے دیکھو خود تمہارے اندر دمبدم خزاں و بہار موجود ہے ۱۲) تم کیا اس ظاہری خزاں و بہار کو لئے بیٹھے ہو تمہارے اندر خود خزاں بھی ہے۔ بہار بھی ہے۔ تو واقعی تم کیا اس ظاہری خزاں و بہار کو لئے بیٹھے ہوئے تمہاری شریعت نے وحدت و عزلت نام رکھا ہے۔ عزلت کا لفظ بھی خلوت پر دال نہیں۔ بہرحال کتاب وسنت میں یہ دونوں لقب یعنی وحدت وعزلت مذکور ہیں اور وہ صوفیہ کی اصطلاح میں ہے۔ یعنی لفظ خلوت تو یہ روح ہے اعتکاف کی۔ اور روح اس معنی کو نہیں کہ مجرد عن الجسد (جسم سے مجرد ہو ۱۲) ہو بلکہ اس کا نفخ (پھونکنا ۱۲) مشروط ہے اس جسد خاص یعنی اعتکاف کے ساتھ جو خلوت معتدلہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ خلوت بھی ہے جلوت بھی ہے۔ سبحان اللہ کیسی اچھی طرح اعتدال کو ظاہر کر دیا۔

صورۃ اختلاط:

پھر یہ رحمت ہے کہ اس اعتدال کو مفسر بھی فرما دیا یعنی اجمالاً ہمیں اس طرح مکلف نہیں کیا کہ کچھ ملنا اور کچھ نہ ملنا نہیں بلکہ اسکی مدت اور صورت بتلا دی۔ اگر یہی حکم ہوتا کہ کچھ ملنا کچھ الگ رہنا تو بڑی مصیبت ہوتی اس کچھ میں بڑا اختلاف ہوتا۔ جیسا ایک قصہ ہے کسی شخص کے یہاں ان کے ایک عزیز مہمان آئے تو انہوں نے فہمائش کر دی کہ دیکھو یہاں کسی سے کوئی معاملہ نہ کرنا یہاں کے لوگ بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ بعد میں جھگڑا کرتے ہیں ان سے بچنا بڑے دانا کا کام ہے تم سے نہ ہو سکے گا۔ اتفاقاً ایک دفعہ یہ مہمان بازار گئے وہاں چمار کو دیکھا انہوں نے کہا گو معاملہ کرنے سے منع کیا ہے مگر یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں چمار سے پوچھا جوتی گانٹھ دے گا۔ اس نے کہا گانٹھ دوں گا۔ اس نے کہا کیا دو گے کہا کچھ دیں گے۔ اس نے جوتا گانٹھ دیا جب گانٹھ چکا انہوں نے ایک پیسہ اسے دیا اس نے کہا میں تو پیسہ نہیں لوں گا میں تو کچھ لوں گا۔ تم نے کچھ دینے کو کہا تھا۔ کچھ لاؤ اب تو یہ بہت گھبرائے انہوں نے کہا واقعی یہاں کے چمار بھی بڑے فسادی ہیں۔ شور وغل ہوا ان کے میزبان بھی پہنچ گئے انہوں نے واقعہ معلوم کیا ان سے کہا دیکھو ہم نے تمہیں منع کیا تھا۔ اس چمار سے کہا چل ہم تجھے کچھ دیں گے اسے لے گئے تھوڑی سی کانچ (آبگینہ) پسوائی

اور دہی میں ڈال کر اس کے پاس لے گئے کہ اسے انگلی سے گھول میں اتنی دیر میں تجھے کچھ دوں گا۔ وہ گھولنے لگا کانچ اس کی انگلی میں چبھنے لگی تو اس نے ان سے کہا اس میں تو کچھ چبھتا ہے۔ انہوں نے کہا بس وہ کچھ تم لے جاؤ۔ یہی تم سے طے ہوا تھا۔ ان سے کہا دیکھا ان کے فساد سے بچنا بڑے دانا کا کام ہے۔ تو اگر شریعت اتنا بتا دیتی کہ کچھ ملنا اور کچھ نہ ملنا تو اس کچھ کے فیصلہ میں بڑے بڑے دانا غوطے کھاتے۔ اس لئے یہاں یہ بتلایا کہ کچھ ملنا اور کچھ نہ ملنا اس کچھ کی تعین بھی کر دی۔ قواعد خود مقرر کر دیئے۔ دیکھو جماعت کی مسجد میں بیٹھنا کہ جو نمازی ہیں ان سے تو ملنا ہوگا اور جو بے نمازی ہیں ان سے نہ ملنا ہوگا۔ اور جو بے نمازی بھی وہاں آئیں گے وہ بھی نمازی ہو کر آئیں گے ان سے ملنے میں بھی کچھ حرج نہیں گو وہ پہلے سے بے نمازی اور دنیا دار ہوں مگر وہاں تو دوسری حیثیت سے آئے ہیں۔

برکت کی صحبت

اسی قاعدے سے ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر تمہارے پاس امراء آویں تو ان سے دنیا دار سمجھ کر بدخلقی نہ کرو کیونکہ اب وہ دنیا دار نہیں ہیں۔ تمہارے پاس جو آئے ہیں تو دیندار ہو کر آئے ہیں۔ اب ان کی تعظیم کرنا دنیا دار کی تعظیم کرنا نہیں ہے۔ **نعم الامیر علی باب الفقیر** اب جب کہ وہ فقیر کے دروازہ پر آ گیا تو اچھا امیر ہے۔ صرف امیر نہیں ہے اس کی تعظیم امیر کی تعظیم نہیں ہے۔ نعم کی تعظیم ہے اب وہ اللہ والا ہو گیا یہ برکت صحبت کی ہے اور یہ وہ چیز ہے کہ اس کے قصد ہی سے یہ برکت ہوگئی کہ نعم کا مصداق ہو گیا گو پہلے کچھ بھی نہ تھا۔ شیخ نے خوب کہا ہے

جمال ہمنشیں درمن اثر کرد   وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

ہمنشیں کی صحبت نے مجھ میں اثر کر دیا ورنہ میں وہی مٹی ہوں جو تھی ۱۲)

صحبت وہ چیز ہے کہ جب ہوا چلتی ہے تو کنکر پتھر گیہوں میں پڑ جاتے ہیں اور اس کی صحبت کی وجہ سے گیہوں کے نرخ فروخت ہوتے ہیں۔ بھلا الگ ہو کر تو بکیں اس قیمت پر کوئی دمڑی کو بھی نہیں پوچھے گا۔ پھر وہ کنکر کے کنکر اور پتھر کے پتھر ہو جائیں گے۔

اسی واسطے ناقص کو اپنے شیخ سے جدا ہونا مضر ہے البتہ کامل کو مضر نہیں۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ بالکل جدا ہو جانا مضر ہے اور یہ معنی نہیں کہ ہر وقت بھوت کی طرح اس کے سر ہو جاؤ۔ جیسا

کسی ساس نے اپنی آرام طلب بہو سے کہا تھا کہ بیٹی گھر کو لگا کرتے ہیں اس نے کیا کیا کہ بہت سا ماش کا آٹا سانا اور دیوار میں لگا کر اس سے چپک گئی تو کہیں تم بھی ایسا نہ کرنا کہ بھوت کی طرح پیر کو چمٹ جاؤ بلکہ مطلب یہ ہے کہ قطع تعلق مضر ہے۔ تو جس وقت وہ امیر یہاں آیا تو تھوڑی دیر کی صحبت بلکہ عدم صحبت کی برکت سے وہ اللہ والا ہو گیا۔

اختلاط میں اعتدال

اسی طرح وہ بے نمازی تھوڑی دیر کے لئے تو نمازی ہو گیا۔ لیکن تم باہر نکل کر ملنے نہ جاؤ۔ سبحان اللہ کیا اعتدال ہے جس طرح صوم میں کھانے اور نہ کھانے کو جمع کر دیا یہاں ملنے اور نہ ملنے کو جمع کر دیا اور یہ جمع واقعی بہت مشکل تھا۔ واسطے اس کے آسان کرنے کو ایک ہیڈ کوارٹر مقرر کر دیا کہ اسی میں رہو اگر کسی ضرورت سے نکلو تو فوراً واپس آ جاؤ۔ پھر جو یہاں آئے اس سے مل لو نہ آئے مت ملو۔ یہاں تک کہ اگر وہ کافر ہو تب بھی بات کر لو۔ ہمارے یہاں کی چیزیں ایسی نازک نہیں کہ ذرا ذرا سی بات میں ٹوٹ جائیں۔ اسی طرح کافر سے بات کرنے اور کسی سے ملنے سے ہمارا اعتکاف نہیں ٹوٹتا۔ بعضے غالی ہوتے ہیں۔ ذرا سے میں ان کے قلب پر بزعم ان کے ظلمت طاری ہو جاتی ہے۔ ارے وہ کیسا نور ہے جس پر ایسے اسباب سے ظلمت طاری ہوتی ہے چراغ اگر دمڑی کا بھی ہو تو اس سے تو ظلمت خود فنا ہو جائے گی۔ البتہ اگر کوئی چیز حائل ہو جاوے اس کے قدر ظلمت بیشک آ جاوے گی پس معلوم ہوا کہ وہ نور ہی نہیں جہاں ایسے اسباب صیغہ سے ظلمت مستولی (غالب ۱۲) ہو جاوے۔ وہ کیسے بزرگ ہیں کہ بالکل چھوئی موئی کا درخت ہیں کہ ذرا کوئی آیا اور حالت میں فرق آیا۔

دریائے فراواں نشود تیرہ بسنگ عارف کہ برنجد تنگ آب است ہنوز

(گہرا دریا پتھروں کے پڑنے سے گدلا نہیں ہوتا جو عارف کہ رنجیدہ ہو وہ ابھی مثل تھوڑے پانی کے ہے ۱۲)

یہ کیا کہ شیخ بھی بنیں اور کچے اتنے چھوڑو پیری مریدی جب اتنے پختہ ہو جاؤ کہ کسی کے ملنے سے ظلمت نہ ہو اس وقت پیری کر لینا۔ ابھی کچھ فرض تھوڑا ہی ہے۔ بہر حال خود کسی سے ملنے باہر نہ جاؤ کوئی اندر آئے اس سے بول لو۔ بات کر لو۔ کچھ حرج نہیں۔ یہ تو ملنے میں اعتدال ہوا۔

جذبات فطری کی رعایت

اسی طرح تمعات ثلثہ میں سے کھانا بھی جائز پینا بھی جائز ہے مگر مباشرت ناجائز۔ چنانچہ ارشاد ہوا لَاتُبَاشِرُوْھُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ یعنی اعتکاف کی حالت میں عورتوں سے مباشرت جائز نہیں یہاں دو کی اجازت دے دی اور ایک سے منع فرما دیا۔ اور لَاتُبَاشِرُوْا فرمایا جو بشرہ سے ماخوذ ہے۔ اس لئے ہاتھ لگانا بھی جائز نہیں کیونکہ دواعی وطی حکم وطی میں ہیں اسی لئے ان سے حرمت مصاہرہ ثابت ہو جاتی ہے اور دیکھئے کیسی خوبصورتی سے اعتدال کیا ہے کہ بالعکس کیوں نہ ہوا۔ یعنی یہ ہوتا کہ مباشرت تو جائز ہوتی اور اکل وشرب ناجائز ہوتا۔ بات ہے کہ ہر ایک میں دو حیثیتیں ہیں۔ حاجت ولذت مگر فرق اتنا ہے کہ عادۃً اکل وشرب میں تو حاجت غالب ہے اور لذت مغلوب اور مباشرت میں لذت غالب ہے اور حاجت مغلوب چنانچہ کھانے پینے میں حاجت کا غالب ہونا ظاہر ہے مگر چونکہ لذت بھی ایک درجہ میں مقصود ہے اس لئے اس میں تکلفات بھی سوجھتے ہیں اور بیوی کے پاس جانا اس میں عادۃً حاجت مغلوب ہے لذت غالب ہے اگرچہ کسی معالجہ کی ضرورت سے حاجت کے پہلو کو غالب کر لینا ضروری ہو جیسا مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے حدیث **ان الذی معھا مثل الذی معھا (لم اجد الحدیث فی "موسوعۃ اطراف الحدیث النبوی شریف")** کی تفسیر میں فرمایا تھا گو اس مضمون کا یہ موقع تو نہ تھا۔ مگر ایک کام کی بات ہے اس لئے بیان کر دیا۔ حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اگر کسی عورت اجنبیہ کی طرف تم کو میلان ہو جاوے تو اپنی بی بی سے فراغت کر لو کیونکہ دونوں کے پاس یکساں چیز ہے پس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مطلب **ان الذی معھا** سے یہ ہے کہ گو عادۃً اس میں لذت کا پہلو غالب ہے مگر تم معالجہ کے لئے اس میں بھی حاجت کے پہلو کو غالب رکھو۔ بہر حال معالجہ کے سوا طبعاً مباشرت میں حاجت مغلوب ہے اور اکل وشرب میں حاجت غالب ہے۔ اب دیکھئے جذبات فطریہ کی شریعت نے کس قدر رعایت کی ہے اگر اکل وشرب دس دن چھڑا دیں تو سخت اذیت ہو اور اس میں کچھ بھی اذیت نہیں زائد سے زائد لذت نہیں اسی واسطے فرمایا لَاتُبَاشِرُوْھُنَّ (عورتوں سے مباشرت نہ کرو ۱۲) اور دوسرے مقام پر كُلُوْا وَاشْرَبُوْا (کھاؤ اور پیو ۱۲) بھی ہے یہاں فرماتے ہیں وَلَاتُبَاشِرُوْھُنَّ - كُلُوْا وَاشْرَبُوْا (یہاں نہیں فرمایا مگر اس سے اوپر اجازت آ چکی ہے پھر یہاں تعرض نہ فرمانا یہ سلوک معرض بیان میں بیان ہے اس کا حاصل یہ ہوا کہ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا - وَلَاتُبَاشِرُوْھُنَّ لہٰذا ان تینوں امر و نہی کے مجمع سے اعتدال ہو گیا سبحان اللہ کتنا صاف مضمون

ہے اور کسی کا کلام اتنا صاف نہیں جتنا خدا اور سول کا کلام صاف ہے۔

مقصود خلوت

ایک توجیہ تو اس اعتدال کی باعتبار تمعات ثلاثہ کے یہ تھی اور ایک توجیہ اس میں اور ہو سکتی ہے وہ یہ کہ خلوت سے مقصود زیادہ کیا ہے۔ مقصود زیادہ تر توجہ الی اللہ (اللہ کی طرف ۱۲) ہے حتیٰ کہ اگر کسی کو خلوت میں بجائے توجہ الی اللہ کے خیالات فاسدہ کا ہجوم ہونے لگے ایسے شخص کے لئے خلوت نہایت مضر ہے اس کو ملنا جلنا ہی اچھا ہے۔

خیالات نادان خلوت نشین　　بہم برزند عاقبت کفر و دین

یعنی جاہل آدمی اگر خلوت میں بیٹھے گا تو عقائد خراب کرے گا اسی واسطے خلوت کے لئے علم کی بھی ضرورت ہے کہیں گاؤں والے یہ نہ سمجھ جائیں کہ بس ہمیں اعتکاف نہ کرنا چاہیے کیونکہ اس میں علم کی ضرورت ہے اور ہمیں علم ہے نہیں۔ بات یہ ہے کہ علم کی ضرورت ہے خواہ وہ تمہارا علم ہو یا کسی دوسرے کا علم ہو۔ جب تم خلوت میں ہو گے تو اس میں تو دوسرے اہل علم یعنی واقفان دین کی صحبت رہے گی ان سے ملتے جلتے رہو گے۔ بس یہ بھی کافی ہے عالم اصطلاحی بننا ضروری نہیں ہے۔ غرض مقصود اس سے توجہ الی اللہ ہے اور اس کو سہل کرنے والی محبت ہے۔

ع　از محبت تلخہا شیریں شود　(محبت سے تلخیاں اور ناگوار باتیں بھی گوارا ہو جاتی ہیں ۱۲) اور محبت مخلوق کی مانع ہوتی ہے۔ محبت مع اللہ و توجہ الی اللہ سے پس وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ کے حکم سے اس محبت کے مادہ سے بچایا ہے کیونکہ جب عورت سے مشغول ہوتا ہے تو طبعی نشاط سے اس کی طرف اس قدر توجہ ہوتی ہے کہ پھر دوسری طرف التفات نہیں رہتا تو اگر اس کی اجازت ہوتی تو ایک زمانہ ایسا ہوتا کہ مخلوق کی طرف سے توجہ قوی ہوتی اور خالق سے غفلت ہوتی تو غیرت حق اسے گوارا نہیں کرتی کہ ہمارا حاضر باش دربار ہو کر کسی اور طرف منہ کرے اس لئے صرف دس دن کے واسطے غیرت حق نے ہمیں روک دیا ہے بخلاف کھانے پینے کے کہ اس میں گو حاجت زیادہ ہے مگر مستی اتنی سوار نہیں ہوتی کہ کچھ یاد رہے بلکہ دوسری طرف بھی توجہ رہنا ممکن ہے۔

ہاتھ میں قوۃ بصر

ہمیں تو خوب یاد ہے کہ اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ہم کھانا کھاتے وقت کتاب دیکھا کرتے تھے۔ نظر کتاب پر رہتی تھی۔ ہاتھ منہ چلتا رہتا تھا کیونکہ ہاتھ میں ایسا ادراک ہے کہ سیدھا منہ تک باوجود دوسری طرف نگاہ ہونے کے جا سکتا ہے۔ لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہاتھ میں صرف قوت

لامسہ ہے باصرہ نہیں ہے میں کہتا ہوں کہ اگر باصرہ نہیں تو ہاتھ ٹھکانے پر کیسے پہنچ جاتا ہے کیا وجہ ہے کہ ناک پر کھجلی ہوتی ہے تو وہیں پہنچتا ہے آنکھ پر نہیں پہنچ جاتا۔ خصوصاً اندھوں کو تو ہاتھ سے نظر آتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ نظر آنے کے لئے شعاعیں ہی نکلتی ہوں کیونکہ جب یہ مسلم ہے کہ مبصرات کا ادراک بلا بصر اور مشمومات کا بلا شم مذوقات کا بلا ذوق مسموعات کا بلا سمع اور ملموسات کا بلا لمس نہیں ہوسکتا تو جب ہاتھ سے مبصرات کا ادراک ہوا لامحالہ ماننا پڑے گا کہ ہاتھ میں بھی قوت باصرہ ہے۔ اگر اس کا نام ابصار نہیں تو اور کیا ہے یا تو کوئی اور چھٹا نام گھڑ دیا مانو کہ یہ ابصار ہے۔ یہاں سے ایک نئی تحقیق کا بھی پتہ چلتا ہے میں نے اخبار میں دیکھا تھا کہ امریکہ میں ایک عورت ہے آنکھوں پر پٹی باندھ کر یا اندھیری رات میں ہاتھ کو خط کے مقابل کر کے خط پڑھ لیتی ہے۔ ہمیں اس کا جواب دینا کچھ بھی مشکل نہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے بھی تمام بدن میں آنکھیں ہیں مگر ایسی ہیں کہ ہمیں نظر نہیں آتا۔ اس نے کسی ترکیب سے ہاتھ کی آنکھوں کو اپنے قابو میں کر لیا یا فطری طور پر اس کی یہ قوت ظاہر ہوگئی ہو بولو اب حکماء اسے کیا کہیں گے اگر ہاتھ میں قوت باصرہ نہیں تو اس طریق سے خط کیونکر پڑھ سکتی ہے اور ہمارے متکلمین پر بھی کوئی اشکال نہیں۔ وہ ان اسباب کو عادی مانتے ہیں اور ان کے نزدیک بجائے آنکھ کے ناک سے دکھائی دینا اور بجائے ناک کے آنکھ سے سونگھائی دینا ممکن ہے واقعی خدا کا قائل ہونے والا ہمیشہ محقق ہوگا۔ جدید تحقیقات والوں نے حکماء کو نیچا دکھا دیا مگر ہماری شریعت کا ایک جزو بھی ایسا نہیں کہ کوئی بھی اس سے کسی واقعی امر کا معارضہ کر سکے اور معارضہ ہو تو کیونکر ہو وہ تو خدا کی بنائی ہوئی ہے کسی محدود العلم انسان کی بنائی ہوئی تھوڑی ہے اور خدا تعالیٰ محیط ہیں تمام واقعیات کو پھر اس کے اخبار میں معارضہ واقعیات کا کیونکر احتمال ہوسکتا ہے۔

اعتکاف میں ترک مباشرۃ کی حکمت

خیر یہ بحث الگ ہے یہاں گفتگو اس میں تھی کہ کھانے کے ساتھ ممکن ہے کہ توجہ الی اللہ باقی رہے مگر مباشرت کے وقت ضعیف ہو جاتی ہے۔ مگر اس میں ضعف توجہ الی اللہ ہونا لوازم عادیہ سے ہے لوازم عقلیہ سے نہیں ہے کہ انبیاء تک اس کو متجاوز سمجھا جاوے اور گو اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ کبھی اس کی اجازت نہ ہوتی مگر مصلحت توالد و تناسل سے اس کی اجازت ہے۔ نیز اہل معرفت کے نزدیک اس میں ایک اور بھی بڑی بات ہے وہ یہ کہ معرفت کی مختلف قسمیں ہیں ایک معرفت وہ ہے جس کے ساتھ کوئی چیز جمع نہ رہے۔ یعنی ایسا استغراق ہو کہ دوسرے کا تصور بھی نہ آوے۔ پس

مباشرت نمونہ ہے اس معرفت استغراقیہ کا اور کاملین کی مباشرت میں یہ حکمت ہے۔

اور ایک حکمت اس میں میرے قلب پر منجانب اللہ وارد ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا ایک کمال یہ ہے کہ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ یعنی جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو کن کہہ دیتے ہیں وہ ہو جاتی ہے اور انسان مظہر ہے کمالات حق کا۔ پس انسان کے اندر بھی اس کا کوئی نمونہ ہونا چاہیے۔ کہ اس کے ارادہ کرنے سے کوئی چیز پیدا ہو جاوے۔ بدون دخل اکتساب واتعاب کے چنانچہ اس کا ظہور اس نکاح ومباشرت سے ہوا کہ صرف ارادہ متوجہ ہوا کہ ہمارے بیٹا ہو بس ہو گیا تو اگر یہ نہ ہوتا تو حق تعالیٰ کی اس صنعت کا انسان میں ظہور نہ ہوتا۔ میرے ایک دوست عارف تھے وہ نکاح نہیں کرتے تھے میں نے انہیں یہ حکمت سمجھائی چنانچہ انہوں نے نکاح کیا ان کے یہاں بیٹا بھی ہوا مگر ہم کہ ہماری ہی بتائی ہوئی یہ تدبیر تھی یوں ہی رہ گئے اور کچھ بھی نہ ہوا۔ (یہ ظرافت تھی ۱۲)

بہر حال ان حکمتوں کی وجہ سے چاہے ادھر متوجہ کیا جاوے مگر واقعی اس سے توجہ الی اللہ ضعیف ضرور ہو جاتی ہے۔ پس یہ وجہ ہے کہ کھانا نہیں چھڑایا۔

اور اس میں اور کھانے میں ایک فرق اور بھی ہے وہ یہ کہ اگر کھاتے چلے جاؤ تو اسی وقت سے بے لطفی شروع ہو جائے گی اور مباشرت میں گو بعد میں خشکی کی بدولت جنون تک نوبت پہنچے مگر جب تک مشغول رہے گا اس وقت لذت منقطع نہیں ہوگی تو کھانے کے اندر تو حاجت سے تجاوز کرنے میں مانع ہے اور اس میں کوئی مانع نہیں اس لئے بھی اس سے نہ روکا اور اس سے روک دیا اور فرما دیا کہ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ. (اور ان بیویوں سے اپنا بدن بھی نہ ملنے دو جس زمانہ میں تم لوگ مسجدوں میں اعتکاف کرنے والے ہو)

سنیت اعتکاف

اور قرآن کے اس جملہ سے اہل فہم نے اس کا درجہ بھی معلوم کر لیا ہوگا کہ سنت ہے اور اس کی سنیت قرآن پر منطبق ہوتی ہے کیونکہ اصل[۱] یہ ہے کہ جو چیزیں فرض وواجب نہیں ان کے صرف آداب ہی قرآن میں مذکور نہیں بلکہ وہاں صرف صیغہ وجوب کا استعمال کیا گیا ہے مثلاً

---

[۱] البتہ جہاں کوئی مستقل دلیل وجوب کی ہو وہاں باوجود اس طرز کے بھی وجوب کے قائل ہوں گے کہ لقولہ تعالیٰ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ (الآیہ) یہاں دلیل مستقل حدیث ہے۔ الحج عرفۃ اور اجماع ۱۲ منہ [۲] حقیقت اس کی یہ ہے کہ غایت جس درجہ میں ضروری ہے حکم اسی درجہ کا ضروری ہے اس سے کم میں نہ وہ ضرورت ہوتی اور نہ اس کے مناسب اعتدال ہوتا ۱۲ منہ

أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى الَّيْلِ (روزوں کو رات تک پورا کرو۱۲) اور یہاں خود وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ أَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ (اپنی بیویوں سے مباشرت مت کرو جس وقت کہ تم مسجدوں میں معتکف ہو۱۲) فرمایا اس میں اعتکاف کے آداب تو بتلائے مگر اس کے فرض وواجب ہونے سے سکوت فرمایا پس یہ اشارہ اس طرف ہوگیا کہ واجب نہیں ورنہ اور مامورات وواجبات کی طرح اس کے لئے بھی وجوب کا صیغہ استعمال فرماتے مگر اس کے آداب واحکام مثل نہی عن المباشرت (مباشرت سے منع کرنا۱۲) کے ذکر فرمانے سے اس کا مہتم بالشان ہونا بھی قرآن ہی میں مذکور ہے۔ ادھر حدیث میں ہے کان خلقه القراٰن (مسند احمد ۶: ۹۱، کنز العمال: ۱۸۳۷۸، تفسیر الطبری ۲۹: ۱۳) (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی قرآن شریف پر عمل کرنا۱۲) پس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ضرور اعتکاف فرمایا ہے اور آپ کا فعل سنیت کو مفید ہوتا ہے اور عدم وجوب سیاق قرآنی سے معلوم ہو چکا ہے۔ پس اعتکاف کا سنت ہونا اس طرح قرآن سے ثابت ہوگیا اس اعتبار سے بھی ایک قسم کا اعتدال ہے کہ نہ فرض وواجب نہ مباح بلکہ سنت ہے۔ گو فرض میں بھی دوسری قسم کا اعتدال ہے مگر وہ اور معنی کو اور یہ اور معنی کو پس اگر اسے فرض کر دیتے تو اس کے مناسب اعتدال کا جو مقتضی ہے یعنی یسر مطلق وہ نہ رہتا۔ اس میں یہ خاص اعتدال رکھا ہے کہ کوئی کرے اور کوئی نہ کرے اور چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ہمیشہ کیا ہے اور نہ کرنے والوں پر ملامت بھی نہیں فرمائی۔

برکت معتکف

اس لئے محققین کا مذہب اس کے متعلق سنت موکدہ علی الکفایہ ہونے کا ہے کہ ایک کر لے سب پر سے بوجھ اتر گیا۔ ایک کر لے اس کی برکت اوروں کو بھی پہنچ جاوے وہ بھی محروم نہ رہیں جیسے بہت کی برکت سے ایک نوازا جاتا ہے۔ ویسے ہی ایک کی برکت سے بہت بھی نوازے جاتے ہیں تو ایک معتکف اور اس کی برکت سب گاؤں کو پہنچ رہی ہے یہ معنی ہیں سنت علی الکفایہ ہونے کے اور اس کے معنی یہ نہ سمجھنا کہ ایک پر سب کا بوجھ لد جاوے گا بلکہ ایک کی برکت سے سب کا بوجھ اتر جائے گا۔ ایک مرتبہ ہمارے قریب کے ایک گاؤں میں ایک شخص اعتکاف میں بیٹھنا چاہتا تھا گاؤں والے یہ سن گئے تھے کہ ایک کے کرنے سے سب پر سے بوجھ اتر جاتا ہے تو اس کے معنی کیا سمجھے اس سے کہتے ہیں "ارے تو کہاں بیٹھے گا سارا بوجھ گاؤں بھر کے گناہوں کا تجھ پر لدے گا" تو اعتکاف سے ایسا نہیں ہوتا۔ بے شک سب کا گٹھڑ گرے گا تو مگر اس کی طرف نہیں گرے گا وہ تو

دوسری طرف گرے گا۔ غرض اعتکاف میں ہر طرح کا اعتدال ہے اور بھی بہت سی حکمتیں ہیں۔

احتیاج معتکف

فی المساجد کی تخصیص سے ایک اور حکمت کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ مساجد کو اعتکاف کے واسطے اس واسطے مقرر کیا کہ فضیلت جماعت بھی منجملہ فضیلتوں کے ہے تا کہ دونوں فضیلتیں جمع ہو جائیں اعتکاف کی بھی اور جماعت کی بھی۔ اگر کوئی کوہ یا صحرا یا مکان کی کوئی کوٹھڑی اس کے واسطے تجویز کرتے تو یہ جماعت کی فضیلت سے محروم رہ جاتا۔ نیز اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف ہے کہ میاں تم خود اس جماعت کی برکت کے محتاج ہو۔ اگر نمازی نہ ہوتے تو تم کو یہ برکت کہاں سے حاصل ہوتی تم جماعت کی برکت سے محروم رہتے پس طاعت میں ساتھ ساتھ عجب کا بھی علاج ہو گیا۔

سبحان اللہ کیا اعتدال ہے حکماء کی تجویز کردہ خلوت میں یہ باتیں کہاں اور جب اپنے کو برکات میں ان کا محتاج سمجھے گا تو اس کو کبر نہ ہوگا اور اس کے لوازم میں سے ہے خلوت میں اس کی وہ نیت نہ ہوگی جو جہلاء کی ہوتی ہے کہ وہ اس لئے خلوت اختیار کرتے ہیں تا کہ وہ لوگوں کے ضرر سے بچیں بلکہ وہ نیت ہوگی جو محققین نے فرمایا ہے کہ خلوت میں یہ نیت رکھے کہ لوگ میرے ضرر سے بچیں۔ غرض اوروں کو حقیر سمجھنے کا جو مرض خلوت سے پیدا ہو سکتا تھا اس کا بھی علاج ہو گیا کہ جن کو یہ حقیر سمجھ کر الگ ہوا تھا وہی اہل برکت ہیں انہیں کی بدولت اسے برکت جماعت حاصل ہوئی۔

نیز اسے اس پر بھی اب ناز نہ ہوگا کہ میرے اعتکاف کی وجہ سے اور لوگوں کو برکت پہنچی کہ سب سبکدوش ہوئے۔ کیونکہ یہ خیال کرلے گا کہ اصل میں ان لوگوں کے آنے کی وجہ سے مجھے جماعت بلکہ اعتکاف کی بھی برکت حاصل ہوئی اور اس جماعت کے موقع ہونے سے مجھ کو اعتکاف کی اجازت ہوئی۔ پس میرا اعتکاف گو سبب ان کی سبکدوشی کا ہوا مگر وہ سبکدوشی تو اس اعتکاف کا صرف اثر ہے اور ان کی جماعت میرے اعتکاف کا سبب ہے اور سبب مؤثر ہوتا ہے تو وہ اگر اثر میں میرے محتاج ہوئے تو میں موثر میں ان کا محتاج ہوا اور اصل احتیاج مؤثر میں ہوتی ہے تو اصل میں میں بھی ان کا محتاج ہوا اور یہ پورا علاج ہے کبر و عجب کا۔ سبحان اللہ کیسی دوا ہے کہ پرہیز بھی ہے اور دوا بھی ہے۔

گدائے افتادہ بر در

اسی طرح عَاكِفُوْنَ (اعتکاف کرنیوالے) بھی دلالت کر رہا ہے ایک حکمت پر اس طرح سے کہ عکفوف کے معنی حبس کے ہیں۔ تو عَاكِفُوْنَ یہ بتلا رہا ہے کہ اس میں حبس نفس مقصود ہے۔ اس

کا صلہ کبھی عن کے ساتھ آ تا ہے اور کبھی فی یا علیٰ کے ساتھ فی اور علیٰ میں تو کوئی فرق نہیں کیونکہ کسی چیز میں روکنا یا کسی چیز پر روکنا دونوں کا حاصل ایک ہی ہے البتہ جب عن کے ساتھ صلہ آ تا ہے تو اس کے معنی مکروہ سے روک دینے کے ہوتے ہیں تو جس سے روکنا تھا اس کا یہاں عاکفون کے صلہ میں ذکر نہیں کیا مگر لَا تُبَاشِرُوْا سے اس کا پتہ لگ گیا یہاں صلہ لائے فی کے ساتھ مطلب یہ کہ نفس کو مقید کر دو مساجد میں جو بیت اللہ ہیں۔

خود خدا نے انہیں بیت اللہ فرمایا ہے فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ (ایسے گھروں میں (وہ جا کر عبادت کرتے ہیں) جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کا ادب کیا جائے ۱۲) چنانچہ خانہ کعبہ کو بھی بیتی (میرا گھر ۱۲) فرمایا۔ اس معنی کو اپنی طرف منسوب کیا کہ اس میں اللہ کا ذکر اور اس کی عبادت ہوتی ہے۔ نماز تو بہت بڑی چیز ہے اس کی جگہ تو کیوں نہ منسوب الی اللہ ہوتی۔ حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے بندے جس جگہ ذکر کریں تدارس قرآن کریں وہ بھی بیوت اللہ میں داخل ہے چنانچہ ارشاد ہے ما اجتمع قوم فی بیت من بیوت الله یتدا رسون القرآن (الحدیث) (الصحیح لمسلم کتاب الذکر والدعاء باب:۱۱، رقم: ۳۸، سنن ابی داوٗد: ۱۴۵۵، سنن ابن ماجه: ۲۲۵) نہیں جمع ہوتی کوئی قوم کسی گھر میں اللہ تعالیٰ کے گھروں سے کہ تدارس کریں قرآن کا ۱۲) اور ظاہر ہے کہ تدارس کے لئے کہیں مسجد کا اہتمام نہیں کیا گیا جیسا نماز کے لئے ہوا ہے اس سے صاف معلوم ہوا کہ مدرسہ بھی بیوت اللہ میں داخل ہے اور اگر اسے عام میں نہ بھی لیا جائے تب بھی مساجد تو ضرور اللہ کے گھر ہی ہیں۔ اب معنی عَاکِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ کے یہ ہوئے کہ عاکفون فی بیوت الله (محبوس ہوتے ہیں وہ اللہ کے گھروں میں ۱۲) اور بیوت اللہ میں محبوس ہونا کس کے واسطے ہے ظاہر ہے کہ اللہ کے لئے ہے۔ پس حقیقت وہ ہوئی جس کو امیر خسرو نے بیان کر دیا ہے ۔

خسرو غریب است و گدا افتادہ در کوئے شما   باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

(خسرو غریب و گدا آپ کے کوچہ میں پڑا ہوا ہے خدا کے لئے غریبوں کی طرف بھی نظر فرمائیے ۱۲)

عنایت بر معتکف

اور جب اعتکاف کی یہ حقیقت ہے اور اس حقیقت کے لوازم سے ہے عنایت تو عاکفون میں یہ بھی بتا دیا کہ جب تم ہمارے دروازہ پر آ پڑو گے تو کیا ہم تم کو محروم کر دیں گے تو ایک حکمت

اس میں یہ بھی ہے اور ایک حکمت عاکفون میں اور بتلادی جو گویا روح الروح ہے۔ روح تو خلوت ہے اور خلوت کی روح ذکر اللہ ہے کیونکہ حقیقت مذکورہ دال ہے ذکر اللہ پر بوجہ اس کے کہ جس کے کوچہ میں سب کو چھوڑ کر جا پڑیں گے۔ کیا اس کو دل سے بھلا سکتے ہیں پس اس کی یاد ضروری ہوئی اور اس کے ساتھ اوروں کا چھوڑنا اور یہی حاصل ہے۔ لاالہ الا اللہ کا تو عاکفون میں گویا یہ بھی بتلا دیا کہ اعتکاف میں نظر اسی پر مقصود رہے کہ لاالہ الا اللہ تو حقیقت میں اعتکاف فنائے محض ہے۔ تو جس نے اس نیت سے اعتکاف کیا تو وہ واقعی معتکف ہے ورنہ جو شخص بلا اس کے رہا اس کا اعتکاف بلا روح ہے پھر یہ رحمت دیکھئے کہ اعتکاف میں حاجتوں کو خدا نے منع نہیں کیا ان کے قضا کرنے کے لئے مساجد سے باہر نکلنے کی اجازت بھی دیدی پھر بھی اگر کسی سے نہ ہو سکے تو اس کا قصور ہے اور اس اجازت کی طرف لاتباشروھن ہے کیونکہ نہی اس شے سے ہوتی ہے جو پہلے متحمل ہو اور یہ ضروریات شرع سے معروف ہے کہ مسجد کے اندر مباشرت ناجائز ہے پس اگر اعتکاف میں خروج کسی طرح جائز نہ ہوتا تو پھر اس نہی کی حاجت نہ تھی۔ اور نہی واقع ہوئی ہے پس یہ خود دال ہے اس پر کہ خروج بعض اوقات میں جائز ہے اور اسی خروج میں احتمال تھا۔ مباشرت کا اس لئے اس سے منع فرمایا اتنا تو قرآن ہی سے معلوم ہو گیا آگے حدیث نے تفصیل کر دی کہ کس کس حاجت کے لئے خروج جائز ہے اور مباشرت کے خروج کا ناجائز ہونا خود قرآن کا مدلول ہے اور دوسری حاجات طبعیہ وشرعیہ کے لئے خروج کا جائز ہونا دوسرے دلائل شرعیہ سے جائز ہے اب رہا دونوں میں فرق سو بات یہ ہے کہ مباشرت میں چونکہ حاجت خفیف ہے اس لئے لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ سے مباشرت کی ممانعت کر دی اور کھانے پینے کی حاجت شدید ہے اس کے کرنے کی بھی اجازت دی مثلاً مسجد کے اندر کھانے کی اجازت ہے اور لانے کی بھی اجازت ہے جبکہ کوئی لانے والا نہ ہو یا اجرت گراں مانگتا ہو یا کسی سے درخواست کرنے میں اس کی زیادہ خوشامد کرنے کی ضرورت واقع ہو خصوص امام صاحب کے قول پر کیونکہ امام صاحبؒ فرماتے ہیں قادر بقدرت غیر قادر نہیں۔ تیمم کے اندر بھی امام صاحب فرماتے ہیں کہ کسی رفیق سے پانی مانگنے کی ضرورت نہیں جب مانگنے میں ذلت ہو گو فتویٰ میں اس کا اعتبار نہیں کیا گیا بلکہ مدار جواز تیمم کا اس پر رکھا گیا ہے کہ غالباً گمان یہ ہو کہ نہ دے گا۔ اسی طرح اگر کسی کے ملنے والے کے پاس ہیں مگر ان پر اس کی اطاعت واجب نہیں اور یہ شخص وضو کرنے پر قادر نہیں تو امام صاحب کے قول پر تیمم کر سکتا ہے کیونکہ اسے قدرت

نہیں کہتے گو فتویٰ یہاں بھی اسی اوپر کی تفصیل سے ہے لیکن امام صاحب کی اصلی رائے وہی ہے ان کی نظر اس پر گئی کہ کسی سے مانگتے اور درخواست کرتے غیرت بھی آتی ہے۔

حقا کہ باعقوبت دوزخ برابر است   رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت

(بخدا ہمسایہ کی سفارش وامداد سے جنت میں جانا عذاب دوزخ کے برابر ہے ۱۲) یوں معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ کے اندر وہ رنگ غالب تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض صحابہ کو تعلیم فرمایا تھا کہ کوڑا بھی گھوڑے پر سے گر جائے تو کسی سے مت مانگو خود اتر کر اٹھاؤ۔ تو اگر کوئی کھانا لانے میں نخرہ کرے یا اجرت زیادہ مانگے تو خود جا کر لے آؤ۔

رعایت معتکف

اور حاجت کی رعایت یہاں تک کی گئی ہے کہ اگر کوئی مثلاً بساطی ہے اور بساط اس کی اتنی ہی ہے کہ اسی پر گزر ہے تو اسے جائز ہے کہ وہ تجارت بھی مسجد میں کر لے مگر اسباب مسجد میں نہ لاوے اور فقہاء متاخرین نے اور بھی وسعت کی ہے کہ بعض چیز دیکھی ہوئی نہیں ہوتی اس لئے اس کے حاضر کرنے کی ضرورت پڑتی ہے تو انہوں نے لکھا ہے کہ اگر چھوٹی سی چیز ہو جس سے نمازیوں کو تکلیف نہ ہو اور مسجد مشغول نہ ہو تو اس کا مسجد میں بھی لانا جائز ہے ہاں صندوق لا لا کر مت رکھ دو بلکہ صندوق کو مارو بندوق البتہ اگر کوئی مختصر سی چیز ہو تو اس کے اندر لے آؤ۔ میرے ایک دوست تھے۔ لکھنؤ میں وہ جواہرات کے سوداگر تھے میں نے ان سے کہا کہ بھئی ہمیں بھی دکھاؤ جواہرات کیسے ہوتے ہیں وہ لائے تو ہزاروں روپے کے جواہرات۔ زمرد' یاقوت' لعل' الماس ان کے پاس تھے۔ اتنی چھوٹی سی ڈبیہ میں رکھے ہوئے تھے کہ ان کی جیب میں وہ ڈبیہ آ جاتی تھی تو اگر کسی کی ایسی ہی تجارت ہو تو اس کو سودا بھی مسجد کے اندر لے آنا جائز ہے۔

آداب مسجد

بعض لوگ تو بڑا ذخیرہ مسجد کے اندر جمع کر لیتے ہیں میں نے ایک شاہ صاحب کو لکھنؤ میں دیکھا کہ مسجد میں چھینکے باندھ رکھے ہیں تمام اپنا ضروری وغیر ضروری اسباب' وہیں رکھا ہے۔ پھر خود تو رہتے ہی تھے ان کی بیوی بھی وہیں رہتی تھی۔ ایک زنانہ قطعہ کا دروازہ مسجد کی طرف لگا ہوا تھا۔ جب تک نمازی رہتے تھے وہ اس کے اندر رہتی تھیں اور جب نمازی چلے جاتے تھے تو شاہ صاحب مسجد کا دروازہ بند کر کے انہیں بھی اپنے پاس بلا لیتے تھے۔ بھائی یہ اللہ کا گھر ہے۔ اللہ

والوں کا گھر نہیں ہے۔ اللہ کی چیزوں کو تم سے کس نے کہا کہ برتنے لگو مگر لوگوں کا وہ مذاق ہو گیا ہے کہ مسجد کی چیزیں برتتے اور لیتے ہوئے ڈر نہیں لگتا۔

ایک حکایت سنی ہے کہ ایک شخص کا کواڑ اتار کر چور لے گئے اس ظالم نے کیا حرکت کی کہ مسجد کا کواڑ اتار لیا۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیا حرکت ہے کہنے لگا انہوں نے ہمارے کواڑ کی کیوں نہ حفاظت کی۔ مگر لوگوں کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتنا ناز نہیں جتنا حق تعالیٰ پر ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ بھی ہماری ناز برداری کرتے ہیں۔ اس لئے جو جی چاہتا ہے کر لیتے ہیں۔ اللہ اکبر کیا رحمت ہے بعض لوگ مسجد کے لوٹے ختم کے روز پانی پڑھوا کر لے جاتے ہیں اب پانی پر اکتفا کرنے لگے ہیں۔ ورنہ پہلے تو اجوائن و سونف کی پڑیوں سے امام کے مصلے کو پنساری کی دوکان بنا دیتے تھے خیر اللہ کا فضل ہے کہ اب معدے لوگوں کے درست ہو گئے ہیں۔ کہ سونف لانا چھوڑ دی مگر اب پانی پڑھواتے ہیں۔ تو یہ آفت کرتے ہیں کہ مسجد کے لوٹے لے جاتے ہیں اگر مؤذن منع کرے تو بے چارہ بدمزاج بداخلاق مشہور ہو پھر اس وقت تو یہ کہہ کر لے جاتے ہیں کہ کیا ہم کھا جائیں گے۔ اس کے بعد پھر وہ گھر ہی میں رہ جاتا ہے۔ بعض کیا کرتے ہیں کہ سفر میں جانے لگے ایک لوٹا مسجد سے اٹھا لیا اور مؤذن کو پیسہ دیا اور چل دیئے۔ مسجد خانہ خدا ہے اس میں ایسا نہیں چاہیے۔ بہرحال مسجد میں اتنا اسباب رکھنا کہ بالکل گھر معلوم ہو نہیں چاہیے۔ بس اتنا مختصر سامان رکھو کہ نمازیوں کو تکلیف نہ ہو۔ مسجد کا ادب اتنا تو کم از کم ضروری ہے جتنا صاحب کلکٹر کے اجلاس کا کرتے ہیں۔ جب صاحب کلکٹر کے اجلاس پر بکھیڑا لے جانے کی اجازت نہیں تو یہاں کیوں نہیں ایسا سمجھا جاتا بلکہ یہاں تو تمہیں ضروری چیزوں کے لانے کی بھی اجازت ہے سونے کی بھی اجازت ہے دنیا کی باتوں کی بھی اجازت ہے بشرطیکہ باتوں کے قصد سے نہ آیا ہو آیا تو ہو نماز کے قصد سے اتفاقاً کوئی معاملہ پیش آ گیا تو اس کے متعلق گفتگو کرنا جائز ہے اسی طرح مسجد میں کھانا بھی جائز ہے مگر جبکہ نماز کے قصد سے گیا ہو۔ اتفاق سے کہیں سے مٹھائی آ گئی تو مسجد میں کھانا جائز ہے۔ کیا ٹھکانا ہے وسعت کا خدا کے معاملات کو دیکھو کس قدر سہل ہیں پھر بھی اگر ان سے کوئی تجاوز کرے تو پھر ایسے اعتکاف سے فائدہ کیا ایک حکمت اعتکاف میں یہ ہے کہ اس میں شب قدر کی تحری (ثواب ڈھونڈنا ۱۲) بھی ہے۔ حدیث میں آتا ہے التمسوافی الوترمن العشر الاواخر (الصحیح للبخاری ۳:۶۰، الصحیح لمسلم کتاب الصیام: ۲۰۹، سنن الترمذی: ۷۹۲ بدون لفظ الوتر) شب قدر کو طاق راتوں میں

تلاش کرو۔ طاق راتیں کون سی ہیں۔ اکیسویں شب، تیئیسویں شب پچیسویں شب، ستائیسویں شب، انتیسویں شب، اکیسویں شب کونسی ہے۔ بیسواں روزہ گزر کے جورات آئے گی وہ ہے اکیسویں شب۔ شریعت میں تاریخ رات سے شروع ہوتی ہے اور رات پہلے ہوتی ہے دن بعد میں ہوتا ہے۔ اس لئے اکیسویں تاریخ سے پہلے جو رات آئے گی وہ اکیسویں شب ہوگی۔ جب چاند دیکھتے ہو تو اول رات مہینے کی وہی ہوتی ہے جس میں چاند دیکھا اس کی صبح اول دن مہینہ کا ہوتا ہے جیسا کہ حکماء کے نزدیک طلوع آفتاب سے تاریخ شروع ہوتی ہے اور ان نئے حکماء کے یہاں نصف شب سے شروع ہوتی ہے بہر حال اکیسویں شب وہ ہے جو بیسواں دن گزر کے آئے اسی طرح اور شبیں بھی۔ یہ پانچ راتیں ہیں جن میں احتمال ہے شب قدر کا سبحان اللہ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ (مسجد میں اعتکاف کرنیوالے) نے اس کی تلاش کے لئے مسجد میں پہنچا دیا۔ بھلا گھر میں اس کی کہاں فرصت؟

معتکف کا سامان

اور اس حکمت سے بھی معلوم ہوا کہ معتکف کو اپنا ضروری سامان مسجد میں رکھنا جائز ہے مگر زیادہ بکھیڑا لانا مناسب نہیں۔ کیونکہ اس سے تو وہ بھی گھر بن جائے گا۔ پھر جس طرح گھر میں عبادت و بیداری دشوار تھی وہی بات مسجد میں ہوگئی۔ سب کا حاصل یہ ہوا کہ مسجد میں تو گھر کے فتنہ سے چھڑا کے لائے تھے وہاں تم نے اتنا بکھیڑا اکٹھا کیا کہ وہ بھی گھر کی طرح ہوگئی۔ مسجد کو اس طرح صاف رکھو جیسا ہماری پھوپھی اس کا وصف بیان کرتی تھیں۔ خدا ان کی مغفرت کرے ان کی عادت تھی کہ گھر کا تمام بکھیڑا پھیلاتی بہت تھیں۔ دیگچی کہیں ہے رکابی کہیں ہے چمچہ کہیں۔ اگر کسی نے اعتراض کیا تو کہتی تھیں یہ گھر ہے مسجد کی طرح صاف صاف نہ ہونا چاہیے۔ تو تم مسجد کو بالکل صاف صاف رکھو۔ سو مسجد میں معتکف کو اتنا بکھیڑا نہ لے جانا چاہیے۔ بعضے آدمی ہوتے بھی ہیں۔ بکھیڑیئے۔ گو گناہ تو نہیں مگر خلاف ادب ہے۔ مسجد میں آئے ہو گھر چھوڑ کے اگر تم نے اسے بھی گھر بنالیا تو مسجد میں آنے کا کیا فائدہ ہوا۔ بعضے بکھیڑیئے کیا کرتے ہیں کہ مسجد میں اعتکاف کے لئے آتے ہیں تو تنہا نہیں آتے۔ ایک پاندان بھی ساتھ ہے اگالدان بھی ہے ایک چاء کا سماوار بھی ہے۔ تمباکو کا تھیلا بھی ہے۔ جو نہیں کھاتے وہ بیچارے بدبو سے پریشان ہوتے ہیں۔ غرض اپنے پیچھے بہت سی علتیں لگا لیتے ہیں اور سب کو گھر کی طرح مسجد میں بھی جمع کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی دلیر ہیں تو وہ حقہ بھی لاتے ہیں خود تو مسجد کے اندر بیٹھے ہیں حقہ باہر رکھا ہے اور گڑ گڑ کر رہے ہیں۔ حقہ کا

قرنطینہ ہے کہ وہ باہر رہے۔ بعضے سگریٹ پیتے ہیں اور دھواں باہر چھوڑتے جاتے ہیں بہرحال اس طرح آتے ہیں کہ خود ہی معتکف نہیں ہوتے ایک آپ کا ساوار پاندان بھی آپ کے پاس معتکف ہوتا ہے۔ حضرت اگر اس کنبہ کو بھی اعتکاف کرانا ہے تو پھر گھر پر ہی اعتکاف کرلیا کیجئے۔ غرض مسجد میں بالکل آزاد ہو کے آنا چاہیے۔ ایک بستر ایک چادر بلکہ آج کل تو گرمی ہے۔ صرف ایک چادر کافی ہے۔ ایک چھوٹا سا تکیہ۔ کھانا پینا۔ بلی سے بچانے کے لئے ایک چھوٹا سا بکس یا ایک چھینکا۔ غرض نہایت مختصر سامان کے ساتھ مسجد میں آنا چاہیے۔ بلکہ اپنے گھر میں بھی نہایت مختصر سامان سے رہنا چاہیے تو مسجد تو پھر خانۂ خدا ہے۔ اس میں زیادہ بکھیڑا لانا مناسب نہیں۔

شب قدر کی تلاش

بہرحال مسجد میں معتکف کو اس لئے لایا گیا کہ شب قدر کی تحری سہل ہو کیونکہ بہت سے آدمی ہونگے جب سب ایک ہی کام میں مشغول ہونگے تو دل بھی لگے گا۔

اور اس میں بھی عجیب حکمت ہے کہ شب قدر کی تاریخ معین نہیں کی کیونکہ مقصود پانچ راتوں میں جگانا تھا۔ پھر سبحان اللہ اس میں یہ کیسا اعتدال ہے کہ متواتر پانچ راتوں میں نہیں جگایا ایک رات جگایا اور ایک رات سلایا۔ اور پھر اس سونے میں بھی ثواب جاگنے کا دیا اور یہ بات میں اپنی طرف سے گھڑ کے نہیں کہتا۔ حدیث سے ثابت ہے۔ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص گھوڑا پالے اللہ کے راستے میں تو اس کی لید اس کا پیشاب سب وزن ہو کر اس کو نیکیاں ملیں گی۔ کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ میزان میں لید رکھ دی جائے گی۔ میزان میں لید کے وزن کی کوئی چیز رکھ دی جائے گی۔ تو جب اس کے گھوڑے کی لید اور پیشاب میں بھی ثواب ہے چونکہ وہ گھوڑا ذریعہ ثواب تھا حالانکہ اس کے قصد سے ہوا تو یہاں یہ سونا جب ذریعہ ہے جاگنے کا اور وہ ذریعہ ہے عبادت کا اور ہوا بھی ہے اسی عبادت کے قصد سے تو اس میں کیوں ثواب نہ ملے گا۔

اہتمام شب قدر

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شب قدر نہایت قابل قدر چیز ہے اس میں جاگنا چاہیے اور خدا کی عبادت کرنی چاہیے اور کوئی ساری رات جاگنا ضروری نہیں جتنا جس سے ہو سکے جاگے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ عادت سے کسی قدر زیادہ جاگے اور اس عبادت شب قدر کی روح مشاہدہ ہے اس میں حق جل وعلیٰ شانہ کی تجلی ہوتی ہے اور گو ہمیں ان تجلیات کا دکھائی دینا ضرور نہیں مگر اس کی پہچان

اس سے ہوتی ہے کہ اس میں اور اور راتوں میں یہ فرق ہے کہ اس رات میں بہ نسبت اور راتوں کے عبادت میں زیادہ جی لگتا ہے قلب کو غفلت نہیں ہوتی اور کیوں ہو وصل کے ساتھ ہجر جمع نہیں ہوتا۔

شب قدر است طے شد نامۂ ہجر

سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (شب قدر میں نامہ ہجر لپیٹ دیا گیا ہے اس میں سراپا سلامتی و برکت ہے طلوع فجر تک ۱۲)

فضیلت شب قدر

اور اس رات کی یہ فضیلت ہے کہ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا میں ملائکہ رحمت کا نزول ہوتا ہے اور اس میں دو احتمال ہیں یعنی یا تو اس میں فضیلت اس وجہ سے آئی ہے کہ اس میں ملائکہ نازل ہوتے ہیں یا ملائکہ اس وجہ سے نازل ہوتے ہیں کہ اس میں پہلے سے فضیلت ہے۔ بہر حال جو بھی ہو۔

بخت اگر مدد کند دامنش آ درم بکف　　　　دربکشد زہے طرب و ربکشم زہے شرف

اس کا دامن ہاتھ آ جائے وہ کھینچ لے تب بھی مقصود حاصل ہم کھینچ لیں تب بھی اسی طرح اس میں بھی بہر حال فضیلت ہے خواہ نزول ملائکہ کا وہ سبب ہو یا اس سے مسبب ہو۔ غرض اس سے کچھ بحث نہیں یہ فضائل اس کے اندر ہیں اسی واسطے حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو اس رات سے محروم رہ گیا وہ بڑی دولت سے محروم رہ گیا۔ یہ دن سال بھر کے بعد آتے ہیں ان کی قدر کرنا چاہیے کیونکہ زندگی کا کیا بھروسہ۔ یوں تو ہر رات میں من وجہ فضیلت ہے یہ اس لئے کہتا ہوں کہ اگر کسی سے فوت ہو جائے تو اور ہی کسی رات میں کچھ کر لے گو وہ ویسی تو نہ ہو گی مگر کام بن جاوے گا۔

اے خواجہ چہ پرسی زشب قدر نشانی　　　　ہر شب شب قدرست اگر قدر بدانی

(شب قدر کی نشانی کو تم کیا دریافت کرتے ہو اگر قدر کرو تو ہر رات شب قدر ہے ۱۲) لیکن اس میں پھر بھی خصوصیت ہی ہے اور اوپر جو ذکر کیا گیا کہ اس میں تجلی حق ہوتی ہے۔ اس میں بھی دو احتمال ہیں یا تو اس شب کی فضیلت کے سبب اس میں تجلی ہوتی ہو اور یا خود تجلی کے سبب اس کی فضیلت ہوتی ہو۔ اور حافظ شیرازی کے قول سے احتمال ثانی اقرب معلوم ہوتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

آن شبقدرے کہ گویند اهل خلوت امشب است

یارب ایں تاثیر دولت ازکدا میں کوکب است

(وہ شب قدر کہ اہل خلوت کہتے ہیں آج کی رات ہے یارب اس میں یہ فضیلت کس کوکب

کی وجہ سے آئی ۱۲) یعنی یہ فضیلت شب قدر میں کس کوکب کی وجہ سے آئی۔ کوکب سے مراد تجلی حضرت حق جل علیٰ شانہٗ ہے معہ ظہور، بہرحال یہ وقت عزیز ہے بڑے فیوض وانوار وبرکات کا ہے اس میں جہاں تک ہو سکے اعتکاف کرو اگر نہ ہو سکے تو ان پانچ راتوں میں جاگ ہی لو۔ اگر تمام راتوں میں نہ ہو سکے تو بعض میں جاگ لو۔ بعض کے بھی بعض حصہ میں جاگ لو تب بھی کافی ہے۔ اعتکاف کا وقت بیسویں تاریخ عصر کے بعد سے ہے۔ بیسویں تاریخ تیس کے چاند کے حساب سے منگل کو ہوگی۔ مگر باہر سے خبریں آرہی ہیں کہ انتیس کا چاند ہوا ہے گو ابھی محقق نہیں ہوا مگر احتیاط اسی میں ہے کہ پیر کی شام سے اعتکاف کر لیں اگر ایک دن زیادہ ہو جائے گا تو کونسا حرج ہو جائے گا۔ آگے حق تعالیٰ فرماتے ہیں تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا یہ اللہ کے حدود ہیں ان سے تجاوز کرنا تو کیسا ان کے پاس بھی مت پھٹکو۔ اور آگے فرماتے ہیں لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (اس امید پر کہ تم متقی بن جاؤ ۱۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقصود تقویٰ ہے سبحان اللہ شروع میں كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے ۱۲) میں بھی لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (اس امید پر کہ تم متقی بن جاؤ) فرمایا ہے۔ اس سے مجاہدہ کی طرف اشارہ تھا۔

اور یہاں ختم پر بھی لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (اس امید پر کہ تم متقی بن جاؤ ۱۲) فرمایا ہے جس سے اشارہ ہو گیا کہ اس کی روح بھی مجاہدہ تھا اور اس کی روح بھی مجاہدہ ہے کیونکہ اعتکاف کی روح خلوت ہے اور وہ مجاہدہ کا ایک جزو ہے۔ اب میں اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ فہم و عقل کی توفیق عطا فرمائیے آمین

تمت روح الجوار

چوتھا وعظ

المسمی بہ

تقلیل الاختلاط مع الانام فی صورۃ الاعتکاف فی خیر مقدم

۲۹ رمضان المبارک ۱۳۴۰ھ مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں نماز جمعہ کے بعد تین گھنٹہ پینتالیس منٹ تک بیان ہوا۔ جو آپ نے کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۲۵۰ تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبہ ماثورہ

الحمد لله نحمده ' و نستعينه' و نستغفره و نؤمن به و نتو كل عليه و نعوذ بالله من شرور انفسنا و من سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له و من يضلله فلا هادى له و نشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريک له' و نشهد ان سيدنا و مولانا محمداً عبده' و رسوله صلى الله عليه وعلىٰ اله واصحابه وبارک وسلم '

امابعد–فاعوذ بالله من الشيطان الرحيم .

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ (عنکبوت:۶۹)

(اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو (قرب وثواب اور جنت) کے راستے ضرور دکھلا دیں گے اور بے شک اللہ تعالیٰ کی (رضا ورغبت) ایسے خلوص کے ساتھ ہے)

تمہید

آج چوتھا جمعہ ہے کہ اسی آیت کے متعلق سلسلہ وار بیان ہو رہا ہے۔ بس آج اس کا بیان ختم کئے دیتا ہوں۔ یہ بات تو پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ اس آیت میں مجاہدہ کا بیان ہے اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ مجاہدہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مجاہدہ حقیقیہ یعنی ارتکاب اعمال واجتناب عن المعاصی۔ دوسرے مجاہدہ حکمیہ یعنی ان مباحات کو ترک کرنا جو معاصی کی طرف مفضی ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ مجاہدہ حکمیہ کے چار ارکان ہیں جن میں سے تین ارکان کا ذکر تو ہو چکا ہے آج چوتھے رکن کا بیان ہوگا۔ یعنی تقلیل اختلاط مع الانام کا

ترک مباح

مجاہدہ حکمیہ کی حقیقت یہ ہے کہ بعض ایسے جائز کاموں سے بچنا جو مفضی ہو جاتے ہیں گناہوں کی طرف اس پر بعض لوگوں کو اشکال ہوتا ہے کہ یہ صوفی جائز کاموں سے بھی منع کرتے ہیں مگر ان کو حقیقت کی خبر نہیں۔ بعض دفعہ طبیب امور مفضیہ سے بھی منع کر دیتا ہے گو فی نفسہ اس مفضی میں ضرر نہ ہو مگر یہ کیا ضرر تھوڑا ہے کہ وہ مضر کی طرف مفضی ہے۔ مثلاً کوئی چیز جیسے مصری تین تولہ کی مقدار میں تو مضر ہے اور ایک تولہ کی مقدار میں مضر نہیں۔ لیکن طبیب کو حق ہے کہ ایک تولہ سے بھی منع کر دے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ایک تولہ کھا کر اس سے صبر نہ ہوگا۔ پھر یہ ڈیڑھ تولہ کھائے گا پھر دو تولہ کھائے گا یہاں تک کہ ایک دن تین تولہ تک نوبت پہنچ جائے گی۔ اور اس وقت ضرر پہنچے گا۔ اس لئے وہ پہلے ہی دن اس سے بالکل منع کر دیتا ہے یا ایک مریض کے متعلق طبیب جانتا ہے کہ اس کو تھوڑی سی مقدار میں گوشت کھانا مضر نہیں اور زیادہ مضر ہے۔ مگر پھر بھی وہ اس سے یہ نہیں کہے گا کہ تم زیادہ گوشت سے پرہیز کیا کرو اور تھوڑا سا کھا لیا کرو۔ بلکہ وہ یہ کہے گا کہ تم گوشت بالکل نہ کھانا۔ بس مونگ کی دال یا ہری ترکاری کھانا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ گوشت سامنے آنے کے بعد تھوڑے اور زیادہ مقدار کا لحاظ کرنا مریض سے دشوار ہے۔ اس لئے وہ قطعاً منع کر دیتا ہے حالانکہ قلیل مقدار مباح تھی۔ مگر خوف افضاء کی وجہ سے اس کو بھی منع کر دیا۔ اسی طرح کلام مباح۔ ونوم مباح واختلاط مباح یہ گو گناہ نہیں مگر چونکہ یہ مباحات اکثر مفضی الی الذنب ہو جاتے ہیں (جس کی تفصیل پہلے وعظ میں گزر چکی ۱۲) اس لئے صوفیہ ان سے بھی منع کرتے ہیں اور مجاہدہ

کے ذریعہ سے ان کی تقلیل کراتے ہیں جیسے بعض مسکرات میں (جیسے افیون) قدر قلیل غیر مسکر گو حرام نہیں مگر چونکہ مقدار قلیل مفضی الی القدر المسکر ہو جاتی ہے۔ اس لئے قلیل سے بھی منع کیا جاتا ہے۔ فقہاء وصوفیہ نے اس قاعدہ کا بہت لحاظ کیا ہے کہ جو مباح ومستحب مفضی الی المعصیت ہو جائے۔ وہ بھی ممنوع ہے۔

بعض لوگ فقہاء پر اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے بعض مباحات کو بھی حرام کر دیا مگر وہ اس راز سے بے خبر ہیں۔ حقیقت میں فقہاء نے مباح کو حرام نہیں کیا بلکہ مقدمۂ حرام کو کہا ہے۔ اور عقلاً یہ قاعدہ مسلم ہے کہ مقدمہ واجب کا واجب اور مقدمہ حرام کا حرام ہے۔ تو وہ مباح جس سے فقہاء منع کرتے ہیں مقدمہ حرام ہونے کی حیثیت سے مباح کی فرد ہی نہیں رہا۔ بلکہ اس حیثیت کے لحاظ سے وہ حرام کی فرد بن گیا۔ اور اختلاف حیثیات سے احکام کا اختلاف ہمیشہ ہوا کرتا ہے۔ بہت چیزیں ایسی ہیں کہ ایک حیثیت سے حسن اور دوسری حیثیت سے قبیح ہیں۔ نماز کے حسن میں کس کو کلام ہوسکتا ہے۔ مگر پاخانہ کا تقاضا ہو تو اس وقت نماز مکروہ ہے۔ اب اگر کوئی اعتراض کرنے لگے کہ صاحب نماز کو قبیح کہہ دیا۔ تو یہ اس کی حماقت ہے نماز تو فی نفسہا حسن ہی ہے مگر اس وقت ایک عارض کی وجہ سے اس میں قبح آ گیا ہے۔ وہ یہ کہ تقاضائے حاجت کے وقت نماز میں اطمینان نہ ہوگا اسی طرح ممکن ہے کہ ایک فعل فی نفسہ مباح ہو مگر دوسری حیثیت سے اس میں قبح آ جائے اور وہ حیثیت افضاء الی المعصیت کی ہے پس اب نہ فقہا پر اعتراض رہا نہ صوفیاء پر۔

منصب اجتہاد

لیکن اس جگہ میں اس پر متنبہ کئے دیتا ہوں کہ کسی مباح کو کسی مصلحت یا مفسدہ کی وجہ سے ناجائز وحرام کہنے میں ہر کس و ناکس کا اجتہاد معتبر نہیں بلکہ اس کو محقق حکیم ہی سمجھ سکتا ہے کہ کون سا مفسدہ قابل اعتبار ہے جس کی وجہ سے فعل مستحب کو ترک کر دینا چاہیے اور کون سا مفسدہ قابل اعتبار نہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ گو یہ قاعدہ شرعی ہے کہ جس مباح ومستحب میں احتمال مفسدہ ہو اس مباح ومستحب کو ترک کر دینا چاہیے۔ مگر اس کا فیصلہ کرنا کہ کون سا مفسدہ قابل اعتبار ہے اور کون سا قابل اعتبار نہیں یہ ہر شخص کا کام نہیں بلکہ اس کا فیصلہ بھی شارع ہی کر سکتا ہے یا وہ شخص جو کلام شارع کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہو۔ چنانچہ شریعت میں اس کی دو نظیریں موجود ہیں کہ دونوں جگہ بعض خاص افعال میں مفسدہ کا احتمال تھا مگر حق تعالیٰ نے ایک جگہ

تو مفسدہ کا اعتبار کیا اور دوسری جگہ اعتبار نہیں کیا۔ ان میں سے ایک تو واقعۂ حطیم ہے کہ قریش نے تنگئ خرچ کی وجہ سے حطیم کو بیت اللہ سے خارج کر دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بیت اللہ میں داخل کرنے کا ارادہ کیا مگر اس خیال سے ملتوی کر دیا کہ اہل مکہ ابھی ابھی اسلام لائے ہیں اگر میں نے کعبہ کو منہدم کیا تو ان کو یہ خیال پیدا ہوگا کہ یہ کیسے نبی ہیں جو کعبہ کو منہدم کر کے اس کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ تو ان کے اسلام میں ضعف پیدا ہوگا حق تعالیٰ نے حضورؐ کے اس خیال کی تقریر فرمائی اور مفسدہ کی وجہ سے ترک مستحب کو گوارا فرمایا۔

دوسرا واقعہ حضرت زینب کے نکاح کا ہے۔ جب حضرت زید بن حارثہ نے ان کو طلاق دے دی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہوا کہ زینب اور ان کے اولیاء کی دلجوئی کی اب صرف یہی ایک صورت ہے کہ میں ان سے نکاح کرلوں۔ مگر آپ اس خیال سے رکتے تھے کہ زید بن حارثہ حضورؐ کے متبنیٰ تھے۔ اور اس وقت متبنیٰ کو مثل اپنی اولاد کے سمجھا جاتا تھا۔ اگر میں نے زینبؓ سے نکاح کیا تو جہلاء مشرکین و منافقین طعن کریں گے کہ بیٹے کی بہو سے نکاح کرلیا اور اس طعن کی وجہ سے بہت لوگ اسلام سے رک جائیں گے۔ اور ممکن ہے کہ بعض ضعفاء اسلام ہی سے مرتد ہو جائیں تو دیکھئے نکاح زینب میں بھی اسی مفسدہ کا احتمال تھا جس کا قصہ حطیم میں احتمال تھا۔ مگر حق تعالیٰ نے

ے قلت و فی قصة زینب هذه اشکال قد یختلج فی بعض الاذهان ارید اذاهته بما افاض الله علینا من برکات الشیخ ادام الله مجده' تقریر الاشکال ان الله تعالیٰ قال فی حقه علیه الصلوة والسلام و تخفی فی نفسک ما الله مبدیه و تخشی الناس والله احق ان تخشاه اثبت فیه خشیة الناس فی حقه صلی الله علیه وسلم ثم قال فی حق غیره من الانبیاء والرسل الذین یبلغون رسالات الله و یخشونه ولا یخشون احداً الاالله' اظهر فیه ان رسل الله کانو الایخشون احداً غیر الله و هذا یقتضی بظاهره فضیلة سائرالانبیاء علیه صلی الله علیه وسلم فی هذا الوصف بعینه و اجاب عنه الشیخ بما نصه ان معنی الآیة انک یا محمد انما تخشی الناس فی هذا الامر لعدم علمک بان هذا النکاح من قبیل تبلیغ الرسالة عملاً ولو علمت ذلک لم تخش احداً فان الله احق ان تخشاه فی ترک التبلیغ ولوعلمت کونه من التبلیغ لفعلت کما کان الرسل تفعله من انهم کانو ایبلغون رسالات الله یخشونه ولا یخشون احداً الاالله ' فاندفع الاشکال راساواساسا کان صلی الله علیه وسلم کسائر الانبیاء بعد علمه بکون هذا النکاح من تبلیغ رسالات الله عملاً فبادر الی النکاح و لم یخش احداً الا الله وانما خشی عن الناس و طعنهم فی الدین مالم یعلم کونه من تبلیغ الرسالات و امابعد ذلک فلا یخشی فلم یثبت من الآیة خشیة صلی الله علیه وسلم عن الناس فی تبلیغ الاحکام حتی یلزم فضیلة سائر الانبیاء علیه بل غایة ماثبت انه کان یخشی الناس قبل علمه یکون ذلک من جملة التبلیغ و بعد علمه به کان کسائر الرسل ۱۲ جامع

بہاں مفسدہ کی پرواہ نہیں کی اور حضورؐ کو حکم دیا کہ آپ زینب سے نکاح کر لیں اور طعن منافقین کی پروانہ کریں۔ بلکہ خود ہی نکاح بھی کر دیا اور آیت میں زوجنکھا نازل ہوا کہ ہم نے آپ کا نکاح زینب سے کر دیا ان دونوں واقعوں سے معلوم ہو گیا کہ ہر مفسدہ قابل اعتبار نہیں اور ہر مصلحت قابل تحصیل نہیں۔ پس کسی مصلحت کے فوت ہونے یا کسی مفسدہ کے پیدا ہونے کے احتمال سے مباح و مستحب کو ناجائز کہنے کا ہر کسی کو حق نہیں بلکہ یہ منصب خاص حضرات مجتہدین کا ہے۔ اس میں ہر شخص کا اجتہاد معتبر نہیں کیونکہ اجتہاد کے بعض اسباب مکتسب ہیں۔ اور بعض اسباب موہوب ہیں ذوق صحیح اور فہم سلیم کسی کی سعی سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ بس جن کو خدا نے یہ دولت عطا کر دی ہے وہی دین میں اجتہاد کا حق رکھتے ہیں۔

غیر فطری مساوات

ہر شخص دین میں مجتہد نہیں ہوسکتا۔ جیسے قوانین سلطنت میں ہر کسی کی رائے نہیں لی جاتی نہ ہر شخص کو رائے دینے کا حق ہے۔ اور جیسے طبیب کے سوا دوسرے کی رائے علاج و پرہیز میں معتبر نہیں نظام عالم اسی طرح قائم رہ سکتا ہے کہ ہر شخص کی رائے کا اعتبار نہ کیا جائے۔ اگر ہر اک کی رائے معتبر ہو تو تابعیت و متبوعیت زائل ہو جائے گی۔ سب مساوات کا دعویٰ کریں گے حالانکہ نظام عالم اس پر قائم ہے کہ بعض تابع ہوں اور بعض متبوع ہوں۔ آپ اپنے گھر میں افسر ہیں۔ یہ افسریت اسی وقت تک باقی ہے جب تک بیوی اور نوکر چاکر حشم خدم آپ کی رائے اور حکم کا اتباع کریں اور اگر آپ کی اولاد اور حشم خدم یا بیوی جو بعض وجوہ سے ہمسر بھی ہے آپ کی رائے میں مزاحمت کرنے لگے تو آپ کو ہرگز گوارا نہ ہوگا اور اگر آپ اس کو گوارا کر لیں تو پھر نہ وہ تابع رہیں گے نہ آپ متبوع۔ پھر گھر میں روز جوتی پیزار ہوا کرے گی۔ آپ کی کچھ رائے ہوگی اور اولاد کی کچھ رائے ہو گی۔ نوکر کچھ چاہے گا بیوی کچھ چاہے گی۔ اور سب کی رائے معتبر ہے تو بتلایئے گھر کا انتظام کیونکر ہو گا۔ آخر کس کی رائے کے موافق عمل ہوگا۔ اگر سب کی رائے پر عمل ہوا تو ذرا کر کے دیکھ لیجئے کہ اس طرح کتنے دن نباہ ہوسکتا ہے۔ اور یہ تو احتمال عقلی پر گفتگو ہو رہی ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ جس دن نوکر یا اولاد وغیرہ آپ کی رائے میں مزاحمت کریں گے اسی دن آپ کان پکڑ کر گھر سے نکال دیں گے۔ آخر یہ کیوں محض اس لئے کہ نظام عالم تابعیت و متبوعیت کو چاہتا ہے۔ اسی لئے متبوع کو تابع کی مساوات گوارا نہیں۔ اسی وجہ سے سلطنت کی ضرورت ہے تا کہ ایک تابع ہو ایک متبوع ہو سب کے

سب آزاد نہ ہوں۔ بلکہ متبوع کے سامنے تابع کی آزادی سلب ہو جائے یہ حقیقت ہے سلطنت کی اگر سلطنت نہ ہو تو ہر شخص آزاد ہوگا اور آزادی مطلق انتظام کے لئے ہرگز کافی نہیں اور نہ کسی نے آج تک اس کو گوارا کیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سلطنت کوئی چیز نہیں چنانچہ آج کل ایک فرقہ نکلا ہے جو سلطنت کا مخالف ہے مگر میں نہیں سمجھتا کہ بدون سلطنت کے انتظام اور نزاعات کا فیصلہ کیونکر ہوگا اگر کہو کہ کثرت رائے سے فیصلہ ہوگا تو میں کہتا ہوں کہ جن کثیرین کی رائے پر فیصلہ ہوگا وہی سلطنت کے مصداق ہو گئے کیونکہ ان کے سامنے دوسروں کی آزادی سلب ہو گئی اور یہی حقیقت ہے سلطنت کی کہ بعض کی آزادی بعض کی رائے کے سامنے سلب ہو جائے کثرت رائے پر فیصلہ ہونے کے بعد بھی آزادی مطلق کہاں رہی۔ اس فیصلہ کی پابندی سے بھی تو آزادی سلب ہوگی تو یہ لوگ جس چیز کو مٹاتے ہیں اخیر میں اس کو ثابت کرتے ہیں خدا تعالیٰ نے بھی آزادی مطلق کو گوارا نہیں کیا۔ بلکہ ایک کو تابع ایک کو متبوع بنایا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اپنے احکام نبی کے واسطہ سے بھیجے ہیں اور تمام مخلوق پر نبی کا اتباع فرض کیا ہے تاکہ مخلوق کو کسی ایک کا تابع کیا جائے ورنہ بہت سہل تھا کہ انبیاء کو نہ بھیجتے بلکہ آسمان سے چھپے ہوئے کاغذ ہر ایک کے پاس آ گرا کرتے اور ہر شخص اس کو پڑھ کر کام کرتا۔ نہ نبی کا اتباع ضروری ہوتا نہ خلیفہ کا نہ علماء و مجتہدین کا۔

شخصی حکومت

شاید کوئی کہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں پریس کہاں۔ میں کہتا ہوں کہ جب تم نے پریس ایجاد کر لئے ہیں تو خدا تعالیٰ کو پریس بنالینا کیا مشکل ہے بلکہ تم جو کچھ ایجاد کرتے ہو یہ عقل سے ایجاد کرتے ہو اور عقل خدا کی دی ہوئی ہے۔ تو یہ ایجاد بھی حقیقت میں خدا تعالیٰ کی ایجاد ہے تمہارا تو محض نام ہی نام ہے۔ اس لئے یہ شبہ محض لغو ہے دوسرے میں دعویٰ کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ کے یہاں اس وقت بھی پریس موجود ہیں کیونکہ کاتبین اعمال کا لکھا ہوا قیامت تک نہ مٹے گا۔ ایسی سیاہی اور ایسا کاغذ تو کسی پریس کو بھی نصیب نہیں جو قیامت تک باقی رہے تو پھر جو کاتبین اعمال آپ کے کاموں کو ایسی سیاہی سے روزانہ لکھتے ہیں وہی اگر احکام کو لکھ کر ہر شخص کے پاس ڈال دیا کریں تو کیا مشکل ہے مگر حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا بلکہ احکام کو نبی پر نازل کیا۔ اور مخلوق کو نبی کا تابع کیا تاکہ آزادی سلب ہو جائے جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں اور حریت و مساوات کے مدعی ہیں وہ بھی آزادی کا عام ہونا گوارا نہیں کرتے۔ کیونکہ جمہوری سلطنت کے بعد بھی وہ کوئی

قانون ہوگا جس کی پابندی عام رعایا پر لازم ہوگی تو اس قانون کے سامنے سب کی آزادی سلب ہو جائے گی۔ ہم تو آزادی کا دعویٰ جب جانیں کہ کسی شخص کو بھی قانون کا پابند نہ کیا جائے بلکہ جس کے جو جی میں آئے کرنے دیا جائے کسی سے کچھ مزاحمت نہ کی جائے کیونکہ تم آزادی کے حامی ہو تو آزادی تو اسی کا نام ہے کہ کوئی کسی بات کا پابند نہ ہو۔ پھر تم لوگوں کو قانون کا پابند کیوں بناتے ہو اور ان کی آزادی کو قانون کا تابع کیوں بنایا کرتے ہو۔ یا کم از کم یہی کرو کہ قانون بنانے میں ساری رعایا کی رائے لے لیا کرو قانون سازی کے لئے پارلیمنٹ کی مختصر جماعت کو کیوں خاص کر رکھا ہے اور تمام رعایا کو چند آدمیوں کی رائے کا تابع کیوں بنا رکھا ہے حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں وہ بھی شخصیت ہی کے حامی ہیں مگر ہر شخص کبھی حقیقی ہوتا ہے کبھی حکمی۔ فلسفہ کا مسئلہ ہے کہ مجموعہ بھی شخص واحد ہے مگر وہ واحد حکمی ہے حقیقی نہیں تو یہ لوگ جس پارلیمنٹ کے فیصلوں کا اتباع کرتے ہیں اس میں گو بظاہر بہت سے آدمی معلوم ہوتے ہیں مگر مجموعہ مل کر پھر شخص واحد ہے کیونکہ جو قانون پاس ہوتا ہے وہ سب کی رائے سے مل کر پاس ہوتا ہے پارلیمنٹ میں بھی ہر شخص آزاد نہیں کہ جو شخص جو رائے دیدے وہی قانون ہو جایا کرے اگر ایسا بھی ہوتا جب بھی کسی قدر آزادی کا دعویٰ صحیح ہوتا مگر وہاں تو پارلیمنٹ کے بھی ہر شخص کی انفرادی رائے معتبر نہیں بلکہ اجتماعی رائے معتبر ہے اور اجتماعی رائے پھر شخصی رائے ہے کیونکہ مجموعہ مل کر واحد حکمی ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ہم شخص واحد حقیقی کے حامی ہیں اور تم شخص واحد حکمی کے حامی ہو جمہوریت کے حامی ہو تو تم بھی نہ رہے۔ جمہوریت اور آزادی کامل تو جب ہوتی جب ہر شخص اپنے فعل میں آزاد ہوتا کوئی کسی کا تابع نہ ہوتا نہ ایک بادشاہ کا نہ پارلیمنٹ کے دس ممبروں کا اور یہ کیا آزادی ہے کہ تم نے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو پارلیمنٹ کے دس ممبروں کی رائے کا تابع بنا دیا۔ ہم تو ایک ہی کا غلام بناتے تھے تم نے دس کا غلام بنا دیا اب تمہیں فیصلہ کر لو کہ ایک کا غلام ہونا اچھا ہے یا دس بیس کا غلام ہونا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص پر ایک کی حکومت ہو وہ اس سے بہتر ہے جس پر دس بیس کی حکومت ہو۔ یہ حاصل ہے جمہوری سلطنت کا کہ رعایا کی غلامی سے تو اس کو بھی انکار نہیں مگر وہ یہ کہتی ہے کہ تم دس بیس کی غلامی کرو۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ صرف ایک کی غلامی کرو۔

نظام تابعیت و متبوعیت

شریعت میں یہ خاص بات ہے کہ اس کے دعاوی کہیں نہیں ٹوٹتے۔ شریعت نے آزادی کا

ایسے زور سے دعویٰ ہی نہیں کیا جو اسپر نقض وارد ہو اور جو لوگ آزادی کا دم بھرتے ہیں کسی وقت ان کو اپنے دعویٰ سے ہٹنا پڑتا ہے۔ آخر کیوں ہٹتے ہو اگر کوئی شخص پارلیمنٹ کے فیصلہ کو نہ مانے تو اس کو مجبور کیوں کرتے ہو اسے پارلیمنٹ کا غلام کیوں بناتے ہو آزاد کیوں نہیں رہنے دیتے۔ مگر کیونکر آزاد رہنے دیں۔ نظام عالم بدون اس کے قائم نہیں ہو سکتا۔ کہ مخلوق میں بعض تابع ہوں۔ بعض متبوع ہوں۔ آزادی مطلق سے فساد برپا ہوتے ہیں اس لئے یہاں آکران کو اپنے دعویٰ آزادی سے ہٹنا پڑتا ہے۔ اور شریعت کو کبھی اپنے دعویٰ سے ہٹنا نہیں پڑتا۔ کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے تابعیت و متبوعیت کی حامی ہے وہ تو آزادی کا سبق سکھاتی ہی نہیں۔ اول ہی دن سے نبی کے اتباع کا حکم دیتی ہے جس سے تمام مخلوق کو ایک کا تابع کر دیا بلکہ اگر کسی وقت خدا تعالیٰ نے ایک زمانہ میں دو نبی بھی ایک قوم کی طرف ارسال کئے ہیں تو ان میں بھی ایک تابع تھے دوسرے متبوع تھے چنانچہ حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام ایک زمانہ میں دو نبی تھے۔ جو بنی اسرائیل و قوم قبط کی طرف مبعوث ہوئے تھے مگر ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام متبوع تھے حضرت ہارون علیہ السلام تابع تھے۔ دونوں برابر درجہ میں نہ تھے۔ اور یہ تابعیت محض ضابطہ کی تابعیت نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام پر پوری حکومت رکھتے تھے۔ وہ ان کی مخالفت نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ایک واقعہ ایسا پیدا کر دیا جس سے اس حقیقت کا ظہور ہو گیا جب موسیٰ علیہ السلام توراۃ لینے کے لئے کوہ طور پر تشریف لے گئے تو ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنا کر چھوڑ گئے تھے کہ میرے پیچھے بنی اسرائیل کا خیال رکھنا اور ان کی اصلاح کرتے رہنا۔ یہاں پیچھے یہ قصہ ہوا کہ سامری نے ایک سونے کا بچھڑا بنایا اور اس میں قدم جبرئیل کی مٹی ڈال دی جس سے اس میں حیات پیدا ہو گئی۔ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ جاہل لوگ کہنے لگے کہ ہمارا اور موسیٰ علیہ السلام کا خدا تو یہ ہے۔ وہ بھول کر نہ معلوم کہاں چلے گئے۔ بس بیوقوف لگے اس کی عبادت کرنے۔ موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے اس واقعہ کی اطلاع دی۔ وہ غصے میں بھرے ہوئے تشریف لائے۔ اور قوم کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا۔ اس وقت انہوں نے ہارون علیہ السلام سے فرمایا کہ جب یہ کمبخت گمراہ ہو گئے تھے تو تم یہاں کیوں رہے میرے پاس باقیماندہ جماعت کو لے کر کیوں نہ چلے آئے اور غصہ میں ان کا سر اور داڑھی پکڑ کر کھینچنے لگے۔ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ہارون علیہ السلام نے کہا اے بھائی میری داڑھی اور سر کو نہ پکڑو۔ میری بات

سنو۔ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ اگر میں ان کو چھوڑ کر چل دوں گا تو آپ یہ نہ کہیں کہ تو نے وہاں رہ کر ان کو سمجھایا کیوں نہیں۔ ان کی اصلاح کیوں نہ کی۔ اس لئے میں یہیں رہ کر ان کو سمجھایا کیوں نہیں ان کی اصلاح کیوں نہ کی اس لئے میں یہیں رہ کر ان کو سمجھا تا رہا۔ حالانکہ ہارون علیہ السلام عمر میں موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے مگر نبوت میں ان کے تابع تھے۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے بے تکلف اپنی متبوعیت اوران کی تابعیت کے مقتضاء پر عمل کیا۔ اوروہ برتاؤ کیا جو حاکم محکوم کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ آج ایک سب انسپکٹر باوجود یہ کہ انسپکٹر کا تابع اور ماتحت ہوتا ہے مگر انسپکٹر اپنے ماتحت کے ساتھ ایسا کر کے تو دیکھیں معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کی تابعیت محض ضابطہ کی نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی جس کا اس واقعہ سے ظہور ہو گیا اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ان دونوں رسولوں میں ایک تابع ہیں ایک متبوع ہیں۔ دونوں یکساں مرتبہ میں نہیں ہیں۔ اس واقعہ سے بعض لوگوں کو تعجب ہوتا ہوگا کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس فعل میں کیا حکمت تھی۔ لیجئے ایک حکمت تو میرے قلب پر اسی وقت آ گئی کہ حق تعالیٰ کو ان کی متبوعیت و تابعیت کا ظاہر کرنا تھا اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو غصہ سے ایسا بے تاب کر دیا کہ جس سے انہوں نے اپنی حکومت و متبوعیت کے مقتضا پر بے تکلف عمل کیا۔ اور نہ معلوم کتنی حکمتیں ہوں گی۔

اسلام کا نظام حکومت

غرض اسلام میں جمہوری سلطنت کوئی چیز نہیں۔ اسلام میں محض شخصی حکومت کی تعلیم ہے اور جن مفاسد کی وجہ سے جمہوری سلطنت قائم کی گئی ہے وہ سلطنت شخصی میں تو محتمل ہی ہیں اور جمہوری متیقن ہیں۔ شخصی سلطنت میں یہ خرابی بیان کی جاتی ہے کہ اس میں ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے حالانکہ ممکن ہے کسی وقت اس کی رائے غلط ہو اس لئے ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام نہ چھوڑ نا چاہیے۔ بلکہ ایک جماعت کی رائے سے کام ہونا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ جس طرح شخصی سلطنت کے بادشاہ کی رائے میں کبھی غلطی کا احتمال ہے اسی طرح جماعت کی رائے میں بھی غلطی کا احتمال ہے کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ ایک شخص کی رائے ہمیشہ غلط ہوا کرے اور دس کی رائے ہمیشہ صحیح ہوا کرے بلکہ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں ہزاروں آدمیوں کا ذہن نہیں پہنچتا۔ ایجادات عالم میں رات دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کیونکہ جتنی ایجادات ہیں وہ اکثر ایک ایک شخص کی عقل کا نتیجہ ہیں۔ کسی

نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ سمجھا۔ ایک نے تار برقی کو ایجاد کیا ایک نے ریل کو ایجاد کیا تو موجد اکثر ایک شخص ہوتا ہے اور اس کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں صدہا ہزار ہا مخلوق کا ذہن نہیں پہنچتا علوم میں بھی یہ امر مشاہد ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کسی مضمون کو اس طرح صحیح حل کرتا ہے کہ تمام شراح ومحشین کی تقریریں اس کے سامنے غلط ہو جاتی ہیں تو جماعت کی رائے کا غلط ہونا بھی محتمل ہے اب بتلایئے اگر کسی وقت بادشاہ کی رائے صحیح ہوئی اور پارلیمنٹ کی رائے غلط ہوئی تو عمل کس پر ہوگا۔

جمہوری سلطنت میں کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے تو بادشاہ اپنی رائے پر عمل نہیں کر سکتا۔ بلکہ کثرت رائے سے مغلوب ہو کر غلط رائے کی موافقت پر مجبور ہوتا ہے اور شخصی سلطنت میں بادشاہ اپنی رائے پر ہر وقت عمل کر سکتا ہے وہ کسی سے مغلوب نہیں ہوتا اگر وزراء کی رائے صحیح معلوم ہوئی اس پر عمل کر لیتا ہے اگر وزراء کی رائے غلط معلوم ہوئی تو وہ اپنی صحیح رائے پر عمل کر سکتا ہے۔ اور جمہوری میں اگر کثرت رائے غلطی پر ہوئی تو صحیح رائے پر عمل کرنے کی کوئی بھی صورت نہیں سب مجبور ہیں غلط رائے کی موافقت پر۔

کثرۃ رائے کی حیثیت

اور یہ کتنا بڑا ظلم ہے اس لئے یہ قاعدہ ہی غلط ہے کہ کثرت رائے پر فیصلہ کیا جائے۔ بلکہ قاعدہ یہ ہونا چاہیے کہ صحیح رائے پر عمل کیا جائے خواہ وہ ایک ہی شخص کی رائے ہو۔ مولانا محمد حسین صاحب آلہ آبادی نے سید احمد خاں سے کہا تھا کہ آپ لوگ جو کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ حماقت کی رائے پر فیصلہ کرتے ہیں کیونکہ قانون فطرت یہ ہے کہ دنیا میں عقلاء کم ہیں اور بیوقوف زیادہ تو اس قاعدہ کی بناء پر کثرت رائے کا فیصلہ بیوقوفی کا فیصلہ ہوگا۔ سید احمد خاں نے جواب دیا کہ دنیا میں جو عقلاء کی قلت اور بیوقوفوں کی کثرت ہے یہ اس صورت میں ہے جبکہ بہت سے آدمیوں کو کیفما اتفق جمع کر لیا جائے تو ان میں واقعی بیوقوف زیادہ ہوں گے۔ لیکن ہم جن لوگوں کی کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں وہ کیفما اتفق جمع نہیں کئے جاتے بلکہ انتخاب کر کے خاص خاص آدمیوں کی کمیٹی بنائی جاتی ہے جس میں سب عقلاء ہی ہوتے ہیں۔ تو ان میں جس طرف کثرت ہوگی وہ بیوقوفوں کی کثرت نہ ہوگی۔ بلکہ عقلاء کی کثرت ہوگی۔ مولانا نے جواب دیا کہ بہت اچھا۔ لیکن عقلاء میں بھی قانون فطرت یہ ہے کہ کامل العقل تھوڑے ہیں اور ناقص العقل زیادہ۔ چنانچہ تجربہ کر لیا جائے کہ ہزار عاقلوں میں کامل العقل ایک ہی یا دو ہوتے

ہیں۔ تو عقلاء میں بھی کثرت ان ہی لوگوں کی ہے جو ناقص العقل ہیں پس کثرت رائے پر فیصلہ اگر حماقت کا فیصلہ نہیں تو کم عقلی کا فیصلہ تو ضرور ہی ہوگا۔ سید احمد خان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا بالکل ہی خاموش ہو گئے۔ غرض صحیح رائے پر عمل کرنا بدون شخصی حکومت کے ممکن نہیں جمہوری میں تو کثرت رائے کا اتباع لازم ہے خواہ وہ غلط ہو یا صحیح بلکہ مولانا محمد حسین صاحب کے قول کے موافق کثرت رائے اکثر غلط ہی ہوگی۔ تو گویا جمہوری میں اکثر غلط رائے پر عمل ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک صحیح رائے پر عمل نہ ہوگا اس وقت تک انتظام درست نہیں ہوسکتا پس ثابت ہو گیا کہ انتظام بدون شخصی حکومت کے نہیں ہوسکتا۔ دوسرے جو لوگ کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھتے ہیں اور بادشاہ کو تنہا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں دیتے وہ پہلے ہی سے اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا بادشاہ ایسا ضعیف الرائے ہے کہ اس کی تنہا رائے قابل اعتبار نہیں۔ اور وہ نااہل ہے۔ تو واقعی جو لوگ اپنے بادشاہ کو ایسا سمجھتے ہوں ہم ان سے گفتگو نہیں کرتے۔ ان کو جمہوریت مبارک ہو ایسا نااہل بادشاہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کو شخصی سلطنت کا بادشاہ بنایا جائے۔

اھل حل وعقد کی ذمہ داری

اسلام میں جو شخصی سلطنت کی تعلیم ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ اہل حل وعقد اور جماعت عقلاء بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو اتنا صائب الرائے ہو کہ اگر کبھی اس کی رائے سارے عالم کے بھی خلاف ہو تو یہ احتمال ہو سکے کہ شاید اسی کی رائے صحیح ہو اور جس کی رائے میں اتنی رزانت نہ ہو اس کو ہرگز بادشاہ نہ بناؤ۔ اب بتلاؤ کہ جس کی رائے اتنی رزین ہو کہ سارے عالم کے مقابلہ میں بھی اس کی رائے کے صائب ہونے کا احتمال ہو۔ وہ حکومت شخصی کے قابل ہے یا نہیں۔ یقیناً قابل ہے بشرطیکہ اہل حل وعقد انتخاب میں خیانت نہ کریں۔ پس ہم شخصی سلطنت کے اس لئے حامی ہیں کہ ہم بادشاہ کو رزین العقل صائب الرائے سمجھتے ہیں۔ اور تم کثرت رائے کے اس لئے حامی ہو کہ تم اپنے بادشاہ کو ضعیف الرائے اور نااہل سمجھتے ہو تو ایسے شخص کو بادشاہ بنانے ہی کی کیا ضرورت ہے جس کے لئے ضم ضمیمہ کی ضرورت ہو بلکہ پہلے ہی سے بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو ضم ضمیمہ کا محتاج نہ ہو۔ مستقل الرائے ہو اور اگر تم بھی اپنے بادشاہ کو مستقل الرائے صائب العقل رزین سمجھتے ہو تو پھر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھنا اور کامل العقل کو ناقصین کی رائے کا تابع بنانا ظلم ہے جس کا حماقت ہونا بدیہی ہے۔

اسلام اور جمہوریت

بعض لوگوں کو یہ حماقت سوجھی ہے کہ وہ جمہوری سلطنت کو اسلام میں ٹھونسنا چاہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہی کی تعلیم ہے اور استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ مگر یہ بالکل غلط ہے ان لوگوں نے مشورہ کے دفعات ہی کو دفع کر دیا اور اسلام میں مشورہ کا جو درجہ ہے اس کو بالکل نہیں سمجھا۔ اسلام میں مشورہ کا درجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ اے بریرہ تم اپنے شوہر سے رجوع کرلو۔ قصہ یہ ہوا تھا کہ حضرت بریرہ پہلے باندی تھیں۔ اور اسی حالت میں ان کا نکاح ایک شخص سے جن کا نام مغیث تھا۔ ان کے آقا نے کر دیا تھا۔ جب وہ آزاد ہوئیں تو قانون اسلام کے مطابق ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ جو نکاح حالت غلامی میں ہوا تھا اگر چاہیں اس کو باقی رکھیں اگر چاہیں فسخ کر دیں۔ اصطلاح شریعت میں اس کو خیار عتق کہتے ہیں۔ اس اختیار کی بناء پر حضرت بریرہ نے نکاح سابق کو فسخ کر دیا۔ لیکن ان کے شوہر کو ان سے بہت محبت تھی وہ صدمۂ فراق میں مدینہ کے گلی کوچوں میں روتے پھرا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر رحم آیا۔ اور حضرت بریرہ سے آپؐ نے فرمایا کہ اے بریرہ کیا اچھا ہوا اگر تم اپنے شوہر سے رجوع کرلو۔ تو وہ دریافت فرماتی ہیں کہ یارسول اللہؐ یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ کی ایک فرد ہے اگر حکم ہے تو بسر و چشم منظور ہے گو مجھ کو تکلیف ہی ہو آپ نے فرمایا حکم نہیں صرف مشورہ ہے تو حضرت بریرہ نے صاف عرض کر دیا کہ اگر مشورہ ہے تو میں اس مشورہ کو قبول نہیں کرتی۔ لیجئے اسلام میں یہ درجہ ہے مشورہ کا کہ اگر نبی اور خلیفہ تو بدرجۂ اولیٰ رعایا کے کسی آدمی کو کوئی مشورہ دیں تو اس کو حق ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کرے اور یہ محض ضابطہ کا حق نہیں۔ بلکہ واقعی حق ہے۔ چنانچہ جب حضرت بریرہ نے حضورؐ کے مشورہ پر عمل نہ کیا تو حضورؐ ان سے ذرا بھی ناراض نہیں ہوئے نہ حضرت بریرہ کو کچھ گناہ ہوا۔ نہ ان پر کچھ عتاب ہوا تو جب امت اور رعایا اپنے نبی یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے اسلام میں مجبور نہیں تو نبی یا خلیفہ رعایا کے مشورہ سے کیونکر مجبور ہو جائے گا کہ رعایا جو مشورہ دے اسی کے موافق عمل کرے۔ اس کے خلاف کبھی نہ کرے۔ پس شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ کرلیا کریں یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کیا کریں اور اگر کثرت رائے بادشاہ کے خلاف ہو جائے تو وہ کثیرین کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہے اور

جب تک یہ بات ثابت نہ ہو اس وقت تک شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ سے جمہوریت ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی جب اسلام میں ایک معمولی آدمی بھی بادشاہ کے مشورہ پر مجبور نہیں ہوتا تو تم بادشاہ کو رعایا کے مشورہ پر کیونکر مجبور کرتے ہو۔ آخر اس کی کوئی دلیل بھی ہے یا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے اور ہمارے پاس حدیث بریرہ سے دلیل موجود ہے کہ کسی کے مشورہ پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ خواہ نبی ہی کا مشورہ کیوں نہ ہو۔ اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اگر حکام رعایا سے مشورہ لیں تو وہ ان کے مشورہ پر عمل کرنے کیلئے مجبور ہرگز نہیں ہیں۔ بلکہ عمل خود اپنی رائے پر کریں۔ خواہ وہ دنیا بھر کے مشورہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس آیت میں آگے ارشاد ہے فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ کہ مشورہ کے بعد جب آپ ارادہ کسی بات کا کریں تو خدا پر بھروسہ کر کے اس پر عمل کریں۔ یہاں اذا عزمت صیغہ واحد ہے معلوم ہوا کہ عزم میں حضور مستقل تھے۔ اسی طرح آپ کا نائب یعنی سلطان بھی عزم میں مستقل ہے۔ اگر عزم کا مدار کثرت رائے پر ہوتا تو اذا عزمت نہ فرماتے بلکہ اس کے بجائے اذا عزم اکثر کم فتوکلوا علی اللہ فرماتے۔ پس جس آیت سے یہ لوگ جمہوریت پر استدلال کرتے ہیں اس کا اخیر جزو خود ان کے دعویٰ کی تردید کر رہا ہے مگر ان کی حالت یہ ہے حفظت شیئاً و غابت عنک اشیاء کہ ایک جزو کو دیکھتے ہیں اور دوسرے جزو سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

دوسرے اس آیت میں صرف حکام کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ رعایا کو تو یہ حق نہیں دیا گیا کہ تم از خود استحقاقاً حکام کو مشورہ دیا کرو۔ چاہے وہ مشورہ لیں یا نہ لیں۔ اہل مشورہ ان کو مشورہ سننے پر مجبور کر سکیں چنانچہ شریعت میں اشیروا الحکام و ھو حقکم علیکم کہیں نہیں کہا گیا۔ جب رعایا کو از خود مشورہ دینے کا کوئی حق بدرجۂ لزوم نہیں۔ تو پھر اسلام میں جمہوریت کہاں ہوئی کیونکہ جمہوریت میں تو پارلیمنٹ کو از خود رائے دینے کا حق ہوتا ہے۔ چاہے بادشاہ ان سے رائے لے یا نہ لے۔ یہاں تک کہ اگر بادشاہ پارلیمنٹ سے بغیر رائے لئے کوئی حکم نافذ کر دے تو اس پر چاروں طرف سے لے دے ہوتی ہے کہ ہم سے بدون مشورہ لئے یہ حکم کیوں جاری کیا گیا۔ بھلا رعایا کو یہ حکم اسلام میں کہاں دیا گیا ہے۔ ذرا کوئی صاحب ثابت تو کریں۔ پس یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ اسلام میں جمہوریت کی تعلیم ہے اور جس آیت سے یہ لوگ استدلال کرتے ہیں میں نے بتلا دیا کہ اس سے استدلال نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اگر غور کریں تو اسی آیت سے شخصی حکومت کا ثبوت ہو رہا ہے اور اس آیت میں فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ جو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اس میں ایک عجیب حکمت ہے۔

یہ بات اسی وقت ذہن میں آئی ہے۔ وہ حکمت یہ ہے کہ بعض لوگوں کا جو خیال ہے کہ ایک شخص کی تنہا رائے کبھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ ضرور اس میں غلطی ہوگی اس کا جواب فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ میں دیا گیا ہے۔ سبحان اللہ حق تعالیٰ کو معلوم تھا کہ ایک زمانہ ایسا بھی آوے گا جس میں مادہ پرستی غالب ہوگی۔ اور بعض لوگوں کا یہ اعتقاد ہوگا کہ شخص واحد کی رائے ضرور غلطی کرے گی۔ اس لئے پہلے ہی سے اس کا بھی جواب دے دیا اور ایسا جواب دیا جس میں گفتگو کی مجال نہیں۔ اس خیال کا ایک جواب تو یہ تھا کہ یہ مشاہدہ کے خلاف ہے تم تجربہ کر کے دیکھ لو معلوم ہو جائے گا کہ بعض دفعہ ایک شخص کی رائے تمام دنیا کے خلاف صحیح ہوتی ہے مگر اس سے گفتگو قطع نہیں ہوتی۔ اور تو تو میں میں شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ آج کل یہ جواب دے کر دیکھ لو جو کبھی گفتگو قطع ہو۔ مخاطب کبھی اس کو اتفاق پر محمول کرے گا کبھی یہ کہے گا کہ واقع میں اکثر ہی کی رائے صحیح تھی مگر بعض موانع کی وجہ سے ان کو کامیابی نہیں ہوئی اور شخص واحد کی رائے واقع میں غلط تھی مگر اسباب خارجہ ایسے پیش آ گئے جن کی وجہ سے اس کی رائے کامیاب ہوگئی۔ وعلیٰ ہذا کچھ نہ کچھ توجیہیں نکال لی جائیں گی مگر حق تعالیٰ نے یہ جواب نہیں دیا۔ حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ جواب ایسا دیا کرتے ہیں جس سے مخاطب کی تسلی ہو جائے۔ قرآن میں مقدمات اور صغریٰ کبریٰ اور قیاسی اشکال سے جواب نہیں دیا گیا۔ کیونکہ اس سے گفتگو قطع نہیں ہوتی مخاطب مقدمات میں گفتگو کرنے لگتا ہے۔ بلکہ قرآن میں جواب ایسی مختصر بات سے دیا جاتا ہے جو دل میں گھس جائے اور مخاطب کو گفتگو کی جگہ نہ ملے چنانچہ اس خیال کا دوسرا جواب وہ ہے جو فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ میں دیا گیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ حاکم کا قلب مشورہ کے بعد جب ایک شق کی طرف مائل ہو جائے تو خدا پر بھروسہ کر کے عمل شروع کر دے۔ تمہارے ہاتھ میں خزائن کامیابی نہیں ہیں بلکہ سب خزائن ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ تم خدا پر بھروسہ کر کے عمل کرو۔ حق تعالیٰ شخص واحد کی رائے کو بھی کامیاب کر سکتے ہیں بلکہ اگر وہ رائے غلط بھی ہوگی تب بھی توکل کی برکت سے صحیح ہو جائے گی۔ اور اگر عقل اس کو تسلیم نہ کرے تو تم عقل کے فتوے پر عمل نہ کرو۔ بلکہ ہمارے قانون پر عمل کرو۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ مشورہ کے بعد حاکم کی رائے جس طرف قائم ہو جائے اس کو اپنی رائے کے موافق عمل کرنا چاہیے اور خدا پر نظر رکھنی چاہیے وہ ایک آدمی کی رائے کو بھی تمام عالم کی رائے پر غالب کر سکتے ہیں۔ عقل اگر یہ کہے کہ ایک کی رائے صحیح نہیں ہو سکتی تو اس کی بات پر التفات نہ کرو۔ عقل بیچاری ہے کیا چیز۔ جو قانون خداوندی میں اس کے فتوے سے مزاحمت کی جاوے۔

اسباب پرستی

عقل کی بس اتنی حقیقت ہے کہ اسے خود اپنی حقیقت بھی معلوم نہیں۔ عقلاء میں اب تک اختلاف ہے کہ عقل جوہر مجرد ہے یا جوہر مادیٔ ہے۔ اور یہ نفس ناطقہ کے علاوہ کوئی چیز ہے یا خود نفس ہی کا نام عقل ہے۔ یہ عقل کا علم ہے پھر اس کو احکام خداوندی میں مزاحمت کا کیا حق ہے۔ جو لوگ عقل کے بہت متبع ہیں۔ وہ ہر وقت پریشان ہیں ہر چیز کی لم دریافت کرنا چاہتے ہیں مگر بعض جگہ گاڑی اٹک جاتی ہے اور کوئی بات نہیں بنتی۔ اور جہاں کچھ اسباب وعلل معلوم بھی ہو جاتے ہیں وہ بھی اٹکل اور تخمین سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے پرسوں آندھی آئی تھی میں کہہ رہا تھا کہ عقلاء کے نزدیک اس کے بھی کچھ اسباب ہیں تو یہ لوگ ان اسباب میں تصرف کر کے ذرا اس کو روک تو دیں۔ آخر اور بہت سے اسباب میں یہ تصرف کے مدعی ہیں۔ آندھی کے اسباب میں بھی تو ذرا تصرف کر کے دکھلائیں دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ اسباب اختیاری ہیں یا غیر اختیاری اگر اختیاری ہیں تو ان میں تصرف کر کے دکھلائیں اور اگر وہ اسباب غیر اختیاری ہیں اور قابل تصرف نہیں ہیں تو معلوم ہوا کہ آندھی کا آنا اور اس کا روکنا کسی کے اختیار میں نہیں تو پھر خواہ مخواہ اسباب کا نام کیوں کرتے ہیں موحد کی طرح صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ حق تعالیٰ کے حکم سے آندھی آتی ہے اسی طرح زلزلہ آتا ہے اس کے لئے بھی ان کے نزدیک کچھ اسباب ہیں تو ذرا ان اسباب میں تصرف کر کے زلزلہ کو روک تو دیں۔ زلزلہ کو تو کیا روکتے جن چیزوں کا ان کو تجربہ سے علم بھی ہو چکا ہے ان کی بھی لم معلوم نہیں مثلاً زلزلہ سے کچھ پہلے مقناطیس کی خاصیت جذب زائل ہو جاتی ہے۔ ذرا اس کی لم مجھے کوئی بتلا دے کہ آخر زلزلہ میں اور مقناطیس کی قوت میں کیا تعلق ہے۔ زلزلہ سے اس کی قوت جذب کیوں زائل ہو جاتی ہے کوئی شخص اس کی لم بیان نہیں کر سکتا۔ باقی اٹکل پچو بات گھڑ دینا تو ہر ایک کو آسان ہے لم تو وہ ہے جس کو دل بھی قبول کر لے ورنہ گھڑ گھڑ کے بیان کر دینا کیا مشکل ہے۔ مگر وہ ایسی ہی لم ہوگی جیسے بعض لوگوں نے چیتے کے بدن پر نشانات کی وجہ بتلائی ہے کہ وہ دھوپ میں سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھتا تھا۔ اس لئے جہاں سے دھوپ پڑی وہاں سے سفید ہو گیا۔ جہاں سایہ پڑا وہاں سے سیاہ ہو گیا۔ واہیات بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ اس چیتے کے پاس کوئی پرکار تھی کہ ہر روز ایک ہی جگہ میں ٹھیک بیٹھتا تھا۔ اور آہستہ آہستہ دھوپ

سے سایہ میں اور سایہ سے دھوپ میں اس طرح ہٹتا تھا کہ بدن پر گول گول ہی نشانات پڑیں کوئی نشان مربع یا مستطیل یا مثلث ومکعب نہ ہو۔ کیا کسی کے دل کو یہ بات لگ سکتی ہے چیتا کیا ہوا بڑا ماہر انجینئر ہوا۔ مگران احمقانہ وجوہ پر یہ لوگ خوش ہیں کہ ہم نے وجہ تو بیان کر دی ہے چاہے وہ ایسی ہی وجہ ہو جیسے ایک شیخ نے جاٹ سے کہا تھا کہ جاٹ رے جاٹ تیرے سر پر کھاٹ اس نے کہا شیخ رے شیخ تیرے سر پر کولہو۔ شیخ نے کہا واہ قافیہ تو ملا ہی نہیں۔ کہنے لگا قافیہ نہ سہی بوجھ میں تو مرے گا ایسے ہی ان کی وجہ ہوتی ہے کہ چاہے جوڑ نہ ہو مگر وجہ ہونی چاہیے۔ یہ ساری خرابی ہے طبیعت بے شعور کو فاعل ماننے کی۔ کیونکہ یہ لوگ یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ یہ نشانات طبیعت نے بلاواسطہ بنا دیئے ہیں کیونکہ طبیعت میں ارادہ اور شعور ہی نہیں وہ کس طرح افعال مختلفہ بناتی۔ اس لئے اسباب کا واسطہ مانتے ہیں پھر اٹکل پچو اسباب گھڑ کر نکالتے ہیں اور موحد کو کسی جگہ اٹکاؤ نہیں وہ بڑا بے فکر ہے جس بات کی اس سے وجہ پوچھو وہ کہتا ہے کہ خدا نے یوں ہی بنانا چاہا تھا۔ بنا دیا اور گو وہ واحد حقیقی ہے مگر ارادہ کے تعلق کی وجہ سے افعال میں اختلاف واقع ہو گیا۔ اس لئے **الواحد لایصدر عنه الا الواحد** کے بھی خلاف نہیں کیونکہ یہ حکم علت موجبہ میں ہے اور حق تعالیٰ ایجاب سے منزہ ہیں اور طبیعت میں ارادہ اور شعور ہی نہیں وہ علت موجبہ ہی ہوگی۔ اس لئے اس کی طرف ان افعال کی نسبت نہیں کر سکتے۔ ہائے کیسے غیر ذی شعور کو فاعل مانا اور جس جگہ ان سے کوئی تاویل نہیں بنتی نہ الٹی نہ سیدھی نہ کوئی سبب ظاہری سمجھ آتا ہے تو وہاں بھی ظالم خدا کو فاعل نہیں مانتے بلکہ ان مواقع کے لئے بخت واتفاق کو گھڑ لیا ہے مگر یہ محض نام ہی نام ہے۔ إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ کوئی ان سے پوچھے بخت واتفاق ہے کیا بلا اس میں فاعلیت کی قوت کہاں سے آ گئی اور یہ کیونکر سبب بن گیا بس اس کا کچھ جواب نہیں۔ یہ ہے عقل محض کے اتباع کا نتیجہ جس سے ایسی بے عقلی کی باتیں ماننا پڑتی ہیں موحد کیسی چین میں ہے کہ اس کو ایسی دور از کار باتیں سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ سب کا فاعل خدا ہے۔ اس نے جس طرح پیدا کرنا چاہا پیدا کر دیا نہ اس کو طبیعت کی ضرورت ہے نہ بخت واتفاق کی۔ اور جہاں ظاہر میں کچھ اسباب کا دخل معلوم بھی ہوتا ہے وہاں وہ کہتا ہے کہ اسباب موثر بالذات نہیں ہیں بلکہ یا تو موثر باذن الخالق ہیں جیسا کہ ایک قول ہے اور یا موثر ہی نہیں۔ بلکہ محض علامات ہیں جیسا ایک قول ہے جیسے جھنڈی کا ہلنا ریل کے چلنے کی محض علامت ہے موثر بالذات حق تعالیٰ ہیں۔ اگر وہ ارادہ نہ کریں تو سارے اسباب بے کار

پڑے رہیں۔ جیسے ڈرائیور گاڑی کو روکنا نہ چاہے تو ہزاروں سرخ جھنڈیاں بے کار ہو جاتی ہیں۔ بتلائیے یہ شخص چین میں ہے یا وہ شخص جو کبھی اسباب کو فاعل مانتا ہے کبھی طبیعت کو کبھی بخت و اتفاق کو موحد ان اسباب پرستوں کی پریشانی دیکھ کر یوں کہتا ہے۔

اربا واحدا ام الف رب ادین اذا تقسمت الامور
ترکت اللات والعزیٰ جمیعا کذلک یفعل الرجل البصیر

ترجمہ: جب معاملات کی تقسیم ہے تو کیا میں ایک رب کی اضافت کروں یا ہزار رب کی؟ میں نے لات وعزی وغیرہ سب کو چھوڑ دیا اور دانا آدمی ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔

وہ ان سب لات وعزیٰ پر لات مارتا ہے اور ایک خدا کو فاعل مانتا ہے اور اسباب پرستوں سے کہتا ہے کہ تم ایک خدا کو چھوڑ کر کہاں مارے مارے پھرتے ہو۔ چھوڑ وان خرافات کو اور یہ مذہب اختیار کرو۔

مصلحت دید من آں است کہ یاراں ہمہ کار بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

ترجمہ: میرے نزدیک مصلحت یہ ہے کہ دوست سب کام چھوڑ کر یار کی زلفوں کے خم کو قابو میں رکھیں۔ اور مولانا جامی فرماتے ہیں۔

خلیل آسا در ملک یقین زن نوائے لااحب الآفلین زن

ترجمہ: حضرت ابراہیم کی طرح ملک یقین کا دروازہ کھٹکھٹا اور غائب ہونے والوں کو میں نہیں چاہتا ہوں۔

کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ اسباب سب اس کے قبضہ میں ہیں۔

خاک و باد وآب و آتش بندہ اند بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

ترجمہ: مٹی ہوا' پانی اور آگ غلام ہیں ہمارے سامنے تو یہ چیزیں مردہ مگر اللہ کے سامنے زندہ ہیں۔ واللہ موحد سے بڑھ کر کوئی چین میں نہیں۔ پھر مشرکین کے بعضے معبود ایسے ہیں کہ ان میں باہم رقابت ہے۔ وہ ایک کی عبادت دوسرے سے چھپا کر کرتے ہیں کہیں وہ یہ معلوم کر کے کہ یہ دوسرے کے پاس بھی جاتا ہے۔ ناخوش نہ ہو جائے جیسے کوئی رنڈی دو آشنا کرے تو وہ ایک کے پاس دوسرے سے چھپ کر جاتی ہے اور موحد کو ایسا اطمینان ہوتا ہے جیسا بچہ کو ماں کی گود میں اطمینان ہوتا ہے۔ بچہ ماں کی گود میں جا کر بالکل بے فکر ہو جاتا ہے کہ بس اب کسی کا خوف نہیں اور اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ دوسرا پیار سے بھی بلائے تو اس سے بھاگتا ہے اور ماں اگر مارتی بھی ہے تو اس سے بھاگتا نہیں بلکہ رو کر اسی کو چمٹ جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں

مادرش گر سیلے بروی زند | ہم بمادر آید ابروئے تند
از کسے یارے نخواہد غیراو | اوست جملہ شر او وخیراو

(دفتر چہارم ثلثہ ارباع)

(اس کی ماں اگر طمانچہ لگائے تو وہ ماں کے اوپر ہی لپٹ جاتا ہے ماں کے علاوہ کسی سے یاری اور مدد نہیں چاہتا صرف ماں کو خیر وشر کا مالک سمجھتا ہے)

عقلی تہذیب

افلاطون نے موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا تھا کہ اگر آسمان کمان ہو اور حوادث تیر ہوں اور خدا تعالیٰ تیر انداز ہوں تو اس سے بھاگ کر کہاں جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیر انداز کے پاس جا کھڑا ہو۔ کیونکہ تیر دور والے کے لگتا ہے پاس والے کے نہیں لگتا۔ افلاطون نے کہا کہ یہ جواب بجز نبی کے کوئی نہیں دے سکتا واقعی آپ نبی ہیں مگر با ایں ہمہ یہ حکما اتباع نہیں کرتے تھے یہ کہتے تھے کہ نبی کی ضرورت ان لوگوں کو ہے جنہوں نے اپنے نفوس کی اصلاح نہیں کی۔ **ونحن قوم قدھذبنا انفسنا فلاحاجة لنا الی من یھذبنا** اور ہم اپنے نفسوں کو مہذب بنا چکے ہیں۔ ہمیں کسی مہذب بنانے والے کی ضرورت نہیں۔ مگر بخدا ان کا یہ خیال غلط تھا۔ بھلا عقلی تہذیب بھی کہیں نبی سے مستغنی کر سکتی ہے ان لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کی تہذیب کو دیکھا ہی نہیں۔ ورنہ اقرار کر لیتے کہ اس کے سامنے ہماری تہذیب سراسر بدتہذیبی ہے۔ چنانچہ مجاہدات وریاضات میں حکماء یونان کو کمال حاصل تھا۔ اور اسی تہذیب کے وہ مدعی تھے۔ مگر میں نے بیانات سابقہ میں ثابت کر دیا ہے کہ مجاہدات کی جو صورت شریعت نے تجویز کی ہے اس کی حکماء یونان کو ہوا بھی نہیں لگی جو طریقے ان لوگوں نے ریاضت ومجاہدہ کے لئے تجویز کئے تھے ان میں بے شمار غوائل وفتن ہیں۔ اور منافع بہت کم اور شریعت نے جو طریقے مجاہدات کے تجویز کئے ہیں وہ غوائل سے محفوظ اور منافع سے پر ہیں۔ ذرا کوئی ان کی نظیر تو دکھلائے۔ یہ کلام تو ان حکماء کی تہذیب میں تھا۔

تعذیب جدید

باقی آج کل جس چیز کا نام تہذیب رکھا جاتا ہے میں تو اس کو تعذیب کہا کرتا ہوں۔ یہ تو ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کو تہذیب کہا جائے اس سے تو حکماء یونان ہی کی تہذیب اچھی تھی۔ کیونکہ ان

میں کسی قدر روحانیت بھی تھی۔ وہ لوگ خدا کے قائل تھے۔ توحید کے قائل تھے گو توحید میں اتنا غلو کیا کہ خدا کو معطل کر کے عقول عشرہ کو فاعل اور قدیم مان لیا۔ مگر پھر وہ لوگ آج کل کے حکماء سے اچھے تھے۔ خدا کے وجود کے تو قائل تھے اور جہاں تک ان کی عقل نے کام دیا وہاں تک صفات کمال کو بھی حق تعالیٰ کے لئے ثابت کرتے تھے۔ اور آج کل کے حکماء تو ایسے بدہ تہذیب ہیں کہ خدا کے بھی منکر ہیں ان کی ایسی مثال ہے جیسے ایک چپراسی اپنے افسر سے تنخواہ لیتا ہو مگر تنخواہ لینے کے بعد کہتا ہے کہ میرا کوئی افسر نہیں نہ مجھے کوئی تنخواہ دیتا ہے بلکہ زمین سے خود بخود روپے پیدا ہو جاتے ہیں اور ہوا سے اڑ کر میرے ہاتھ میں آ جاتے ہیں۔ رسالہ حمیدیہ میں موحد اور دہری کی مثال ایک گفتگو کے پیرایہ میں خوب لکھی ہے کہ ایک موحد اور ایک دہری کسی جزیرہ میں گئے۔ وہاں ایک مکان نہایت خوبصورت مستحکم بنا ہوا دیکھا جس میں ایک طرف کھانے کا کمرہ ہے جو فرش فروش اور آئینوں سے سجا ہوا ہے۔ ایک طرف سونے کا کمرہ ہے جس میں عمدہ عمدہ مسہریاں بچھی ہوئی اور فرشی پنکھے لگے ہوئے ہیں۔ ہر کمرہ میں ہوا کے لئے روشندان بنے ہوئے ہیں۔ ایک طرف باغ لگا ہوا ہے جس کے درخت نہایت قرینے سے لگائے گئے ہیں۔ ایک طرف حوض بنا ہوا ہے جس میں فوارہ سے ہر وقت پانی آتا ہے۔ موحد نے اس مکان کو دیکھ کر کہا کہ اس کا بنانے والا بڑا ہی صناع اور بہت ہی ماہر تھا۔ جس نے نہایت عمدگی اور مضبوطی اور خوبصورتی کے ساتھ اس مکان کو تیار کیا۔ دہری نے کہا کہ اس کا بنانے والا کوئی نہیں بلکہ عرصہ دراز تک بارش ہونے سے زمین کی مٹی جم گئی پھر دھوپ سے پختہ اینٹیں بن گئیں۔ پھر ہوا سے اڑ اڑ کر وہ اینٹیں اس جگہ آ کر جمع ہو گئیں۔ پھر ہوا چلی اور ان کو اوپر نیچے کر دیا اس طرح دیواریں بن گئیں پھر پہاڑوں سے پتھر گرے اور ہوا نے ان کو اڑا کر یہاں کھڑا کر دیا۔ اس کے ستون بن گئے۔ پھر درختوں کی لکڑیاں ہوا سے ٹوٹ گئیں اوہ اڑ کر یہاں چھت کی صورت میں قائم ہو گئیں۔ اسی طرح اس نے سارے مکان کو ہوا اور دھوپ سے تیار کر دیا۔ میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ بتلایئے ان میں گدھا کون ہے اور آدمی کون ہے یقیناً وہ شخص بالکل گدھا ہے جو ایسے مکان کی نسبت یوں کہتا ہے کہ وہ خود بخود تیار ہو گیا۔ اسی طرح سمجھ لیجئے کہ جو آسمان و زمین کی اتنی بڑی عجیب و غریب اور عظیم الشان عمارت کو کسی صانع کی بنائی ہوئی نہیں مانتے بلکہ از خود تیار مانتے ہیں وہ بیوقوف ہیں یا نہیں۔ تو یونان کی حکمت اس حکمت سے پھر اچھی تھی وہ لوگ خدا کے تو قائل تھے اور اہل سائنس تو غضب کرتے ہیں کہ خدا کے بھی منکر

ہیں۔اور سائنس والوں میں سے جو مسلمان خدا کے قائل بھی ہیں یہ ان کی محض وضعداری ہے ورنہ ان کا خدا کا ماننا ایسا ہے جیسے کوئی شخص کسی سے پوچھے کہ تو نے بادشاہ کو دیکھا ہے وہ کہے ہاں دیکھا ہے اس کے ایک سونڈ تھی اور ذرا سا سر تھا۔اور آنکھیں نہیں تھیں تو پہلا شخص یہ اوصاف سن کر کہے گا کہ کمبخت تو نے بادشاہ کو نہیں دیکھا نہ معلوم کس بلا کو دیکھ لیا ہے۔ بادشاہ تو ایسا بدصورت نہیں ہے۔ یہی حال ان سائنس دان مسلمانوں کا ہے جو خدا کے قائل ہیں مگر اس کے کمالات کے منکر ہیں جن میں سے ایک بڑا کمال یہ ہے۔ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ وَ یَحْکُمُ مَایُرِیْدُ (وہ جو چاہے کرتا ہے اور جو چاہے حکم فرماتا ہے) مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ بس خدا نے عالم کو پیدا کر کے طبیعت اور مادہ کے سپرد سارا کام کر دیا ہے۔اب جو ہوتا ہے وہ اسباب طبعیہ سے ہوتا ہے خدا تعالیٰ کے ارادہ کو کچھ دخل نہیں۔ گویا خدا نے گھڑی میں کوک بھر دی ہے اب اس کے چلنے میں فنر اور بال کمانی کی طاقت کو دخل ہے خدا کو کچھ دخل نہیں۔ اسی لئے یہ لوگ ابراہیم علیہ السلام پر نار کے گلزار ہونے کا انکار کرتے ہیں کہ آگ بھلا کیوں کر ٹھنڈی ہوگئی۔ یہ تو قانون طبعیت کے خلاف ہے۔ بھلا بنی اسرائیل پر پہاڑ کیوں کر معلق ہوگیا۔ اور ایک ذرا سے پتھر میں سے بارہ چشمے کیونکر بہنے لگے۔ یہ تو قانون فطرت کے خلاف ہے ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کو قانون فطرت کے تابع بنا دیا۔ موحد کہتا ہے کہ نہ معلوم تم کس عاجز کو خدا سمجھتے ہو۔ خدا تو ایسا عاجز نہیں اس کی تو شان یہ ہے کہ ایک پتہ بھی اس کے حکم اور اس کے خلاف نہیں ہل سکتا اور اگر وہ چاہے تو تمام عناصر کی خاصیت کو دم بھر میں بدل دے۔ پس ان اوصاف کیساتھ یہ انکا کہنا کہ ہم خدا کے قائل ہیں ویسا ہی ہے جیسا اس شخص نے کہا تھا کہ ہاں میں نے بادشاہ کو دیکھا ہے اس کے ایک سونڈ تھی۔ اور آنکھیں ندارد تھیں۔ مگر باایں ہمہ ہم ان کو کافر نہ کہیں گے۔ کیونکہ ان کے اقوال سے خدا کا انکار صرف لازم آتا ہے۔ التزام نہیں پایا گیا اور لزوم کفر کفر نہیں التزام کفر کفر ہے۔ اس لئے ہم ایسے مسلمانوں کو کافر نہیں کہتے پھر بھی یہ لوگ ہم پر اعتراض کرتے ہیں کہ مولوی مسلمانوں کو کافر بناتے ہیں۔ میں اس کے جواب میں کہا کرتا ہوں کہ مولوی کافر بناتے نہیں بلکہ کافر بتاتے ہیں۔ یعنی جو شخص اپنی حرکتوں سے کافر بن جاتا ہے مولوی اس کے کفر کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ جیسے کسی شخص کے کپڑے میں پاخانہ لگا ہوا ہو اور دوسرا شخص اس سے کہہ دے کہ آپ کے کپڑے میں پاخانہ لگ رہا ہے اس کو دھو لیجئے تو کہیے اس نے پاخانہ لگایا یا کہ پاخانہ لگا ہوا بتا دیا۔ پس آپ کا مولویوں پر جھلانا ایسا ہی ہے جیسا وہ شخص جس کے کپڑے میں

پاخانہ لگ رہا ہے بتلانے والے کو دھمکانے لگے کہ واہ صاحب تم ہمارے لباس میں پاخانہ لگاتے ہو۔ وہ کہے گا بیوقوف میں نے تو لگایا نہیں۔ نہ میرے پاس پاخانہ موجود ہے جو میں لگاتا۔ تو نے خود ہی اپنی بے احتیاطی سے کہیں لگالیا ہے میں نے تو تجھے اطلاع کی ہے۔ کہئے ان دونوں میں کون حق پر ہے۔ دیکھو کافر بنانا تو یہ ہے کہ کسی کو کفر کی تلقین کی جائے جیسے مسلمان بنانا یہ ہے کہ کسی کو اسلام کی تلقین کی جائے۔ جس طرح ہم کافروں کو اسلام کی تلقین کر کے مسلمان بناتے ہیں کیا اسی طرح کسی مسلمان کو تلقین کفر کرتے ہوئے آپ نے کسی مولوی کو دیکھا ہے۔ کبھی نہ دیکھا ہوگا پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ مولوی کافر بناتے ہیں بلکہ یوں کہو کہ وہ کافر بتاتے ہیں۔

ڈارون کا نظریہ

ایک اور مزے کی بات سنئے۔ جب اہل سائنس نے خدا کا انکار کیا اور طبیعت کو فاعل مانا تو ان کو اس کی بھی فکر ہوئی کہ اسباب طبعیہ کے موافق انسان کی اصل دریافت کی جائے۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کا خدا کے ہاتھ سے پیدا ہونا تو ان کو مسلم نہیں۔ یہ تو ان کی عقل سے بعید ہے۔ تو ڈارون کو یہ کہنا پڑا کہ انسان کی اصل بندر ہے۔ بندر ترقی کر کے انسان بن گیا۔ اس کا نام مسئلہ ارتقا ہے اس بیچارہ کو اپنے مناسب تمام حیوانات میں بندر ہی نظر آیا۔ جب کوئی اس قول کی تردید کے درپے ہوتا ہے میں کہتا ہوں کہ اس قول کے انکار کی ضرورت نہیں۔ اس کو اپنے نسب کا حال ہم سے زیادہ معلوم ہے۔ اس لئے وہ اپنا نسب بیان کرتا ہے۔ وہ بندر ہی کی نسل سے ہوگا اور ہم کو اپنے نسب کا حال اس سے زیادہ معلوم ہے کہ ہم آدم علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ تو تم اس کی بات کا کیوں انکار کرتے ہو وہ بیچارہ تو اپنا نسب بتلا رہا ہے تمہارا نسب تھوڑا ہی بتلا رہا ہے۔ اور جس دن وہ ہمارا نسب بتلائے گا ہم کہہ دیں گے صاحب البیت ادری بما فیہ کہ گھر والے کو اپنے گھر کی خبر دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہمارے نسب کی خبر تجھ کو ہم سے زیادہ نہیں ہوسکتی ہمارے پاس شجرہ نسب آدم علیہ السلام تک محفوظ ہے۔ تجھے ہمارے نسب میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ ہاں تیرے پاس اپنا شجرہ نسب محفوظ نہ ہوگا تو تجھے اختیار ہے کہ جس سے چاہے اپنا نسب ملالے (مجہول النسب یہ نہ کرے تو اور کیا کرے ۱۲ جامع) یہ ساری خرابی طبیعت کو فاعل ماننے سے لازم آئی۔ خدا کو مان لیتے تو اس جھگڑے میں نہ پھنستے۔ یہ تو ان سائنس والوں کا حال تھا۔ جو خدا کے منکر ہیں۔

وضعداری کا اسلام

اب ان سائنس والوں کا حال سنئے جو برائے نام خدا کے قائل ہیں ان میں سے ایک صاحب علم کا قصہ ہے کہ جب انہوں نے دیکھا کہ قرآن میں آدم علیہ السلام کا قصہ ڈارون کی تحقیق کے مصادم ہے تو وہ بولے کہ شاید وہ پہلا بندر جس نے انسان کی طرف سب سے پہلے ترقی کی ہے (نعوذ باللہ) آدم علیہ السلام ہی ہوں۔ استغفر اللہ، استغفر اللہ۔ میرے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ اس بات کی نقل سے بھی۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ یہ لوگ جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں اور خدا کا قائل بتلاتے ہیں یہ محض وضع داری ہے۔ ورنہ حقیقت میں یہ خدا کے قائل نہیں۔ بھلا ڈارون کو تو اس قول پر اس بات نے مجبور کیا تھا کہ وہ خدا کو فائل نہیں مانتا۔ طبیعت کو فاعل مانتا ہے اور طبیعت دفعۃً ترقی نہیں کر سکتی تدریجاً ترقی کرتی ہے کہ پہلے اجسام بسیط یعنی عناصر کی صورت اختیار کی۔ پھر اس سے ترقی کر کے جمادات مرکبہ کی صورت اختیار کی۔ پھر اس سے ترقی کر کے حیوانات کی صورت اختیار کی پھر حیوانات میں سے کسی نے ترقی کر کے انسان کی صورت اختیار کر لی۔ مگر جو شخص خدا تعالیٰ کو فاعل مختار مانتا ہو اس کو اس قول کی طرف کس چیز نے مضطر کیا۔ اس کے نزدیک اس میں کیا استحالہ ہے کہ خدا تعالیٰ آدم علیہ السلام کے پتلہ کو مٹی اور پانی سے بنا کر دفعۃً اس کو انسان بنا دیں۔ اس ظالم کو ڈارون کی تقلید پر کس بات نے مجبور کیا۔ کہ وہ خواہ مخواہ ایک نبی کی توہین پر آمادہ ہوتا ہے۔ پھر اس میں علاوہ توہین نبی کے یہ بھی خرابی ہے کہ یہ تاویل ڈارون کے قول پر بھی غلط ہے کیونکہ ڈارون اس کا قائل نہیں کہ دنیا میں صرف ایک بندر ترقی کر کے انسان ہوا ہو جس کی نسل میں یہ سب انسان ہیں وہ تو یہ کہتا ہے کہ جس وقت بندر کی طبیعت نے ترقی کی ہے تو ایک خاص وقت میں ہر جگہ ہزاروں لاکھوں بندر آدمی بن گئے۔ اور یہ سب ایک کی نسل سے نہیں تو اس شخص نے ڈارون کی تقلید میں قرآن کے اندر تحریف کی اور وہ تحریک بھی ڈارون کے یہاں قبول نہ ہوئی۔ تو ادھر سے بھی گئے ادھر سے بھی گئے۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم　　نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے ہوئے

ہائے یہ لوگ ایک خدا کو چھوڑ کر کدھر مارے مارے پھرتے ہیں۔

موحد کی ترقی

موحد کو ایک خدا سے تعلق ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

حق تعالیٰ سے بلاواسطہ علاقہ ہے۔ اس لئے حضور کے اقوال میں غلطی نہیں ہوسکتی۔ آپ کی شان یہ ہے۔

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

ترجمہ: اس کا کہا اللہ کا کہا ہے اگر چہ وہ اللہ کے بندے کے گلے سے نکل رہا ہے۔ اس لئے موحد کو اپنے علوم پر اطمینان ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو وہ علوم ہی اطمینان بخش ہیں۔ موحد کہتا ہے کہ ہر چیز کا فاعل خدا ہے۔ خدا نے آدم علیہ السلام کو دفعتاً مٹی سے پیدا کر کے دفعۃً انسان بنا دیا۔ اس کو کچھ ضرورت نہیں کہ اپنا نسب بندر یا سور سے ملائے تو خدا کو فاعل ماننے میں کیسی راحت ہے کہ سب جھگڑوں سے نجات ہوگئی۔ یہ تو علمی راحت اور دنیوی حسی راحت یہ ہے کہ حوادث و مصائب میں موحد مستقل و مطمئن رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ کہ ہم کو وہی پیش آئے گا جو خدا نے مقدر کر دیا ہے۔ اس کے خلاف ہرگز کچھ پیش نہیں آ سکتا۔ اور حق تعالیٰ ہمارے آقا و مولیٰ ہیں۔ ان کی طرف سے جو کچھ بھی پیش آئے گا اس میں رحمت و حکمت ہی ہوگی۔ اس لئے خدا ہی پر مسلمان کو بھروسہ کرنا چاہیے۔ بتلایئے جس کا یہ اعتقاد ہو وہ مصائب میں کب پریشان ہوسکتا ہے۔ اور ملحد پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو اس کی پریشانی کی کوئی حد نہیں رہتی کیونکہ اس کو اسباب پر اعتماد تھا۔ اور اسباب اس کے مخالف ہو گئے تو اب اس کے پاس کوئی سہارا نہیں اور موحد کو خدا پر اعتماد ہے اور خدا کو وہ اپنا مخالف نہیں سمجھتا۔ بلکہ مولیٰ اور آقا سمجھتا ہے اس کو اسباب کے مخالف ہو جانے پر بھی یہ امید ہے کہ شاید خدا تعالیٰ اسباب مخالفہ کو موافق بنا دیں اور اگر اسباب مخالف ہی رہے اور اس کو ناکامیابی بھی ہو جائے۔ تب بھی وہ راضی ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو بات بھی آتی ہے اس میں خیر ہی ہوتی ہے پس اس صورت میں اگر دنیا کا ضرر ہوا تو میری آخرت کی ترقی ہوگی۔ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ موحد کے لئے مصائب میں بھی فائدہ ہی ہے اور وہ تکالیف سے بھی خوش ہوتا ہے۔ جیسے بچہ دودھ چھوٹنے کے وقت گو پریشان ہوتا ہے اور اس وقت اس کو بہت تکلیف ہوتی ہے مگر بعد میں ماں کو دعا دیتا ہے کہ۔

جزاک اللہ کہ چشمم باز کر دی مرا با جان جاناں ہمراز کر دی

ترجمہ: اللہ تجھے جزا دے میری آنکھیں تو نے کھول دیں اور مجھے محبوب کے ساتھ ہمراز بنا دیا۔ وہ کہتا ہے کہ خدا اس ماں کا بھلا کرے جس نے دودھ چھڑا کر مجھے اس قابل کر دیا کہ آج میں پلاؤ زردہ قورمہ اور کباب کھا رہا ہوں۔ اگر دودھ ہی پیتا رہا تو یہ نفیس ولذیذ غذائیں کیونکر کھاتا۔ اسی طرح موحد کو مصیبت کے وقت گو ظاہر میں تکلیف ہوتی ہے مگر تکلیف کے بعد جب اپنی ترقی کا

احساس ہوتا ہے تو وہ خوش ہو کر یوں کہتا ہے۔

نا خوش تو خوش بود بر جان من　　　دل فدائے یار دل رنجان من

ترجمہ: تیری ناخوشی کی بات بھی مجھے اچھی لگتی ہے میرے دل کو رنجیدہ کرنے والے دوست پر میرا دل فدا ہے۔

اشتیاق عارف

اور موحد عارف کو تو عین مصیبت کے وقت اس کی حکمتیں اور اپنی ترقی محسوس ہو جاتی ہے اس لئے وہ تکلیف بھی لذیذ ہو جاتی ہے اور سب سے بڑھ کر مصیبت لوگوں کی نظر میں موت ہے۔ یہ منتہیٰ المصائب ہے کہ وہ تمام مصائب کا انتہائی درجہ ہے اور اسی کے اندیشہ سے آدمی تمام مصائب سے گھبراتا ہے مگر عارف موحد کے نزدیک یہ زہر کا پیالہ بھی شیریں ہے۔ وہ کہتا ہے۔

خرم آں روز کزیں منزل و یران بردم　　　راحت جاں طلبم و زپئے جاناں بردم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے　　　تا درمکیدہ شاداں و غزل خواں بردم

ترجمہ: وہ دن اچھا ہوگا جب میں اس جگہ سے جاؤں گا جہاں سے راحت پا کر جاناں کی تلاش میں جاؤں گا میں نے نذر مانی ہے کہ اگر یہ غم ختم ہو گیا تو میں میکدے کے دروازے تک ناچتا ہوا جاؤں گا۔

یعنی وہ تو موت کا مشتاق ہوتا ہے اور اس کے لئے نذریں مانتا ہے شاید کوئی کہے کہ یہ سارا اشتیاق موت سے پہلے ہی ہوگا۔ مرتے وقت تو نانی یاد آئی ہوگی۔ صاحبو! نہیں نہ ان کو نانی یاد آئی نہ دادی یاد آئی۔ بلکہ وہی ایک یاد رہا جس کے لئے موت کی تمنا کرتے تھے کون ایک وہ ایک جس کے متعلق حضرت قلندر فرماتے ہیں۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم　　　گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

ترجمہ: مجھے آنکھ پر رشک آتا ہے تمہارا چہرہ نہ دیکھنے دوں اور کان کو تیری بات نہ سننے دوں اور۔

ر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد　　　تا نہ بینم رخ تو روح رمیدن ندہم

ترجمہ: جب ملک الموت میری روح نکالے گا جب تک آپ کا چہرہ نہ دیکھ لوں روح نہ نکلنے دوں گا۔ اور ایک بزرگ مرتے وقت جب کہ لوگ رو رہے تھے مگر وہ خوش ہو کر فرما رہے تھے۔

چیست توحید آنکہ از غیر خدا　　　فرد آئی درخلا و در ملا

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم　　　جسم بگذارم سراسر جان شوم

(توحید یہ ہے کہ خلوت و جلوت میں غیر اللہ سے قطع تعلق کرو وقت قریب آ گیا ہے کہ میں بدن کے لباس سے ننگا ہو جاؤں گا جسم کو چھوڑ کر سراپا جان ہو جاؤں گا)

کہ اب تو مدت کے بعد وہ وقت آیا کہ میں جسم سے مجرد ہو کر سرتا پا روح ہو کر حق تعالیٰ کی

جناب میں پہنچوں گا اور اس قید خانہ ناسوت سے نجات پاؤں گا۔تم روتے کس لئے ہو یہ تو خوشی کا وقت ہے مگر یہ عدم توحش موت سے وہ محمود ہے جوحق کی محبت سے ناشی ہو ورنہ بعضے ایسے متہور بھی ہیں جو باوجود معاصی میں مبتلا ہونے کے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایسے بہادر ہیں ویسے بہادر ہیں ہم جیل خانہ سے نہیں ڈرتے۔ہم کوموت کا خوف نہیں سو چونکہ منشا اس کا محض اتباع نفس اور دعویٰ ہے اس لئے کوئی کمال نہیں بلکہ جرأت مذمومہ ہے۔عارف کوموت کا اشتیاق ہوتا ہے مگر وہ ڈینگیں نہیں مارا کرتا۔دعویٰ کرنا اور ڈینگیں مارنا اتباع نفس کی علامت ہے یہ کچھ کمال نہیں ایسے متہور تو کفار میں بھی ہوتے ہیں۔ان کو بھی جیل خانہ کا خوف نہیں ہوتا نہ موت کا اندیشہ۔مگر یہ سب حقیقت بنی سے پہلے ہی پہلے ہے۔باقی جب موت کے فرشتے نظر آنے لگتے ہیں اس وقت ساری بہادری خاک میں مل جاتی ہے اگر یہ تہور بھی کچھ کمال ہے تو ایسے کافروں کو بھی صاحب کمال کہنا چاہیے جو کہ موت سے نہیں ڈرتے۔پھانسی کے وقت بعض کفار نے جرأت ظاہر کی ہے۔

اتباع شریعت

مگر ظاہر ہے کہ کفر کے ساتھ کوئی دینی کمال جمع نہیں ہوسکتا۔اس سے صاف معلوم ہوا کہ یہ تہور دینی کمال نہیں۔بس دینی کمال یہ ہے کہ جہاں خدا کہے وہاں خوشی سے جان دو۔ورنہ اپنی جان کو آرام دو۔ خدا کی مرضی کے موافق جب آدمی جان دیتا ہے تو اس کو عین موت کے وقت بھی راحت نصیب ہوتی ہے جس کے آثار مخفی نہیں رہتے۔اس وقت دیندار اور متہور میں فرق ظاہر ہو جاتا ہے (کما قال الشاعر ؎

اذا اشتبک الدموع علی خدود   تبین من بکی ممن تباکی

جب آنسوؤں کی لڑیاں رخساروں پر بہتی ہیں اس وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سچ مچ رو رہا ہے۔اور کون رونے کے لئے منہ بنا رہا ہے ۱۲ جامع) بہادری ہر موقعہ میں کمال نہیں اور جان دینا ہر وقت دین کا کام نہیں۔بلکہ جس وقت خدا کا حکم ہو اس وقت جان دینا دین ہے۔ورنہ اتباع نفس ہے اگر کسی موقع میں خدا تعالیٰ جان دینے سے منع کر دیں اس وقت جان کی حفاظت فرض ہے۔ دیکھو شریعت نے ایک وقت میں نماز کو حرام کیا۔اور پاخانہ میں جانا فرض کیا ہے۔اس وقت نماز پڑھنے سے گناہ ہوگا اور پاخانہ میں جانے سے ثواب ہوگا۔اسے کہتے ہیں حکومت کہ بندہ کو اپنے حکم کا تابع بنایا ہے جب چاہا طاعت کو حرام کر دیا اور نفس کی راحت دینے کو واجب کر دیا۔شاید تم اس مسئلہ کو نہ سمجھے ہو مگر فقہاء نے صاف تصریح کی ہے کہ تقاضائے بول و براز کے وقت نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔اور پاخانہ پیشاب سے فراغت کرنا واجب ہے۔اب جو عاشق ہیں وہ ہر وقت حکم کا

اتباع کرتے ہیں۔ خواہش نفس کا اتباع نہیں کرتے۔ ایک وقت ان کا جی چاہتا ہے کہ نماز پڑھیں مگر شریعت حکم دیتی ہے کہ پاخانہ جاؤ تو وہ حکم شریعت کو نفس کی خواہش پر مقدم کریں گے گو اس میں ان کی جماعت فوت ہو جائے اور لوگ ملامت کریں مگر ان کو ملامت کی پرواہ نہیں ہوتی۔

عشق کا خاصہ

اسی طرح اگر کسی وقت بہادری کا جوش ہو اور دین کے لئے جان دینے کا تقاضا ہو مگر شریعت اجازت نہ دے تو وہ اپنے تقاضے کو روک لیں گے اور حکم شریعت کا اتباع کر کے جان کی حفاظت کریں گے۔ گو اس میں ان پر چاروں طرف سے ملامت ہو کہ بڑا بزدل ہے جان دینے سے ڈرتا ہے جیل خانہ جانے سے گھبراتا ہے مگر وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے اور صاف کہتے ہیں ۔

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں　　　مانمی خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ یہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے لیکن ہم ننگ و نام کے سوا کچھ نہیں چاہتے)

عشق کا خاصہ ہے کہ یہ سب سے پہلے ننگ و ناموس کو پھونکتا ہے۔ عاشق کو بدنامی اور رسوائی کی پرواہ کبھی نہیں ہوتی۔ رضائے محبوب کے سامنے دیکھو اگر کوئی شخص ایک طوائف پر عاشق ہو اور وہ اس سے یہ کہے کہ میاں میں تم سے کچھ نہیں مانگتی بس یہ چاہتی ہوں کہ تم سب کپڑے اتار کر ایک لنگوٹی باندھ کر بازار کے بیچ میں سے نکل جاؤ تو اگر یہ عاشق ہے گو فاسق ہی تو کر گزرے گا کیوں؟ اس لئے کہ عشق سے نخوت و ناموس خاک میں مل جاتی ہے۔ اسی لئے مولانا فرماتے ہیں ۔

شاد باش اے عشق و خوش سودائے ما　　　اے طبیب جملہ علتہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما　　　اے تو افلاطون و جالینوس ما

(اے عشق تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیالات درست ہو جاتے ہیں اور تجھ سے سب امراض کا علاج ہو جاتا ہے اے عشق تو ہمارے نخوت و ناموس کی دوا ہے اور تو ہمارے لئے افلاطون و جالینوس ہے)

جب ایک چڑیل کے حکم کے سامنے عاشق کو اپنی عزت و ناموس کا خیال نہیں رہتا تو محبوب حقیقی کے عاشق کو اس کے احکام کے سامنے اپنی عزت و ناموس کا خیال اور مخلوق کی ملامت و طعن کا خوف کیونکر ہو سکتا ہے۔

عشق مولی کے کم از لیلی بود　　　کوئے گشتن بہرا او اولی بود

(محبوب حقیقی کا عشق لیلیٰ سے کیا کم ہو اسکی گلیوں میں پھرنا اولیٰ اور بہتر ہے)

صاحبو! دنیا بھر کی گالیاں سننا آسان نہیں۔ ہر وقت ملامت وطعن کا تحمل سہل نہیں مگر یہ عشق وہ چیز ہے کہ اس سے سب احکام سہل ہو جاتے ہیں اور کوئی کام مشکل نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ نری عقل کافی نہیں عشق حاصل کرو۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ عقل بیکار محض ہے۔ عقل کا کام مبادی تک پہنچانا ہے۔ آگے عشق کی ضرورت ہے وہاں عقل کا دخل نہیں۔ پس عقل کا کام اتنا ہے جتنا مشاطہ کا کام ہوتا ہے کہ وہ دولہا دلہن میں وصال کراتی ہے اور دلہن کو بنا سنوار کر تیار کر دیتی ہے۔ مگر وصال کے بعد الگ ہو جاتی ہے۔ اب اگر جھانکے تو جوتے کھائے گی۔

مقام محبوبیت

اسی طرح وصال کی ابتدائی مرحلہ تک تو عقل ساتھ رہتی ہی ہیں مگر جب وصال شروع ہو گیا تو اس کے بعد عقل بیکار ہے۔ اب عشق ہی تنہا رہ جاتا ہے اب عقل کو کچھ دخل نہیں رہتا اور اس کو اسرار الٰہیہ میں گفتگو کرنے کا کچھ حق نہیں رہتا۔ بلکہ اس پر ہاں یہ حق ہے کہ اپنے کو تابع بنا دے جب عقل تابع ہو گی عشق کی تو لازم ہے کہ اہل عقل اتباع کریں۔ اہل عشق کا۔ بلکہ اہل عشق کی شان بعض اوقات یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ ان کی غلطیاں بھی منقلب ہو جاتی ہیں صواب سے اور اسی کی طرف اشارہ ہے۔ حدیث شریف میں اللھم ادر الحق معه (العلل المتناھیة ۱:۲۴۵) (اے مع علی) حیث دار حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی کے لئے دعا فرماتے ہیں کہ اے اللہ حق کو علی کے ساتھ گھماتے رہئے۔ جدھر وہ گھومیں بظاہر یہ دعا اس طرح ہونی چاہیے تھی اللھم ادارہ مع الحق حیث دار یعنی اے اللہ! علی کو حق کے ساتھ گھماتے رہیے جدھر حق گھومے۔ مگر نہیں حضورؐ نے یہ دعا فرمائی کہ حق کو علی کے ساتھ گھماتے رہیے یعنی جس طرح علی حق کے تابع ہیں اسی طرح حق کو علی کا تابع کر دیجئے۔ اس میں حضور نے اس مسئلہ پر تنبیہ فرمائی ہے کہ بعض لوگ ایسے محبوب ہوتے ہیں کہ محبوبیت کے مقام میں امر حق ان کا تابع ہو جاتا ہے کہ اگر وہ اجتہاد سے کسی غلط شق کو بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ تو حق تعالیٰ اسی کو حق بنا دیتے ہیں۔ جیسے ایک بزرگ کسی پر اجتہاد سے ناراض ہوں اور واقع میں وہ ناراضی بے جا ہو تو غیب سے سامان ایسا ہو جاتا ہے کہ اسی مجلس ناراضی میں اس شخص سے کوئی حرکت ایسی صادر ہو جاتی ہے جس سے وہ ناراضی صحیح ہو جاتی ہے۔

یا کسی شیخ نے مرید کے اندر مرض کبر وعجب تشخیص کیا۔ اور واقع میں یہ مرض اس کے اندر نہ

تھا۔ اب اگر مرید نے شیخ کے قول کو بے چوں وچرا تسلیم کرلیا تب تو خیر وہ اس مرض سے محفوظ رہتا ہے کیونکہ شیخ کا بھی اس تشخیص سے مقصود یہی تھا کہ اس میں یہ مرض نہ رہے اور اگر اس نے شیخ کی تشخیص کو رد کیا اور اعتراض کیا تو حق تعالیٰ سامان ایسے پیدا کر دیتے ہیں جس سے اس میں وہ مرض پیدا ہو کہ شیخ کی تشخیص صحیح ہو جاتی ہے۔ تو ایسا شخص کیونکر قابل اتباع نہ رہے گا۔ یہ تقریر بہت طویل ہو گئی اصل میں میں یہ کہہ رہا تھا کہ احکام شرعیہ میں ہر اک کی رائے معتبر نہیں۔ اس پر یہ مضمون چل پڑا تھا کہ آزادی مطلق سے کبھی انتظام نہیں ہوسکتا۔ نہ دنیا کا نہ دین کا۔ بلکہ تابعیت و متبوعیت ہی سے ہمیشہ انتظام درست ہوا ہے۔ اس لئے دین میں بھی بعض کو تابع اور بعض کو متبوع ہونا چاہیے ہر اک کی رائے کو دخل نہ ہونا چاہیے اس پر جمہوریت و شخصیت کی بحث درمیان میں آ گئی کیونکہ جمہوریت والے آزادی کے مدعی ہیں میں نے بتلا دیا کہ وہ بھی اس دعویٰ آزادی سے کسی نہ کسی وقت ہٹتے ہیں اور یہ ساری گفتگو اس پر شروع ہوئی تھی کہ میں نے کہا تھا کہ فقہاء و صوفیا نے اس قاعدہ کا ہمیشہ لحاظ کیا ہے کہ جو مباح مفضی الی المعصیۃ ہو اس سے بھی منع کر دیتے ہیں اس پر میں نے بطور تنبیہ کے یہ کہا تھا کہ اس قاعدہ سے ہر شخص کو کام لینے کا حق نہیں کہ بس لگے مباحات کو حرام کرنے بلکہ یہ خاص خاص محققین کا منصب ہے بہر حال مجاہدات حکمیہ میں جن چیزوں سے روکا جاتا ہے گو وہ فی نفسہ مباح ہیں مگر افضاء الی المعصیت کی وجہ سے صوفیہ نے ان کے ترک کی تاکید کی ہے۔ اور اس مجاہدہ حکمیہ کی چار قسمیں ہیں جن میں سے تین کا ذکر تو ہو چکا۔

منافع اختلاط

اب ایک قسم کا ذکر رہ گیا جو کہ قلت اختلاط مع الانام ہے۔ آج اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے یہ تو میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ قلت کلام کی ضرورت فی نفسہ اس قلت اختلاط سے زیادہ ہے مگر قلت کلام عادۃً موقوف ہے قلت اختلاط پر کیونکہ لوگوں سے میل جول کر کے زبان کو سنبھالنا دشوار ہے اس لئے قلت کلام کی سہل صورت یہی ہے کہ مخلوق سے الگ رہے۔ گوشہ نشینی اختیار کرے کیونکہ مجمع کا قرب بھی اختلاط کی مثل ہے مجمع کے قرب سے بھی سکوت نہیں ہوسکتا۔ اس لئے صوفیہ نے عزلت کو اختیار کیا ہے اور اس کی بہت تاکید کی ہے البتہ سلف کے کلام کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلف میں مجاہدات کا یہ طرز نہ تھا جو متاخرین میں ہے گو اصل سب کی موجود ہے مگر ہیئت مختلف ہے اسی وجہ سے سلف کے کلام میں عزلت اور گوشہ نشینی کی تاکید بہت کم نظر آتی ہے۔ جس

سے معلوم ہوتا ہے کہ سلف میں عزلت کا وہ اہتمام نہ تھا جو متاخرین میں ہے بلکہ وہ اختلاط زیادہ کرتے تھے۔ اسی وجہ ان کے کلام میں منافع اختلاط کا زیادہ ذکر ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اختلاط میں ایک نفع تو یہ ہے کہ تعلیم وتعلم اسی پر موقوف ہے۔ عزلت سے تعلیم وتعلم کا باب مسدود ہو جائے گا دوسرے اختلاط میں خدمت خلق کا موقع ملتا ہے جو شخص سب سے منعزل ہوگا۔ وہ خدمت خلق کی فضیلت سے محروم رہے گا۔ تیسرے جماعت کی فضیلت اختلاط ہی سے حاصل ہو سکتی ہے جو شخص عزلت گزیں ہوگا وہ جماعت کے ثواب سے محروم رہے گا۔ چوتھا نفع اختلاط میں یہ ہے کہ اس سے تواضع پیدا ہوتی ہے جب آدمی مخلوق سے ملے گا تو بہت لوگوں کو اپنے سے افضل پائے گا تو اس شخص کی نظر اپنے اعمال پر کم ہوگی کیونکہ اپنے سے افضل کے اعمال کو دیکھ کر سمجھے گا کہ میں کرتا ہی کیا ہوں اللہ کے بعض بندے مجھ سے زیادہ عمل کرنے والے ہیں اور عزلت میں دوسروں کے اعمال تو پیش نظر ہوتے نہیں بس اپنے ہی اعمال پر نظر ہوتی ہے تو اس سے بعض دفعہ عجب وکبر پیدا ہو جاتا ہے پانچواں نفع یہ ہے کہ اختلاط میں بزرگان دین سے فیض حاصل ہو جاتا ہے بدون اختلاط کے بزرگوں سے فیض حاصل کرنا دشوار ہے۔ اس کے سوا اور بھی منافع اختلاط میں انہوں نے بتلائے ہیں۔

شرائط اختلاط

اب جو لوگ محقق نہیں ہیں وہ سلف کے کلام میں اختلاط کے یہ منافع دیکھ کر ایک غلطی میں مبتلا ہو گئے۔ وہ مطلقاً اختلاط کو عزلت پر ترجیح دینے لگے اور عزت کی مذمت کرنے لگے۔ پھر حالت یہ ہوئی کہ یہ لوگ مخلوق سے اختلاط تو حظ نفس کے لئے کرتے ہیں اور تمسک بزرگوں کے اقوال سے کرتے ہیں یہ نہ دیکھا کہ جس اختلاط کے یہ فضائل سلف نے بیان کئے ہیں۔ وہ کون سا اختلاط ہے کیا یہ وہ اختلاط ہے جس میں تم مبتلا ہو جس سے حظ نفس کے سوا کچھ مقصود نہیں۔ نہ غیبت سے احتراز ہے نہ کذب وزور سے نہ لایعنی باتوں سے پرہیز ہے۔ نہ فضول بک بک سے اس حالت میں بزرگوں کے اقوال وافعال سے ان کا تمسک کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص طبیب کو سنکھیا کے منافع بیان کرتے ہوئے دیکھ کر خود سنکھیا کھانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میاں کھاتے ہی مر گئے۔ یا کسی مریض نے طبیب کو ایک قوی غذا کھاتے ہوئے دیکھا مریض اس کو دیکھ کر خود بھی کھانے

لگے۔ انجام یہ ہوا میاں مرنے کے قریب ہوگئے کیونکہ طبیب نے جو سنکھیا کے منافع بیان کئے تھے اس میں کچھ شرائط و قیود بھی تھیں کہ بدرقہ کے ساتھ استعمال کیا جائے پہلے اس کو مدبر کیا جائے اس شخص کو ان قیود کی تو خبر نہ تھی۔ لگا ویسے ہی استعمال کرنے تو اب بجز ہلاکت کے کیا نتیجہ ہوگا یا طبیب کو جو قوی غذا کھاتے ہوئے دیکھا تھا اس کے لئے معدہ کا تندرست ہونا شرط تھا اور مریض کا معدہ تندرست نہ تھا اس نے اپنے کو طبیب پر قیاس کر کے وہ چیز کھالی ظاہر ہے کہ اس کو ضرر ہو گا۔ اسی طرح جس اختلاط کے منافع بزرگوں نے بیان کئے ہیں اس کے لئے غوائل نفس سے مامون ہونا شرط ہے اور تمہارے اندر یہ شرط مفقود ہے۔ پس تم کو اس باب میں ان کے اقوال سے تمسک کرنے کا حق نہیں کسی نے خوب کہا ہے۔

تو صاحب نفسی اے غافل میاں خاک و خوں میخور
کہ صاحب دل اگر زہرے خورد آں انگبیں باشد

ترجمہ: تو جی دار آدمی ہے غافل خاک وخون نہ کھا کہ صاحب دل تو زہر بھی کھالے شہد بن جاتا ہے اسی لئے نیم ملا خطرہ ایمان ہوتا ہے جیسے عالمگیر کے دربار میں ایک عورت کا مقدمہ پیش ہوا جس نے چار نکاح کر رکھے تھے اور ایک خاوند کو دوسرے کی اطلاع نہ تھی ظالم نے ہر اک سے یہ شرط کر رکھی ہوگی کہ میں سال میں تین مہینہ تمہارے گھر رہوں گی اور نو مہینہ اپنے گھر رہوں گی اور تین مہینہ کے بعد وہ دوسرے خاوند کے پاس رہتی اس کی غالباً یہی شرط تھی پھر تین مہینہ کے بعد تیسرے خاوند کے پاس رہتی۔ ان میں ہر اک یہ سمجھتا تھا کہ شرط کے موافق نو مہینے اپنے گھر رہنے گئی ہے۔ یہ خبر کسی کو نہ تھی کہ یہ اس مدت میں اپنے دوسرے آشناؤں کے پاس جاتی ہے۔ دہلی بڑا شہر ہے وہاں ایسے واقعات کا مخفی رہ جانا کچھ دشوار نہیں۔ مگر کب تک آخر کو بھانڈا پھوٹا۔ اور عالمگیر کے دربار میں یہ واقعہ پیش ہوا۔ عالمگیر کا زمانہ ایسا نہ تھا جیسا آج کل کا زمانہ ہے کہ رضا مندی کے ساتھ زنا پر کوئی مواخذہ ہی نہیں۔ خیر غیر مسلم ایسا قانون مقرر کریں تو کچھ زیادہ تعجب نہیں۔ افسوس یہ ہے کہ آج کل بعض مسلمانوں کی بھی یہی رائے ہے۔ چنانچہ رڑکی میں چند مسلمانوں کا ایک مجمع ہوا تھا جس میں یہ رائے پیش ہو رہی تھی کہ نکاح کی کیا ضرورت ہے خواہ مخواہ کی قید ہے۔ بس جس کو جو عورت پسند آئے وہ اس کو اپنے رضامندی سے رکھ لے۔ جب دوسری پسند آئے پہلی کو الگ کر کے دوسری کو رکھ لے۔ اسی طرح اپنی خواہش کو پورا کر لینا چاہیے جس میں طرفین کو آزادی ہے

کوئی کسی کا پابند نہیں نہ کسی قسم کی قید ہے۔ آج کل مسلمانوں میں بھی یہ رائے رکھنے والے موجود ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ مگر عالمگیر اس خیال کے مسلمان نہ تھے۔ وہ نہایت پابند شریعت تھے لوگ کہتے ہیں کہ سلطنت کا زوال عالمگیر سے ہوا کہ تمام راجاؤں کو اپنا مخالف بنالیا۔ رعایا کو بددل کردیا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ سلطنت کا زوال عالمگیر سے نہیں ہوا بلکہ اکبر نے اس کو زائل کیا ہے۔ اس نے غیر قوموں کو سلطنت میں دخیل کار بنا کر ان کے ہاتھوں میں سلطنت کی باگ دیدی تھی۔ اگر غیر قوموں کا یہی اقتدار باقی رہتا تو ایک نہ ایک دن سلطنت پر ضرور زوال آتا۔ عالمگیر نے اس کی اصلاح کرنا چاہی تھی۔ اور غیر قوموں کے اقتدار کو کم کرنا چاہا تھا۔ اگر سب مسلمان اس میں ان کا ساتھ دیتے تو سلطنت کی بنیاد مستحکم ہوجاتی مگر افسوس مسلمانوں ہی نے اس میں مخالفت کی اور عالمگیر کا ساتھ نہ دیا۔ اس لئے ہندوؤں کی بغاوت کو ترقی ہوگئی تو بتلایئے اس میں عالمگیر کی کیا خطا ہے قصور اس شخص کا ہے جس نے سلطنت میں غیروں کو دخل دیا۔ دیکھئے اگر کوئی شخص کسی کو سوئی کھلا دے اور وہ پیٹ میں جا کر زخم ڈالدے اور ایک ڈاکٹر سوئی نکالنے کے لئے اس کا آپریشن کرے اور اپریشن کر کے پیٹ میں ٹانکے لگا دے مگر اس شخص کی انگڑائی لینے سے ٹانکے ٹوٹ جائیں جس کے صدمہ سے وہ ہلاک ہوجائے تو آپ کیا کہیں گے کیا یہ کہیں گے کہ ڈاکٹر نے اس کو ہلاک کیا یا یہ کہیں گے کہ سوئی کھلانے والے نے ہلاک کیا۔ یقیناً ہر عاقل سوئی کھلانے والے کو قاتل کہے گا۔ ڈاکٹر کی خطا کوئی نہ بتلائے گا۔ اس بیچارہ نے تو صحت کی تدبیر کی تھی۔ اگر وہ اپریشن نہ کرتا جب بھی سوئی کے پیٹ میں ہونے سے وہ ضرور ہلاک ہوتا اور اپریشن کے بعد ٹانکے نہ ٹوٹتے تو ساری عمر کے لئے صحت ہو چکی تھی۔ اس نے تو احسان کیا تھا مگر اس کی انگڑائی سے نقصان ہوگیا یہی حال اکبر و عالمگیر کا ہے۔ اکبر نے سلطنت کے پیٹ میں ایک سوئی چبھا دی تھی جس سے ناسور پڑ گیا تھا عالمگیر نے شریعت کی طب پڑھی تھی اس نے شریعت کے موافق آپریشن کر کے ناسور کو صاف کیا تھا پھر ٹانکے لگا دیئے مگر مسلمانوں کی مخالفت نے ٹانکوں کو توڑ دیا۔ اس لئے سلطنت پر زوال آیا۔ اگر سب متفق ہو کر عالمگیر کا ساتھ دیتے تو زوال کی کوئی وجہ نہ تھی۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا بہر حال مقدمہ پیش ہوا اور وہ عورت طلب کی گئی ایک طالب علم نے اس عورت سے کچھ رقم لینا کی اور رہائی کی تدبیر بتلائی کہ تو یہ کہہ دینا کہ میں نے ایک مولوی صاحب کو وعظ میں یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ لوگ فضول حرام کاری کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے تو چار نکاح تک

کی اجازت دی ہے۔ اور اگر یہ دریافت کیا جائے کہ مولوی صاحب نے یہ اجازت مردوں کے لئے بیان کی تھی یا عورتوں کے لئے تو کہہ دینا کہ بس میں نے اتنا ہی سنا تھا کہ پھر میں ساگ لینے چلی گئی۔ میں نے تو اس اجازت کو عام ہی سمجھا تھا۔ تو جیسے یہ طالب علم نیم ملا خطرۂ ایمان تھا اس نے چار نکاحوں کی اجازت کو عام کر دیا ایسے ہی وہ لوگ بھی نیم ملا ہیں جو اختلاط کے منافع کو عام کرتے ہیں اور بزرگوں کے اقوال میں منافع اختلاط کا ذکر دیکھ کر اپنے نفسانی اختلاط کو اس میں داخل کرتے ہیں۔ حالانکہ اختلاط زہر ہے۔

قیاس بے جا

اور سنکھیا کھانے کا طبیب ہی کو حق ہے کیونکہ اس کے پاس تریاق بھی ہے تم کو یہ حق نہیں تم اپنے کو اس پر قیاس نہ کرو مولانا فرماتے ہیں۔

لقمۂ و نکتہ است کامل را حلال — تو نئی کامل مخورمی باش لال

یعنی بعض غذائیں ایسی ہیں جو کامل کے لئے حلال ہیں۔ تمہارے واسطے حلال نہیں تم ان کو نہ کھاؤ ایک جگہ دونوں میں فرق بتلاتے ہیں۔

ایں خورد گرد د پلیدی زوجدا — واں خورد گرد ہمہ نور خدا

(یہ کھاتا ہے تو پلیدی اور گندگی باہر نکلتی ہے اور وہ کھاتا ہے تو اس سے سب نورِ خدا بنتا ہے)

تم کھاؤ گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ساری غذا گندگی بن جائے گی۔ اور کامل کھاتا ہے تو سب کا سب نور بن جاتا ہے۔ مجھے اس شعر پر شبہ ہوا تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے کیا بزرگوں کا پاخانہ نہیں ہوتا جیسے ہمارے یہاں لوگ ایک بزرگ کو حضرت حضرت کہتے تھے۔ تو ایک بڑھیا ہمارے گھر میں آ کر کہنے لگی کہ اے بھولوگ فلانے کو حضرت حضرت کہتے ہیں میں یوں پوچھوں کہ حضرت کہیں ہگا بھی کریں ہیں۔ تو اس بڑھیا کے نزدیک حضرت بننے کے لئے یہ شرط تھی کہ وہ ہگا نہ کریں تو مجھے حیرت تھی کہ کیا اس شعر کا بھی وہی مطلب ہے جو اس بڑھیا کا اعتقاد تھا۔ پھر ہم حضرت حاجی صاحب کے پاس سبق پڑھنے کے لئے گئے تو حضرت نے فرمایا۔

ایں خورد گرد د پلیدی زوجدا — واں خورد گرد ہمہ نور خدا

(یہ کھاتا ہے تو پلیدی اور گندگی باہر نکلتی ہے اور وہ کھاتا ہے تو اس سے سب نورِ خدا بنتا ہے)

یعنی اخلاق رذیلہ پیدا ہوتے ہیں — یعنی اخلاق حمیدہ ہویدا ہوتے ہیں

اب معلوم ہوا کہ یہ مطلب نہیں کہ بزرگوں کو پاخانہ نہیں ہوتا بلکہ مطلب یہ ہے کہ ناقص ایک غذا کو کھاتا ہے تو اس میں اخلاق رذیلہ پیدا ہوتے ہیں اور کامل اسی کو کھاتا ہے تو اس میں اخلاق حمیدہ ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ فرق ہے تمہارے کھانے میں اور بزرگوں کے کھانے میں اسی طرح مجھے مثنوی کے ایک اور شعر پر اشکال ہوا تھا مولانا نے اول ایک تمثیل کے ضمن میں مسئلہ وحدۃ الوجود کی طرف اشارہ فرمایا ہے چنانچہ کہتے ہیں۔

ماہمہ شیراں ولے شیر علم　　　حملہ شاں از باد باشد دمبدم

کہ ہم بھی ظاہر میں شیر معلوم ہوتے ہیں مگر ہم ایسے شیر ہیں جیسے جھنڈے پر شیر کی تصویر بنی ہوتی ہے کہ جب ہوا سے جھنڈا ہلتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا شیر حملہ کر رہا ہے اس کے بعد فرماتے ہیں۔

حملہ شاں پیدا و ناپید است باد　　　انچہ ناپیدا ست ہرگز کم مباد

یعنی شیر علم کا حملہ تو ظاہر ہوتا ہے اور ہوا مخفی ہوتی ہے اور حقیقت میں اس حملہ کا ظہور اسی سے ہو رہا ہے اسی طرح ہم لوگ ظاہر میں فاعل مختار معلوم ہوتے ہیں مگر ہم کو جو حرکت دے رہا ہے وہ مخفی ہے یعنی حق تعالیٰ تو ناپیدا سے مراد یہاں حق تعالیٰ ہیں۔

ضرورت محقق

اب آگے فرماتے ہیں کہ وہ جو پیدا ہے خدا کرے وہ کم نہ ہو۔ تو میں یہ سمجھا کہ اس میں ظاہراً تو خدا تعالیٰ کو دعا دینا لازم آتا ہے کہ ان کے کمالات میں کمی نہ آوے تو مجھے حیرت تھی کہ خدا تعالیٰ کو یہ دعا کیسی یہ تو ویسی ہی دعا ہوئی جیسے کانپور میں جاہل عورتیں حق تعالیٰ کی سلامتی گایا کرتی ہیں۔ بعضی خاصی رات ہوتی ہے۔ جس میں رت جگا کرتی ہیں۔ اس میں یہ فرقہ خدا تعالیٰ کی سلامتی منایا کرتا ہے۔ مگر چونکہ وہ محبت میں یہ مضمون گاتی ہیں اس لئے شاید مواخذہ بھی نہ ہو جیسے کانپور میں مجھ سے ایک یورپ کے رہنے والے صاحب نے ایک عجیب حکایت بیان کی تھی کہ ایک جاہل سنی کہیں غالی شیعہ کی مجلس میں پھنس گیا تھا۔ وہاں ظالموں نے ایک نقل بنا رکھی تھی بہت سے پتلے تیار کئے تھے جن میں کسی کا نام امام حسینؓ تھا کسی کا نام امام حسنؓ تھا۔ کسی کا نام حضرت علیؓ تھا۔ ایک پتلہ کا نام حضرت فاطمہ تھا۔ ایک پتلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب تھا اور ایک سب سے بڑا پتلہ تھا۔ نعوذ باللہ وہ خدا کا پتلہ تھا۔ پہلے حضرت حسینؓ کا پتلا لایا گیا اور صدر مجلس جو کہ مجتہد بنا ہوا تھا اس سے پوچھا کہ ان کے واسطے کیا حکم ہے اس نے کہا کہ سارا فساد انہی کا ہے۔ انہوں نے خواہ مخواہ

یزید سے بغاوت کی اوراس کی فوج سے مقابلہ کیااورسارے خاندان اہل بیت کوتباہ و برباد کیا اگر تقیہ کر لیتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔لہذا ان کی گردن ماردو۔ پھرامام حسن کا پتلہ آیاان کے واسطے کیا حکم ہے۔کہا یہی تو بانی فساد ہیں۔انہوں نے اپنے کوخلافت سے معزول کر کے (حضرت) معاویہ کو خلافت سونپ دی جبھی تو یزید کوسلطنت ملی اوراسے خاندان نبوت کے برباد کرنے کا موقع ملا۔اگر یہ اپنے کوخلافت سے معزول نہ کرتے تو یزید کو یہ موقع کیوں ملتا۔لہذاان کی بھی گردن ماردو پھر حضرت علی کا پتلہ آیا کہ ان کے واسطے کیا حکم ہے کہاارے سارا بیج فساد انہی کا بویا ہوا ہے انہوں نے (حضرت) ابوبکر وعمر کا ساتھ دیااوران کے زمانہ میں خلافت بلافصل کا دعویٰ نہ کیا۔جس سے خلافت دوسروں کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔توانہوں نے امیر معاویہ کوشام کا حاکم بنادیا جس کی بدولت حضرت علی سے مقابلہ کی ان کو ہمت ہوئی۔اگر یہ اول ہی سے خلافت بلافصل کا دعویٰ کرتے تو غیروں کو یہ حوصلہ نہ ہوتا کہ وہ اہل بیت کے مقابلہ میں سراٹھائیں۔لہذاان کی بھی گردن ماردو۔ پھر حضرت فاطمہ کا پتلا لایا گیا کہ ان کے واسطے کیا حکم ہے کہا یہ اپنے اباجان سے دعا کرا کے سب کچھ کرا سکتی تھیں۔ان کو معلوم تھا کہ حسین شہید ہوں گے پھر بھی انہوں نے دشمنوں کے واسطے بددعا نہ کرائی۔یہ بھی قصوروار ہیں۔ان کی بھی گردن ماردو۔ پھر (نعوذ باللہ) حضورؐ کا پتلہ آیا کہ ان کے واسطے کیا حکم ہے کہا یہی تو سب سے بڑے قصوروار ہیں (نعوذ باللہ) یہ تو خداتعالیٰ سے کہہ کر سب کچھ کرا سکتے تھے مگر باوجود شہادت حسین کے علم کے انہوں نے کچھ نہ کیا۔لہذا حضور کے پتلہ کے واسطے بھی وہی حکم ہوا جواوروں کے واسطے ہوا تھا۔سنی بیچارہ یہ خرافات دیکھ دیکھ کر دل میں پیچ وتاب کھا رہا تھا۔حیران تھا کہ یہ کیا قصہ ہے۔سب کے بعد وہ لمبا پتلا لایا گیا جونعوذ باللہ خدا کا پتلہ تھا پوچھاان کے واسطے کیا حکم ہے مجتہد نے کہاارے یہ تو سب کچھ کر سکتے تھے۔سارے عالم کے خدا تھے۔ان کے قبضہ میں تو سب کچھ تھا مگر انہوں نے قصداً امام حسین کوشہید کرایااور یزید کا ساتھ دیا۔ پھراس کے لئے بھی وہی حکم ہوا جواوروں کے واسطے ہوا تھا جب اس پتلہ کی گردن مارنے کو لے چلے توسنی سے نہ رہا گیاوہ غریب سمجھا کہ سچ مچ یہی خدا ہے اسے فکر ہوئی کہ جب اللہ میاں نہ رہے تو پھر بارش کون دے گا۔روزی کون دے گااولاد کون دے گا۔بس جوش محبت میں اٹھ کر وہ پتلہ شیعہ کے ہاتھ سے چھین یہ جاوہ جا۔شیعہ لاٹھیاں لے کراس کے پیچھے دوڑے کہ ہماری مجلس میں یہ غیر کون آ گیا۔مگر وہ کسی کے ہاتھ نہ آیا۔قریب ہی سنیوں کی بستی تھی۔انہوں نے جوشور سنا باہر

نکل آئے اور دیکھا کہ ایک سنی کے مارنے کو شیعہ آ رہے ہیں لوگوں نے سنی کو بچالیا۔ شیعہ بھی سنیوں کی جمعیت دیکھ کر لوٹ گئے۔ اب لوگوں نے اس پردیسی کو تسلی دی کہ تم مطمئن رہو خدا کا شکر ہے کہ اس نے تم کو ان موذیوں سے بچالیا تو وہ کہتا ہے کہ واہ میں نے ہی خدا کو بچالیا وہ مجھے کیا بچاتے۔ میں نہ ہوتا تو شیعہ ان کو بھی مار ڈالتے۔ لوگوں نے کہا توبہ کرتوبہ کر کمبخت کیا کہتا ہے تو خدا کو کیا بچاتا اور انہیں کون مار سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ پتلہ جو میں لے کر بھاگا ہوں یہی تو خدا ہے میں نے اسے بچالیا شیعہ اسے مارے ڈالتے تھے۔ لوگوں نے سمجھایا کہ یہ غلاۃ شیعہ کی شرارت تھی یہ سب پتلے ان کے بنائے ہوئے اور گھڑے ہوئے تھے۔ بھلا خدا کا بھی کہیں پتلا ہوسکتا ہے اسے تو کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا۔ چہ جائیکہ وہ ان کے ہاتھوں میں آ جائے۔ تب اس کی تسلی ہوئی اور سمجھا کہ یہ جھوٹ موٹ کی نقل تھی۔ اور یہ پتلہ خدا نہیں ہے تو اس بیچارہ نے تو محبت ہی میں یہ فعل کیا تھا گو جاہل تھا۔ شاید اس پر مواخذہ نہ ہو اور محبت کی وجہ سے بخش دیا جاوے ایسے ہی کان پور میں محبت کی وجہ سے خد کی سلامتی گائی جاتی ہے شاید اس پر بھی مواخذہ نہ ہو۔ مگر مولانا پر حیرت تھی کہ عالم ہو کر خدا کو دعا کیسی دی جاتی ہے اس کے بعد شیخ محقق کی خدمت میں چلے جب یہ شعر پڑھا۔

انچہ ناپید است یارب کم مباد

حاجی صاحب نے فرمایا اے ازدل ما۔ بس جان ہی تو پڑ گئی شعر میں۔ اب معلوم ہوا کہ یہ خدا کو دعا نہیں دی بلکہ اپنے واسطے دعا کی ہے کہ وہ جو ناپیدا ہے خدا کرے وہ ہمارے دل سے کم نہ ہو۔ یعنی اس کی یاد ہمارے دل سے کم نہ ہو۔ واقعی محقق کی ضرورت قدم قدم پر ہے۔

تقلید بلا عقل

اسی طرح مجھے مثنوی کے ایک اور شعر کی تفسیر میں تحیر تھا۔ مصداق متعین نہ ہوتا تھا۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

نکتہ ہا چوں تیغ پولادست تیز   چوں نداری تو سپر واپس گریز
پیش ایں الماس بے اسپر میا   کز بریدن تیغ را نبود حیا

میں سوچتا تھا کہ سلوک میں باریک نکات کا ہونا تو مسلم مگر سپر کیا چیز ہے حاجی صاحب نے فرمایا کہ سپر سے مراد فہم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان باریک نکات کے لئے فہم صحیح کی ضرورت ہے۔ اگر فہم سلیم حاصل ہے تو حقیقت کو سمجھ جاؤ گے اور اگر فہم نہیں تو پھر بے سمجھے پوچھے بزرگوں کی تقلید کرو گے کہ جو کام دوسروں کو کرتے دیکھا خود بھی کرنے لگے۔ پھر اس تقلید کا وہ انجام ہوگا جو بندر کی تقلید کا

انجام ہوا تھا کہ ایک بندر کسی حجام کا استرہ لے کر بھاگ گیا تھا۔ حجام بڑا پریشان ہوا کہ اس سے کس طرح چھینوں اس نے یہ عقلمندی کی کہ دوسرا استرہ نکال کر آہستہ آہستہ اپنی ناک پر پھرایا۔ بندر کو اتنی عقل کہاں جو اس فعل کی حقیقت سمجھتا اس نے بھی تقلید کی اور استرہ کو زور سے اپنی ناک پر پھیرا۔ جس سے ناک کٹ گئی پھر تو بڑا گھبرایا اور استرہ کو وہیں ڈالکر چلاتا ہوا بھاگا۔ حجام نے اپنا استرہ اٹھالیا تو بدون عقل کے تقلید کا یہ انجام ہوتا ہے اس لئے بزرگوں کے افعال کی تقلید کے لئے عقل کی بہت ضرورت ہے شاید اس پر یہ شبہ ہو کہ اس سے تو تقلید جو عمل میں تقلید ہو بلا دریافت اس کی بناء صحیح کے جیسے ایک صوفی سفر میں کسی خانقاہ میں ٹھہرا۔ ان لوگوں پر کئی وقت کا فاقہ تھا۔ انہوں نے رات میں خادم کو غافل پاکر صوفی کا گدھا کھول کر بازار میں بیچ دیا اور خوب کھایا پیا۔ اور صوفی کی بھی دعوت کی اور کھانے کے بعد قوالی ہوئی اور قوال سے فرمائش کردی کہ یہ شعر پڑھو ؎

خر برفت و خر برفت و خر برفت   خر برفت و خر برفت و خر برفت

(گدھا چلا گیا گدھا چلا گیا گدھا چلا گیا)

اور چونکہ سب کھانا پینا اسی خر برفت کی بدولت تھا اس خوشی میں صوفیوں پر حال بھی طاری ہو گیا۔ اور سب یہی کہنے لگے۔

خر برفت و خر برفت و خر برفت

گدھے کا مالک بھی یہی کہہ رہا تھا۔ صبح کو جو دیکھا تو گدھا ندارد۔ خادم سے پوچھا اس نے کہا وہ تو رات سے غائب ہے اور میں نے حضور کو اطلاع کرنا چاہی تھی مگر آپ خود ہی کہہ رہے تھے۔

خر برفت و خر برفت و خر برفت

(گدھا چلا گیا گدھا چلا گیا گدھا چلا گیا)

میں سمجھا کہ آپ کو کشف سے اطلاع ہو چکی ہے اس لئے خاموش واپس آ گیا کہنے لگا۔ کمبخت مجھ کو کیا خبر تھی میں تو اوروں کی تقلید میں کہہ رہا تھا۔

تقلید بعد از تحقیقات

بس ایسی تقلید کو مولانا فرماتے ہیں۔

خلق راتقلید شاں برباد داد   کہ دو صد لعنت بریں تقلید باد

ترجمہ: مخلوق کو ان کی تقلید نے برباد کیا پس ان کی اس تقلید پر دو سو لعنتیں ہوں۔ اس سے بعض

غیر مقلدین نے تقلید کی مذمت پر استدلال کیا ہے میں نے کہا کہ مولانا نے مطلق تقلید پر لعنت کہاں کی ہے۔ بلکہ وہ تو خاص قسم کی تقلید پر لعنت فرماتے ہیں یعنی خر برفت جیسی تقلید پر جس میں ایک فعل کی تقلید تھی بدون دریافت حال کے چنانچہ یہ نہیں فرمایا کہ لعنت بر تقلید باد۔ بلکہ یہ فرمایا کہ لعنت بریں تقلید باد اور ہم جو بزرگوں کی تقلید کرتے ہیں وہ ایسی تقلید نہیں ہے بلکہ بناء صحیح کی تحقیق کے بعد ہے اس لئے وہ اس شعر کا مصداق نہیں۔ لہذا اس شعر سے غیر مقلدین کو مقلدین کے مقابلہ میں احتجاج کا حق نہیں۔ الغرض بعض لوگوں نے اختلاط تو اختیار کر رکھا ہے حظ نفس کیلئے اور بزرگوں کے اقوال کو سند بنا لیا ہے یہ ان کی غلطی ہے بہر حال اسی تفاوت حالت کے سبب سلف کا اصل مذاق اختلاط ہے۔

ترجیح عزلت

اور متاخرین نے عزلت کو ترجیح دی ہے اور اس کے منافع کثیرہ بیان فرماتے ہیں جن میں ایک نفع یہ ہے کہ عزلت میں گناہوں سے اجتناب ہوتا ہے بشرطیکہ ایسی عزلت نہ ہو کہ تنہائی میں رہ کر روشندان سے عورتوں کو گھورا کرے بلکہ ایسی عزلت ہو جس میں نگاہ کی بھی حفاظت کرے۔ کان کی بھی حفاظت کرے دل کی بھی حفاظت کرے کہ قصداً کسی غیر کا خیال دل میں نہ لائے۔ اگر آ جائے تو ذکر میں مشغول ہو کر اسے دفع کر دے۔ ایسی عزلت میں واقعی گناہوں سے بہت حفاظت ہو گی۔ اور ظاہر ہے کہ دفع مضرت مقدم ہے۔ جلب منفعت پر تو عزلت اختلاط پر مقدم ہے۔ کیونکہ اختلاط میں گو منافع بہت ہیں مگر ساتھ ہی مضرت بھی ہے کہ اس میں اکثر گناہ ہو جاتے ہیں۔ شیخ سعدی اس پر ایک حکایت فرماتے ہیں ۔

بزرگے دیدم اندر کوہسارے نشستہ از جہاں در کنج غارے
چرا گفتم بشہر اندر نیائی کہ بارے بندے از دلبر کشائی
بگفت آنجا پری رویاں نغزند چو گل بسیار شد پیلاں بلغزند

تو اس بزرگ نے اختلاط کی بھی مضرت بتلائی کہ اس میں نامحرم پر نگاہ پڑ جاتی ہے۔ جس سے بعض دفعہ سنبھلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اسی لئے بعضے بزرگ منہ پر چادر لپیٹ کر سر جھکا کر چلتے ہیں کسی طرف نہیں دیکھتے بلکہ زمین پر نگاہ رکھتے ہیں لوگوں نے اور اس کی وجہ میں بعض نے فرمایا ہے کہ شیطان ہر طرف سے انسان کے پاس آ سکتا ہے مگر نیچے اور اوپر سے نہیں آ سکتا اور اوپر نگاہ رکھنا ہر وقت دشوار ہے۔ اس لئے میں نگاہ نیچی رکھتا ہوں۔ قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

قرآن میں شیطان کے قول کی حکایت کی گئی ہے۔ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ شیطان نے حق تعالیٰ سے کہا کہ میں بنی آدم کے پاس سامنے سے آؤں گا اور پیچھے اور دائیں سے اور بائیں سے۔ اس میں صرف چار جہت کا ذکر ہے فوق وتحت مذکور نہیں۔ معلوم ہوا کہ فوق وتحت سے شیطان نہیں آ سکتا (مگر فوق سے مراد وہ ہے جو کہ بالکل تحت کا مقابل ہو جس میں جہت قدام کا شائبہ بھی نہ ہو تو یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ اوپر نگاہ کرنے سے تو اکثر نامحرموں پر نظر پڑ جاتی ہے جواب یہ ہے کہ نگاہ اگر بالکل اوپر ہو تو نظر صرف آسمان پر پڑے گی اور وہاں کوئی نامحرم نہیں۔ ہاں نگاہ اونچی کر کے جب سامنے بھی نظر کو دوڑایا جائے گا تب البتہ شیطان کو موقع ملے گا۔ خوب سمجھ لو ۱۲ جامع)

احتیاط از امتیاز

بہرحال بزرگوں نے زمین پر نگاہ رکھنے کی تاکید کی ہے ہاں اگر اس سے امتیاز کی شان پیدا ہونے لگے تو ہمارے مشائخ کا طرز یہ ہے کہ وہ امتیاز سے بچتے ہیں ایسی ہیئت سے نگاہ نیچی نہیں کرتے کہ گردن بھی جھک جائے۔ بلکہ معمول کے موافق چلتے ہیں اور نگاہ نیچی رکھتے ہیں۔ نگاہ کے جھکانے کے لئے گردن جھکانے کی کیا ضرورت ہے پس امتیازی شان نہ بنانا چاہیے۔ اسی لئے ہمارے بزرگ نہ عبا پہنتے ہیں نہ چونہ نہ صدری کہ اس سے آدمی خواہ مخواہ دوسروں سے ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ صدری میں آج کل ہماری جماعت میں اختلاف ہے بعض اس کی ضرورت سمجھتے ہیں اور میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک یہ زائد چیز ہے۔ ہمارے مدرسہ میں کیرانہ کا ایک لڑکا صدری پہنتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کی کیا ضرورت ہے اس نے یہ ضرورت بتلائی کہ کرتہ پھٹ رہا ہے اس سے کم نظر آتی ہے میں نے کہا کہ پھر تم صدری کو کرتہ کے نیچے پہنو یہ ضرورت پوری ہو جائے گی کرتہ کے اوپر پہننا تو محض زینت کے لئے ہے یہ تو ایک امتیازی شان ہو گئی ہے ہم نے اپنے اکابر کو صدری پہننے کا عادی نہیں دیکھا۔ یہ رواج عموم ولزوم کے ساتھ آج کل ہی نکلا ہے۔ اور اس وجہ سے لوگوں نے علماء کا خاص ایک امتیازی شعار بنا لیا ہے جس سے ہمارے اکابر بچتے تھے چنانچہ اگر کسی وقت عزلت سے تنگی ہونے

قلت ولكن في لبسه فوق القميص من سهولة النزاع وقت الحر وغيره ماليس في لبسه تحته ولذالم يحتاطوا في الصدرى المحشو بالقطن واجازوا لبسه فوق القميص لاجل تلك العلة بعينها و بالجملة ففي كونه داخلا في مالا يعني نظر لما بخلاف في قبحه اذا لبسه لمحض الزينة بدون الحاجة والله اعلم ۱۲ جامع و كذا اذا خيف على المبتدى وقوعه من الحاجة الى الزينة فالشيخ سادا للباب مادام شدا الخوف و هذا على راى الشيخ ۱۲ اشرف على

لگے تو ہمارے اکابر عزلت بھی اختیار نہ کرتے تھے بلکہ اختلاط کے ساتھ زبان کی حفاظت کرتے تھے مگر یہ کام صدیقین کا ہے کہ اختلاط کے ساتھ بھی کوئی بات خلاف شرع نہ کرے بحمد اللہ ہمارے اکابر نے ایسا بھی کر کے دکھلا دیا ہے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اکثر اوقات لوگوں میں بیٹھے رہا کرتے تھے تنہائی کے خاص اوقات تھے زیادہ وقت مولانا کا مجلس ہی میں گزرتا مگر باوجود اختلاط کے باتیں بہت کم کرتے تھے مجلس میں بیٹھے ہوئے اکثر درود شریف پڑھتے رہتے تھے مگر جب باتیں کرتے تھے تو دریا بہتا تھا۔ پھر خاموش ہو جاتے تھے بعض لوگوں کو یہ خاموشی ناگوار تھی مولانا کی شکایت کرتے تھے کہ بڑے روکھے ہیں ہم گھنٹوں بیٹھے رہے دو چار بات کے سوا کوئی بات ہی نہیں کی۔ میں نے دل میں کہا کہ تم بڑے سوکھے ہو جو مولانا کو روکھا بتلاتے ہو یا بہت تر ہو کہ ڈوبنے کے قابل ہو۔

انضباط اوقات

بس تمہارے نزدیک بڑا سخی اور با اخلاق وہ ہے جو اپنا قیمتی وقت ضائع کرتا رہے۔ افسوس اگر سفید چمڑے والے وقت کا انضباط کریں تو اس میں حکمت ہے انتظام ہے اور مولوی وقت کا انضباط کریں تو بد خلقی ہے روکھا پن ہے۔ آخر دونوں میں فرق کیا ہے بس یہی فرق ہے نہ کہ وہ امیر ہیں۔ اور مولوی غریب ہیں۔ امیروں کی ہر بات اچھی معلوم ہوتی ہے گو بری ہی کیوں نہ ہو اور غریبوں کی اچھی بات بھی بری معلوم ہوتی ہے جیسے ایک غریب نے کہا تھا کہ آج کل غریبوں کی ایسی ذلت ہے کہ امیر گوز مارے تو کہتے ہیں مبارک ہو صحت ہوئی۔ سلامتی ہوئی اور غریب گوز مارے تو کہتے ہیں بڑا بد تہذیب ہے دماغ سڑا دیا واقعی بات تو یہی ہے۔

اس پر اگر کوئی یوں کہے کہ صاحب انگریز تو ہم سے مستغنی ہیں وہ اگر اپنے وقت کا انضباط کریں تو ان کو حق ہے مگر مولویوں کو کیا حق ہے کہ یہ ہم سے اینٹھیں اور بات بھی نہ کریں یہ تو چندہ کے لئے ہمارے گھروں پر آتے رہتے ہیں۔

چندے کا احسان

میں کہتا ہوں کہ لعنت ہے ایسے چندہ پر جس کی وجہ سے لوگ علماء سے یہ توقع رکھیں کہ وہ ان کی آواز پر حاضر ہو جایا کریں جو لوگ اس غرض سے چندہ دیتے ہیں مہربانی کر کے وہ اپنے چندہ کو اپنے گھر رکھیں علماء اپنے واسطے چندہ نہیں کرتے بلکہ دینی کاموں کے واسطے کرتے ہیں اور دین سب مسلمانوں کا ہے تنہا مولویوں کا نہیں ہے پس علماء کا تم پر یہ احسان ہے کہ وہ تمہارا مال دین کے کام میں لگا دیتے ہیں تمہارا ان پر کیا احسان ہے تمہارا احسان جب ہوتا جب تم ان کے ذات خاص کے

واسطے چندہ دیتے۔ مگر جب تم خدا کے واسطے اور دین کے کاموں کے واسطے دیتے ہو تو یہ اپنے کام کے واسطے دینا ہوا تو اس دینے کا مولویوں پر کیا احسان ہے۔ اور اس کی وجہ سے تم کو کیا حق ہے کہ مولویوں سے اپنی تعظیم وتکریم کی امید رکھو اور یہ کہ وہ تمہاری خاطر سے اپنا قیمتی وقت ضائع کیا کریں اور یہ ساری خرابی اس کی ہے کہ علماء آج کل چندہ دینے والوں کا لمبے چوڑے القاب سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ مجھے تو یہ طرز بہت ناگوار ہے۔ آخر علماء پر انہوں نے کیا احسان کیا ہے جس کا وہ شکریہ ادا کرتے ہیں ہاں دعا دینے کا مضائقہ نہیں یہ تو نص سے ثابت ہے خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۚ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لیجئے آپ (ان کو گناہ کے آثار سے) پاک وصاف کردیں گے اور ان کیلئے دعا کیجئے بلاشبہ آپ کی دعا ان کیلئے موجب اطمینان ہے)

وفی الحدیث انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللھم صل علی آل ابی اوفیٰ اھ (الصحیح للبخاری ۲:۱۵۹، الصحیح لمسلم کتاب الزکوٰۃ: ۱۷۶، سنن النسائی کتاب الزکوٰۃ: ۷) پس جب کوئی چندہ دیا کرے اس کے حق میں اس طرح دعا کرنے کا مضائقہ نہیں کہ حق تعالیٰ آپ کے چندہ کو قبول فرمائے اس کا اجر دے آپ کے دین ودنیا میں ترقی دے۔ اعمال صالحہ کی توفیق بڑھائے وغیر ذلک لیکن شکریہ ادا کرنے کے کیا معنی۔ اس کا تو مطلب یہ ہے کہ چندہ دینے والوں نے مولویوں پر کچھ احسان کیا ہے تو کیا یہ چندہ تمہارے گھر کے خرچ کے لئے دیا ہے یا تمہارا ارادہ اس کو اپنے خرچ میں لانے کا ہے۔ جب یہ نہیں تو آپ پر کیا احسان۔ اگر احسان کیا ہے تو دینے والے نے اپنی ذات پر احسان کیا ہے کہ ثواب کے لئے خدا کے کام میں اپنا مال خرچ کرتا ہے اس صورت میں تو چندہ دینے والوں کو علماء کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ وہ ان کا روپیہ اچھے مصرف میں لگا رہے ہیں۔ الثاتم کیوں شکریہ ادا کرتے ہوئے ۱۲ جامع) اس سے لوگوں کے دماغ خراب ہوگئے ہیں اور وہ علماء کے اس شکریہ سے (جس کا منشاء ان کی تواضع ہے ۱۲) یہ سمجھ گئے کہ سچ مچ ہم نے کچھ ان پر احسان کیا ہے۔ بس اب وہ اس کے منتظر رہنے لگے کہ علماء ہماری تعظیم وتکریم بھی کریں۔ ہمارے لئے اپنے گھنٹے بھی ضائع کیا کریں۔ حالانکہ حقیقت میں ان کو اس کا کچھ حق نہیں کیونکہ میں بتلا چکا کہ اس چندہ سے وہ علماء پر کچھ بھی احسان نہیں کرتے۔ انصاف سے بتلاؤ اگر کسی وقت گورنمنٹ اپنی کسی ضرورت کے لئے رعایا سے چندہ طلب کرے اور تحصیلدار وغیرہ کو

چندہ وصول کرنے کے لئے مامور کرے تو کیا اس وقت بھی آپ یہ سمجھیں گے کہ تحصیلدار پر ہم نے احسان کیا ہے اس لئے ان کو ہماری خاطر مدارات اور تعظیم وتکریم کرنی چاہیے ہرگز نہیں بلکہ وہاں تو آپ چندہ بھی دیں گے اور تحصیل دار صاحب کو نذرانہ بھی دیں گے اور اگر وہ نذرانہ قبول کرلیں تو ان کا احسان سمجھیں گے اس کا کبھی وسوسہ بھی نہ آئے گا کہ تحصیلدار پر ہم نے کچھ احسان کیا ہے پھر علماء کو چندہ دے کر آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ ان پر احسان ہوا۔ بس یہی تو فرق ہے کہ حکام دنیا کی قلوب میں وقعت ہے اور دین کی وقعت نہیں۔ اگر کسی درجہ میں آپ کی یہ بات معقول بھی ہو تب بھی آپ کو سب علماء سے یہ امید رکھنے کا حق نہیں کہ وہ آپ کی تعظیم وتکریم کریں۔ اور تمہارے لئے اپنا وقت ضائع کریں اگر کچھ حق ہے تو ان علماء پر ہے جو تم سے چندہ مانگتے ہیں اور جو چندہ نہیں مانگتے ان سے یہ امید رکھنے کا آپ کو کیا حق ہے اور اگر وہ انضباط اوقات کریں تو ان کی شکایت کیوں کی جاتی ہے۔ یہاں سے ان لوگوں کی حماقت ظاہر ہوگئی جو مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی کم گوئی پر اعتراض کرتے تھے۔ آخر مولانا ان کی وجہ سے اپنا وقت ضائع کیوں کرتے وہ کب اور کس دن ان سے چندہ مانگنے آئے تھے۔

ایک تحصیلدار صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے گیا تھا اس وقت چارپائی پر لیٹے ہوئے جاگ رہے تھے مگر مجھے دیکھ کر آنکھیں بند کرلیں منہ پھیر لیا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئے۔ بہت ہی روکھے تھے۔ میں نے دل میں کہا کہ وہ تمہارے باپ کے نوکر تھے کہ جس وقت تم جاؤ اسی وقت اٹھ کر بیٹھ جائیں اور تم سے باتیں بنانے لگیں یہ تمہاری حماقت تھی کہ سونے کے وقت ملنے گئے بھلا یہ وقت ملنے کا تھا۔ تم کو چاہیے تھا کہ حجرہ سے باہر بیٹھتے۔ جب مولانا نماز کے لئے باہر آتے اور نماز سے فارغ ہو کر جلسۂ عام میں بیٹھتے اس وقت ملتے پھر دیکھتے کہ مولانا روکھے ہیں یا تم سوکھے ہو۔ ایک صاحب نے مجھ سے ایک حاکم انگریز کی حکایت بیان کی کہ اس نے کسی دوسرے حاکم سے چارج لینے کے لئے دس بجے کا وقت مقرر کیا تھا۔ چنانچہ دس بجے کے قریب یہ انگریز کچہری میں پہنچا۔ مگر قریب پہنچ کر اس انگریز نے گھڑی دیکھی تو دس بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ تو وہ کچہری کے اندر نہیں گیا۔ بلکہ پانچ منٹ تک کچہری کے باہر ٹہلتا رہا۔ جب گھڑی میں پورے دس بج گئے اس وقت اس نے اندر قدم رکھا اور دوسرے حاکم سے چارج لیا۔ یہ حکایت بیان کر کے وہ بہت مدح کر رہے تھے کہ یہ لوگ اوقات کے بہت ہی پابند ہیں وہ مدح کر رہے تھے اور میں حیرت کرتا تھا کہ اگر کوئی مولوی ایسا کرے تو اس کی شکایت بیان

کی کی جاتی ہے کہ ہم وقت سے پانچ منٹ پہلے پہنچے تھے تو ہم سے بات نہ کی۔

لیکچر میں چندہ

اور یہ شکایت محض اس لئے کی جاتی ہے کہ مولوی ان سے چندہ لیتے ہیں حالانکہ یہ معترض صاحب چندہ میں مولویوں سے زیادہ مبتلا ہیں۔ ہر لیکچر میں چندہ کی مانگ ہوتی ہے آج کالج کے لئے چندہ ہو رہا ہے کل یونیورسٹی کے لئے کبھی کانگریس کے لئے کبھی اور کسی خاک بلا کے لئے۔ اکبر حسین جج الہ آبادی لکھتے ہیں۔

در پس ہر لکچر آخر چندہ ایست — مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

(یعنی جو ابتداء لیکچر ہی سے انجام کو سمجھ لے کہ اخیر میں چندہ مانگا جائے گا اور یہ سمجھ کر پہلے ہی سے چلا جائے وہ بہت مبارک بندہ ہے ۱۲ جامع)

اکبر حسین مرحوم کہتے تھے کہ وعظ تو ہم نے چندہ سے خالی بہت سنے مگر لیکچر ایک بھی اس سے خالی نہیں سنا تو ظاہر میں دعویٰ مگر میں دعوے کی نیت سے نہیں کہتا کہ واللہ وعظ تو ہم پچاسوں چندہ سے خالی سنا دیں گے تم لیکچر ایک تو اس سے خالی دکھا دو۔ مگر فرق یہ ہے کہ جنٹلمین چندہ کرتے ہیں قیمتی کپڑے پہن کر اور مولوی چندہ کرتے ہیں معمولی کپڑے پہن کر۔

واعظ کا لباس

اس پر ایک واقعہ یاد آیا کہ ہم جو بعض معززین کی درخواست پر شملے گئے تو وہاں وعظ کا اعلان ہوا۔ کرنل عبدالمجید صاحب نے اپنے نام سے اعلان کیا جس وقت میں وعظ کے لئے کھڑا ہوا تو میرے کپڑے دیکھ کر بعض جنٹلمینوں نے کرنل صاحب سے کہا کہ تمہارے علماء کے کپڑے تو ایسے ہیں جیسے ابھی پاخانہ سے نکل کر آ رہے ہوں حالانکہ میں کھدر پہنے ہوئے بھی نہ تھا۔ اور نہ میرا ارادہ کھدر[1] پہننے کا ہے۔ چکن اور لٹھہ کے کپڑے تھے اور چونکہ جمعہ کا دن تھا اس لئے صاف بلکہ کلف استری کے ہوتے تھے مگر ہاں کرتہ لمبا تھا اور پاجامہ اونچا تھا یہ نہ تھا کہ کرتہ اونچا ہو اور پاجامہ ٹخنوں سے نیچا ہو ان نو تعلیم یافتہ صاحب کو یہ لباس حقیر معلوم ہوا۔ کرنل صاحب نے ان سے کہا کہ میں ابھی اس بات کا جواب دینا نہیں چاہتا۔ وعظ ختم ہونے کے بعد پوچھنا اس وقت جواب دوں

---

[1] کیونکہ کھدر پہننا آج کل گاندھی پرست جماعت کا شعار ہو گیا ہے ۱۲ جامع

گا۔ چنانچہ بعد ختم وعظ کرنل صاحب منتظر رہے کہ یہ اس اعتراض کا اعادہ کریں مگر وہ کچھ نہیں بولے تب کرنل صاحب نے خود یاد دلایا کہ اب آپ کہیے کیا کہتے تھے۔ کہنے لگے کچھ نہیں کہتا۔ اور جو کچھ کہا تھا حماقت تھی۔ میں یوں سمجھا تھا کہ لیاقت بھی کپڑوں کے موافق ہوتی ہے مگر اس وقت اپنی غلطی ظاہر ہوئی اور یہ معلوم ہوا کہ کپڑے معیار لیاقت نہیں۔ اتفاق سے یہ بات میرے کانوں تک بھی پہنچ گئی میں نے دوسرے جلسہ میں ممبر پر آتے ہی کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض حضرات ہمارے لباس پر خاص رائے رکھتے ہیں اور میں حسن ظن منشاء اس کا نیک نیتی ہی سمجھتا ہوں۔ غالباً محبت، ہے وہ چاہتے ہوں گے کہ علماء عمدہ اور قیمتی لباس پہن کر وعظ کہا کریں تا کہ سامعین کے قلوب میں ان کی عظمت ہو۔ اور ان کی عظمت سے مضمون کی عظمت ہو۔ مجھے اس منشاء پر اعتراض نہیں اور میں اس کے حُسن قبح سے اس وقت بحث نہیں کرنا چاہتا میں تسلیم کئے لیتا ہوں کہ علماء کو عمدہ لباس پہن کر ہی وعظ کہنا چاہیے مگر سوال یہ ہے کہ عمدہ لباس آئے کہاں سے ہمارے پاس تو اتنا روپیہ نہیں جو آپ کی تجویز اور منشاء کے موافق لباس بنائیں۔ تو اس صورت میں اتنا روپیہ کہاں سے آوے۔ زیادہ روپیہ حاصل کرنے کے جو ذرائع ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ بعض تو شرعاً قبیح ہیں جن کو ہم جائز نہیں رکھتے جیسے ڈپٹی کلکٹری وسب ججی وغیرہ اور بعض عقلاً بھی قبیح ہیں جن کو نہ ہم جائز رکھیں نہ آپ جیسے وعظ کہہ کر اپنی حاجت پیش کرنا جب یہ دونوں ذرائع ناجائز ہیں صرف ایک ذریعہ یہی رہ گیا کہ ہم میں کوئی مدرس ہے کوئی مصنف کوئی محشی' کوئی کسی مطبع کا مصحح تو اس صورت میں ہماری مالی حیثیت اسی لباس کی ہوگی جو ہم پہنے ہوئے ہیں۔ اور اگر اس سے زیادہ حیثیت بھی ہوتی تب بھی ہمیں یہ کیونکر معلوم ہوتا کہ آپ کی منشاء کے موافق کس قیمت کا لباس ہونا چاہیے ممکن ہے کہ ہم اس موجودہ لباس سے بڑھیا لباس پہن کر آئیں اور آپ کی نظر میں وہ بھی حقیر ہو اس لئے اس کی آسان صورت یہ ہے کہ معترض صاحب اپنی منشاء کے موافق نہایت عمدہ قیمتی جوڑے ہمارے لئے بنا دیں تا کہ جب تک ہم شملہ میں رہیں اسی لباس کو پہن کر وعظ کہا کریں۔ اور اس کا ہم وعدہ کرتے ہیں کہ جب شملہ سے جانے لگیں گے وہ لباس آپ کے حوالہ کر جائیں گے اپنے ساتھ نہ لے جائیں گے تا کہ ہمارے بعد کوئی اور مولوی وعظ کہنے آئے تو آپ اس کو بھی وہ لباس دے سکیں کہ مولانا یہ کپڑے پہن کر وعظ فرمایئے۔ اس میں آپ کا مقصود بھی حاصل ہو جائے گا کہ سامعین وعظ کی نظروں میں قیمتی لباس کی وجہ سے علماء کی عظمت ہوگی اور ہم بھی خرچ کے بارے سبکدوش

رہیں گے اور آپ کا بنایا ہوا لباس پھر آپ کے پاس واپس آ جائے گا۔ آپ کو ہر مولوی کے واسطے بار بار جوڑا تیار کرنا نہ پڑے گا۔ ایک دفعہ کا بنایا ہوا برسوں کام دے گا اور غالباً معترض صاحب میں اتنی وسعت تو ضرور ہوگی کہ ایک دفعہ ہمارے لئے قیمتی جوڑے تیار کر دیں کیونکہ ہمارا لباس اس شخص کی نظروں میں حقیر ہوسکتا ہے جو مالدار صاحب وسعت ہو کیونکہ دوسرے مقامات پر ہمارے لباس کو کسی نے حقیر نہیں بتلایا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بہت ہی مالدار لوگ رہتے ہیں جن کی نظروں میں ہمارا چکن کا لباس بھی حقیر ہے تو مہربانی فرما کر وہ لباس ہمارے لئے تیار کرا دیں ہم اس کو پہن کر وعظ کہہ دیا کریں گے۔ اس سے ہمیں انکار نہ ہوگا اور یہاں سے روانگی کے بعد اگر کسی دوسری جگہ بھی ہمارے لباس کو حقیر سمجھا گیا تو ہم وہاں کے لوگوں سے بھی یہی کہہ دیں گے جو آپ سے کہا ہے اگر ان کو قیمتی لباس میں وعظ سننا ہوگا تو وہ بھی اس کا انتظام خود کریں گے آپ کے بنائے ہوئے جوڑے ہم یہیں چھوڑ جائیں گے یہ صورت اس لئے بھی سہل ہے کہ وعظ کہنے والا تو ایک آدمی ہے جو سینکڑوں مقامات پر جاتا ہے تو ایک آدمی کو ہر جگہ کے مذاق کی رعایت کرنا دشوار ہے۔ اور ہر ہر شہر کے آدمیوں کو ایک ایک جوڑا اپنے مذاق کے موافق تیار کر لینا آسان ہے۔ اب میں منتظر ہوں کہ ہمارے واسطے جوڑے تیار ہو کر کب آتے ہیں۔ اگر غیرت ہوگی تو بہت جلد اس کا انتظام کیا جاوے گا اس تقریر سے معترضین کی گردنیں جھک گئیں اور نگاہیں نیچی ہو گئیں۔

جنٹلمین کا چندہ

تو آج کل لوگوں کا مذاق ایسا بگڑا ہے کہ ان کی نظروں میں صرف قیمتی لباس والے کی عظمت ہوتی ہے حالانکہ چندہ کرنے میں جنٹلمین اور مولوی دونوں شریک ہیں مگر وہ لوگ قیمتی کپڑے پہن کر چندہ مانگتے ہیں اس لئے ان کی ذلت نہیں ہوتی اور مولویوں کو ذلیل سمجھا جاتا ہے حالانکہ عقل کا مقتضاء یہ ہے کہ چندہ مانگنے والے کو قیمتی لباس نہ پہننا چاہیے کیونکہ اس کا اثر مسلمانوں پر یہ ہوتا ہے کہ غریب آدمی چندہ میں شرکت نہیں کرسکتا۔ وہ سوچتا ہے کہ جو شخص سو روپیہ کا لباس پہن کر سوال کر رہا ہے اسے چار پانچ روپیہ کیا دوں کم از کم سو پچاس تو دوں اور جو وسعت والے بھی ہیں اگر ان کی نیت تمیں روپیہ دینے کی ہوتی ہے تو وہ لیکچرار کے لباس کو دیکھ کر اور اس کی شان وشوکت سے دب کر بیس کی جگہ پچاس دیتا ہے اور جو چندہ دباؤ سے وصول ہو وہ حرام ہے مگر افسوس ہے کہ عوام

میں پھر بھی ان ہی لوگوں کی عزت ہے جو دباؤ سے چندہ لیتے ہیں۔ مولوی تو دس پانچ روپیہ پر ہی قناعت کر لیتے ہیں اور دینے والوں کو دعائیں دیتے ہیں اور جنٹلمین دوسو پانچ سو سے کم پر قناعت ہی نہیں کرتے اور اگر کوئی یہ کہے کہ مولوی چندہ کھاتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ واللہ مولوی اگر کھاتے بھی ہیں تو جنٹلمینوں سے کم کھاتے ہیں ان میں اگر کوئی کمبخت کھاتا بھی ہے تو بہت سے بہت چار پانچ سو روپیہ کھالے گا اور جنٹلمین تو ہزاروں لاکھوں کھا کر بھی ڈکار نہیں لیتے۔ چنانچہ آج کل جو چندوں میں خیانت کا راز کھلا ہے تو معلوم ہوا کہ بعضے جنٹلمین ہزاروں لاکھوں روپیہ ہضم کر گئے اور ایک پیسہ کا بھی حساب نہیں دیا۔ تو مولوی تو برزخ ہیں قبر ایک ہی مردہ سے بھر جاتی ہے اور یہ لوگ دوزخ ہیں جس کی حالت یہ ہے یَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَئْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ دوزخ کا کبھی پیٹ ہی نہیں بھرتا وہ یہی کہتی رہے گی کہ اور لاؤ اور لاؤ۔ پس جو لوگ چندہ کے باب میں مولویوں پر اعتراض کرتے ہیں وہ ان سے زیادہ محل اعتراض ہیں لیکن اس پر بھی میں علماء سے یہی کہتا ہوں کہ خدا کے لئے تم یہ چندہ کا کام چھوڑ دو۔ اگر جنٹلمین چندہ کریں انہیں کرنے دو۔ تم یہ کام مت کرو واللہ شرم کی جگہ ہے کہ لوگ یہ سمجھیں کہ روپیہ مولویوں کی حاضرات ہے کہ جہاں فلیتہ سلگایا اور جن حاضر ہو گئے۔

چندہ کی ذمہ داری

اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ چندہ کے بغیر دین کا کام کیونکر چلے گا میں کہتا ہوں کہ دین کا کام سب مسلمانوں کا کام ہے۔ سب لوگ مل کر کام کریں۔ مولویوں کا کام وعظ کہنا تبلیغ کرنا درس دینا وغیرہ ہے۔ یہ کام تو وہ کریں چندہ کرنا ان امراء ورؤسا کا کام ہے جن پر کسی کو یہ شبہ نہ ہو سکے کہ یہ اپنے واسطے مانگ رہا ہے کیونکہ جانتے ہیں کہ اسی کی اتنی بڑی حیثیت ہے کہ ہم دس دیں گے تو یہ اپنے پاس سے پچاس دے سکتا ہے۔ ایسے شخص کا چندہ کرنا ذلت کا سبب نہیں ہو سکتا تو یہ کام امراء ورؤساء کریں۔ یہ لوگ چندہ جمع کر کے پھر علماء سے پوچھ کر کام میں لگا دیں۔ اس طرح کر کے دیکھیں معلوم ہو جائے گا کہ دین کا کام چلتا ہے یا نہیں۔

وعظ برائے چندہ

باقی مولویوں کو تو چندہ کے لئے وعظ بھی ہرگز نہ کہنا چاہیے ہاں اس کا مضائقہ نہیں کہ دینی

ضرورتوں سے مسلمانوں کو مطلع کر دیا جائے کہ فلاں جگہ یہ کام دین کا ہو رہا ہے اس میں مسلمانوں کی امداد کی ضرورت ہے اس کے بعد اگر کوئی چندہ دے تو تم اپنے ہاتھ میں بھی ہرگز نہ لو۔ بلکہ اس سے کہہ دو کہ منی آرڈر وغیرہ کے ذریعہ سے خازن کے پاس خود بھیجو۔ اگر قسمت میں ہے تو واللہ وہ روپیہ مدرسہ میں ضرور آئے گا۔ ایک صاحب نے تھانہ بھون کے مدرسہ میں دوسو روپیہ بھیجے اور خط میں اتنا اور لکھ دیا کہ زیارت کا بہت اشتیاق ہے کوئی تاریخ مقرر فرمائی جائے تو بہت عنایت ہو۔ میں نے روپیہ واپس کر دیا اور لکھ دیا کہ خط میں اگر میرے آنے کی تحریک نہ ہوتی تو میں روپیہ وصول کر لیتا۔ مگر اب نہیں لے سکتا۔ کیونکہ مجھے شبہ ہو گیا کہ شاید آپ مدرسہ میں یہ رقم دے کر مجھ پر دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں کہ اب ضرور آئے گا۔ کیونکہ ہم مدرسہ کے اتنے بڑے معاون ہیں۔ تھوڑے دنوں کے بعد روپیہ پھر واپس آیا جس کے ساتھ ایک خط بھی آیا اس میں لکھا تھا کہ واقعی مجھ سے بڑی بدتہذیبی ہوئی مجھے رقم بھیجنے کے ساتھ شوق زیارت کا ذکر نہ کرنا چاہیے تھا۔ اب میں اپنی اس تحریک کو واپس لیتا ہوں۔ للہ آپ یہ رقم وصول کر کے مدرسہ میں داخل کر دیجئے میں تو مدرسہ میں یہ رقم دے رہا ہوں آپ کو تھوڑا ہی دے رہا ہوں اس لئے آپ پر اس کا کچھ بھی احسان نہیں نہ کسی قسم کا دباؤ ہے اس شائستہ جواب کے بعد میں نے رقم لے کر مدرسہ میں داخل کر دی۔ اور ان کو جواب میں لکھا کہ پہلے آپ کو اشتیاق ملاقات تھا۔ اب مجھ کو آپ سے ملنے کا اشتیاق ہو گیا۔ آپ کی سلامتی طبیعت سے بہت دل خوش ہوا۔ پھر انہوں نے کئی ماہ بعد مجھے بلایا میں نے لکھا کہ اس شرط کے ساتھ آ سکتا ہوں کہ مجھے نذرانہ کچھ نہ دیا جائے اور اگر کچھ دیا گیا تو میں واپس کر دوں گا۔ انہوں نے شرط منظور کر لی میں چلا گیا۔ واپسی کے وقت انہوں نے اپنی والدہ کی طرف سے کچھ دینا چاہا اور کہا کہ میں نے تو آپ کی شرط پر عمل کیا مگر والدہ سے کوئی شرط نہ ہوئی تھی یہ رقم انہوں نے پیش کی ہے اس کو قبول کر لیا جائے۔ میں نے کہا والدہ اور ولد سب ایک ہیں اس لئے میں قبول نہیں کر سکتا یہ بھی میری شرط کے خلاف ہے۔ وہ کہنے لگے کہ پھر کسی کا دل ہدیہ کو چاہے تو وہ کیونکر پیش کرے۔ میں نے کہا کیا ہدیہ دینے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ گھر پر بلا کر دیا جائے یہ بھی تو طریقہ ہے کہ میرے گھر پر آ کر دو۔ آپ تھانہ بھون تشریف لاویں وہاں ہدیہ دیں گے تو میں لے لوں گا۔ چنانچہ وہ تھانہ بھون آئے اور مجھے تین گنی دیں۔ میں نے لے لیں گھر پر تو غالباً ایک یا دو ہی گنی والدہ کی طرف سے دے رہے تھے شاید اس پر انکار کی وجہ سے ایک یا دو اور بڑھ گئیں کیونکہ نخروں سے قیمت بڑھ جاتی ہے۔

چندے میں احتیاط

ایک صاحب نے طلبہ کے لئے پانچ روپیہ بھیجے اور ساتھ میں دعا کی استدعا بھی لکھی۔ میں نے روپیہ واپس کر دیئے کہ یہاں دعا کی دوکان نہیں ہم بدون ہدیہ کے بھی سب مسلمانوں کی بھلائی کے لئے دعا کرتے ہیں۔ روپیہ پھر واپس آیا اور ساتھ میں خط بھی آیا کہ مجھ سے حماقت ہوئی۔ واقعی مجھے ہدیہ کے ساتھ دعا کی درخواست نہ کرنی چاہیے تھی۔ اب میں دعا نہیں کرانا چاہتا۔ آپ للہ طلبہ کے لئے یہ ہدیہ قبول فرمالیں۔ اب میں نے لے لیا اور ان کو لکھ دیا کہ آپ کے مقصد کے لئے دعا بھی کر دی گئی۔ تو جہاں روپیہ لینے سے دین کی وقعت کم ہوتی ہو وہاں ہرگز روپیہ بھی نہ لیا جائے واپس کر دینا چاہیے۔ واللہ لاکھوں اور کروڑوں روپیہ بھی ملتے ہوں مگر دین کی عزت کم ہوتی ہو تو ایسے روپیہ پر لعنت بھیجنی چاہیے۔ اور مانگنا تو درکنار رہا یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ باوجود اختلاط کے باتیں کم کرتے تھے۔ بعض لوگوں کو یہ بات ناگوار تھی یہ لوگ مولانا کو روکھا بتلاتے تھے اس پر یہ ساری گفتگو درمیان میں آ گئی کہ لوگ علماء کی اچھی باتوں پر بھی اعتراض کرتے ہیں اور وہی باتیں امراء کریں تو مدح ہوتی ہے۔

ضرر اختلاط

بہرحال میں یہ کہہ رہا تھا کہ اختلاط کے ساتھ قلت کلام بہت دشوار ہے یہ کام صدیقین و کاملین کا ہے۔ ورنہ اکثر حالت یہی ہے کہ اختلاط میں فضول باتیں بہت کرنا پڑتی ہیں۔ اب اگر یہ دستور العمل رکھا جائے کہ جو شخص بھی ملنے آئے اس کے ساتھ خاطر مدارات و تعظیم و تکریم کا معاملہ کیا جائے۔ اور گھنٹوں باتیں بنائی جائیں تو سارا وقت اسی کا ہو رہے۔ اپنا کوئی کام بھی نہ ہوگا۔ اور اگر ایک کے ساتھ یہ برتاؤ کیا اور دوسرے کے ساتھ نہ کیا تو اس کو ناگوار ہوگا۔ اور جس کی تم نے خاطر مدارات کی تھی اس کے ساتھ حسد پیدا ہو جائے گا۔ کہ اس کی بہت خاطر ہوتی ہے پھر یہ شبہ بھی ہونے لگے گا کہ شاید کسی نے شیخ سے میری شکایت کی ہوگی۔ اس لئے میرے حال پر وہ عنایت نہیں جو دوسروں کے حال پر ہے۔ اب گمان ہی گمان پر کسی کسی کی غیبت شروع کر دی جس سے دشمنی بڑھ گئی۔ دشمنی کے بعد رات دن اس کو اس کے ایذا کی فکر ہے۔ اس کو اس کی فکر ہے بس اسی کے ہو لئے نہ ذکر میں دل لگتا ہے نہ نماز میں نہ تلاوت میں نہ کسی کام میں ہر وقت فکر سوار ہے ضرر کثرت اختلاط کا یہ ہے کہ آپ کے وہ دوست صاحب ہر روز تمہارے پاس موجود ہیں دو گھنٹے تین گھنٹے روز ضائع

کرتے ہیں کسی معمول کو لے کر بیٹھے تھے کہ دوست صاحب آ گئے بس معمول تو رخصت ہوا ان کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گئے۔ اس طرح اوقات و اوراد کا بہت ناس ہوتا ہے اسی لئے میں نے خانقاہ میں قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ نہ کسی سے دوستی بڑھاؤ نہ دشمنی پیدا کرو نہ زیادہ مجلس آرائی کرو۔ کیونکہ یہ مجلس آرائی فساد کی جڑ ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ چوپال میں بیٹھ کر زیادہ باتیں کرنے سے اکثر لڑائی ہو جاتی ہے۔ اس لئے سلامتی عزلت وقلت اختلاط ہی میں ہے۔

گوشہ نشینی کا طریقہ

مگر ایک بات قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ قلت اختلاط سے بھی بعض دفعہ شہرت ہو جاتی ہے اور شہرت دنیا و دین دونوں کے لئے مضر ہے مگر تجربہ یہ ہے کہ اگر قلت اختلاط اول ہی سے اختیار کر لو تو شہرت بھی نہ ہوگی۔ کیونکہ لوگوں کی نظر میں یہ حالت کوئی نئی بات نہ ہوگی جانیں گے کہ اس شخص کی طبیعت ہی ایسی ہے اور اختلاط کے بعد اگر قلت اختلاط کرو گے تو شہرت ہو جائے گی کیونکہ لوگوں کو ایک نئی بات معلوم ہوگی کہیں گے آج کل فلاں شخص چلا کشی کر رہا ہے گوشہ نشین ہو گیا ہے پھر شہرت کے بعد چین نہ ملے گا۔ اسی زمانہ میں ایک بزرگ نے اختلاط کے بعد جو عزلت اختیار کی تو پہلے سے زیادہ شہرت ہوگئی مخلوق کا رجوع زیادہ ہو گیا بڑے پریشان ہوئے ایک دوسرے بزرگ نے ان کو لکھا۔

آنروز کہ مہ شدی نمی دانستی کانگشت نمائے عالمے خواہی شد

یعنی اب کیا گھبراتے ہو جس دن تم چاند بنے تھے اس دن تمہیں معلوم نہ تھا کہ چاند انگشت نمائے عالم ہوا کرتا ہے۔ اس لئے لازم تھا کہ پہلے ہی سے چاند نہ بنتے یعنی اختلاط کر کے اپنے کو ظاہر نہ کرتے پس شہرت کے طریقے سے بچنا چاہیے۔ اور اول ہی سے گمنامی اختیار کرنا چاہیے۔

شہرت کا نقصان

کیونکہ زیادہ شہرت دین و دنیا دونوں کے لئے ضرر رساں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

خویش را رنجور ساز و زار زار تاترا بیرون کنند از اشتہار

(اپنے آپ کو رنجور اور گمنام رکھو تا کہ لوگ تم کو شہرت سے باز رکھیں)

کیوں اس لئے کہ۔

اشتہار خلق بند محکم است بند ایں از بند آہن کے کم است

مخلوق کی شہرت اللہ اور انکے بندہ کے درمیان محکوم بند ہے یہ بند لوہے کے بند سے کیا کم ہے

انیش گوید نے منم ہمراز تو ۔۔۔ آتش گوید نے منم انباز تو
اوز چو بیند خلق راسرمست خویش ۔۔۔ از تکبر میرود از دست خویش

(یہ کہتا ہے کہ میں تیرا ہمراز ہوں اور آگ کہتی ہے کہ میں تیری شریک ہوں اور جب وہ ساری دنیا کو اپنا معتقد دیکھتا ہے تو تکبر سے اپنے آپ مست ہوجاتا ہے)

یعنی جب وہ دیکھتا ہے کہ ساری دنیا میری معتقد ہے کوئی ہاتھ چومتا ہے کوئی پیر تو آپے سے باہر ہوجاتا ہے یہ تو دین کا ضرر ہے اور دنیا کا ضرر یہ ہے۔

چشمہا و خشمہا و رشکہا ۔۔۔ برسرت ریزد چو آب از مشکہا

(غصے اور آنکھیں اور اشک تیرے اوپر ایسے ٹپکتے ہیں جیسے مشکوں سے پانی ٹپکتا ہے)

چنانچہ مشہور آدمی سے عام لوگوں کو بھی حسد اور رشک پیدا ہوجاتا ہے اور حکام کی نظر بھی مشہور لوگوں پر زیادہ ہوتی ہے جب کوئی قصہ ہوتا ہے تو سب سے پہلے مشہور لوگوں پر آفت آتی ہے آج کل جو عوام حکومت کے مقابلہ میں بہادر بنے ہوئے ہیں اس کا راز یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ ہم کو پوچھتا کون ہے۔ ہاں جو لوگ مشہور ہیں ان کا حکومت سے مقابلہ کرنا بیشک بہادری ہے کیونکہ ان کو ہر وقت اپنے اوپر خطرہ ہے گو اس سے بحث نہیں کہ یہ بہادری جائز ہے یا حرام اور یہ دینی شجاعت ہے یا نفسانی تہور۔ اس کو علماء سے پوچھو۔

علمائے حقیقت

مگر صاف بات یہ ہے کہ علماء بھی سب نہیں ہیں۔ بلکہ علماء حقیقت میں صرف وہ ہیں جو لیڈروں کے تابع نہ ہوں۔ حکم شرعی کے تابع ہوں۔ اور جو علماء لیڈروں کے تابع ہیں ان کی تو حالت یہ ہے کہ واللہ اگر لیڈر آج اپنی رائے کو بدل دیں تو یہ علماء بھی ادھر ہی ہوجائیں مگر ہیں عقلمند کہ فوراً اپنے فتوے کو نہ بدلیں گے کیونکہ اس سے عوام کو صاف معلوم ہوجائے گا کہ ان کے فتوے لیڈروں کی رائے کے تابع ہیں بلکہ آہستہ آہستہ اپنی رائے کو بدل کر لیڈروں کے راستہ پر آجائیں گے۔ آج کل علماء لیڈروں کے ساتھ دو وجہ سے ہیں یا تو اس لئے کہ ان سے علیحدگی میں زوال جاہ کا اندیشہ ہے چنانچہ مشاہد ہے کہ جو علماء ان کے ساتھ نہیں ہیں ان کو عوام نے کیسا بدنام کیا اور کتنا برا بھلا کہا۔ یا روپیہ کی طمع سے ان کے ساتھ ہیں کہ اگر ہم نے ان تحریکات میں شرکت نہ کی تو مدرسہ کا چندہ بند ہوجائے گا۔ کوئی مدرسہ کی اعانت نہ کرے گا ایک عالم نے مجھے لکھا تھا کہ ان تحریکات سے علیحدگی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اکیلے رہ جاؤ گے۔ کوئی تمہارے ساتھ نہ ہوگا میں نے جواب دیا کہ مجھے خدا کا ساتھ ہونا کافی ہے اور کسی کے ساتھ ہونے کی ضرورت نہیں۔ لعنت ہے ایسے مال و جاہ پر جس سے مخلوق کی رضاء مقصود ہو

مسلمانوں کی شان تو یہ ہونا چاہیے کہ رضاء الٰہی کے سامنے اس کو کسی کی پرواہ نہ ہو۔ اگر مخلوق اس کو پاگل بنا کر چھوڑ دے مگر خدا راضی ہو تو وہی اس کے لئے سلطنت ہے اگر وہ پاگل بھی ہے تو کس کا پاگل ہے۔

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم   مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگر قلاش اور دیوانہ ہیں تو کیا غم ہے یہی دولت کیا کم ہے کہ اس ساقی و محبوب حقیقی اور اسکی شراب محبت سے مست ہیں)

اس کے نزدیک جو خدا کا دیوانہ ہو وہ خود دیوانہ ہے۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد   مرعسس رادید ودر خانہ شد

(وہ دیوانہ دراصل دیوانہ نہیں ہے، جو سپاہی (کے ڈر سے لاٹھی چارج کے وقت) گھر چلا جائے)

مگر ان کی دیوانگی بے عقلی کی دیوانگی نہیں بلکہ مستی عقل سے ان پر ایک نشہ سوار ہے یہ وہ دیوانگی ہے، جس پر ہزار عقلیں قربان ہیں۔

اوگل سرخ ست تو خوش مخواں   مست عقل است اوتو مجنونش مخواں

(وہ گل سرخ ہے تو اس سے خوش نہ ہو وہ عقل سے مست ہے تو اسے مجنوں نہ سمجھ)

کوئی تو اس لئے نیند میں پڑا سو رہا ہے کہ روٹی نہیں ملی فاقہ گزر رہا ہے اور یہ اس لئے نیند میں ہے کہ کھا بہت گیا ہے۔ بہت کھانے سے بھی نیند آیا کرتی ہے۔ اسی طرح کوئی تو اس لئے مجنون ہے کہ اس کے پاس عقل نہیں اور کوئی اس لئے مجنون ہے کہ غلبہ عقل سے مست ہو گیا ہے۔ یہ لوگ مصالح کو مسالہ کی طرح پیس ڈالتے ہیں ان کی بڑی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ ایک کو راضی کر لیں۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار   بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

(بڑی مصلحت یہ ہے کہ سب کو چھوڑ کر بس ایک (اللہ رب العزت) کو لے لو)

مقصود سلطنت

یاد رکھو سلطنت خود مقصود بالذات نہیں بلکہ اصل مقصود رضا حق ہے اگر ہم سے خدا راضی نہ ہو تو ہم سلطنت کی حالت میں فرعون ہیں اور لعنت ہے ایسی سلطنت پر جس سے ہم فرعون کے مشابہ ہوں۔ اگر سلطنت مقصود بالذات ہوتی تو فرعون و ہامان و نمرود و شداد بڑے مقرب ہونے چاہیں۔ حالانکہ وہ مردود ہیں معلوم ہوا کہ سلطنت وہی مطلوب ہے جس میں رضاء حق بھی ساتھ ساتھ ہو اور جس سلطنت میں رضاء حق نہ ہو وہ وبال جان ہے اگر ہم سے خدا راضی ہو تو ہم پاخانہ اٹھانے پر بھی راضی ہیں اور اسی حالت میں ہم بادشاہ ہیں۔ آخر حضرت ابراہیم بن ادھم کیا تمہارے نزدیک پاگل تھے ان کو تو سلطنت ملی ہوئی تھی پھر کیوں چھوڑ دی محض اس لئے کہ مقصود میں خلل واقع ہوتا تھا معلوم ہوا کہ سلطنت خود مقصود

نہیں بلکہ مقصود دوسری چیز ہے کہ اگر اس میں خلل واقع ہونے لگے تو اس وقت ترک سلطنت ہی سلطنت ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادھم ہر فن کے امام ہیں۔ حدیث میں ثقہ اور محدث ہیں اور فقہاء میں فقیہ اور صوفیہ میں تو امام ہیں۔ ان کو کوئی پاگل نہیں کہہ سکتا جوان کو پاگل کہے وہ خود پاگل ہے پھر دیکھ لو انہوں نے کیا کیا۔ جب رضاء حق میں سلطنت کو مزاحم دیکھا تو بادشاہت پر لات مار کے الگ ہو گئے۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو سلطنت مضر مقصود نہ تھی تو ان کو اجازت دی گئی کہ منصب خلافت کو قبول کریں اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے لئے مضر مقصود تھی تو ان کے لئے حکم ہے **لاتلین مال یتیم ولا تقضین بین اثنین (اتحاف السادة المتقین ۳۱۸:۸)** اس سے صاف معلوم ہوا کہ سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ مقصود رضائے حق ہے اگر سلطنت سے مقصود میں خلل واقع ہو تو اس وقت اس سے منع کیا جائے گا حضرت ابوذر تو اتباع احکام کا ارادہ بھی کرتے ہیں ان کو جب بھی قضاء و حکومت کی اجازت نہ دی گئی اور تم تو اتباع احکام کا بھی قصد نہیں کرتے۔ اس حال میں تم کو کیونکر اجازت دی جا سکتی ہے چنانچہ دیکھ لو کہ جو لوگ ابھی تھوڑا زمانہ ہوا پنچائت میں مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے ان کے کتنے فیصلے شریعت کے موافق ہوتے تھے اور وہ خود اتباع احکام کتنا کرتے تھے حالت یہ تھی کہ خود لوگوں کے حقوق دبائے ہوئے ہیں اور پنچائت میں فیصلے کر رہے جن میں اکثر فیصلے خلاف شریعت ہوتے تھے۔ اگر ان لوگوں کو سلطنت مل جاتی تو مخلوق کو کچا کھا جاتے تو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ خدا تعالیٰ اس ظلم کی حالت میں تم کو سلطنت دے دیں گے۔ ارے اگر تم بادشاہ بن جاتے تو نہ معلوم مخلوق کا کیا حال ہوتا۔ بڑی خیر ہوئی کہ خدا نے گنجے کو ناخن ہی نہ دیئے اتنا ہی فرق دیکھ لو اپنے میں اور ان لوگوں میں جن کو خدا نے سلطنت دے رکھی ہے کہ تم نے اپنے مخالفوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا اور اہل سلطنت نے تمہارے ساتھ باوجود تمہاری اس مخالفت کے کیا برتاؤ کیا۔ اگر تم بادشاہ ہوتے اور اس وقت تمہارے ساتھ کوئی اس طرح مقابلہ سے پیش آتا جیسا تم اس وقت سلطنت کے ساتھ برتاؤ کر رہے ہو تو نہ معلوم تم کتنوں کو پھانسی پر لٹکا دیتے اور یہ ساری خرابی اس کی ہے کہ تم صرف سلطنت کو مقصود سمجھتے ہو۔ رضاء حق کو مقصود نہیں سمجھتے اس لئے تم کو خلاف شرع اقوال و افعال سے ذرا پاک نہیں حالانکہ فقیر کا مقصود[1] پلاؤ ہے اگر رکابی بھی ساتھ میں مل گئی فبہا ورنہ صرف ڈھوبرے جمع کرنے سے کیا فائدہ یہ تو نری حماقت ہے۔ خصوصاً پھوٹے ہوئے ڈھوبرے جمع کرنا تو سخت حماقت ہے لوگ تو پھوٹا ہوا بیل بھی نہیں لیتے۔ اس

---

[1] رضاء حق کو پلاؤ سے تشبیہ دی ہے اور سلطنت کو رکابی سے اور ظاہر ہے کہ پلاؤ بدون رکابی کے بھی مقصود ہے اور رکابی بدون پلاؤ کے بیکار ہے۔ اسی طرح رضاء حق بدون سلطنت کے بھی مقصود ہے اور سلطنت بدون رضاء حق کے بیکار محض ہے۔ خوب سمجھ لو۔ خصوصاً جب کہ سلطنت بھی ظلم و بے انتظامی کی سلطنت ہو وہ تو پھوٹی ہوئی رکابی کے مشابہ ہے ۱۲ جامع

پر ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک شخص نے بیل خریدا تھا وہ موتنے لگا تو اس نے بیچنے والے سے کہا کہ اپنا بیل لے جاؤ ہم نہیں خریدتے یہ تو پھوٹا ہوا ہے۔ غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ جاہ سے دین اور دنیا دونوں کا ضرر ہوتا ہے۔ اس لئے عزلت میں ایسا طریقہ اختیار نہ کرنا چاہیے جس سے شہرت وجاہ حاصل ہو۔

شہرت بلا طلب

لیکن جس جاہ سے ضرر ہوتا ہے یہ وہ جاہ ہے جو طلب سے حاصل ہو اور جو بدون طلب کے حاصل ہو وہ مضر نہیں ہوتی۔ اس میں خدا تعالیٰ کی امداد ہوتی ہے اگر لوگ اس پر حسد کریں اور اس کو برا بھلا کہنے لگیں تو حق تعالیٰ اس کے دل کو قوی کر دیتے ہیں جس سے کوئی اذیت اس کے نزدیک اذیت نہیں رہتی۔ نیز ان مصائب سے جو باطنی ترقی ہوتی ہے حق تعالیٰ اسے قلب پر منکشف فرما دیتے اور ہر واقعہ کی حکمت پر مطلع فرما دیتے ہیں۔ اب اسے کچھ تکلیف نہیں ہوتی بلکہ خوش ہوتا ہے جیسے انسپکٹر اپنے عہدہ سے خوش ہوتا ہے۔ اگرچہ کبھی ڈاکوؤں کے مقابلہ میں گولی بھی لگتی ہے مگر باینہمہ اس عہدہ پر مبارک باد ہی دی جاتی ہے اور گولی کھانے کے بعد بھی کوئی اس عہدہ کو نہیں چھوڑتا۔ کیونکہ اس حالت میں ترقی کی امید ہوتی ہے۔ سو یہاں تو صرف امید ترقی پر گولیاں کھانا آسان ہو گیا اور جس کو مصیبت کی حالت میں اپنی ترقی محسوس ہو رہی ہو اس کا تو کیا حال ہوگا۔ پس طلب شہرت سے جو حاصل ہوتا ہے وہ تو دنیا و دین دونوں کے لئے مضر ہے اور بدون طلب کے جو جاہ حاصل ہو وہ مضر نہیں۔

اور اس کی تائید حدیث شریف سے ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صحابی سے فرمایا **یاعبدالرحمن بن سمرة لا تسئل الامارة فانک ان اعطیتها عن مسئلة وکلت الیها وان اعطیتها عن غیر مسئلة اعنت علیها (الصحیح للبخاری ۸:۱۵۹، الصحیح لمسلم الامان: ۱۹، لامارة:۱۳، سنن ابی داوٗد: ۲۹۲۹)** اے عبدالرحمٰن بن سمرۃ حکومت کا سوال نہ کرنا کیونکہ اگر تم سوال کے بعد حکومت دیئے گئے تو تم کو اسی کے حوالہ کر دیا جائے گا اور اگر بدون سوال کے دیئے گئے تو تمہاری اعانت وامداد کی جائے گی۔ پس اختلاط میں ایک ضرر تو یہ ہے کہ اس کے بعد عزلت اختیار کرنے میں شہرت ہوتی ہے۔

اختلاط کا عظیم ضرر

اور ایک ضرر اختلاط میں یہ ہے کہ اس میں ذکر کا موقع نہیں ملتا اور فکر کا موقع تو بہت ہی کم ملتا ہے فکر تو اختلاط میں ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے تو یکسوئی اور تنہائی کی سخت ضرورت ہے اور فکر بہت

بڑی چیز ہے حق تعالیٰ نے جہاں ذکر کا بیان فرمایا ہے وہاں فکر کو بھی ساتھ ساتھ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یاد رکھو تمام علوم واسرار کا ورود قلب پر فکر ہی کی برکت سے ہوتا ہے یہ مطلب نہیں کہ فکر کے بغیر علوم واسرار قلب پر نہیں آتے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ورود علوم واسرار کی قابلیت بدوں فکر کے حاصل نہیں ہوتی۔ قلب علوم واسرار کے قابل فکر ہی سے ہوتا ہے پھر قابلیت کے بعد بدون فکر کے بھی علوم آنے لگتے ہیں اس وقت یہ حال ہوتا ہے۔

بنی اندر خود علوم انبیاء   بے کتاب و بے معید و اوستا

خلوۃ شب

جو شخص عرصہ تک فکر میں مشغول رہ چکتا ہے اس کے بعد اختلاط میں بھی اس کے دل پر اسرار وعلوم منکشف ہوتے رہتے ہیں۔ بشرطیکہ تھوڑا بہت وقت خلوت کے لئے بھی رکھے اس لئے ہر سالک کے لئے ایک وقت خلوت کا ہونا ضروری ہے جس میں وہ یکسوئی کے ساتھ ذکر وفکر میں مشغول ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ کون ہوگا۔ آپ نے بھی اپنے لئے ایک وقت خلوت کا مقرر کر رکھا تھا۔ چنانچہ آپ رات کو جب سب لوگ سو جاتے تھے اٹھ کر نماز وغیرہ میں مشغول ہوتے تھے حق تعالیٰ نے قیام لیل کی حکمت یہی بتلائی ہے کہ دن میں مشاغل کثیرہ کی وجہ سے یکسوئی کا وقت نہیں مل سکتا۔ اس لئے رات کو اٹھنا چاہیے۔ اِنَّ نَاشِئَۃَ الَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا یعنی رات کے اٹھنے میں نفس پر مشقت بھی زیادہ ہے اور بات بھی اچھی طرح زبان سے نکلتی ہے تجربہ ہے کہ رات کو اٹھنے کے بعد نماز وغیرہ میں زبان سے ذکر وقرآن میں جو بات نکلتی ہے گویا دل سے نکلتی ہے آگے ارشاد ہے کہ دن میں آپ کو بہت شغل ہے اس لئے رات کو اٹھنا چاہیے اور اس وقت خدا کا ذکر کیجئے اور اسی کی طرف یکسو ہو جایئے۔ یہ خلوت شب تو حضورؐ نے عمر بھر اختیار کیا اور نبوت سے پہلے چھ مہینہ تک رات دن آپ خلوت میں رہتے تھے اور غار حرا میں جا کر جو مکہ سے فاصلہ پر ہے تنہا رہتے تھے۔

مثال خلوۃ

خلوت کی مثال ایسی ہے جیسے کنویں سے پانی بھر کر تھوڑی دیر کے لئے اس کو چھوڑ دیتے ہیں تا کہ پانی کی آمد زیادہ ہو اور اچھی طرح جمع ہو جائے اس کے بعد پھر بھرنے لگتے ہیں اگر کچھ دیر

کنویں کو نہ چھوڑا جائے تو پھر گارا کیچڑ آنے لگتا ہے پانی شفاف نہیں آتا۔ اسی طرح جو لوگ ہر وقت اختلاط میں رہتے اور باتیں ہی بناتے رہتے ہیں ان کا قلب خالی ہو جاتا ہے اور دل کا خالی ہو جانا بہت ہی برا ہے اس لئے چاہیے کہ ایک وقت خلوت کا ضرور ہو جس میں قلب انوار ذکر و فکر سے پر ہو جائے پھر اختلاط کے وقت علوم و اسرار ظاہر ہوں گے اور اختلاط کے بعد پھر خلوت ہونی چاہیے تاکہ اختلاط سے جو انوار میں کمی ہوئی تھی وہ پوری ہو جائے اور جن لوگوں کا کوئی وقت خلوت کے لئے مخصوص نہیں ہوتا رفتہ رفتہ ان کا قلب انوار سے بالکل خالی ہو جاتا ہے۔ پھر بجائے علوم و اسرار کے ظلمانی اقوال ان کی زبان سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ بزرگان دین جلوت میں جو اسرار و علوم بیان کرتے ہیں وہ خلوت میں ان کی تلقی کرتے ہیں۔ اور گو یہ مسئلہ فی نفسہ اختلافی ہے کہ عزلت بہتر ہے یا اختلاط۔ بعض صوفیہ نے اختلاط کو ترجیح دی ہے اور وہ اس کے منافع بیان کرتے ہیں اور عزلت میں مفاسد بتلاتے ہیں بعض نے عزلت کو ترجیح دی ہے اور اس کے منافع بیان کئے ہیں اور اختلاط میں مضرتیں بتلاتے ہیں جس کا سب سے اچھا فیصلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے آپ فرماتے ہیں الوحدة خير من جليس السوء والجليس الصالح خير من الوحدة (مستدرک حاکم ۳:۳۴۳، الدرر المنتشرة:۱۷۰) یعنی نہ خلوت مطلقاً بہتر ہے نہ جلوت بلکہ ملنے والے بد ہوں تو ان سے علیحدگی اور خلوت ہی بہتر ہے اور نیک ہوں تو ان سے ملنا خلوت سے بہتر ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ آج کل جو حالات واقع ہیں وہ مقتضی خلوت ہی کی ترجیح کو ہیں۔ میری رائے اس باب میں یہاں تک ہے کہ گو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بزرگوں سے ملنا خلوت میں ہر حال میں بہتر ہوگا۔

زیارتِ بزرگاں

مگر آج کل کبھی کبھی اپنے احباب کو ایک مشورہ دیا کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض لوگوں کو بزرگوں کی زیارت کا بہت شوق ہوتا ہے وہ آئے دن سفر ہی میں رہتے ہیں آج ایک بزرگ کے پاس جا رہے ہیں کل دوسرے بزرگ کے پاس ہیں ان کو منع کیا کرتا ہوں کہ بزرگوں سے بہت نہ ملا کرو۔ بس ایک اپنا بزرگ بنالو اور جم کر اس کے پاس رہو۔ اور اس کے پاس بھی زیادہ آمد و رفت نہ کرو۔ بلکہ ایک دفعہ بہت سا رہ لو۔ پھر اپنے گھر بیٹھو۔ برس میں ایک دفعہ پھر مل لینا۔ ہر مہینہ اس کے پاس بھی نہ جاؤ اور اس مشورہ کا راز یہ ہے کہ حدیث شریف میں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے الجليس الصالح خير من الوحدة (مستدرک حاکم ۳:۳۴۳، الدرر المنتشرة:۱۷۰) اس کا

مطلب یہ نہیں کہ جلیس صالح سے اختلاط کرنا ہر حال میں وحدت سے بہتر ہے بلکہ قاعدہ[ؔ] بلاغت کے موافق اس کا مطلب یہ ہے کہ جلیس صالح سے ملنا صلاح کے لئے مقصود ہے تو جب تک اس کے اختلاط سے صلاح حاصل ہو اُسی وقت تک اُس سے ملنا وحدت سے بہتر ہے اور اگر کبھی بزرگوں کی زیارت سے بھی صلاح حاصل نہ ہو۔ بلکہ فساد بڑھنے لگے تو اُس وقت اختلاط صالح سے بھی منع کر دیا جائے گا۔ اب واقعات یہ ہیں کہ بعض لوگ تو بزرگوں کی زیارت کا نام کرتے ہیں اور مقصود سیر و سیاحت ہوتی ہے۔ تا کہ سیاحت سے تفریح حاصل ہو اور عمدہ عمدہ غذائیں کھانے کو ملیں۔ یہ مقصود تو اُن کو حاصل ہو جاتا ہے مگر باطن کا ضرر ہوتا ہے۔ کیونکہ جب نیت درست نہیں تو بزرگوں سے فیض حاصل نہیں ہوتا پھر رات دن گشت سے اوراد میں خلل پڑتا ہے جس میں یہ لوگ اپنے کو سفر کی وجہ سے معذور سمجھتے ہیں۔ حالانکہ سفر عذر کی وجہ سے نہیں کیا تھا۔ اور مسافر وہی معذور ہے جو ضرورت کی وجہ سے سفر کرے۔ اور بعضوں کو زیارت ہی مقصود ہوتی ہے۔ سیر و سیاحت کا قصد نہیں ہوتا۔ مگر یہ لوگ ایک مستحب کو ادا کرتے ہیں اور بہت سے فرائض میں خلل ڈالتے ہیں۔ چنانچہ بہت لوگ بزرگوں کے یہاں ہفتوں قیام کرتے ہیں اور اپنے کھانے کا خود انتظام نہیں کرتے۔ بزرگوں ہی کے سر پڑ جاتے ہیں وہ مروت کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے مگر انتظام وغیرہ میں ان کو کلفت ضرور ہوتی ہے دفعہ نمازیں قضا ہو جاتی ہیں اور جماعت کا خون تو ضرور ہوتا ہے بلا وجہ جماعت کو ترک کرنا کب مناسب ہے اگر سفر کا عذر کرو تو میں کہہ چکا کہ سفر وہی عذر ہے جو ضرورت سے ہو بلا ضرورت سفر عذر نہیں عارف مسعود بک تو اس حال میں حج نفل سے بھی منع کرتے ہیں۔

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید   معشوق دریں جاست بیائید بیائید

یعنی جس حج کے تم طالب ہو وہ اس حالت میں بیت اللہ میں نہ ہوگا بلکہ اپنے گھر رہ کر ہوگا۔ کیونکہ تم ایک حج نفل کے لئے بیسوں نمازیں ضائع کرو گے۔ اور اوراد و تہجد میں خلل ڈالو گے جس سے بجائے ترقی کے تنزل کا اندیشہ ہے۔ تمہارا حج (یعنی ترقی ۱۲) اسی میں ہے کہ اپنے گھر رہو اور معمولات و فرائض کو پابندی سے ادا کرتے رہو۔

ؔ وہ قاعدہ یہ ہے کہ جب مسند الیہ مشتق ہو یا منعوت بنعت ہو تو علت حکم مادۂ اشتقاق یا لغت ہوا کرتی ہے کما فی قولہ تعالیٰ۔ والسارق والسارقۃ۔ فاقطعوا ایدیہما فالعلۃ السرقۃ ولعبد مؤمن خیر من مشرک فعلۃ الخیریۃ الایمان وامثال ذلک واللہ اعلم ۱۲ جامع)

ایک خرابی بزرگوں کی زیادہ زیارت میں یہ ہے کہ بعض دفعہ ان کی حالت سمجھ میں نہیں آتی۔ جیسے شیخ یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص ملنے گیا دیکھا ان کی گود میں ایک حسین لڑکا بیٹھا ہوا ہے اور سامنے شراب کی بوتل رکھی ہے۔ یہ شخص بدون تحقیق حال کے ان سے بدگمان ہو گیا حالانکہ وہ لڑکا ان کا بیٹا تھا اور بوتل میں کوئی شربت بصورت شراب تھا۔ لوگوں کے امتحان کے لئے انہوں نے یہ صورت اختیار کی تھی۔ تو بزرگان کی ایسی حالت کے دیکھنے سے بعض دفعہ قلب میں انکار پیدا ہو جاتا ہے اور اہل اللہ سے انکار قلب میں پیدا ہو جانا سخت وبال کا باعث ہے جس سے بعض دفعہ ایمان سلب ہو جاتا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

ہیچ قومے راخدا رسوا نہ کرد   تادل صاحب ولے نامد بدرد

بزرگوں پر انکار کرنا اور ان پر طعن کرنا عذاب کا سبب ہے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات   بادرد کشاں ہر کہ در افتاد برافتاد

ایک خرابی یہ ہے کہ اگر ایسی حالت دیکھ کر بزرگوں سے بداعتقادی نہ ہوئی اور حقیقت بھی منکشف نہ ہوئی تو یہ شخص خود بھی وہ کام کرنے لگتا ہے جس میں بزعم خود بزرگ کو مبتلا دیکھا تھا۔ ان کی گود میں تو اپنا بیٹا تھا یہ اجنبی لڑکوں سے اختلاط کرنے اور ان کے ساتھ ناجائز افعال کرنے لگتا ہے۔ بزرگ کے سامنے تو شربت کی بوتل تھی یہ سچ مچ شراب پینے لگتا ہے اس کا دین تو برباد ہوا تو جس پیر سے ایسے اعمال ظاہر ہوں جو تاویل کے محتاج ہوں۔ اس سے زیادہ نہ ملو۔ بلکہ ناقص العقل کے لئے تو فتویٰ یہ ہے کہ اس سے بالکل نہ ملے لوگ بزرگوں کی زیارت کو روٹی کا نوالہ سمجھتے ہیں مگر بعض دفعہ وہ لقمہ گلے میں ایسا پھنستا ہے کہ جان پر بن جاتی ہے۔ اہل اللہ پر مختلف حالات کا ورود ہوتا ہے جن کی حقیقت بہت کم لوگوں کی سمجھ میں آتی ہے۔ ناسمجھ کا وہاں کام نہیں اس کا تو بیڑا ہو جاتا ہے۔ مولانا ایسے ہی قول کے باب میں فرماتے ہیں۔

ہم سریا ہم سریا ہم دین   امتحانے نیست مارا مثل این

اور اختلاف حالات کے متعلق فرماتے ہیں۔

گہ چنیں بنماید و گہ ضد ایں   جز کہ حیرانی نباشد کار دیں

ان مختلف حالات کو دیکھ کر طالب حیران ہو جاتا ہے پھر بعض تو اس وقت بھی شیخ سے بداعتقاد نہیں ہوتے اور نہ خود ویسے اعمال کرتے ہیں بلکہ انکشاف حقیقت کے منتظر رہتے ہیں اور

بعض یا تو شیخ سے بداعتقاد ہو گئے یا بدون کشف حقیقت کے تقلید کرنے لگے۔ایک خرابی مختلف بزرگوں سے ملنے میں یہ ہے کہ شاید کوئی بزرگ اس کو اپنے پیر سے زیادہ نظر آ گئے ان کی کوئی ادا پسند آ جائے جس نے اس کو فریفتہ کر دیا۔ جیسے جہانگیر کولڑکپن میں نور جہاں کی کہ وہ بھی اس وقت بچی تھی۔اس کی ادا پر فریفتہ ہو گیا تھا کہ کسی میلہ میں شہزادہ بھی گیا تھا وہ بھی آئی تھی۔شہزادہ کے پاس دو کبوتر تھے ہاتھ سے کوئی کام لینے کی ضرورت ہوئی اتفاقاً یہ سامنے موجود تھی۔شہزادہ نے وہ دونوں کبوتر اس کے ہاتھ میں دے دیئے کہ ان کو تھامے رہو۔ جب جہانگیر فارغ ہوا تو ایک کبوتر ندارد پوچھا کبوتر کیا ہوا۔نور جہاں نے کہا اڑ گیا اس نے غصہ میں کہا کیسے اڑ گیا۔نور جہاں نے دوسرے کو بھی چھوڑ دیا کہ ایسے اڑ گیا جہانگیر اس ادا پر سو جان سے فریفتہ ہو گیا۔ حالانکہ یہ بات اور زیادہ موجب غضب تھی کہ ایک تو گیا ہی تھا اس نے دوسرا بھی کھو دیا مگر دل کے آنے کا کچھ قاعدہ نہیں۔بعض دفعہ یہ دل ایسی بات پر فریفتہ ہو جاتا ہے جو حقیقت میں قابل فریفتگی کے نہیں ہوتی اسی طرح ممکن ہے کہ آپ کو کسی بزرگ کی کوئی ادا پسند آ جائے کیونکہ اس کے کمالات ظاہر تھے۔آپ کے شیخ کے کمالات مخفی تھے۔ وہاں تک نظر نہیں پہنچی۔اب لگے دوسرے بزرگ سے بیعت ہونے وہ صاحب فراست تھے۔انہوں نے پوچھا کہ تم کسی سے بیعت تو نہیں۔اس نے اقرار کیا کہ جی ہاں فلاں بزرگ سے بیعت ہوں اب وہ خفا ہو گئے کہ پھر تم مجھ سے کیوں بیعت ہوتے ہو وہ تو بڑے کامل ہیں تم ان سے کیوں انحراف کرتے ہو جاؤ میں تم کو بیعت نہ کروں گا۔اب دونوں طرف سے راندہ گیا۔اپنے شیخ سے تو اعتقاد نہ رہا۔اس لئے وہاں سے فیض بند ہو گیا اور دوسرے نے بیعت نہ کیا۔وہاں سے بھی محروم رہا۔اور اگر دوسرے نے بیعت بھی کر لیا اور بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو فلاں شخص سے بیعت تھا اس نے مجھے دھوکہ دیا کہ یہ بات مجھ سے ظاہر نہ کی تو اب بعد میں وہ اس سے خفا ہو گئے اور بیعت فسخ کر دی پھر بھی دونوں جگہ سے منہ کالا ہوا۔اور ایک خرابی مختلف بزرگوں کے ملنے میں یہ ہے کہ کسی وقت دوسرے بزرگوں کے مریدوں سے یہ اپنے شیخ کی تعریف کرنے لگتا ہے۔اس کے جواب میں وہ اپنے شیخ کے فضائل بیان کرتے ہیں پھر یہ اپنے شیخ کے کمالات ظاہر کرتا ہے وہ اس کے جواب میں اس کے شیخ کے عیوب بیان کرتے ہیں۔یہ ان کے شیخ میں عیوب نکالتا ہے اب تبرا ہونے لگا اور شیعہ سنیوں کی طرح پارٹی بندی ہو گئی۔جس کے مفاسد ظاہر ہیں محتاج بیان نہیں۔پس آج کل مختلف بزرگوں کی زیارت میں صلاح حاصل نہیں ہوتی

بلکہ فساد بڑھتا ہے اس لئے میں بعض لوگوں کو اس سے منع کیا کرتا ہوں۔

بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اپنے پیر کے پاس بھی کم جاؤ زیادہ نہ لپٹو۔ کیونکہ گاہے گاہے خاص اوقات میں اس کے پاس جاؤ گے تو اس کو ذکر میں مشغول دیکھو گے رزانت و متانت کی حالت میں پاؤ گے اس سے اعتقاد بڑھے گا اور اگر ہر وقت لپٹے رہو گے تو کبھی ہگتے دیکھو گے کبھی موتتے ہوئے۔ کبھی تھوکتے سنکتے دیکھو گے۔ اس سے تمہیں اعتقاد کم ہوگا۔ ہاں عقلاء کو تو ان حالات کے مشاہدہ سے اعتقاد بڑھتا ہے کیونکہ وہ جانیں گے کہ یہ شیخ فرشتہ نہیں بشر ہے مگر بشر ہو کر بے شر ہے تو بڑا کامل ہے۔ اور ناقص العقل کبھی شیخ میں اور اس کی بیوی میں لڑائی جھگڑا دیکھے گا اس کا ان باتوں سے اعتقاد کم ہوگا اور اگر اعتقاد بھی کم نہ ہو تب بھی ہر وقت نہ لپٹو کیونکہ آخر شیخ کو بھی تو اپنے اوقات کی پابندی ضروری ہے۔ زیادہ لپٹنے سے اس کو کدورت ہوگی۔ اور شیخ کو مکدر کرنا طالب کے لئے مضر ہے۔ اس کی رعایت بہت ضروری ہے کہ جس کے پاس جاؤ ایسے وقت میں جاؤ کہ اس وقت تمہارے جانے سے اس کو کدورت نہ ہو۔

آداب عیادت

فقہا نے تو اس کی یہاں تک رعایت کی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی جہالت کی وجہ سے کسی دن میں عیادت کو منحوس سمجھتا ہو تو اس کی عیادت کو اس دن نہ جاؤ کیونکہ اس سے اس کو وحشت ہوگی اب بعض خشک مولوی اس مذاق کے ہیں کہ نہیں اسی دن جانا چاہیے اور اس کے عقیدہ کی اصلاح کرنا چاہیے۔ سبحان اللہ اصلاح عقیدہ کا وقت بھی یہی رہ گیا ہے۔ یاد رکھو اس دن میں جانے سے پہلے ہی اس کو توحش ہو جائے گا تو وہ تمہاری بات پر توجہ بھی نہ کرے گا اصلاح کا طریقہ بھی یہ ہے کہ دوسرے دن جاؤ اور باتوں باتوں میں اس کے عقیدے کی اصلاح کر دو۔ واقعی حضرات فقہاء کی وجود بھی امت کے لئے رحمت ہے۔ مسلمانوں کو تکدر اور وحشت سے بچانے کا کتنا خیال کیا ہے کہ عیادت میں جاہلانہ عقائد کی بھی رعایت کی ہے کہ جس دن میں جہلاء عیادت کو منحوس سمجھتے ہوں اس دن عیادت نہ کرو ورنہ وہ عیادت ایسی ہوگی جیسے ایک بہرہ اپنے دوست کی عیادت کو گیا تھا وہ اس کی صورت ہی دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ یہ کمبخت کہاں آمرا۔ اپنی سب کہے گا اور میری کچھ نہ سنے گا۔ چنانچہ بہرہ نے مزاج پرسی کی کہ اب کیا حال ہے۔ مریض نے جھلا کر کہا کہ مر رہا ہوں۔ وہ سمجھا یوں کہتا ہے اب افاقہ ہے تو آپ فرماتے ہیں الحمد للہ۔ پھر پوچھا کہ آج کل کون سی دوا استعمال میں

ہے۔ مریض نے کہا کہ زہر پی رہا ہوں۔ آپ سمجھے کہ کسی دوا کا نام لیا ہوگا۔ تو فرمایا خدا اسے رگ رگ میں پیوست کرے۔ پھر پوچھا کون سے حکیم کا علاج ہے۔ مریض نے کہا ملک الموت کا بہرہ نے جواب دیا کہ خدا ان کے قدم کو مبارک کرے بڑے اچھے طبیب ہیں تو بتلایئے ایسی عیادت سے کیا نفع جس سے مریض کو بجائے تسلی کے وحشت ہو۔ اس لئے عیادت کے واسطے وہ لوگ جائیں جن سے مریض کو انس ہو اور ان کے جانے سے تسلی ہو۔ ایسے لوگوں کی عیادت سے واقعی مریض میں تخفیف ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک بار کانپور میں مجھے والد صاحب کا خط ملا کہ میں آج کل ایک ضرورت سے آلہ آباد آیا تھا یہاں مجھ کو بخار ہو گیا ہے۔ میں خط دیکھتے ہی آلہ آباد گیا پس میرے جاتے ہی والد صاحب بالکل اچھے ہو گئے تو عیادت کے لئے صرف ایسے لوگوں کو جانا چاہیے جن سے مریض کو انس ہو اور دوسرے لوگ جائیں بھی تو وہاں جا کر زیادہ باتیں نہ بنانی چاہئیں۔ اس سے مرض کو وحشت ہوتی ہے پس مزاج پرسی کر کے تھوڑی دیر بیٹھیں پھر اپنے کام میں لگیں۔ مگر آج کل عادت یہ ہے کہ مریض کے پاس گھنٹوں بیٹھتے اور باتیں بناتے ہیں جس سے اس غریب کو تکلیف ہوتی ہے مگر یہ اپنے گمان میں اس پر احسان کر رہے ہیں۔ افسوس غیر مسلموں میں یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی کسی سے ملنے جاتا ہے تو وہ پوچھ لیتا ہے کہ آپ کو کچھ کہنا ہے اگر کہنا ہوا تو فوراً سن لیا اور جو کچھ کہنا نہ ہوا تو فوراً رخصت کر دیتے ہیں مگر ہمارے یہاں کوئی ایسا کرے تو کمبختی آ جائے طعن و تشنیع ہونے لگے اور اس کا راز یہ ہے کہ ہم لوگوں کو کوئی کام نہیں اس لئے وقت کی بھی قدر نہیں۔

اجتماع تعزیت

الغرض تعزیت میں ان لوگوں کو جانا چاہیے جن سے وارثوں کو تسلی ہو۔ باقی لوگوں کو خط سے تعزیت کرنا چاہیے۔ مگر آج کل قاعدہ یہ ہے کہ جہاں برادری میں کوئی مرا۔ چاروں طرف سے گاڑیاں لے کر برادری والے اس کے یہاں ڈھبہ ڈالتے ہیں۔ اس بیچارہ کو ایک غم تو اپنے عزیز کے مرنے کا تھا دوسرا غم ان زندوں کے کھلانے پلانے کا ہوتا ہے۔ پھر گاڑیوں کے گھاس دانے کا الگ تردد۔ یہ بھی کوئی انسانیت ہے ضلع بلند شہر میں بھی یہی رواج تھا کہ چالیسویں کے دن میت کے گھر ساری برادری جمع ہوتی تھی۔ ایک رئیس زادے نے اس کا خوب علاج کیا۔ اس کے والد کا انتقال کے بعد جب موقع پر ساری برادری جمع ہوئی۔ اسے ناگوار ہوا کہ مجھے ایک تو والد کا غم تھا دوسرا غم برادری کے کھلانے پلانے کا سر پڑا۔ اس نے ملامت کے خوف سے عمدہ عمدہ کھانے تو

پکوائے اور سارا انتظام کیا جب کھانا تیار ہو گیا اور برادری کے لوگ کھانے کے واسطے بیٹھے اس وقت رئیس زادہ نے سب کو خطاب کر کے کہا کہ مجھے آپ حضرات سے ایک بات عرض کرنی ہے وہ یہ کہ سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ میرے سر پر سے والد صاحب قبلہ کا سایہ اٹھ گیا ہے۔ اور اس کا جتنا رنج وغم بیٹے کو ہوتا ہے سب جانتے ہیں تو اس حالت میں میری ایک ہمدردی کرنا چاہیے کیا یہی ہمدردی ہے جو آپ لوگ کر رہے ہیں۔ آپ لوگوں کو شرم نہیں آتی کہ میں تو غم میں مبتلا اور آپ پلاؤ زردہ کھانے کے واسطے تیار۔ بس مجھے جو کہنا تھا کہہ چکا۔ اب بسم اللہ کیجئے۔ لوگوں نے کہا تم نے جوتے تو پہلے ہی کھلا دیئے۔ اب کھانا خاک کھاویں۔ یہ کہہ کر سب لوگ دستر خوان پر سے اٹھ گئے اور دوسرے مکان میں ہو کر ان کی کمیٹی ہوئی کہ واقعی یہ رسم بہت وا۔ ت ہے اس کو توڑنا چاہیے۔ چنانچہ طے ہو گیا کہ میت کے گھر تعزیت کے لئے سب کو جانے کی ضرورت نہیں۔ خاص خاص عزیزوں کو جانا چاہیے اور برادری والے جائیں بھی تو تعزیت کر کے فوراً واپس چلے آئیں۔ وہاں کھانا نہ کھائیں یہ طے کر کے سب چلے اور وہ کھانا غرباء کو کھلایا گیا۔

سالک کے لئے تنبیہ

یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ میں نے کہا تھا کہ شیخ کے پاس ایسے وقت میں جانا چاہیے، جس میں تمہارا جانا اس پر گراں نہ ہو بزرگوں کو زیادہ لپٹنے میں یہ بھی خرابی ہے کہ بعض دفعہ ایسی حرکات تم سے صادر ہوں گی جن سے ان کو انقباض ہوگا۔ تھوڑی دیر پاس بیٹھنے میں تو تم اپنی حرکات کی نگہداشت کر سکتے ہو اور ہر وقت پاس رہنے میں اس کی رعایت دشوار ہے اور اہل اللہ میں چونکہ لطافت زیادہ ہوتی ہے اس لئے ان کو بعض ایسی حرکات سے انقباض ہو جاتا ہے۔ جن کو تم معمولی بات سمجھتے ہو۔

حضرت مرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک مرید سال میں دو دفعہ آیا کرتا تھا۔ ایک بار ان سے عرض کیا کہ حضرت مجھے حاضر خدمت ہوتے ہوئے اتنا زمانہ گزر گیا آپ نے مجھ سے کوئی فرمائش نہیں فرمائی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کوئی فرمائش کریں اور میں اس کو پورا کروں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ بھائی تم محبت سے مل لیتے ہو۔ بس یہی کافی ہے۔ فرمائش کی کیا ضرورت ہے اس نے پھر اصرار کیا تو فرمایا کہ تمہارے اصرار کے بعد میں ایک فرمائش کرتا ہوں برا نہ ماننا اس نے کہا حضرت میں تو غلام ہوں میری کیا مجال کہ حضرت کی فرمائش سے برا مانوں خصوصاً جب میرے اصرار ہی سے آپ فرما رہے ہیں فرمایا بھائی میری تم سے یہ فرمائش ہے کہ تم سال میں

دو دفعہ آیا کرتے ہو اب سے ایک دفعہ آیا کرو۔ کیونکہ تم کھاتے بہت ہو تمہارے کھانے کو دیکھ کر میرے پیٹ میں گڑ بڑ ہونے لگتی ہے پھر جب تک مسہل نہیں لے لیتا اس وقت تک طبیعت درست نہیں ہوتی تو سال میں ایک بار مسہل لینا تو آسان ہے مگر دو دفعہ مشکل ہے۔ کیا ٹھکانا ہے لطافت کا کہ دوسرے کو زیادہ کھاتے ہوئے دیکھ کر آپ کے پیٹ میں گڑ بڑ ہونے لگتی تھی۔ چاہے کھانے والے کو خاک بھی اثر نہ ہوتا ہو۔ اسی طرح ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت ان کے پاجامہ میں سلوٹیں ایک طرف کم تھیں ایک طرف زیادہ پڑی ہوئی تھیں۔ مرزا صاحب کی نظر جو سلوٹوں پر پڑی پریشان ہو گئے۔ اتنے تو نازک تھے مگر اسی کے ساتھ آپ کے عدل کی یہ حالت تھی کہ ایک مرید سے آپ نے فرمایا کہ تم اپنے بچوں کو ہمارے پاس نہیں لاتے وہ بیچارہ کچھ بہانے کر دیتا کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ مرزا صاحب بہت نازک مزاج ہیں اور بچے شوخ ہوتے ہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی کسی حرکت سے آپ کو تکلیف پہنچے جب آپ نے کئی بار تقاضا کیا تو تین چار دن ٹال کر وہ اپنے بچوں کو لائے اور اس عرصہ میں ان کو خوب تعلیم دی کہ اس طرح سر جھکا کر بیٹھنا یوں ادب کرنا۔ مجلس میں ادھر ادھر نہ دیکھنا۔ بچوں نے اسی طرح کیا کہ سلام کر کے بت کی طرح خاموش بیٹھ گئے۔ نہ نگاہ اوپر اٹھائی نہ کوئی بات کی۔ اب مرزا صاحب ان کو کھولنا چاہتے ہیں تو کھلتے نہیں۔ مرزا صاحب نے مرید سے فرمایا کہ میاں تم آج بھی اپنے بچوں کو نہ لائے اس نے عرض کیا حضرت یہ حاضر تو ہیں۔ فرمایا یہ بچے ہیں یہ تو تمہارے بھی ابا ہیں۔ بچے تو کھیلتے ہیں کودتے ہیں شوخیاں کرتے ہیں کوئی ہماری ٹوپی اتارتا کوئی کمر پر سوار ہوتا بچے تو ایسے ہوتے ہیں۔ اور یہ تو تمہارے بھی ابا بن کے بیٹھ گئے۔ اسوقت معلوم ہوا کہ مرزا صاحب نازک نہیں ہیں بلکہ لطیف المزاج ہیں اور لطافت میں خلاف اعتدال حرکات ناگوار ہوا کرتی ہیں اور بچوں کی شوخی اعتدال کے خلاف نہیں کیونکہ بچپن کا مقتضاء یہی ہے کہ بچہ بچوں کی طرح شوخ ہو۔ باوا دادا کی طرح متین نہ ہو۔ اس لئے یہاں آپ کو شوخی ہی پسند تھی متانت پسند نہ تھی۔ غرض اہل اللہ میں چونکہ ذکر اللہ سے لطافت بڑھ جاتی ہے اس لئے ان کو لوگوں کی بے ڈھنگی حرکت سے انقباض ہوتا ہے اور جب شیخ کو انقباض ہوگا تو اس کا قلب تم سے مکدر ہو جائے گا اور شیخ کی مثال پرنالہ جیسی ہے اگر پرنالہ میں گارا کیچڑ بھر دو گے تو پانی بھی گدلا آئے گا اسی طرح جب تم شیخ کو مکدر کر دو گے تو فیض بھی مکدر ہو کر آئے گا۔ اس لئے اپنے شیخ کو بھی زیادہ نہ لپٹنا چاہیے۔

ایک ضرر شیخ کو زیادہ لپٹنے سے یہ ہوتا ہے کہ تم نے بزرگوں کے قصے دیکھے تھے کہ فلاں بزرگ رات میں سو رکعتیں پڑھتے اور اشراق کی اتنی رکعتیں پڑھتے تھے۔ اور دن رات میں اتنا ذکر کرتے تھے۔ زیادہ اختلاط سے تم نے اپنے شیخ کو ویسا نہ پایا تو اب تم شیخ سے ضعیف الاعتقاد ہو گئے۔ حالانکہ تم کو اپنے شیخ کے سامنے کسی کی طرف التفات بھی نہ کرنا چاہیے تھا۔

عظمت شیخ

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اگر کسی مجلس میں جنید و شبلی ہوں اور حاجی صاحب بھی ہوں تو ہم تو جنید و شبلی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ بس حاجی صاحب ہی کی طرف اپنی نگاہ رکھیں۔ ہاں حاجی صاحب کا جی چاہے وہ ان کی طرف دیکھیں ہم تو کسی کی طرف بھی نہ دیکھیں گے۔ سبحان اللہ یہ حضرات ہیں شیخ کی قدر جاننے والے۔

جب میں مکہ معظمہ گیا تو حاجی صاحب کی مجلس کے سوا میں کہیں نہ جاتا تھا۔ اس وقت خلیل پاشا بہت بڑے بزرگ وہاں موجود تھے۔ حاجی صاحب بھی ان کی تعریف فرماتے تھے۔ مگر میں کبھی ان کی خدمت میں نہیں گیا۔ ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ تم خلیل پاشا سے ملنے نہیں گئے۔ میں نے کہا کہ شیوخ طرق ہیں اور طرق کی مثال ایسی ہے جیسے کراچی اور بمبئی مکہ پہنچنے کے لئے۔ تو اب جو شخص کراچی بندر سے سوار ہو اس کو بمبئی کے بندر پر آنے کی کیا ضرورت ہے اور جو بمبئی کے بندر سے سوار ہو اس کو کراچی جانے کی کیا ضرورت ہے۔ مقصود تو کعبہ ہے اس کے لئے کسی ایک بندر سے سوار ہونا کافی ہے۔ اسی طرح مقصود وصول الی اللہ ہے اس کے لئے ایک شیخ کی صحبت کافی ہے۔ دنیا بھر کے شیوخ کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے اس جواب پر وہ بزرگ خاموش ہو گئے۔

تو جس طرح اپنے شیخ کے ہوتے ہوئے دوسرے شیوخ اخیار کی طرف التفات خلاف ادب ہے اسی طرح شیوخ اموات کی طرف التفات بھی مضر ہے۔ اور اپنے شیخ کے حالات کو ان کے حالات سے موازنہ کرنا تو بہت ہی حماقت ہے مگر کثرت اختلاط میں بعض لوگ اپنے شیخ کے اعمال کو پہلے بزرگوں کے اعمال سے موازنہ کرنے لگتے ہیں۔ یہ طالب کے لئے بہت مضر ہے۔

آداب صحبت

بزرگوں کی صحبت کے آداب سلاطین کی صحبت سے بھی زیادہ ہیں۔ کیونکہ سلاطین تو اپنی سلطنت کے بقاء کے لئے بعض دفعہ اہل دربار کی رعایت بھی کرتے ہیں کہ مبادات یہ ہم سے برگشتہ ہوکر کسی دوسرے کو بادشاہ نہ بنالیں۔ نیز سلاطین میں بزرگوں کے برابر لطافت بھی نہیں ہوتی۔ اس لئے ان کو اہل دربار کی بعض حرکتوں پر التفات بھی نہیں ہوتا۔ اور اہل اللہ کو نہ کسی کا خوف ہے بجز خدا کے نہ کسی کا ان پر دباؤ ہے اور لطافت ان میں بہت ہوتی ہے۔ اس لئے ان کی صحبت کے آداب بہت سخت ہیں جو ان آداب کی رعایت نہ کر سکے اس کو بزرگوں کے زیادہ اختلاط سے منع کیا جائے گا۔ اور جب بزرگوں سے زیادہ اختلاط کرنا بھی مضر ہوتا ہے تو اشرار سے اختلاط تو کیوں مضر نہ ہوگا۔ بس سالک کو اکثر اوقات عزلت میں رہنا چاہیے۔ ہاں جس شخص کی صحبت میں دین ہی دین ہو۔ صلاح ہی صلاح ہو فساد کا بالکل اندیشہ نہ ہو اس سے ملنے کا مضائقہ نہیں۔ بلکہ ایسی جلوت خلوت سے بہتر ہے اور جس کے اختلاط میں فساد کا کچھ بھی اندیشہ ہو اس سے نہ ملے حتیٰ کہ اگر اپنے شیخ کی مجلس میں بھی غیبت ہونے لگے فوراً اٹھ جاؤ جیسے بارش عمدہ چیز ہے اور اس میں نہانا مفید بھی ہے مگر اولے پڑنے لگیں تو بھاگنا ہی چاہیے۔ اسی طرح شیخ کی باتیں بارش کے مشابہ ہیں اور غیبت وغیرہ اولے کے مشابہ ہے۔ جب تک بارش ہی بارش ہو جمے رہو اور جب اولے پڑنے لگیں تو بھاگو۔

محاسن اعتکاف

جب آپ کو کثرت اختلاط کے مفاسد اور قلت اختلاط کے منافع معلوم ہو چکے تو اب سنئے کہ شریعت نے قلت اختلاط کی کیا صورت تجویز کی ہے۔ شریعت نے قلت اختلاط کی صورت اعتکاف تجویز کی ہے اور رمضان میں اس کا خاص اہتمام کیا گیا ہے چنانچہ عشرہ اخیر میں اعتکاف کرنا سنت مؤکدہ علی الکفایہ ہے اس لئے رمضان سے اس کو بھی خاص تعلق ہے۔ بہرحال تقلیل اختلاط کی یہ ایسی صورت ہے کہ کوئی صاحب ریاضت اس کی نظیر نہیں دکھلا سکتا۔ اعتکاف میں نہ وہ غوائل ہیں جو خلوت محضہ میں ہیں نہ وہ غوائل ہیں جو اختلاط صرف میں ہیں۔ کیونکہ معتکف خلوت میں بھی ہے اور جلوت میں بھی۔ یہ ریاضت خلوت وجلوت دونوں کو جامع ہے ایسی ریاضت جو دونوں کو جامع ہو کسی صاحب ریاضت کے خواب میں بھی نہ آئی ہوگی۔

اہل اختلاط نے عزلت میں ایک خرابی یہ بتلائی تھی کہ اس سے تعلیم وتعلم کا باب مسدود ہوتا ہے تو یہ خرابی اعتکاف میں نہیں۔ کیونکہ معتکف کو تعلیم وتعلم سے منع نہیں کیا گیا اور چونکہ اعتکاف مسجد میں ہوتا ہے جہاں اہل علم آتے رہتے ہیں اس لئے معتکف کو تعلیم وتعلم میں کوئی دقت بھی نہیں ہوسکتی۔

ایک خرابی یہ بتلائی تھی کہ عزلت میں جماعت کے ثواب سے محروم ہو جاتا ہے اعتکاف اس سے بھی منزہ ہے کیونکہ اعتکاف کے لئے مسجد جماعت شرط ہے۔ معتکف سے زیادہ تو جماعت کا ثواب کسی کو مل ہی نہیں سکتا۔ وہ تو ہر نماز میں تکبیر اولیٰ کو پاتا ہے اور ہر وقت جماعت کے انتظار میں رہتا ہے۔ اور انتظار جماعت کا ثواب بھی جماعت کے برابر ہے۔

ایک خرابی یہ بتلائی تھی کہ عزلت میں بزرگوں کے فیض سے محروم ہو جاتا ہے۔ اعتکاف اس سے بھی منزہ ہے کیونکہ یہ شخص پانچوں وقت نمازیوں سے ملتا ہے جن میں بعض اولیاء بھی ہوتے ہیں۔

ایک خرابی یہ بتلائی تھی کہ عزلت میں صرف اپنے اعمال پیش نظر ہوتے ہیں جس سے عجب وکبر کا اندیشہ ہے۔ اور اختلاط میں اپنے سے افضل کے اعمال پر نظر پڑتی ہے تو تواضع پیدا ہوتی ہے۔ اعتکاف میں یہ غائلہ بھی نہیں کیونکہ مسجد میں بہت لوگ نماز کے لئے آتے ہیں جن میں بعضے بہت عبادت کرنے والے ہوتے ہیں معتکف کی نظر ان کے اعمال پر بھی پڑتی ہے تو کبر وعجب پیدا نہیں ہوسکتا۔

ایک خرابی یہ بتلائی تھی کہ عزلت سے شہرت ہو جاتی ہے اعتکاف میں یہ بات بھی نہیں کیونکہ معتکف کسی پہاڑ کی کھو میں نہیں بیٹھتا۔ جس سے شہرت ہو بلکہ بستی کی مسجد میں بیٹھتا ہے جہاں سب سے ملاقات بھی ہوتی رہتی ہے اور اس کو عرفاً گوشہ نشینی اور عزلت گزینی نہیں شمار کیا جاتا۔ اس لئے معتکف کی شہرت بھی نہیں ہوتی۔ ہر سال بیسوں اعتکاف کرتے ہیں کوئی بھی بزرگ مشہور نہیں ہوتا۔ اسی طرح اعتکاف میں وہ غوائل بھی نہیں جو اختلاط صرف میں تھے۔

اختلاط میں ایک مضرت یہ تھی کہ اس میں اشرار کی صحبت بھی بعض دفعہ ہوتی ہے اور اشرار کی صحبت سے دین کا ضرر ہوتا ہے سو معتکف اس سے محفوظ ہے کیونکہ اشرار مسجد میں آتے ہی نہیں۔ مسجد میں نمازی آتے ہیں اور نمازی اکثر نیک ہوتے ہیں اور اگر بعضے بد بھی ہوں تو نماز کے وقت وہ نیک ہی بن جاتے ہیں اس لئے ان کی صحبت مضر نہیں ہوتی۔ پھر وہ صحبت طویل نہیں ہوتی ایسے لوگ مسجد میں نماز کے بعد ٹھہرتے ہی نہیں تو صرف نماز کے وقت میں تھوڑی دیر کی صحبت ہوتی ہے اور اس میں بھی اشرار شر سے خالی اور نیک کام میں مشغول ہوتے ہیں۔

ایک مفسدہ یہ بتلایا گیا تھا کہ اختلاط میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے باتوں میں وقت برباد ہوتا ہے۔ معتکف اس سے بھی محفوظ ہے کیونکہ اس کے پاس باتیں کرنے والے آتے ہی نہیں مسجد میں نماز سے فراغت کے بعد ٹھہرتا کون ہے جو معتکف سے باتیں کرے۔ دوست احباب بھی گھر پر ہی آتے ہیں مسجد میں کوئی نہیں آتا۔ اس لئے معتکف کو باتیں بنانے کا موقع نہیں ملتا۔ اور کثرت کلام کے غوائل سے وہ محفوظ رہتا ہے اور ذکر وفکر وتلاوت نماز کے لئے اس کو بہت وقت ملتا ہے۔

ایک مفسدہ اختلاط میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اس میں نگاہ کی حفاظت نہیں ہوتی معتکف اس سے بھی محفوظ ہے اس کے پاس نامحرم عورت کوئی نہیں آتی۔ اور مسجد میں امارد بھی کم آتے ہیں اور جو آتے ہیں وہ نماز کے بعد بھاگ جاتے ہیں۔ غرض معتکف سے ایسا اختلاط کسی کا نہیں ہوتا جو اس کا وقت ضائع ہو یا دوستی اور دشمنی پیدا ہو اور مزا یہ ہے کہ معتکف سے نماز کے وقت سب ملنے آتے ہیں یہ کسی سے ملنے نہیں جاتا اور ویسے بھی کسی کو اس سے ملنا ہو تو خود ہی آئے گا یہ کہیں نہیں جاتا۔ تو خوب آزاد رہتا ہے اور اس کی آزادی کی یہ حالت ہوتی ہے۔

نہ براشتر سوارم نہ چواشتر زیر بارم نہ خداوند رعیت نہ غلام شہر یارم

ترجمہ: نہ میں اونٹ پر سوار ہوں نہ اونٹ طرح زیر بار ہوں نہ رعیت کا آقا ہوں اور نہ کسی آقا کا غلام۔

فضیلت اعتکاف

غرض اعتکاف ایسی عجب ریاضت ہے کہ خلوت وجلوت دونوں کے منافع اس میں موجود ہیں اور غوائل سے دونوں کے مبرا ہے۔ اس لئے شریعت میں اعتکاف کی بہت فضیلت بیان کی گئی ہے اور اس کی ترغیب دی گئی ہے چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔

(هوای المعتكف) يعتكف الذنوب و يجزى له من الحسنات كعامل الحسنات كلها رواه ابن ماجه (لم اجد الحديث في "موسوعة اطراف الحديث النبوی شريف") کہ معتکف گناہوں سے الگ رہتا ہے اس پر بظاہر ایک اشکال وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر کوئی شخص اعتکاف نہ کرے اور ویسے ہی گھر کو بند کر کے خلوت اختیار کرے وہ بھی گناہوں سے بچ سکتا ہے پھر اعتکاف کی اس میں کیا خصوصیت ہے اور اگر خصوصیت نہیں تو اس حکم کو بعنوان معتکف بیان کرنا صحیح نہ ہوگا کیونکہ بقاعدہ بلاغت مسند الیہ مشتق میں مادۂ اشتقاق علت حکم ہوا کرتا ہے پس مطلب یہ ہوا کہ کف عن الذنوب کی علت اعتکاف ہے اور یہ مطلب بدون خصوصیت کے

صحیح نہیں ہوسکتا۔ جواب یہ ہے کہ گناہوں کے ترک کرنے کی دو قسمیں ہیں اور ہر ایک کا جدا جدا حکم سوایک ترک تو اصلی ہے یعنی گناہ کا عدم اصلی کے ساتھ منعدم ہونا اور ایک وہ ترک ہے جو عزم کے ساتھ ہو یعنی ترک کو قصد کے ساتھ متعلق کیا۔ سو اول قسم ہو تو کوئی ثواب نہیں ملتا اس لئے کہ ثواب اعتقاد قصد پر ہے دوسرے ایسے تروک تو غیر متناہی ہیں تو چاہیے ہر آن میں غیر متناہی اجر ملا کرے اور اس کا کوئی قائل نہیں اس کا التزام خلاف اجماع ہے اور دوسری قسم پر ثواب ہوتا ہے یعنی کسی معصیت کی طرف التفات ہوا اور اس سے اپنے کو روک لیا اس پر ثواب ملتا ہے یہ قاعدہ تو عام ہے۔

خصوصیات اعتکاف

اب سمجھو کہ اعتکاف میں یہ تخصیص ہے کہ معتکف کو تمام تروک پر ثواب ملتا ہے گو وہ اس کے ذہن میں بھی نہ ہوں اور ان سے ان کے ترک کا قصد بھی نہ کیا ہو۔ بس یہ خصوصیت ہے اعتکاف میں جو مطلق خلوت میں نہیں جس کی وجہ سے حضورؐ نے فرمایا هو (ای المعتکف) یعتکف الذنوب اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اس کے بعد حضورؐ کا ارشاد ہے و یجزی له من الحسنات کعامل الحسنات کلها یعنی جن حسنات پر یہ قادر تھا اور اعتکاف کی وجہ سے نہیں کر سکتا گو اس نے ان کی نیت بھی نہ کی ہو ان سب کا ثواب اس کے نامہ اعمال میں لکھا جاتا ہے (اور دلیل اس عموم کی الحسنات کلها کا عموم ہے) پس جب معتکف کے لئے تمام حسنات کا ثواب لکھا جاتا ہے تو اس سے پہلے جملہ کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام گناہوں سے بچنے کا ثواب بھی لکھا جاتا ہے گو اس نے ان سے بچنے کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو۔ اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ اہل اختلاط نے جو عزلت میں یہ خرابی بیان کی تھی کہ اس کی وجہ سے آدمی خدمت خلق کے ثواب سے محروم ہو جاتا ہے اعتکاف اس سے بھی بری ہے کیونکہ اس میں تمام طاعات کا جن پر معتکف قادر تھا مگر اعتکاف کی وجہ سے نہ کر سکا ثواب ملتا ہے پس مطلق خلوت اعتکاف کے برابر نہیں ہے گو گناہوں سے بچنا اس میں بھی ممکن ہے اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اعتکاف میں عبدیت زیادہ ہے کہ لوگ کمانے کھانے اور سیر و تفریح میں مشغول ہیں اور معتکف اپنے آقا کے دروازہ پر پڑا ہے اور زبان حال سے یوں کہہ رہا ہے۔

خسرو غریب است و گدا افتادہ در کوئے شما　　شاید کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

اگر معتکفین اس شعر کے مضمون کو متحضر رکھیں تو اعتکاف میں ان کو ایک خاص کیفیت حاصل

ہوگی بلکہ گا ہے گا ہے اس شعر کو پڑھ لیا کریں تو اور اچھا ہے۔

غرض شریعت نے جو مجاہدہ بھی تجویز کیا ہے وہ نہایت عجیب ہے کہ منافع مجاہدہ کے اس میں سب مجتمع ہیں بلکہ مع شئی زائد اور غائلہ کچھ نہیں۔ بحمد اللہ اب چاروں مجاہدات کا بیان ختم ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ رمضان میں مجاہدات اربعہ کی ایسی عجیب طرز سے رعایت کی گئی ہے کہ کسی صاحب ریاضت نے آج تک ایسی رعایت نہیں کی اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ بقیہ ایام میں ہم کو عمل کی توفیق دیں اور اگر روزہ وذکر وتلاوت قرآن وتراویح وغیرہ میں ہم سے کچھ کوتاہی ہوگئی ہو تو حق تعالیٰ بقیہ ایام میں اس کی تلافی کی ہمت عطا فرماویں۔ ابھی ایک رات اور باقی ہے جس میں شب قدر کا احتمال ہے کیونکہ شب قدر بعض قول پر رمضان کی تیسویں شب میں بھی ہوتی ہے[ا]

اہتمام شب قدر

اور اگر شب قدر نہ بھی ہو تب بھی رمضان کی رات تو ہے۔ اور رمضان کی ہر رات قابل قدر ہے اور اگر چاند بھی ہو جاوے تو شب عید تو ہے جس کے احیاء کو فقہاء نے مستحب فرمایا ہے کما فی الدر المختار۔ بلکہ رمضان اور عید کی کیا خصوصیت ہے۔ رات تو ہر اک ہی قابل قدر ہے کسی نے خوب کہا ہے[ا]

اے خواجہ چہ پرسی زشب قدر نشانی ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

اس لئے اس رات میں جاگنا چاہیے اور اگر کسی کو خود جاگنا نہ آتا ہو تو کم از کم جاگنے والوں کے پاس ہی آ پڑے ان کی حالت دیکھ کر چکھی ہو جائے گی پھر خود بھی جاگنا آسان ہو جائے گا۔ اسی لئے مولانا نے اس جماعت کی مجاورت ہی کا مشورہ دیا ہے فرماتے ہیں۔

حواب را بگذار امشب ای پسر یک شبے درکوئے بے خواباں گزرے

(اے لڑکے آج کی رات نہ سو۔ ایک رات نہ سونے والوں کے کوچہ میں بسر کرتے)

[ا] کما فی النووی و قیل تختص باوتار العشر و قیل باشفاعها کما فی حدیث ابی سعید ۱۵ و الحدیث رواہ مسلم و فیہ فالتمسو ها من العشر الاواخر من رمضان التمسو ها فی التاسعة والسابعة والخامسة قال قلت یا اباسعید انکم اعلم بالعدد ومناقال اجل نحن احق بذلک منکم قال قلت ماالتاسعة والسابعة والخامسة قال اذا مضت واحدة و عشرون فالق تلیها لثنتین و عشرین وهی التاسعة فاذا مضی ثلث و عشرون فالق تلیها السابعة فاذا مضی خمس و عشرون فالق تلیها الخامسة الحدیث قلت و کذااذامضی سبع وعشرون فالق تلیها الثالثة و اذا مضی تسع و عشرون فالق تلیها هی الاولیٰ فهذا تسع لیال والله اعلم ۱۲ منه)

جن لوگوں کو تہجد کی عادت نہ ہو وہ چند روز خانقاہ میں آ کر رہیں۔ ان شاء اللہ بہت جلد عادت ہو جائے گی ایک بات قابل تنبیہ یہ ہے کہ شب قدر میں تمام رات جاگنا لازم نہیں بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ شب قدر میں تمام رات جاگنا ضروری ہے جبھی اس کی فضیلت حاصل ہوتی ہے اور کہتے ہیں کہ شب قدر ایک خاص وقت کا نام ہے جس میں تجلی ہوتی ہے یہ صحیح نہیں بلکہ تمام رات کا ہر حصہ شب قدر ہے چنانچہ قرآن میں ہے ہِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ اور یہ جو حدیث میں آتا ہے۔ من حرمها فقد حرم الخير كله (لم اجد الحديث فى "موسوعة اطراف الحديث النبوى شريف") وہ بھی ہماری ہی دلیل ہے کیونکہ محروم ہونا یہ ہے کہ کچھ نہ ملے اور اگر کچھ مل جائے تو وہ محروم نہیں جیسے سائل کو ایک روپیہ یا ایک پیسہ ہی مل جائے تو اس کو محروم نہیں کہہ سکتے پس اگر کوئی شخص تمام رات نہ جاگے بلکہ سحری ہی میں اٹھ کر صبح سے پہلے دو رکعت نماز پڑھ لے اس نے بھی شب قدر کی فضیلت حاصل کر لی محروم نہیں ہوا چنانچہ شامی نے امداد سے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے۔ وقيل بساعة منه (باب) السنن والنوافل اور جو ہمت کر کے زیادہ جاگے بیشک اس کو زیادہ فضیلت حاصل ہوگی لیکن احیاء لیل کے لئے تمام رات جاگنا ضروری نہیں بلکہ بعض کو تو ساری رات جاگنا ممنوع ہے جن کو اس سے اپنے بیمار ہونے کا اندیشہ ہو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جو طالبین جمع ہوئے تھے وہ سب کے سب دو بجے رات کو جاگتے تھے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی دو بجے اٹھنا چاہتے تو حاجی صاحب ان سے فرماتے کہ ابھی بہت رات ہے سو رہو۔ بس مولانا صبح کے قریب اٹھتے تھے کیونکہ بوجہ نازک مزاجی کے مولانا کو زیادہ جاگنا مضر تھا اس لئے حاجی صاحب دو بجے اٹھنے سے ان کو منع فرماتے اور ایسے ہی موقع پر حضرت حاجی صاحب یہ شعر پڑھ دیتے تھے۔

گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ وفریاد ہم　　بس ہے اپنا ایک بھی نالہ اگر پہنچے وہاں

یہ شعر حاجی صاحب ہی کا ہے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ زیادہ محنت کرنے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ قاعدہ کے ساتھ کام کرنے سے نفع ہوتا ہے ایک شخص دو بجے سے جاگ کر ذکر میں مشغول ہو گیا مگر سر میں درد ہے کام میں جی نہیں لگتا یا نیند کے جھونکے آ رہے ہیں یہ مفید نہیں اس شخص کو تین بجے اٹھنا چاہیے۔ جب نیند خوب بھر جائے۔ اب جو یہ کام میں لگے گا دماغ تازہ ہوگا۔ توجہ بھی خوب ہوگی۔ اس سے نفع ہوگا شب قدر کے متعلق یہ ضروری مضمون تھا اس لئے بیان کر دیا۔ اب میں ختم

کرتا ہوں اور اس بیان کا نام تقلیل الاختلاط مع الانام فی صورۃ الاعتکاف فی خیر مقام تجویز کرتا ہوں۔

اور خیر مقام سے مراد مسجد ہے جیسے یہ وعظ لمبا ہے ایسے ہی اس کا نام بھی لمبا ہو گیا اور مجموعہ مواعظ اربعہ کا نام ابواب المجاہدہ رکھتا ہوں چونکہ یہ چاروں وعظ ایک ہی آیت کے متعلق ہیں اور ان میں مضمون بھی ایک ہی بیان ہوا ہے یعنی مجاہدہ کا اس لئے جو صاحب ان کو طبع کریں وہ سب کو یکجا طبع کریں۔ متفرقاً طبع نہ کریں کہ اس سے مضمون میں تشتت ہو جاوے گا اس سے پہلے بھی رمضان کے متعلق چند مواعظ یکجا ہی طبع ہوئے ہیں جن کا لقب ہفت اختر ہے چونکہ یہ وعظ چار ہیں اس لئے ان کا لقب عناصر اربعہ مناسب ہے کیونکہ ان میں مجاہدہ کے چار ارکان بیان ہوئے ہیں اور لغت میں ارکان وعناصر ہم معنی ہیں۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ فہم سلیم عطا فرمائے اور عمل کی توفیق دے آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ وسلم علی خیر خلقہ
سیدنا محمد و علیٰ آلہ واصحابہ اجمعین
و آخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین
والحمدللہ الذی بنعمتہ وجلالتہ تتم الصالحات.

وعظ مسمی بہٗ

التہذیب

(۴)

۱۳؍رمضان المبارک ۱۳۳۲ھ کو جامع مسجد تھانہ
بھون ساڑھے ۳ گھنٹے فضائل اعتکاف اور اس کی
حکمتوں کے بارے میں بیٹھ کر بیان فرمایا
مولانا محمد عبداللہ صاحب گنگوہیؒ نے قلمبند فرمایا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبہ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہٗ و نستعینہ‘ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ‘ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہ‘ و رسولہ وصلی اللہ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم‘

اما بعد......**فاعوذ باللہ من الشیطان الرحیم۔**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا۝ (الکہف:۱۶)

(اور جب تم ان لوگوں سے الگ ہو گئے اور ان کے معبودوں سے بھی سوائے اللہ کے تو تم غار میں چل کر پناہ لو تم پر تمہارا رب اپنی رحمت پھیلا دے گا اور تمہارے لئے اسی کام میں کامیابی کا سامان درست کر دے گا)

تمہید

میں نے اس سے پہلے تین جمعوں میں مبسوط طور سے بیان کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بعض حکم ومصالح کے لئے اس ماہ مبارک میں روزہ اور قیام لیل یہ دو عبادتیں مشروع فرمائی ہیں اور ان حکم ومصالح کو بھی مختصراً بیان کیا تھا اور یہ بات بھی بتلائی تھی کہ حقیقت ان عبادات کی مجاہدہ اور بعض

امراض باطنیہ کا معالجہ ہے کہ جس میں بعض امراض کے معالجہ میں قیام لیل کو دخل ہے اور بعض میں روزہ کو دخل ہے اور یہ بھی بتلایا تھا کہ وہ حکم ومصالح جب مرتب ہوتے ہیں کہ جب حقوق ان کے ادا کئے جاویں اور ان حقوق کو بھی بیان کیا تھا اور تمہید میں یہ بھی بیان کیا تھا کہ ان مجاہدات کی تکمیل کے لئے اور ان پر آثار مرتب ہونے کے لئے اکثر عادتاً ضرورت ہوتی ہے ایک خاص طریق کی اور وہ طریق خلوت ہے اور یہ بھی بیان کیا تھا کہ وہ آثار کیونکر مرتب ہوتے ہیں اور یہ بھی کہ اس خلوت کا طریقہ اور دستور العمل بھی شریعت نے مقرر فرمایا ہے۔ جس کا لقب اصلاح شریعت میں اعتکاف ہے۔ اعتکاف کے سوا اور سب مضامین مفصلاً بیان ہو چکے ہیں اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مکمل مجاہدات کو جس کا لقب اعتکاف ہے مفصلاً بیان کر دیا جائے اور ہر چند کہ ترتیب کا مقتضٰی یہ تھا کہ یہ مضمون اس جمعہ سے پہلے بیان کیا جاتا اس لئے کہ اعتکاف مسنون کا وقت ۲۰ تاریخ کی شام سے ہے اور آج ۲۱ ہے۔ لیکن اب بھی غیر مناسب نہیں ہے اس لئے کہ ابھی صرف ایک ہی شب گزری ہے جنہوں نے اعتکاف شروع کر دیا ہے ان کو تو عدم تقدم بیان کا ظاہر ہے کہ مضر نہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ آیا کہ مفید بھی ہے سو اس حیثیت سے ان کو یہ مضمون مفید بھی ہے کہ انہوں نے یہ اعتکاف شروع کر دیا ہے لیکن اس کی حقیقت سے آگاہی نہیں اس کو سن کر اس کی حقیقت منکشف ہو کر زیادتی بصیرت حاصل ہوگی اور اس سے زیادہ خلوص ہوگا۔

تدارک مافات

اور جنہوں نے اعتکاف نہیں کیا ان کو البتہ عدم تقدم کے مضر ہونے کا احتمال ہے لیکن مضر اس لئے نہیں کہ ان کو اگر دس دن نہیں ملے تو ایک دن کم تو مل سکتا ہے بلکہ اگر حق تعالیٰ کے یہاں اگر مقبول ہو جائے تو ایک دن بھی کافی ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

بس ہے اپنا ایک بھی نالہ اگر پہنچے وہاں   گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ وفریاد ہم

نیز ایک تدارک اس کا یوں ہو سکتا ہے کہ کوئی عبادت غیر فریضہ اگر فوت ہو جائے اور اس پر قلق اور افسوس ہو تو حق تعالیٰ اس پر بھی اتنا ہی ثواب عطا فرما دیتے ہیں کہ جس قدر اس عبادت کے کرنے سے ملتا ہے۔ بلکہ بعض بزرگوں سے تو بعضی باوقعت عبادتوں کی نسبت ایسے قصے منقول ہیں کہ انہوں نے دوسروں کے تاسف اور حسرت کو اپنی عبادت پر ترجیح دی ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکل رہے تھے ایک شخص ملا اور اس نے پوچھا کہ

جماعت ہو چکی حضرت ابراہیمؒ نے فرمایا کہ ہو چکی۔ اس نے ایک آہ سرد کھینچی۔ حضرت ابراہیمؒ نے فرمایا کہ تم اپنی آہ مجھ کو دیدو اور میری جماعت کا اجر تم لے لو۔ وہ شخص عارف تھا جیسا عنقریب اس کے جواب سے معلوم ہوگا۔ لیکن حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے باوجود اس کے بڑے عارف کامل تھے اس شخص کو پہچانا نہیں اور یہ نہ پہچاننا کوئی عجیب بات نہیں اگرچہ مشہور تو یہ ہے کہ ولی را ولی می شناسد (ولی کو ولی پہچانتا ہے) مگر یہ کلیتہً صحیح نہیں ہاں ولی را نبی می شناسد (ولی کو نبی پہچانتا ہے) یہ صحیح ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ نسبتیں مختلف ہوتی ہیں ہر ایک ولی کی نسبت کا رنگ جدا ہوتا ہے۔

اس پر ایک اور حکایت یاد آ گئی۔ حضرت خضر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں یہ سمجھتا تھا کہ میں سب اولیاء اللہ کو پہچانتا ہوں لیکن ایک مرتبہ ایک مجمع تھا وہاں حدیثوں کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ اور وہاں ایک شخص علیحدہ نماز پڑھتا تھا میں نے اس سے کہا کہ بھائی تم اس مجمع میں کیوں شریک نہیں ہوتے وہ شخص صاحب حال تھے انہوں نے جو جواب دیا گو وہ بظاہر قواعد شرعیہ پر منطبق نہیں ہوتا مگر واقع میں خلاف نہیں جواب یہ دیا کہ بتلاؤ یہ لوگ کس سے روایت حدیث کی بیان کرتے ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ سفیان اور اوزاعی وغیرہما سے کہا کہ جو خود اللہ تعالیٰ سے حدیث بیان کرے اس کو کیا ضرورت ہے کہ سفیان اور اوزاعی سے بیان کرے۔ خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کی دلیل کیا ہے کہ تم ایسے ہو کہا کہ دلیل اس کی یہ ہے کہ تم کو پہچانتا ہوں اور تم مجھ کو نہیں پہچانتے تم خضر ہو اور تم تو بتلاؤ میں کون ہوں۔ خضر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اس روز مجھ کو معلوم ہوا کہ بعض اہل ولایت کو میں بھی نہیں پہچانتا۔ سچ ہے۔ **اولیائی تحت قبائی لا یعرفھم سوائی** (اولیاء اللہ میری چادر تلے ہیں ان کو میرے سوا کوئی نہیں پہچانتا) ایسے حضرات سے ارشاد اور تلقین بھی بہت کم ہوتا ہے مگر ان کو اس کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی کہ ہم سے کسی کو نفع نہیں۔ حضرت احمد جامؒ اسی مضمون کو بیان فرماتے ہیں۔

احمد تو عاشقی بمشیخت تراچہ کار دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

ترجمہ: اے احمد تو عاشق ہے تجھے پیری مریدی سے کیا کام ہے دیوانہ رہ۔ سلسلہ ہوا ہوا نہ ہوا نہ ہوا۔

اور اس خواب کا واقع میں خلاف قواعد نہ ہونا اس طرح سے ہے کہ وہ حدیثیں مضامین ضروریہ کی نہ ہوں گی یا ان کو پہلے سے معلوم ہوں گی اور جس حالت میں وہ مشغول تھے وہ بحکم وقت ضروری ہوگا۔ اس ضروری کو حدیث من اللہ سے تعبیر فرما کر یہ جواب دیا غرض حضرت ابراہیم بن ادھمؒ اتنے بڑے تو عارف کامل لیکن اس شخص کو نہ پہچانا۔ اسی طرح حضرت سلطان نظام الدین

اولیاء قدس سرہٗ کا ایک مسجد میں جو کہ ایک ویرانہ میں تھی گزر ہوا منتظر تھے کہ کوئی آ جاوے تو جماعت سے نماز پڑھ لیں لیکن وہاں ویرانہ تھا اس لئے امید نہ تھی کہ کوئی یہاں آئے گا مگر اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کی مراد پوری کرتے ہیں۔

میدہد یزداں مراد متقی (اللہ تعالیٰ متقیوں کی مراد پوری کر دیتا ہے)

اس پر ایک حکایت اور یاد آ گئی۔ایک بزرگ تھے جماعت کے بڑے پابند تھے۔سفر میں حضر میں کبھی ان کی جماعت فوت نہ ہوتی تھی اور اگر سفر کرتے تھے تو ایسی طرح کرتے تھے کہ نماز کے وقت کسی مسجد میں جا پہنچیں۔ایک مرتبہ سفر میں تھے اتفاقاً اس روز نماز کا وقت راستہ میں آ گیا گاڑیبان ہندو تھا اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ آج میری جماعت فوت ہوتی ہے غیب سے کوئی سبب میری جماعت کا کر دیجئے۔ورنہ مجھ کو سخت قلق ہوگا۔کہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکے گا۔اللہ تعالیٰ تو اپنے نیک بندوں کی مراد پوری فرماتے ہیں۔گاڑیبان آیا اور عرض کیا کہ حضرت مجھے مسلمان کر لیجئے فرمایا تو کیوں مسلمان ہوتا ہے کہا کہ دفعتہً میرے جی میں آ گیا۔ان بزرگ نے اس کو غسل دلایا اور کلمہ شہادت پڑھایا اور کہا کہ آؤ میرے برابر میں کھڑے ہو کر نماز پڑھو۔الحاصل حضرت سلطان جیؒ کو بھی آرزو ہوئی کہ جماعت سے نماز پڑھوں اتفاق سے ایک لکڑ ہارا موٹے جھوٹے کپڑے پہنے ہوئے مسجد آیا اور السلام علیکم کہا : سلطان جیؒ نے کہا میاں وضو کر لو کہنے لگا اے نظام الدین کیا مسلمان بھی بے وضو رہا کرتا ہے۔**الوضوء سلاح المومن** یہ تو مسلمان کی ادنیٰ بات ہے کہ باوضو رہے حضرت بہت حیران ہوئے کہ یہ کون ہے کہ مجھ کو جانتا ہے اور میں نہیں جانتا۔حضرت نے نظر بصیرت سے جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ بڑا صاحب مقام شخص ہے پس یہ ضروری نہیں کہ ولی کو ولی ضرور پہچانے۔اسی طرح حضرت ابراہیم بن ادھم نے اس آہ کرنے والے کو نہ پہچانا اس نے جواب دیا کہ میاں جاؤ کسی اور کو بہکانا۔میں ایسا مبادلہ نہیں کیا کرتا۔

لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ حقیقت میں مبادلہ مقصود تھا یا مبادلہ کرنے سے مبادلہ ہو جاتا بلکہ مقصود اس کہنے سے اس کی اس حالت کے شرف کا اظہار تھا اس لئے کہ مقصود تمام اعمال سے اپنے اور اپنے اعمال پر سے نظر کا اٹھ جانا اور اپنا فقر و عجز کا پیش نظر ہو جانا ہے۔تو اس شخص کو اس وقت یہ صفت حاصل تھی اس لئے اس کی تمنا کی لیکن یہ ہو سکتا ہے اور ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنے عمل کا ثواب مردہ کو یا زندہ کو دے دے جس طرح مردہ کو ثواب پہنچتا ہے اسی طرح زندہ کو بھی پہنچ جاتا

ہے۔اوراس کی دلیل یہ ہے کہ حدیث شریف میں قصہ وارد ہوا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس چند شخص مقام ابلہ کے آئے حضرت ابو ہریرہؓ نے پوچھا کہ تمہارے یہاں ایک مسجد عشار ہے کوئی ایسا ہے جو وہاں جا کر دو رکعت پڑھے اور یوں کہہ دے **ھذہ لابی ھریرۃ** یعنی یہ دو رکعتیں ابو ہریرہؓ کے لئے ہیں اور ظاہر ہے کہ صحابی کا غیر مدرک بالقیاس قول حکماً مرفوع ہوتا ہے۔ پس حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ فرمانا مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔ پس زندہ کو ثواب مل جاتا ہے۔ القصہ اس شخص نے حضرت ابراہیم بن ادھمؒ سے کہا کہ میاں جاؤ کسی بیوقوف کو بہکانا۔ میری آہ کا وہ ثواب ہے کہ میں تمام جہان کے عوض میں بھی نہ بدلوں۔ مگر یاد رکھو وہ عارف تھا اس کو اپنی آہ کا ثواب مکشوف ہوا ہوگا۔ اس لئے کوئی ذہین آدمی یہ استنباط نہ کرے کہ یہ تو بہت سہل نسخہ بتلا دیا بس نماز روزہ کی جگہ آہ ہی کر لیا کریں گے۔ اس لئے کہ یہ تو اس شخص کا حال تھا کہ باوجود کوشش کے نیک عمل اس سے فوت ہو گیا ہو۔ بہر حال اگر ایک دن فوت ہو گیا ہے تو اعتکاف کی فضیلت سن کر جس شخص کو ایک دن کے فوت ہونے پر حسرت ہو گی اس کا تدارک اس طور سے ہو جاوے گا۔ پس یہ مضمون دونوں فریق کے لئے نافع ہے۔

علامت مذہب الٰہی

اب مقصود شروع ہوتا ہے۔ اعتکاف کی حقیقت تو میری تقریر سابق سے معلوم ہو گئی ہو گی کہ حقیقت اس کی خلوت ہے۔ لیکن مطلق خلوت نہیں ہے بلکہ خاص خاص حکمتوں اور خاص خاص قیود و شرائط کے ساتھ یہی امتیاز ہے اس کو حکماء و جوگیہ کی خلوتوں سے یہ اعمال ان کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں لیکن ہمارے یہاں مکمل ہیں اور ان کے یہاں ناتمام اور غیر مکمل ہیں۔ چنانچہ پہلے اس مضمون کو بھی بیان کیا گیا ہے جس طور سے یہاں مقرر کیا گیا ہے حکماء کا ذہن وہاں کیسے پہنچ سکتا ہے۔ میرے چھوٹے بھائی نے ایک ملحد کو خوب جواب دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ہمارا دین معقول ہے۔ اس کے سب مسائل عقل کے موافق سمجھ میں آتے ہیں۔ اور تمہارے مذہب کے بہت سے مسائل عقل سے سمجھ میں نہیں آتے۔ بھائی نے کہا یہی دلیل ہے اس بات کی کہ ہمارا مذہب سچا ہے۔ جبکہ ہمارے نوکروں کو ہمارے خانگی اسرار تک رسائی نہیں اور ان کی عقل میں نہیں آتے۔ حالانکہ ان کو ہم سے نسبت ہے کہ وہ اور ہم حقیقت واحدہ میں شریک ہیں تو بندہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے اسرار پر کیسے مطلع ہو سکتا ہے۔ آسمانی اور الٰہی مذہب کی علامت ہی یہ ہے کہ اس کی کوئی بات تو سمجھ میں آوے اور کوئی نہ آوے اور اگر ہر بات سمجھ میں آ جاوے تو معلوم ہوتا ہے کہ

ہمارے جیسے آدمیوں کا بنایا ہوا ہے کہ ان کے اسرار تک ہماری رسائی بھی ہو سکتی ہے۔ بس اللہ تعالیٰ کی وضع کی برابری کسی حکیم وفلسفی کی وضع کیسے کر سکتی ہے۔ غرض وہ لوگ بھی مجاہدات کی اعانت کے لئے خلوت اختیار کیا کرتے تھے۔

فوائد خلوت

اور حکمت اس میں یہ ہے کہ خلوت میں جمعیت اور یکسوئی ہوتی ہے اور اسی پر مدار ہے تمام مجاہدات کے ثمرات کا اور خلوت میں یکسوئی اس لئے ہوتی ہے کہ پریشانی قلب کے اسباب مختلف ہیں۔ بعض آفاقی ہیں بعض انفسی ہیں یا یوں کہو کہ بعض خارجی ہیں بعض داخلی۔ یعنی بعضے اسباب تو ایسے ہیں کہ اس شخص کے اندر وہ نہیں ہیں بلکہ خارج سے اس کو لاحق ہوتے ہیں اور بعض اسباب ایسے ہیں کہ خود اس کے نفس کے اندر ہیں لیکن منشا ان کا بھی کوئی امر خارجی ہی ہے اور خلوت میں سب قطع ہو جاتے ہیں اور جو نفس میں باقی بھی رہتے ہیں وہ بھی خارج ہی سے حاصل شدہ ہوتے ہیں۔ دیکھئے مجمع میں جب آدمی ہے تو ہر قسم کی صورتیں اس کو نظر آتی ہیں اور ہر قسم کی باتیں سننے میں آتی ہیں کوئی ناگوار بات معلوم ہوتی ہے کوئی گوارا ہوتی ہے بعض اوقات سخت سخت پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں اور خلوت میں یہ سب کم ہو جاتے ہیں۔ اسی واسطے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

بزرگے دیدم اندر کہسارے — قناعت کرد از دنیا بغارے
چرا گفتم بشہر اندر نیائی — کہ بارے بندے از دل برکشائی
بگفت آنجا پریر ویاں نغز زند — چوگل بسیار شد پیلاں بلغزند

ترجمہ: ایک بزرگ کو میں نے پہاڑ میں دیکھا جو دنیا سے ایک غار پر قناعت کئے ہوئے تھے۔ میں نے اس سے کہا شہر میں کیوں نہیں آتے تا کہ بند دل کھول سکو۔ کہا وہاں خوبصورت پری چہرہ لوگ ہیں۔ کیچڑ بہت ہو تو ہاتھی بھی پھسل پڑتے ہیں۔

بڑی بڑی آفتیں اور بڑے بڑے واقعات مجمع میں بیٹھنے سے پیش آ جاتے ہیں تو پریشانی کے تمام اسباب خارج ہی سے آتے ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ کوئی کہے کہ خلوت میں بھی تو پریشانی ہوتی ہے اس لئے کہ ذہن میں حسینوں کی مثلاً صورتیں ہیں یا کسی اور شی کی صورت ہے وہ قلب کو پریشان کرتی ہے بات یہ ہے کہ وہ صورتیں بھی خارج ہی سے آئی ہیں اس لئے کہ ان حسینوں کو دیکھا ہے اس لئے پریشانی ہوتی ہے

اور اگر خلوت میں رہتا اور نہ دیکھتا تو ہرگز پریشانی نہ ہوتی پس خلوت میں بیٹھ کر جو صورتیں پریشان کرتی ہیں وہ بحیثیت ذہن میں ہونے کے پریشان کن نہیں ہیں۔ بلکہ بحیثیت اس کے کہ انہا مستفادۃ عن الخارج باعث تشتت ہوئی ہیں ورنہ اگر بغیر کسی کو دیکھے ہوئے خود ذہن کسی حسین کی صورت تراشے تو ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ خواہ احسن سے احسن صورت کا اختراع کرے ہرگز وہ قلب کو پریشان نہ کرے گی۔ پس یہ آفت لگائی ہوئی صورت خارجیہ ہی کی ہے پس پریشانی باطنی ہمیشہ سبب ظاہری کا مسبب ہوتی ہے اور خلوت میں چونکہ وہ اسباب منقطع ہو جاتے ہیں اس لئے وہی ذخیرہ رہ جاتا ہے جو پہلے سے قلب میں ہوتا ہے۔ آئندہ کو آمدنی بند ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ بقیہ بھی نکل جاتا ہے۔ چنانچہ جس وقت خلوت میں بیٹھا ہوا یہ کسی صورت کو سوچ رہا تھا تو اس وقت اس کا تصور ضعیف تھا اگر عین تصور کے وقت وہی حسین وہاں گزر جائے تو ایک بجلی سی دل پر گرے گی اور وہ پریشانی اور زیادہ ترقی پذیر ہو گی اور اگر اس سے بھاگے اور اپنے پاس نہ آنے دے قصداً خیال کو نہ لاوے اور اگر خیال خود آوے تو فوراً دوسرے خیال کو غالب کر دے تو چند روز اس پر عمل کرنے سے وہ خیال خود ضعیف ہو کر قلب سے نکل جائے گا اور پریشانی جاتی رہے گی۔

صفت عشق مجازی

یہ جو لوگ مدتوں پریشان رہتے ہیں اپنے ہاتھوں رہتے ہیں ورنہ وہ صورت تو خود بخود زائل ہو جاتی ہے خود بیٹھ کر سوچتے ہیں اور اس سے مزے لیتے ہیں اور ملنا بولنا دیکھنا چھوڑتے نہیں اس لئے یہ بلا اور زیادہ لازم ہو جاتی ہے۔ شیخؒ نے جو بوستان میں باب عشق لکھا ہے اس کی نسبت وہ لکھتے ہیں

باب سوم عشق است مستی و شور   نہ عشقے کہ برخود نہ بندند بزور

یعنی تیسرا باب عشق حقیقی کے بیان میں ہے وہ عشق مراد نہیں جس کو زبردستی اپنے اوپر لپیٹ لیں۔ اس سے خود معلوم ہو گیا کہ عشق مجازی کو لوگ اپنے ہاتھوں اپنے اوپر لادتے ہیں خود بخود نہیں ہوتا اور جو بلا قصد بھی ہو جاتا ہے تو اس کو اسی حد تک قائم رکھ کر اس کے دفع کرنے کی فکر نہیں کرتے بلکہ محبوب کے ملنے اور بولنے اور دیکھنے کی تمنائیں کرتے ہیں ایسے ہی عشق کی نسبت کوئی حکیم فرماتے ہیں۔

ایں نہ عشق است اینکہ درمردم بود   ایں فساد از خوردن گندم بود

ترجمہ: یہ عشق نہیں جو لوگوں میں ہے یہ سب گندم کھانے کا فساد ہے۔

اگر دفع کرنا چاہتے تو دفع ہوسکتا تھا اس کی ایسی مثال ہے جیسے تمباکو کہ ایک مرتبہ کھایا طبیعت پریشان ہوئی سر چکرایا بیہوش ہو گئے۔ اب مناسب یہ تھا کہ پھر اس کے پاس نہ جاتے لیکن پھر کھاتے ہیں۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ ایسی عادت ہو جاتی ہے کہ پھر چھوٹتی نہیں اسی طرح افیون اور شراب کی عادت ہے بعض کو جوتے کھانے میں مزہ آتا ہے کہ بغیر جوتے لگے ان کو تسلی نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ مصالحہ طلب کہلاتے ہیں۔ اپنا اپنا مزہ ہے کسی کو کسی میں مزہ آتا ہے کسی کو کسی میں ہم تو اس کو بے حسی سے تعبیر کریں گے جیسے ایک غیر ملکی گنوار ہندوستان کی سیر کے لئے آیا۔ ایک حلوائی کی دوکان پر پہنچا اور بغیر اجازت کھانا شروع کیا۔ حلوائی نے پولیس کو اطلاع کی پولیس والوں نے یہ سزا تجویز کی کہ اس کا منہ کالا کر کے اور گدھے پر سوار کر کے اس کو تمام شہر میں گھمایا جائے اور پیچھے پیچھے لڑکے تالیاں بجاویں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا جب یہ اپنے ملک پہنچے تو اہل وطن نے پوچھا آغا ہندوستان رفتہ بودی چہ طور یافتی کہا۔ ہندوستان خوب ملک است حلوہ خوردن مفت است' سواری خر مفت است فوج طفلاں مفت است ڈم ڈم مفت است' ہندوستان خوب ملک ہے تو جیسے ان آغا صاحب کو اپنی رسوائی اور بے آبروئی کی حس نہیں ہوئی اسی طرح لوگوں کو معاصی میں مزہ آتا ہے اور جو اس میں کدورت اور پریشانی ہے اس کا ادراک نہیں ہوتا۔ بہر حال اس عشق مجازی میں یہ صفت کہ یہ سریع الزوال ہوتا ہے بشرطیکہ کوئی مقوی اس کو نہ پہنچے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے سلیٹ پر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ خود بخود مٹ جاتا ہے۔ اسی طرح ذہن میں جو صورت آجاتی ہے اگر اس کو جمایا نہ جاوے تو وہ خود بخود محو ہو جائے گی ہاں اگر چاقو سے سلیٹ پر حرف لکھ دیئے تو ان کا زائل ہونا واقعی مشکل ہے۔ اسی طرح اگر مراقبہ کر کے اس صورت کو جمایا جاوے تو اس کا زوال مشکل ہے۔ بلکہ نہیں نکلتی حتیٰ کہ مرنے کے وقت بھی نہیں جاتی۔ ایک شخص کسی امرد پر عاشق تھا اور وہ اس سے ملتا نہیں تھا۔ رنج وفراق میں گھل گھل کر مرنے کے قریب ہو گیا اور مایوسی کی نوبت پہنچ گئی اور نزع کا وقت آ گیا کسی نے جا کر اس کو خبر کی کہ ظالم اس کی یہ کیفیت ہے۔ ذرا چل کر اس کو دیکھ تو لے اس کو خیال آ گیا چنانچہ ملنے کے لئے چلا اس کو کسی نے دوڑ کر خبر کی کہ تمہارا محبوب آ رہا ہے یا تو یہ حالت تھی کہ مر رہا تھا اور دم توڑ رہا تھا اور یا ایسی طاقت آئی کہ اٹھ بیٹھا اور اس لڑکے کا تھوڑی دور چل کر خیال بدل گیا اور کہا کہ میں تو بدنام ہونا نہیں چاہتا یہ کہہ کر واپس ہو گیا۔ عاشق کو اس کی خبر پہنچی سنتے ہی فوراً گر گیا اور جانکنی شروع ہو گئی لوگوں نے کہا کہ تو کلمہ پڑھ لے بجائے کلمہ کے یہ پڑھا۔

رضاک اشہی الے فوٴادی من رحمۃ الخالق الجلیل

یعنی اے محبوب تیری رضامندی میرے دل کو خالق جلیل کی رحمت سے زیادہ مرغوب ہے اور اسی پر دم نکل گیا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ کمبخت نے ایمان بھی کھویا اور محبوب بھی نہ ملا۔ حضرت یہ بری آفت کی پڑیہ ہے قلب میں جب رچ جاتی ہے تو اس سے جو کچھ بھی آفتیں آویں کم ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو غیرت آتی ہے کہ میرا چاہنے والا میرا پیدا کیا ہوا دوسرے کی طرف مائل ہو اس لئے سب نعمتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات کفر پر خاتمہ ہوتا ہے جیسے اس شخص کی کیفیت ہوئی۔

بدنگاہی کا علاج

کانپور میں ایک بزرگ تھے وہ بیان کرتے تھے کہ میں جوانی کی عمر میں لکھنؤ میں ایک مرتبہ ناچ میں چلا گیا وہاں ایک بازاری عورت پر جو نظر پڑی بس دل ہاتھ سے نکل گیا اور اس قدر فریفتگی کا غلبہ ہوا کہ بیوی بچوں کو چھوڑ اس کے پیچھے ہو لئے اور میں ایک بزرگ کی خدمت میں بھی جایا کرتا تھا۔ صاحبو! بزرگوں سے علاقہ قطع نہ کرو ان کو لگے لپٹے رہو۔ یہ عجیب کیمیا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بزرگوں کے پاس جانے سے ڈر لگتا ہے ان سے کوئی پوچھے کہ ڈر کس بات کا لگتا ہے وہ کسی کو مارتے ہیں یا بھیڑیے ہیں۔ پھاڑ کھاویں گے۔ بیش برین نیست (اس سے زیادہ نہیں) کہ تمہاری بدتمیزی پر برا بھلا کہہ لیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنے کو بڑا اور شاندار جانتے ہو میاں ہماری تمہاری شان ہی کیا ہے عقیدت اور محبت کی بات تو یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہیں سب گوارا کرے بلکہ اگر مار بھی بیٹھیں اس کو بھی جھیل جاوے ڈرے گا ہمیشہ وہ شخص جو اپنے کو شاندار سمجھتا ہو گا اور یہی سم قاتل ہے اور جو ساری باتوں پر آمادہ ہو اس کو کس بات کا ڈر ہوگا۔ نہ ڈرے نہ شرمائے ایسی ہی شرم کی نسبت کسی نے کہا ہے جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم غرض ان کو چھوڑو مت۔ الحاصل اس شخص کی خوبی یہ تھی کہ اس روز بھی ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بار بار چاہتا تھا کہ اپنا دکھ ان سے کہوں لیکن زبان نہ اٹھتی تھی ان بزرگ کو اس کا انکشاف ہوا انہوں نے خود فرمایا کہ ہماری طرف متوجہ ہو جاؤ۔ چنانچہ وہ متوجہ ہو گیا پہلے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس بازاری عورت کا پتلا میرے اندر اتر گیا ہے اس کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ان بزرگ نے اس کا سر کاٹ کر اور نکال کر پھینک دیا اس کے بعد ہاتھ پھینک دیئے اسی طرح اس کا ایک ایک جز و نکال دیا اور قلب بالکل

آئینہ ہوگیا۔ یہ بھی ایک تدبیر اس مرض کے زوال کی ہے اس کے علاوہ اور تدبیریں بھی ہیں ذکر اللہ کی کثرت بھی نہایت بہتر تدبیر ہے اور میں تو اس کی بہت آسان تدبیر یہ بتلایا کرتا ہوں کہ اگر ذکر نہ ہو سکے تو یوں کرو کہ جس طرح اس حسین کو دیکھا ہے ایسے ہی کسی بہت برے بدشکل کو بھی دیکھو اور اس کا تصور کرو ان شاء اللہ تعالیٰ جاتا رہے اور راز اس میں یہ ہے کہ یہ فلسفی مسئلہ ہے کہ جب آدمی ایک خیال قلب میں جمالیتا ہے تو وہ خیال ماضی کا دافع ہو جاتا ہے باقی رہی یہ بات کہ ماضی اگر گیا تو مستقبل آیا۔ فائدہ کیا ہوا بات یہ ہے کہ وہ مستقبل چونکہ کسی حسین کا تصور نہیں ہے بلکہ بدشکل کا ہے اور بطریق معالجہ ہے اس لئے وہ تصور راسخ نہ ہوگا دوسرے کو دفع کر کے خود بھی دفع ہو جائے گا اور یہی حکمت ہے تصور شیخ میں کہ اس سے اور خیالات زائل ہو جاتے ہیں اس لئے کہ شیخ محبوب ہوتا ہے اور محبوب کی شکل کا تصور بھی آسان ہوتا ہے۔

علاج میں غلطی

بعض لوگ لڑکوں اور عورتوں کے تصور سے خطرات کا علاج کرتے ہیں یہ سخت غلطی اور دھوکہ ہے یہ تو مرض کو اور بڑھانا ہے اور وجہ اس دھوکہ کی یہ ہوتی ہے کہ حسن پرستی میں ان لوگوں کو ایک مزہ آتا ہے اور جب وہ کوئی اطاعت کرتے ہیں مثلاً نماز پڑھتے ہیں تو اس حالت میں بھی ایک لطف آتا ہے تو سمجھتے ہیں کہ نماز میں ہم کو مزہ آرہا ہے حالانکہ وہ نماز کی حلاوت نہیں ہے وہ اس حسن پرستی کی طبعی لذت ہے۔ ایک شخص کہنے لگے کہ ایک روز ایک طوائف گا رہی تھی اسی حالت میں نماز کا وقت آگیا۔ اس روز نماز میں ایسا مزہ آیا ہے کہ کبھی نہ آیا تھا۔ بہت حضور قلب میسر ہوا۔ تو یہ حضور قلب نہیں حضور کلب ہے۔ بلکہ حضور کلبہ۔ جس نماز میں کتیا کا تصور ہو وہ کیا نماز ہوئی۔ کتیا پر ایک حکایت یاد آئی ہم سبعہ معلقہ پڑھتے تھے۔ اس میں شعر ہے **لخولة اطلاله ببرقة ثهمد** جب اس کا امتحان ہوا تو ہماری جماعت میں سے ایک طالب علم نے اس کا یہ ترجمہ کیا کتیا کے لئے مقام ثہمد میں نشان دار ہیں استاد نے تعجب سے اس ترجمہ کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ خولہ کے نیچے محشی نے یہ لکھ دیا تھا **امراۃ من بنی کلب** بھلے مانس نے بنی کلب سے کتے کی اولاد مراد لی بہرحال کتا ہو یا کتیا ہو نہ نماز کے اندر اور نہ خارج میں کسی طرح تصور نہ کرے۔ بعض لوگ امردوں کو گھورنے کو قرب الٰہی میں مؤثر سمجھتے ہیں استغفر اللہ یہی لوگ ہیں جنہوں نے طریق کو بدنام کیا ہے۔ شہوت پرستی کا نام قرب رکھا ہے۔

خداوندی قلعہ

بعض لوگ گھورنے والوں کا علاج بھی کر دیتے ہیں۔ حضرت مولانا فخر نظامیؒ بڑے حسین وجمیل نوجوان تھے۔ اور ابتداء ہی سے حق تعالٰی نے دولت نسبت باطنی سے ان کو مشرف فرمایا تھا۔ دہلی میں تشریف لائے غل مچ گیا کہ بڑا حسین لڑکا آیا ہے۔ بہت سے شہدے گھورنے کے لئے آئے۔ مولانا جامع مسجد سے نماز پڑھ کر اتر رہے تھے کہ ایک جماعت کی جماعت سامنے آئی۔ حضرت کو منکشف ہوا کہ یہ مجھ کو گھورنے آئے ہیں۔ ایک نظر اٹھا کر دیکھا سب گر گئے۔ فرمانے لگے آؤ گھورتے کیوں نہیں سب سے زیادہ خداوندی قلعہ اس سے بچاؤ کا داڑھی ہے کہ جب داڑھی نکل آتی ہے سب آفتوں سے حفاظت ہو جاتی ہے لیکن ہمارے نوجوان اس قلعہ کو بھی ڈھاتے ہیں یعنی ڈاڑھی کا صفایا کراتے ہیں اول اول تو اس لئے منڈاتے ہیں کہ حسن محفوظ رہے اور پھر عادت ہو جاتی ہے اگر کوئی ناصح نصیحت کرتا ہے تو کہتے ہیں۔

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن　　　آخری وقت میں کیا خاک مسلمان ہونگے

اور بعضے اہل یورپ کی تقلید کرتے ہیں سنا ہے انگلستان میں داڑھی رکھنے کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی اگر داڑھی کا رکھنا طے ہوا تو اے فیشن پرستو تم کو بھی اس وقت رکھنا پڑے گی۔ لیکن افسوس اس بات کا ہوگا کہ خدا اور رسول کے کہنے سے تو نہ رکھی ہاں غیر قوموں کی تقلید سے رکھو گے۔ غرض یہ ایک خداوندی قلعہ ہے اور نیز حسن کی حفاظت منڈانے میں نہیں ہے بلکہ مرد کا حسن تو داڑھی سے ہے الغرض اس قسم کی آفتیں مجمع میں پیش آجاتی ہیں بہرحال جو سبب ہی قلب کا پریشان کرنے والا ہے اس کا مرجع خارج ہے خلوت کے اندر ان سب آفتوں سے حفاظت رہتی ہے جو پچھلی پریشانی ہے وہ کمزور ہو کر چند روز میں خود جاتی رہے گی اور آئندہ کو کوئی سبب پریشانی کا نہیں ہے اس لئے قلب بالکل صاف ہو کر آئینہ کی طرح ہو جائے گا اور اس میں استعداد پیدا ہوگی۔ فیوض باطنیہ کے حاصل کرنے کی نسبت مولانا فرماتے ہیں۔

قعر چہ بگزید ہر کہ عاقلست　　　زانکہ در خلوت صفا ہائے دلست

ترجمہ: جو عقلمند ہے وہ علیحدگی اس لئے ڈھونڈتا ہے کہ علیحدگی میں دل صفا ہوتے ہیں یہ صورت ہے خلوت کے معین ہونے کی مولانا دوسرے مقام پر فرماتے ہیں۔

چشم بند و لب بہند و گوش بند　　　گر نہ بینی نور حق برما بخند

فضولیات سے اجتناب

بعض لوگوں نے غلو کیا ہے کہ اس شعر سے حبس دم کا شغل استنباط کیا ہے کہ اس شغل میں آنکھیں اور کان بند کر لیتے ہیں۔ حاشا کلا مولاناؒ کی یہ مراد نہیں ہے گو خود شغل قابل انکار نہیں لیکن شعر کا مطلب یہ ہے کہ آنکھیں بند کر لو معاصی اور فضولیات سے جیسا حضور کو خطاب ہے :

لَاتَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ مائل مت ہو بلکہ یہ ارشاد ہے کہ کفار کے متاع کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی مت دیکھو۔ اس سے معلوم ہوا کہ فضول نگاہ بھی بچنے کے قابل ہے۔ مولانا رفیع الدین صاحبؒ مہتمم مدرسہ عالیہ دیوبند۔ رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد صاحب بڑے بزرگ تھے۔ ہر وقت نگاہ نیچی رکھتے تھے۔ اپنے پاس آنے والوں کو بھی نظر اٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ لوگوں نے اس کا سبب پوچھا فرمایا کہ دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جن کو میں پہچانتا ہوں اور ایک وہ جن کو نہیں پہچانتا ہوں۔ آواز سے پہچان لیتا ہوں اور جن کو نہیں پہچانتا دیکھنے سے بھی نہیں پہچانتا۔ پس فضول کیوں دیکھوں یہ حضرات جس طرح مال میں اسراف نہیں کرتے افعال میں بھی اسراف نہیں کرتے اپنے افعال کو منضبط رکھتے ہیں۔ یہ معنی ہیں چشم بند کے اور گوش بند کے یہ معنی ہیں کہ کانوں کو بھی معاصی اور فضولیات کے سننے سے روکو۔

ضرر سماع

اس مقام میں سماع کے متعلق سمجھو کہ اس میں بعض یہ عذر کرتے ہیں کہ جب گناہ نہیں ہے تو حرج کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ سلمنا گناہ نہیں ہے لیکن کوئی نفع بھی اس کے اندر نہیں بتلا سکتا۔ بہت سے بہت کوئی بڑی عرق ریزی سے مضر نہ ہونا ثابت کرے گا لیکن نافع ہونا تو کوئی ثابت ہی نہیں کر سکتا اور بڑی صاف دلیل اس کے نافع نہ ہونے کی یہ ہے کہ کسی شیخ کے باوجود سماع ہونے کے اپنے مریدوں کو اس کی تعلیم نہیں دی۔ کہیں کتب تصوف میں اور بزرگوں کے ملفوظات میں اس کا نشان نہیں کہ کسی شیخ نے اپنے مرید کو یہ کہا ہو کہ گانا سنا کرو۔ پس جو شئے ایسی ہو کہ اس میں نہ نفع ہو نہ نقصان وہ فضول ہے اور فضول کا چھوڑنا ہمارے اسلام کی تعلیم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے من حسن اسلام المرء ترکه مالایعنیه (الکامل لابن عدی ۳:۹۰۷، کنز العمال: ۸۲۹۱، مجمع الزوائد ۸:۱۸) (اسلام میں انسان کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی کو ترک کر دے) اور حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (اور وہ لایعنی سے اعراض کرتے ہیں)

امتحان قلب

اور یہ گفتگو تنزلاً ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مضر ہے اس کا اثر قلب پر اچھا نہیں ہوتا اور اس کا

امتحان یہ ہے کہ جو شخص گانا سنتا ہو وہ چار ماہ کے لئے اللہ کا نام لے اور نفلیں پڑھے اور قرآن پڑھے اور سنے اور گانے کو یک لخت ترک کردے۔ اس کے بعد اپنی پہلی حالت اور اس وقت کی حالت کا اندازہ کرے کہ آیا اس وقت نماز اور قرآن اور ذکر میں جی زیادہ لگتا تھا یا اب زیادہ لگتا ہے۔ واللہ گانا سننے کے زمانہ میں وہ اپنی حالت یہ پائے گا کہ اس کو بجز گانے کے نہ قرآن میں نہ ذکر میں نہ نماز میں کہیں میں لطف نہ آتا تھا اور اب ہر شے میں حلاوت محسوس ہوگی۔ ایسے ہی گانا کی نسبت حدیث میں آیا ہے۔

الغناء ينبت النفاق في القلب او كماقال (مشكوٰة المصابيح: ۴۸۱۰، الدر المنثور ۱۵۹:۵، كنز العمال: ۴۰۶۵۹) یعنی راگ قلب میں نفاق کو اگاتا ہے۔ اور قلب کا ضرر وہ چیز ہے جس کی نسبت مولانا فرماتے ہیں۔

بر دل سالک ہزاراں غم بود　　گر ز باغ دل خلالے کم بود

(اگر سالک کے دل کے باغ سے ایک تنکا بھی کم ہوجائے تو سالک کو ہزاروں غم لاحق ہوجاتے ہیں)

حالانکہ یہ کمی جس کو مولانا فرمارہے ہیں کوئی شرعی اور معتدبہ کمی نہیں بلکہ خیالی اور وہمی کمی ہے یعنی واردات کے بند ہوجانے اور قبض کے پیش آجانے کے سبب جو کمی ہوجاتی ہے اس کمی پر فرمارہے ہیں کہ ہزاروں غم قلب پر مستولی ہوجاتے ہیں بلکہ یہ غم یہاں تک ہوا ہے کہ بعضوں نے خودکشی کرلی ہے۔

اھل اللہ کی دولت

اور نماز اور قرآن میں جی نہ لگنا تو بڑا بھاری خسارہ ہے۔ اللہ کے نام میں کسی کو لطف نہ آوے اس سے زیادہ کون خسارہ میں ہوگا یہ تو وہ نام ہے۔

اللہ اللہ ایں چہ شیریں است نام　　شیر و شکری شود جانم تمام

(اللہ اللہ یہ کیسا اچھا نام ہے کہ میری تمام جان شیر و شکر ہورہی ہے)

اور یہ تو ان کا حال ہے جس کو ناتمام لطف ہے[1] اور جن کو پورا ادراک ہے وہ تو یوں کہتے ہیں کہ افسوس سلاطین اس دولت سے محروم ہیں شب وروز سلاسل واغلال کے اندر مقید ہیں مگر خبر نہیں حس نہیں۔ اے اھل تنعم یہ سامان دنیا کا اس غیر ملکی کا حلوا ہے اور سواری خر ہے۔

فسوف ترى اذا انكشف الغبار　　افرس تحت رجلك ام حمار

ترجمہ: عنقریب جب غبار چھٹا تو تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ تم گھوڑے پر سوار ہو یا گدھے پر۔

جیسے اس گنوار کو اس حلوے اور گدھے کی سواری میں مزہ آرہا تھا اہل حقیقت کے نزدیک

---

[1] یعنی بقدر اپنی پوری استعداد کے پورا اور نہ پورا تو کسی کو نہ ہوا۔ نہ ہوا ۱۲ جامع

ہماری یہی حالت ہے ہم پریشانی میں ہیں اور اس کی حس نہیں۔ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا سچ ہے یہ دنیا کا مال اور اولاد دنیا ہی میں اہل دنیا کو وبال جان ہے۔ ہر وقت ایک پریشانی میں مبتلا ہیں کوئی لڑکا مر نہ جاوے کوئی بیمار نہ ہو جائے۔ مال کو کوئی چور نہ لے جائے فلاں مجھ سے بڑھ نہ جائے لباس ہمارا ایسا ہو خوراک اس قسم کی ہو غرض شب و روز اسی دھن اور خیالات میں گزر جاتے ہیں اور عمریں ختم ہو جاتی ہیں اور اہل اللہ کو وہ دولت حاصل ہے کہ جس کی نسبت وہ کہتے ہیں کہ اگر سلاطین کو ہماری دولت کی خبر ہو جاوے تو تلواریں کھینچ کر ہم پر چڑھ آویں۔ حضرت غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کے لئے پادشاہ سنجر نے چاہا تھا کہ کوئی گاؤں وقف کر دے۔ حضرت نے اس درخواست کے جواب میں لکھا۔

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد　　دردل بود اگر ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبراز ملک نیم شب　　من ملک نیمروز بیک جونمی خرم

ترجمہ: سنجر کے جھنڈے کی طرح میرا بخت سیاہ ہو جائے اگر ملک سنجر کی مجھے آرزو ہو۔ جب سے ملک نیم شب کی خبر پائی ہے ملک نیمروز کی قیمت میری نظر میں ایک جو بھی نہیں رہی۔

یہ وہ ملک ہے۔

پس ازسی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی　　کہ یکدم باخدا بودن بہ از ملک سلیمانی

ترجمہ: تیس سال کے بعد خاقانی کو یہ بات معلوم ہوئی کہ ایک لحظہ خدا رسیدہ ہونا ملک سلیمان سے بھی بہتر ہے۔

یہاں شبہ ہوتا ہے کہ کیا ہم سلیمان علیہ السلام سے بڑھ جائیں گے جواب یہ ہے کہ مراد یہ ہے کہ ملک سلیمانی کہ باما شد یعنی ملک سلیمان ہم کو مل جاوے تو وہ کچھ نہیں اب شبہ تفضیل کا سلیمان علیہ السلام پر جاتا رہا۔ ان کو اس سلطنت کی اطلاع نہیں ہے حجاب میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ ان حضرات کو کہتے ہیں کہ بیچارے ترقی سے محروم ہیں ان کو رفتار زمانہ کی خبر نہیں۔ پست خیال ہیں۔ جی ہاں آپ بلند خیال ہیں یاد رکھو جس قدر اوپر چڑھو گے اسی قدر نیچے گرو گے۔ قطب کی لاٹھ سے گرو گے۔ اور زیادہ چوٹ کھاؤ گے وہ تو ان کو تنزل میں اور اپنے کو ترقی میں سمجھ رہے ہیں اور وہ ان کو کھلی آنکھوں نظر حقیقت سے دیکھ رہے ہیں کہ یہی نیچے کو جا رہے ہیں ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص منارہ پر چڑھ رہا ہو اور کوئی شخص آئینہ لے کر دیکھے تو اس کو منارہ الٹا نظر آئے گا اور یہ

معلوم ہوگا کہ یہ شخص منارہ سے نیچے کو اتر رہا ہے۔ ایسے ہی لوگ اہل اللہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ درحقیقت اوپر کو جارہے ہیں مگر ان کی آنکھ پر چونکہ غلط بیں عینک لگی ہوئی ہے اس لئے یہ ان کو اترتا ہوا دیکھتے ہیں جس کو یہ لوگ ترقی یافتہ سمجھتے ہیں۔ اہل اللہ اس کو پستی میں جاتا ہوا دیکھتے ہیں جو کنویں میں گر رہا ہے۔ یہ اس کو اوپر جاتا ہوا دیکھتے ہیں اس لئے کہ نظر حقیقت بیں نہیں ہے اور ہونا مشکل ہے اس لئے کہ جس مینڈک نے اول سے چوبچہ میں پرورش پائی ہو وہ سمندر کو کیا جانے گا یہ تو ہمیشہ سے دنیا کے جوڑے اور کیچڑ میں پھنس رہے ہیں دین کی ماء مصفیٰ کی ان کو کیا خبر ہے جو ہمیشہ پریشانی ہی میں رہا ہو جس کو عمر ہمیشہ ظلمت ہی میں گزری ہو اس کو جمعیت اور نور کی حقیقت سے کیسے آگاہی ۔

تو نہ دیدی گر سلیماں را چہ شناسی زباں مرغاں را

ترجمہ: جب تو نے سلیمان کو نہیں دیکھا تو تو پرندوں کی زبان کیا جان سکتا ہے۔

غرض وہ ان کو تنزل میں دیکھتے ہیں اور یہ ان کو حقیقت نظر آ رہی ہے اس لئے بادشاہوں پر ان کو رحم آتا ہے کہ یہ بیچارے کس خرافات میں پڑے ہیں اور اصلی دولت سے بے خبر ہیں اور وہ ان کو پست خیال بتلاتے ہیں غرض جبکہ قلبی دولت ایسی شئے ہے تو اس میں تھوڑی سی کمی بھی اگر یہ حضرات دیکھتے ہیں تو ان کی جان تک نوبت پہنچ جاتی ہے چہ جائیکہ بڑی کمی ہو وہ تو بہت فکر کی بات ہے اور جس بات سے وہ کمی پیدا ہوتی ہو وہ بہت احتراز کے قابل ہے پس سماع میں یہ ضرر ظاہر ہے۔

سماع سے دھوکہ

بعض دفعہ یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ سماع سے ہم کو جمعیت قلب ہوتی ہے میں بتلاتا ہوں کہ وہ جمعیت کیسی ہوتی ہے جناب من وہ جمعیت ایسی ہوتی ہے جیسے شطرنج باز کو شطرنج میں ہوتی ہے۔ کہ بجز شطرنج کے کسی شئے میں دل نہیں لگتا۔ شطرنج ہی میں سب خیالات آ کر جمع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح صاحب سماع کو گانے میں جمعیت ہوتی ہے کہ تمام تر توجہ ان کی اس میں مصروف ہوتی ہے اس کو وہ جمعیت سمجھتے ہیں جمعیت مطلوبہ تو وہ ہے کہ ذکر اللہ میں جمعیت ہو غرض اس سے بھی کان کو روکنا چاہیے یہ معنی ہیں گوش بند کے اور لب بند کے بھی یہی معنی ہیں کہ معاصی اور فضولیات سے لب بند کرو یہ معنی ہیں مولانا کے اس شعر کے جس دم اس کا مدلول نہیں اس لئے کہ جس دم کوئی ایسی شئے نہیں کہ ایسی جلیل القدر کتاب میں اس کا ذکر کرتے۔ مثنوی شریف اس رتبہ کی کتاب ہے کہ جس کی نسبت مولانا جامیؒ فرماتے ہیں ۔

مثنوی مولوی معنوی ہست قرآں درزبان پہلوی

(حضرت مولانا رومؒ کی مثنوی فارسی زبان میں قرآن (یعنی الہامی کتاب) ہے)

لیکن اس کا نفع اسی شخص کے لئے ہے جس کا فہم سلیم ہو ورنہ یہ کتاب مومن سے کافر بنادینے والی ہے اور اگر فہم درست ہو تو کافر سے مومن بنادینے والی بھی یہی ہے لوگ برا کرتے ہیں[1] کہ جس کو دیکھو مثنوی لئے بیٹھا ہے۔ ہر شخص کو یہ مفید نہیں ہے۔ غرض مولانا کی تعلیم کے یہ معنی نہیں ہیں۔ معنی یہ ہیں جو میں نے عرض کئے حاصل یہ ہے کہ خلوت میں اسباب مشوشہ للقلب جب کم ہوں گے تو حضور قلب میسر ہوگا قلب کا انجلاء ہوگا خدا تعالیٰ کی معرفت اور خشیت پیدا ہوگی نور حق سے مولانا کے شعر میں یہی مراد ہے اور یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی روشنی لالٹین کی نظر آنے لگے گی نور کے معنی اصل میں ظاہر بنفسہ اور مظہر لغیرہ ہیں۔ پس نور سے مراد قوت ادراکیہ ہے چنانچہ اس کا خاصہ ہے کہ اس سے حقائق کما ہی کا قلب کو ادراک ہوتا ہے اور خود اس کا ظاہر ہونا ظاہر ہی ہے۔ غرض یہ فائدہ ہے خلوت میں کہ خلوت مجاہدات کی معین ہے۔

خلوت کا درجہ

اس تمام تر تقریر سے خلوت کا درجہ اور افضل معلوم ہوا کہ وہ معین مقصود ہے۔ خود فی نفسہ عبادت نہیں ہے اس کا درجہ معلوم ہونے سے دو قسم کی غلطیاں رفع ہوتی ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ بعض تو ان میں تفریط کرتے ہیں کہ اس کا قصد ہی نہیں کرتے ہیں وہ بھی غلطی میں ہیں کہ اس کے منافع سے محروم ہیں اور بعض افراط اور غلو کرتے ہیں کہ اس کو مقصود سمجھتے ہیں اور ہر وقت خلوت ہی میں رہتے ہیں جو چیزیں ان پر واجب یا مستحب ہیں ان کو بھی ادا نہیں کرتے جنازہ کی نماز میں شریک نہیں ہوتے کسی کو نفع نہیں پہنچاتے اگر کوئی مسئلہ پوچھنے آتا ہے ٹال دیتے ہیں اور بعضے اس قدر غلو کرتے ہیں کہ گناہ کا ارتکاب بھی ان سے ہو جاتا ہے۔ کوئی جاہل درویش کسی مسجد میں مراقب تھے۔ ایک مسافر کی کمبختی آئی بیچارا ہارا تھکا آ کر وہاں سو رہا۔ خراٹے کی آواز سے بزرگ صاحب کے مراقبہ اور جمعیت میں فرق پڑا۔ اس کو اٹھایا کہ جاگو ہمارے مراقبہ میں فرق آتا ہے۔ وہ اٹھ بیٹھا تھکا ہوا بہت تھا پھر سو رہا اور خراٹے لینے لگا پھر آئے پھر اٹھایا کہ ہماری نماز میں فرق آتا ہے۔ وہ

---

[1] حضرت قطب الارشاد مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کتاب کے دیکھنے سے عموماً منع فرمایا کرتے تھے بعضے خاص ہی خاص لوگوں کو اجازت دی ہے ۱۲ جامع

پھر سو رہا اس کے بعد پھر ان بزرگ سے نہ رہا گیا چھرے سے آ کر اس کا کام تمام کر دیا اور خوب جی لگا کر عبادت میں مشغول ہو گئے۔ صبح کو نمازی آئے دیکھا تو تمام مسجد میں خون بہہ رہا ہے پوچھا کہ کس نے مارا۔ میاں صاحب نے فرمایا ہم نے مارا۔ ہماری نماز میں خلل ڈالتا تھا۔ اللہ بچاوے ایسی جمعیت سے۔ ایک اور ایسے ہی کسی صاحب کا قصہ ہے کہ جنگل میں خلوت نشین تھا کسی نے پوچھا کہ آپ کو یہاں ڈر نہیں لگتا کہنے لگے ڈر کا ہے کا ہے۔ اس نے کہا کہ یہاں بھیڑیے شیر وغیرہ ہیں کہنے لگے میں مخلوق سے کیا ڈرتا میں خدا سے تو ڈرتا ہی نہیں۔ (توبہ توبہ) ایسی خلوت اور جمعیت قلب کس کام کی ہے۔ غرض یہ کہ خلوت کے اندر غلو ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کا درجہ بیان کر دیا جائے۔ پس یاد رکھو کہ یہ مقدمہ مقصود ہے خود مقصود نہیں۔ جیسے آ گبوٹ میں بیٹھ کر مکہ معظمہ جاتے ہیں تو آ گبوٹ کا سفر عبادت نہیں ہاں وسیلہ عبادت ہے۔ پس وسیلہ اور مقدمہ کو مقصود نہ سمجھنا چاہیے۔ مثلاً جب آ گبوٹ جدہ پہنچے اور کہا جائے کہ اترو تو انکار کرے کہ نہ صاحب میں تو اترتا نہیں اس میں بیٹھنے سے تو مکہ پہنچتے ہیں۔ یہ تو عبادت ہے تم تو اتارتے ہو اس کو یہی کہا جاوے گا کہ ارے ظالم یہ تو سن لیا لیکن یہ بھی تو نے سنا کہ وسیلہ اور مقدمہ سے بقدر ضرورت کام لیا جاتا ہے ورنہ وہی مقصود ہو جاتا ہے۔ یہی ناتمام علم نیم ملا خطرۂ ایمان کا مصداق ہے جیسے عالمگیر کے وقت میں ایک فاحشہ عورت تھی اس نے کئی شوہر کر رکھے تھے۔ اور ایک کی دوسرے کو خبر نہ تھی کسی نے عالمگیر کو خبر کر دی عالمگیر نے اس کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ وہ بہت گھبرائی اور کسی آزاد طالب علم سے پوچھا کہ مولوی صاحب کوئی حیلہ بتاؤ کہا کچھ دلواؤ تو بتلائیں۔ چنانچہ کچھ روپیہ ٹھہرا کہا یوں کہیو کہ ایک مولوی صاحب وعظ میں فرما رہے تھے کہ لوگ ناحق زنا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے چار چار نکاح حلال کئے ہیں۔ ارے کم بختو جب ایک چھوڑ چار چار جائز ہیں تو کیوں زنا کرتے ہو حضرت جی یہ مسئلہ میں نے سنا تھا اس لئے مجھے جرأت ہوئی۔ عالمگیر نے کہا یہ تو تو نے سنا لیکن یہ بھی سنا کس کو جائز ہیں اری بے حیاء مرد کو چار نکاح جائز ہیں۔ ایسے ہی ان حضرت نے یہ تو سن لیا کہ آ گبوٹ میں سوار ہونا عبادت ہے لیکن یہ تحقیق نہ کہ عبادت مقصودہ ہے یا غیر مقصودہ۔ اسی طرح خلوت بھی مقدمہ اور وسیلہ ہے عبادت کا۔

بعض لوگ خلوت کو جلوت پر ترجیح دیتے ہیں۔ مولانا رومیؒ نے اس کی نسبت عجیب بات لکھی ہے وہ فرماتے ہیں اے عزیز تو جو خلوت کو جلوت پر مطلقاً ترجیح دیتا ہے یہ تیری ناشکری ہے اس لئے

یہ فضیلتیں خلوت کی تجھ کوجلوت ہی کی بدولت تو معلوم ہوئی ہیں اور صحبت ہی کی وجہ سے خلوت کے برکات معلوم ہوئے ہیں اور اگر تمام عمر خلوت ہی میں رہتا تو خلوت کی حقیقت اور اس کے فضائل اور نیز دیگر تمام کمالات سے محروم رہتا آج تو اس جلوت کو مٹا رہا ہے اور خلوت کو اس پر فضیلت دیتا ہے تیری ایسی ہی مثال ہے۔

یکے بر سر شاخ و بن می برید (ایک شاخ پر بیٹھ کر اسکی جڑ کاٹ رہا تھا)

واللہ بڑی لاجواب بات ہے یہ ہے حقیقت میں معقول اور یہ ہے فلسفہ سبحان اللہ کیا سمجھے ہیں اس تقریر سے معلوم ہوگیا کہ اصل مقصود جلوت ہے اس لئے کہ انسان مدنی الطبع ہے اس کی طبیعت کا اقتضاء ہے کہ اپنی بنی نوع سے مل کر رہے۔ یہ فطری اور فلسفی دلیل ہے اور شرعی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو عبادتیں ہمارے لئے مقرر فرمائی ہیں ان میں سے اکثر میں اجتماع کی ضرورت ہے دیکھو نماز کہ جو بہت بڑی عبادت ہے اس کی نسبت ارشاد ہے وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ اور حدیثوں میں حلقہ ذکر کی بڑی فضیلت آئی ہے ایسے مجمع میں ملائکہ نازل ہوتے ہیں تقویت اسلام اور اعلاء کلمۃ اللہ کے جتنے اسباب ہیں وہ سب اجتماع ہی پر موقوف ہیں۔ حج ہے اس میں اجتماع کی ضرورت ہے اور حدیثوں میں صحبت نیک کی بہت فضیلت آئی ہے غرض فطرت سے شریعت سے جلوت اور اجتماع کا مقصود ہونا معلوم ہوتا ہے لیکن اس اجتماع اور جلوت کا معین خلوت ہے۔ اس اجتماع کی اہلیت خلوت ہی سے پیدا ہوتی ہے اس کو ایک مثال کے ضمن میں سمجھئے اور اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ہم کو اپنے دنیوی مقاصد میں بھی خلوت کی ضرورت معین ہونے کے درجہ میں ہے وہ یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص ہے اس کے نقطہ خیال میں تحصیلداری مطلوب ہے اب دیکھئے اس کی غایت کیا ہے۔ غایۃ اس کی یہ ہے ایک کمرہ میں بیٹھنا اور مقدمات فیصل کرنا' دیکھئے تحصیلداری ایک ایسا منصب ہوا جو اجتماع کو مقتضی ہے لیکن اہلیت اس منصب کی خلوت ہی سے آوے گی۔ اس لئے کہ خلوت میں بیٹھ کر قانون یاد کرے گا۔ اور جن کتابوں میں امتحان ہوگا ان کو بیٹھ کر رٹے گا۔ پس یہ خلوت اس جلوت کے اہل بننے کے لئے ہوئی اور لیجئے طبیب جو مریض کو مسہل دیتا ہے تو کہہ دیتا ہے کہ تنہا رہنا باتیں کسی سے نہ کرنا اور یہ تصور کرنا کہ اب دست آتے ہیں غایۃ اس کی یہ ہے کہ تندرست ہو کر پھر مل جل کر رہیں گے لیکن وہ اس اجتماع کا اہل نہ رہا تھا اس لئے ضرورت ہوگئی خلوت کی۔ غرض خلوت کی ہر کام میں ضرورت ہے آج اگر کوئی اہل تصوف پر اعتراض کرے کہ وہ خشک دماغ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو عقل نہیں۔ صاحبو! طبیب نے جو تم کو ایک ادنیٰ اور خسیس مقصود یعنی دست آنے کیلئے خلوت کی تعلیم کی تھی اس پر تو تم نے اعتراض نہ کیا اور جس کا مقصود

اعلیٰ درجہ کا ہو کہ اس سے بڑھ کر کوئی مقصود نہیں اس پر اعتراض کرتے ہو تف بریں عقل و دانش جیسے طبیب نے دستوں کے لئے خلوت اور تصور دستوں کا بتلایا ہے۔ ایسا ہی ان سالکین کو بھی ماسوی اللہ کے دفع کے واسطے مسہل دیا گیا ہے اور وہ اس تصور میں بیٹھے ہیں کہ اب محبوب جلوہ گر ہوا اور اب جلوہ گر ہو۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی　　شاہد کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

ترجمہ: ایک لحہ بھی اس سے غافل نہ ہونا' محبوب جب دیکھے تو تجھے آگاہی نہ ہو۔

یہ ہے درجہ خلوت کا کہ جس سے اس کی ضرورت ہو گئی اور یہ بھی ثابت ہوا کہ وہ لذاتہا مقصود نہیں لغیر ہا ضروری ہے۔

خلوۃ اصحاب کہف

اس آیت میں اسی کا ذکر ہے ارشاد ہے وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ (اور جب تم ان لوگوں سے الگ ہو گئے اور ان کے معبودوں سے بھی) الخ یہ قصہ اصحاب کہف کا ہے میں مفصل قصہ ان کا نہ بیان کروں گا۔ قرآن مجید میں بقدر ضرورت ہی ہے۔ اکثر واعظین قصے ہی بیان کیا کرتے ہیں ہمارے بزرگوں کا مشرب تو موافق قرآن کے یہ ہے۔

ماقصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم　　ازما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

ترجمہ: ہم نے دارا وسکندر کا قصہ نہیں پڑھا ہم سے تو محبت و وفا ہی کا قصہ تو پوچھ۔ اور چونکہ اس وقت جو مجھ کو مقصود ہے وہ پورے مجمل قصہ پر بھی موقوف نہیں اس لئے میں صرف اتنا قصہ بیان کر دوں گا جو فقط اس آیت کے حل کرنے کے لئے کافی ہو بعض کو قصے ہی مقصود ہوا کرتے ہیں اور جو حقیقت شناس ہیں وہ اس سے گھبراتے ہیں۔ اصحاب کہف ایک مشہور جماعت کا لقب ہے یہ سات آدمی تھے ایک کافر بادشاہ کے زمانہ میں وہ پادشاہ بتوں کو سجدہ کرایا کرتا تھا۔ ان سات کو اللہ تعالیٰ نے خود بخود ہدایت کی اور توحید ان کے دل میں گھر کر گئی۔ اب ان کو پریشانی ہوئی کہ اگر ہم یہاں رہتے ہیں تو بادشاہ ہم سے شرک کرائے گا۔ اور مقابلہ کریں تو کیسے کر سکتے ہیں سات آدمی ایک سلطنت کا کس طرح مقابلہ کریں۔ ایسی صورت میں آدمی اپنی جان اور ایمان مخفی ہو جانے اور بھاگ جانے ہی سے بچا سکتا ہے ہاں شاذ و نادر اتفاق سے ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ کسی حکمت عملی سے حق بھی ظاہر ہو جائے اور جان و ایمان بھی بچ جائے۔ اکبر بادشاہ کے یہاں ایک مرتبہ بہت سے بددین جمع ہو گئے تھے۔ آپس میں صلاح ہوئی کہ ملا دوپیازہ کو زک پہنچانا چاہیے بادشاہ نبی بنے اور کوئی ابوبکر کوئی عمر اسی طرح ہر ایک نے ایک ایک صحابی کا نام لیا کہ میں فلاں بنتا ہوں اور یہ فلاں بنتا ہے۔ ملا دوپیازہ کا نمبر آیا یہ حیران تھا کہ اگر کسی کا نام لیتے ہیں تو اس مجمع باطل کی شرکت ہوتی ہے اور اگر نہیں لیتے تو اور اس مجمع پر انکار کریں تو بادشاہ کی مخالفت ہوتی ہے لیکن ایک بات

سوجھ گئی کہنے لگے میں تمہارا ابوجہل ہوں گا اور تم سب پر لعنت کیا کروں گا کیا خوبصورتی سے اپنا ایمان اور جان بچائی لیکن ہر جگہ تو ملا دو پیازہ جیسے ذہین ہوتے نہیں اور نہ ہر وقت ایسی باتیں چل سکتی ہیں۔اس لئے ان حضرات نے اسی میں سلامتی سمجھی کہ سب سے خفیہ طور سے رہو چنانچہ چند روز تک مخفی طور سے رہے۔ایک مرتبہ مشورہ کیا کہ یوں کب تک رہیں گے اگر کسی دن ظاہر ہو گئے تو پھر آفت آوے گی اور نیز یہاں اگر اسی طرح رہتے رہے تو ان کی صحبت کا اثر نہ ہم پر ہو جاوے اس لئے کہیں ایسی جگہ چل دو کہ ان کو ہماری مطلق خبر نہ ہو چنانچہ مشورہ کر کے وہ ایک غار میں جا چھپے اور ان کے ہمراہ ایک کتا بھی چلا گیا اور وہاں ان پر اللہ تعالیٰ نے نوم مسلط کر دی چنانچہ تین سو برس سوتے رہے۔اس کے بعد آنکھ کھلی آگے پورا قصہ ان کا اس سورۃ میں ہے عجیب قصہ ہے مجھ کو اتنا ہی بیان کرنا تھا غرض اس مقام کی یہ آیت ہے اس آیت میں ان کے مشورہ کا ذکر ہے ترجمہ اس آیت کا یہ ہے کہ جب تم ان سے علیحدہ ہو گئے اور ان کے معبودوں سے سوا اللہ کے۔الا اللہ میں دو احتمال ہیں اول تو یہ کہ یا تو اس میں یَعْبُدُوْنَ عامل ہے۔اس وقت تو یہ معنی ہوں گے کہ تم لوگ ان کفار سے اور جن کی وہ سوائے اللہ کے عبادت کیا کرتے تھے ان سے علیحدہ ہو گئے لیکن اس توجیہ پر ان کا تعلق خدا تعالیٰ کے ساتھ اس کلام سے معلوم نہیں ہوا دوسری توجیہ یہ ہے کہ **الا اللہ اعتزلتموھم** کا معمول ہو یعنی جب کہ تم لوگ ان سے علیحدہ ہو گئے مگر اللہ سے کہ اس سے علیحدہ نہیں ہوئے۔اس صورت میں استثناء منقطع ہوگا اور الا اللہ کی یہ تقدیر ہو گی لکن **اللہ فلم تعتزلوہ فاوٗا الی الکھف** یعنی جب ان سے علیحدہ ہو گئے تو اب غار کی طرف چلو نتیجہ اس کا کیا ہوگا۔ یَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ یعنی نتیجہ یہ ہے کہ تمہارے لئے تمہارا رب اپنی رحمت کا حصہ پھیلائیں گے۔ یہ لوگ کیسے مؤدب تھے کہ ان کو حالانکہ نہ شرائع معلوم تھے نہ کسی سے تعلیم پائی تھی نہ کسی کے صحبت یافتہ تھے لیکن مؤدب اس درجہ کہ وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ الخ سے وہم ہوتا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ کو بھی چھوڑ دیا ہو اس لئے کہ کلام اس طرح کا ہے جیسے ہمارے محاورہ میں کہا کرتے ہیں کہ میاں جب تم نے سب معبودین کو چھوڑ دیا جس میں اللہ تعالیٰ بھی بظاہر داخل ہیں کیونکہ وہ سب ہی کے معبود ہیں بت پرست بھی ان کی عبادت کے مدعی ہیں گو اگر الا اللہ نہ ہوتا تب بھی یہ معلوم تھا کہ ان سب کو اللہ ہی کے واسطے چھوڑا ہے تو پھر خدا کو کیسے چھوڑتے لیکن تاہم کلام میں ادب ملحوظ رکھنے کے لئے الا اللہ بڑھایا اس سے ان کا اللہ تعالیٰ کا محبّ ہونا اور نہایت مؤدب ہونا معلوم ہوتا ہے اور دوسری عجیب بات یہ ہے کہ تعلیم تو کہیں پائی نہ تھی ان کے دل میں یہ کیسے آیا کہ دین کے بچانے کی ضرورت ہے یہ نہایت درجہ ان کے متادب ہونے کو بتلا رہا ہے۔تیسرے یہ کہ غار میں جانے کے ثمرات کو بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی رحمت نازل فرماویں گے اور حقیقت شناسی ملاحظہ کیجئے کہ یوں نہیں کہا **ینشر لکم ربکم رحمۃ** بلکہ من بڑھایا جس سے یہ مسئلہ مستفاد ہوا کہ حق تعالیٰ کی رحمت غیر متناہی ہے جس پر رحمت ہو گی کوئی حصہ اس کا ہوگا باقی اس کی صفت

رحمت کا کیا ٹھکانا ہے اس قدر وسیع ہے کہ جس کی نہایت نہیں ہے۔ حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے چالیس برس تک رحمت کا بیان کیا ایک روز قہر کا بیان فرمادیا تو کئی آدمی مر گئے الہام ہوا کہ اے عبدالقادر کیا ہماری اتنی ہی رحمت تھی کہ چالیس برس میں اس کا بیان ختم ہو گیا۔ پس رحمت کی اور اسی طرح حق تعالیٰ کی ہر صفت کی کوئی انتہا نہیں ہے شیخ شیرازی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ۔

دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر ۔۔۔ ماہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم
اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم ۔۔۔ وزہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم

ترجمہ: دفتر پورا ہو گیا اور عمر ختم ہو گئی اور ہم صرف تیری اولین ثنا ہی کرتے رہے اے وہ ذات جو وہم و قیاس و گمان سے برتر ہے اور تو ہمارے کہے سنے اور پڑھے ہوئے سب سے بالا ہے۔

اور فرماتے ہیں۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی راسخن پایاں ۔۔۔ بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی
داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار ۔۔۔ گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

ترجمہ: نہ اس کے حسن کی انتہا ہے اور نہ سعدی کی باتوں کی انتہا ہے جیسے استسقاء کا مریض پانی پیتے پیتے مر جاتا ہے اور دریا پھر بھی باقی رہتا ہے۔

ہم بیچارے کیا شئی ہیں جو رحمت کا احاطہ کر سکیں رحمت ہم کو خود محیط ہو رہی ہے اس لئے ارشاد ہے اَلَآ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ (آگاہ ہو جاؤ بے شک وہ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے) جب احاطہ ذاتی ہے تو رحمت لازم ذات ہے اس لئے وہ بھی محیط ہو گی اور اَلَآ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ (آگاہ ہو جاؤ بے شک وہ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے) سے بیحد عنایت ظاہر ہوتی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ محبوب اگر کہیں ملے تو دو حالتیں ہوا کرتی ہیں یا تو تم اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لو اور یا وہ تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے۔ دوسری صورت میں جس قدر لطف اور مزہ ہے پہلی صورت میں نہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ۔

اگرچہ دور افتادم بایں امید خورسندم ۔۔۔ کہ شاید دست من بار دگر جاناں من گیرد

ترجمہ: اگر دور ہوں مگر اس امید پر خوش ہوں کہ شاید میرا ہاتھ مکرر دامن جاناں کو پکڑ لے۔

اگر تم محبوب کو اپنی گود میں بٹھلاؤ تو لطف اس میں بھی ہے لیکن اگر قسمت سے وہ تم کو اپنی آغوش میں لے لے تو اس کی برابر کہیں میں لطف نہیں چنانچہ اہل محبت اس کو خوب سمجھ سکتے ہیں۔ پس حق تعالیٰ کو اول تو کوئی احاطہ نہیں کر سکتا اور اگر بفرض محال کوئی کر بھی سکتا تو محبت کا مقتضیٰ یہ تھا کہ تم اسی کی تمنا کرتے کہ وہ ہم کو اپنے احاطہ میں لے لے لیکن وہ بے مانگے ہی دیتے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے اَلَآ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ (آگاہ ہو جاؤ بے شک وہ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے) غرض حق تعالیٰ کی

رحمت چونکہ بے انتہا ہے اس لئے رحمت پر من بڑھایا ایک ثمرہ تو غار میں جانے کا یہ ہوا دوسرا ثمرہ یہ ہے کہ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ أَمْرِكُم مِّرْفَقًا اور مہیا کر دے گا تمہارے امر دین میں کامیابی کا سامان پس دو ثمرے بیان کئے ایک تو اشارہ مقصود کی طرف ہے اور دوسرے میں اس مقصود کے مقدمات کی طرف تفصیل اس کی یہ ہے کہ مقصود رحمت حق ہے جو فَأْوُا إِلَى الْكَهْفِ (پس آ ؤ نماز کی طرف) پر مرتب ہے لیکن یہ مقصود عادتاً اس پر بلا واسطہ مرتب نہ ہوگا گو کلام میں بوجہ اہتمام شان اور بسبب اس کی مقصودیت کی اظہار کے اس کو بلافصل **فاوٗا الی الکھف** (بغیر فاصلہ کے غار کی طرف آ ؤ) کے بعد ذکر کر دیا ہے لیکن صورت اس کے ترتب کی یہ ہوگی کہ کہف میں جانے کے بعد اسباب مہیا ہوں گے تکمیل دین کے اور بواسطہ اس کے رحمت کا ترتب ہوگا۔ پس رحمت کا مقدمہ تکمیل دین کے اسباب کا مہیا ہونا ہے۔ اور تکمیل دین کا مقدمہ کہف میں جانا ہے۔ پس کہف میں جانا مقدمہ کا مقدمہ ہے اور یہ آیت شرح اور اعادہ ہے اس اجمال کا جو اول اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا ہے یعنی اول حق تعالیٰ نے اجمالاً قصہ اصحاب کا بیان فرما دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے:

إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا آتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا ○ فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا ○ ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصَىٰ لِمَا لَبِثُوا أَمَدًا ○

(وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ ان نو جوانوں نے غار میں جا کر پناہ لی پھر کہا اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنے پاس سے رحمت کا سامان عطا فرما دے اور ہمارے لئے کام میں درستی کا سامان مہیا کر دے پس ہم نے اس غار میں ان کے کانوں پر سالہا سال تک نیند کا پردہ ڈال دیا پھر ہم نے ان کو اٹھایا کہ ہم معلوم کریں کہ ان دونوں گروہ میں کونسا گروہ ان کے رکھنے کی موت سے زیادہ واقف تھا)

یہ قصہ ہے اجمالاً گویا متن ہے آگے نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُم بِالْحَقِّ (ہم ان کا واقعہ آپ سے ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہیں) سے اس کی شرح ہے متن کے اندر جو اصل مغز تھا قصہ کا وہ بیان فرما دیا۔ شرح میں اس کی تفصیل ہے سبحان اللہ کیا عجیب طرز ہے مصنفین کی عادت ہے کہ اول مختصراً بطور فہرست کے مقصود بیان کرتے ہیں حق تعالیٰ نے ان اسالیب کی اپنے کلام پاک میں رعایت فرمائی ہے اور دوسرے مقامات میں بھی ایسے امور کی بہت رعایت ہے دیکھئے خطیبوں اور واعظین کی عادت ہوتی ہے کہ اس کے بعد خطبہ پڑھتے ہیں اس کے بعد مقصود شروع کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بھی ایک مقام پر دلائل توحید سے پہلے خطبہ بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ وَسَلَامٌ عَلَىٰ عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَىٰ

(کہہ دو کہ سب تعریف اللہ کیلئے ہے اور سلام ہے اس کے برگزیدہ بندہ پر) یہ ایک خطبہ ہے اس کے بعد مقصود یعنی بیان دلائل توحید شروع ہوا ہے۔ اور یہاں متن کے موقعہ پر ایک دعا آئی ہے رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ رَحۡمَةً وَّهَيِّئۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا (اہمارے رب ہم کو اپنے پاس سے رحمت کا سامان عطا فرما اور ہمارے لئے اس کام میں درستی فرما) اس آیت میں جو کہ شرح کے موقع پر ہے يَنۡشُرۡ لَكُمۡ رَبُّكُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِهٖ (تم پر تمہارا رب اپنی رحمت پھیلا دیگا) سے اس کی طرف اشارہ ہے یہاں اضافت کی وجہ سے رحمت کی تنکیر نہ ہو سکتی تھی اس لئے یہاں من بڑھا دیا اور متن کے موقع میں من لدنک کی وجہ سے تعریف کی ضرورت نہ تھی اس لئے رحمۃ کو منکر لائے جو تنکیر کے سبب مترادف ہے من رحمۃ کا متن میں جس رحمت کی درخواست کی تھی شرح میں بھی اس کی امید کو ایواء الی الکہف کا ثمرہ کر کے ظاہر کیا ہے گویا حاصل یہ ہے کہ اے اللہ جس رحمت کا ہم نے آپ سے سوال کیا تھا وہ ہم کو عنایت فرمائیے۔ سبحان اللہ کلام میں کیا تناسق ہے اور فَاۡوٗۤا اِلَى الۡكَهۡفِ يَنۡشُرۡ لَكُمۡ رَبُّكُمۡ (پس آؤ غار کی طرف تم پر تمہارا رب اپنی رحمت پھیلا دے گا) الخ میں ایک مسئلہ لطیف کی طرف اشارہ ہے وہ یہ ہے کہ اعمال کو گو ثمرات میں دخل ہے لیکن بدون مشیت حق کے ان کا ترتب ضروری نہیں ہے۔ بعض مرتبہ بڑی بڑی محنتیں کرتے ہیں اور ثمرہ کچھ مرتب نہیں ہوتا اس لئے ہر حالت میں یہ ضروری ہے کہ حق تعالیٰ پر نظر رکھے عمل کرے اور عمل پر نظر نہ ہو مولانا فرماتے ہیں۔

ایں ہمہ گفتیم لیک اندر بسیچ　　بے عنایات خدا ہیچم و ہیچ
بے عنایات حق و خاصان خدا　　گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

(ہم نے یہ سب کچھ کہہ دیا ہے مگر ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ خدا کی عنایت کے بغیر ہم کچھ نہیں ہیں بغیر اللہ تعالیٰ کی عنایت اور خاصان خدا کی توجہ کے اگر وہ فرشتہ بھی ہو جائے تو اسکی ہستی سادہ ورق کی طرح ہے)

اسی واسطے اصحاب کہف غار میں جا پہنچے تو مطمئن نہیں ہوئے ناز نہیں ہوا غار میں آ جانے سے یہ نہیں سمجھے کہ اب ہم مامون ہو گئے بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے منتظر رہے اپنی تدبیر پر وثوق نہیں کیا اسی واسطے مولانا تدبیریں بتلاتے ہیں مگر پھر مضطر ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف التجا ظاہر فرماتے ہیں۔

صد ہزاراں دام و دانہ است اے خدا　　ماچو مرغان حریص بے نوا
دم بدم پابستۂ دام نو ایم　　گر ہمہ شہباز و سیمرغے شویم

صد ہزاراں دام و دانہ ست اے خدا ما چو مرغان حریص بے نوا (?)

اے رہانی ہر دمے مارا وباز سوئے دامے میرویم اے بے نیاز

ترجمہ:۔لاکھوں جال اور دانے ہیں اور ہم اے اللہ مرغان حریص کی طرح ہیں ہر تشنئے جال میں پھنسنے کو تیار ہیں اگر ہم سب شہباز و سیمرغ بھی ہو جائیں اور تو ہمیں چھوڑ دے تو پھر دام میں پھنس جائیں گے۔

ہماری یہی حالت ہے کہ ایک جال سے بچتے ہیں دوسرے جال میں پھنستے ہیں۔ہم پھنستے ہیں وہ نکالتے ہیں میں خود اپنی حالت کہتا ہوں کہ ایک بلا سے بچتا ہوں دوسری میں مبتلا ہوتا ہوں حسب حال یہ شعر یاد آتا ہے۔

چہل سال عمر عزیزت گزشت مزاج تو از حال طفلی نہ گشت

ترجمہ: چالیس سال گزر گئے مگر تمہارا مزاج طفلانہ ہی رہا۔

پچاس کا ایک شعر ہے۔

ایک پنجاہ رفت در خوابی مگر ایں پنج روز دریا بی

ترجمہ: اے وہ کہ تیرے پچاس سال خواب میں گزر گئے شاید یہ باقی پانچ سال ہی پالو۔

اور ساٹھ کی نسبت کسی نے کہا ہے

چو شصت آمد نشست آمد بدیوار

اصلاح نہ ہوئی تمام عمر خرافات ہی میں گزر گئی لیکن اس سے دل شکستہ نہ ہو اس لئے کہ دل شکستہ ہونے کا انجام یہ ہے کہ آدمی کام سے بیٹھ رہتا ہے۔ہمارا کام یہی ہے کہ چلیں اور گریں ان کا کام یہ ہے کہ ہم کو اٹھائیں ان شاء اللہ انجام بخیر ہوگا بندہ کا کام سعی کا ہے۔

اندریں رہ می تراش و می خراش تادمے آخر دمے فارغ مباش

ترجمہ: اسی راستے میں تراشو چھیلو اور آخر وقت تک کبھی فارغ نہ رہو۔

یہ فکر نہ کرو کہ بے فکر ہو کر رہیں یہ نفس کا کید ہے نفس یوں چاہتا ہے کہ آرام سے رہوں۔نفس کو کشا کشی سے تکلیف ہوتی ہے وہ کبھی غالب ہوتا ہے کبھی ہم اس پر غالب ہوتے ہیں وہ چاہتا ہے کہ میں چین سے بیٹھ جاؤں مصیبت سے چھوٹ جاؤں اس لئے فارغ ہونے کی فکر نہ کرو۔آگے مولانا فرماتے ہیں۔

تادمے آخر دمے آخر بود کہ عنایت با تو صاحب سر بود

یعنی آخر کوئی وقت تو ایسا آوے گا کہ عنایت حق تجھ کو کھینچ لے گی۔

شرک طریقت

اور اگر اس بات کا فکر ہے کہ افسوس بزرگ تو نہ ہوئے تو ماور جھاڑ و کیسی بزرگی اس کو چہ میں تو مٹنا ہے بعض لوگ اسی واسطے ذکر و شغل کرتے ہیں کہ بزرگ بن جاویں یاد رکھو یہ شرک فی الطریقت ہے ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت کوئی عمل ایسا بتلایئے جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہو حضرت نے فرمایا کہ بھائی تمہارا بڑا حوصلہ ہے کہ جو اس کی تمنا کرتے ہو ہمارا تو ذہن بھی کبھی اس طرف نہیں جاتا۔ ہم کو تو واللہ اگر حضورؐ کے روضہ اقدسؐ کے گنبد خضرا ہی کی زیارت ہو جائے تو غنیمت ہے بزرگی اور تقدس کی نیت چھوڑو ہم تو کہتے ہیں کہ اگر اللہ میاں ناراض نہ ہوں تو یہی غنیمت ہے۔ محبت تو وہ شئے کہ محبوب کا مرتبہ تو بہت زیادہ ہے۔ محبوب کے یہاں کا کوئی ادنیٰ آدمی اگر جوتیاں بھی مارے تو فخر سمجھے۔ میں نے ایک حکایت سلاطین ترکیہ میں سے کسی سلطان کی سنی ہے کہ قسطنطنیہ میں وزیر اعظم کی سواری جارہی تھی اور حسب دستور امراء ایک آدمی ہٹو بچو کا غل مچاتا ہوا آگے آگے جاتا تھا۔ ایک عرب کو ذرا ہٹنے میں دیر ہوئی اس وزیر نے ایک ہنٹر رسید کیا۔ اس عرب کو غصہ آیا اس نے منہ پر ایک جوتہ کھینچ کر مارا۔ گرفتار کر لئے گئے اور یہ مقدمہ سلطان المعظم کے اجلاس میں پیش کیا۔ سلطان نے فرمایا کہ واقعی انہوں نے بڑا جرم کیا لیکن میں اطلاع کئے دیتا ہوں کہ اگر میرے ساتھ یہ واقعہ ہوتا تو میں انکا جوتہ سر پر رکھ لیتا اس لئے کہ دار محبوب یعنی مکہ کے رہنے والے ہیں تو صاحبو یہ ہوس ہی چھوڑ دو کہ ہماری بڑی شان ہوگی ارے محبت اور جاہ تو متضاد یں ہیں۔ محبت جلنے اور گلنے اور مٹنے کے لئے۔

افروختن و سوختن و جامہ دریدن　　پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن　　دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

سوئے زلفش نظرے کردن درویش دیدن　　گاہ کافر شدن و گاہ مسلماں بودن

ترجمہ: پروانہ نے مجھ سے جلنا شمع نے گھلنا اور پھول نے کپڑے پھاڑنا مجھ سے سیکھا۔ کفر اور اسلام یہ اصطلاحی الفاظ ہیں ان سے فنا اور بقا مراد ہے۔ پس یہاں ہر دم فنا و بقا ہے۔ حضرت احمد جام فرماتے ہیں۔

کشتگان خنجر تسلیم را　　ہر زماں از غیب جان دیگر است

پس ترا ہر لحظہ مرگ و رجعتے است مصطفیٰ فرمودہ دنیا ساعتے است

ترجمہ: خنجر تسلیم کے مقتولوں کو ہر وقت غیب سے نئی جان ملتی ہے۔ تجھے ہر وقت موت آتی ہے اور موت سے اٹھنا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا دنیا ایک ہی لحظہ ہے۔

اگر اس فنا و بقا کا تماشہ منکشف ہو جائے تو آدمی بھول جائے دعویٰ اور پندار کو اور اس کا دعویٰ اور پندار ایسا ہی ہے جیسے ایک قطرہ بارش کا ابر سے جس وقت جدا ہوا تو کہتا تھا انا کذا و انا کذا لیکن جس وقت دریا میں پہنچا تو اس وقت اس کو اپنی ہستی کی حقیقت معلوم ہوئی۔ شیخ شیرازیؒ اسی مضمون کو فرماتے ہیں۔

یکے قطرہ از ابر نیساں چکید خجل شد چو پہنائے ذوریا بدید
کہ جائے دریاست من کیستم گر او ہست حقا کہ من نیستم

الحاصل اصحاب کہف کو اپنے عمل پر ناز نہیں ہوا بلکہ حق تعالیٰ پر نظر رہی اور اول جو دعا کی تھی رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً (اے اللہ ہم کو اپنے پاس سے رحمت کا سامان عطا فرما) الخ اس کو یہاں بطور ثمرہ دوسرے عنوان سے بیان کیا اور اس عنوان بدلنے میں بہت اسرار اور غوامض ہونگے جو غور کرنے سے سمجھ میں آ سکتے ہیں لیکن میری عادت یہ ہے کہ جو بات بے تکلف سمجھ میں آ جاتی ہے اس کو بیان کر دیتا ہوں اور جو نہیں سمجھ میں آتی اس کو چھوڑ دیتا ہوں یہ تمام تر تقریر اس آیت کی تفسیر و ترکیب اور بعض لطائف کے متعلق تھی۔ اب مقصود کو اس سے استنباط کرتا ہوں جس کو تقریر سابق پر غور کرنے سے عاقل خود بھی سمجھ سکتا ہے لیکن تصریحاً بھی ذکر کیا جاتا ہے پس جاننا چاہیے کہ اس آیت سے چند امور ثابت ہوئے (اول) تو فَأْوٗا اِلَى الْكَهْفِ (پس آ و غار کی جانب) سے یہ سمجھا گیا کہ کسی درجہ میں خلوت مقصود ہے (دوم) فَأْوٗا کو اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ (جب ان سے الگ ہوئے) پر مرتب کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ خلوت جب نافع ہے جبکہ جلوت سے مضرت ہو (سوم) اشارہ اس طرف ہوا کہ مسلم کی شان یہ ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو جب باطناً عزلت ہے تو ظاہراً بھی عزلت ہونا چاہیے (چہارم) خلوت فی نفسہ مقصود نہیں بلکہ رحمت حق مقصود ہے کما یدل علیہ يَنْشُرْ لَكُمْ الخ (پنجم) جب ناجنسوں کی صحبت میں ہو تو ایسے وقت خلوت مکمل دین ہے میں نے جو دعویٰ کیا تھا الحمد للہ آیت سے وہ ثابت ہو گیا کہ خلوت فی نفسہ مقصود نہیں۔

ترک تعلقات

بلکہ جن لوگوں نے اس کو مقصود سمجھا ہے۔ ان پر حق تعالیٰ نے انکار فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (اور انہوں نے رہبانیت کو خود ایجاد کیا ہم نے ان پر اس کو واجب نہ کیا تھا لیکن انہوں نے حق تعالیٰ کی رضا کے

واسطے اس کو اختیار کیا تھا پس انہوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی) یہ آیت بنی اسرائیل کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ترک تعلقات کو انہوں نے خود ہی ایجاد کر لیا تھا ہم نے ان پر اس کو فرض نہیں کیا۔ اس آیت کی ترکیب یہ ہے کہ الا بمعنی لکن ہے اور ابتغاء کا عامل مقدر ہے اور تقدیر کلام یہ ہے کہ لکن ضعلوھا ابتغاء رضوان الله الخ یعنی انہوں نے اس رہبانیت کو اللہ کی رضا مندی طلب کرنے کے لئے اختیار کر لیا تھا لیکن چونکہ اس کی رعایت نہ کی اس لئے رضاء حق سے محروم رہے پس حق تعالیٰ نے ایسے ترک تعلقات کو ابتداع سے تعبیر فرمایا اس لئے کہ ترک تعلقات سے مقصود تقلیل تعلقات ہے نہ کہ یک لخت تعلقات ترک کر دیئے جائیں انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ مخلوق سے علیحدہ ہو کر جنگل میں رہتے تھے نہ کسی سے ہنستے تھے نہ بولتے تھے نہ نکاح کرتے تھے اس پر رد فرمایا ہے ایسا ترک تعلقات پسندیدہ نہیں بلکہ ہنسو بولو کھاؤ پیو ہاں انہماک مضر ہے اور حضور سے زیادہ کون ہوگا آپ ہنستے بھی تھے باتیں بھی کرتے تھے بیبیوں کے پاس بھی جاتے تھے اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ حضور کو تو ضرورت خلوت اور ترک تعلقات کی نہ تھی اور ہم کو ضرورت ہے فلیف القیاس بات یہ ہے کہ یہ صحیح ہے لیکن قواعد شرعیہ سے ثابت ہے کہ ہم کو بھی ایک حد خاص ہی تک ضرورت ہے یعنی جب تک کہ نسبت راسخ نہ ہو اس وقت تک خلوت کی ضرورت ہے اور جب رسوخ ہو جائے اس وقت یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ مطلقاً ضرورت نہیں ہے ضرورت تو اس وقت بھی ہے لیکن فرق اس قدر ہے کہ ابتداء میں تو زیادہ خلوت کی ضرورت ہے اور رسوخ کے بعد بھی ضرورت رہتی ہے لیکن قلیل خلوت کی اور دلیل اس کی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا (اور سب سے قطع کر کے اسکی طرف متوجہ ہو) اور ارشاد ہے فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (پس جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہو جایا کریں تو محنت کیا کریں) پس اہل تمکین کے لئے بھی اس کی ضرورت رہتی ہے کہ شب و روز میں کوئی وقت ایسا ہو کہ جس میں ان کی یہ حالت ہو۔

خوشا وقتے و خرم روزگارے　　　که یارے برخور داز وصل یارے

ترجمہ: کتنا ہی اچھا وقت ہوگا جب دوست سے دوست کی ملاقات ہوگی۔ اور یہ کیفیت ہو۔

بفراغ دل زمانے نظرے بما ہر دے　　　به از انکه چتر شاہی ہمه روز ہائے ہوئے

ترجمہ: دل کی فراغت سے ایک لحظہ محبوب کے چہرے کو دیکھنا اس سے بہتر ہے کہ چتر شاہی کے ساتھ سارا دن شور و شر میں مبتلا ہوں۔ پس خلوت قلیلہ کی ہر وقت ضرورت ہے۔

ترک لذات

باقی خلوت طویلہ اور ترک تعلقات کی ایک حد خاص تک ضرورت رہتی ہے لیکن اس خلوت

کے اندر بھی اس کی ضرورت ہے کہ حقوق واجبہ فوت نہ ہوں اور اتباع سنت کے ساتھ ہوں بعضوں کی شہرت ہو جاتی ہے کہ فلاں صاحب کسی سے بولتے نہیں بلکہ روٹی نہیں کھاتے یا فلاں بزرگ آم نہیں کھاتے ان لوگوں نے حلال چیزیں چھوڑ کر ایک شی یعنی عجب اور ریا کو اختیار کیا اور نیز گویا در پردہ اللہ میاں پر بھی معترض ہیں کہ یا اللہ میاں آپ نے یہ چیزیں فضول پیدا کی ہیں ان کی ضرورت نہ تھی یہ سب فضول اور مردود باتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں کھانے کے لئے پیدا کی ہیں خوب کھاؤ پیو۔ ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ فصل کی ہر شے کھانا چاہیے حتیٰ کہ بھٹے بھی کھاؤ لیکن حدود کی رعایت ہر شے کے اندر رکھنا ضروری ہے۔ اتنا نہ کھاؤ کہ منہ سے نکلنے لگے جیسا کہ ایک شخص تھے بہت کھانا کھالیا تھا۔ مولوی فیض الحسن صاحب کے پاس آئے کہ حضرت کوئی تدبیر بتلایئے تکلیف ہو رہی ہے حضرت مولوی صاحب نے ایک پڑیہ دی کہ اس کو کھالو تو کہنے لگا کہ واہ حضرت اگر اس کی جگہ ہوتی تو میں دو لقمہ اور ہی نہ کھاتا میں نے تو بڑی محنت سے بھرا ہے ہاں کوئی لیپ اوپر کا بتلا دیجئے۔ تو اتنا کھانا بھی اچھا نہیں ہے باقی سب چیزیں کھاؤ آج کل بعض لوگ بزرگی کی وجہ سے نعمتوں کے کھانے سے محروم رہتے ہیں اور بعضے وہم میں پڑے ہوئے ہیں کہ فلاں شے نہ کھاؤ ثقیل ہے پیٹ میں سدہ پڑ جاوے گا فلاں شے نہ کھاؤ بخار آ جائے گا۔ یاد رکھو یہ مقولہ مشہور ہے کہ ان تمار ضتم تمرضوا یعنی اگر تم بیمار نہ ہوگے تو بیمار ہو جاؤ گے بے کھٹکے سب چیزیں کھاؤ ہاں اگر کوئی اس وقت بیمار ہو اور حکیم جی نے پرہیز بتلایا ہو تو وہ دوسری بات باقی اچھے خاصے تندرست کو آئندہ کے اوہام سے نہ ڈرنا چاہیے دیکھو گاؤں کے لوگ ہیں وہ خوب بے کھٹکے سب کچھ کھالیتے ہیں ان کو کچھ بھی نہیں ہوتا ہے۔ ایک حکیم صاحب تھے وہ کہیں جنگل میں چلے جا رہے تھے ایک کسان کو دیکھا کہ گھر سے اس کے کھانا آیا چار روٹ موٹے موٹے اور ایک لوٹہ چھاچھ کا۔ اس نے وہ چاروں روٹیاں کھا کر اور اوپر سے چھاچھ کا لوٹہ منہ سے لگالیا اور حکیم صاحب قواعد کی رو سے ڈر رہے ہیں کہ اب یہ ضرور مریگا۔ جب وہ سب پی گیا حکیم جی نے کہا چودھری صاحب اس چھاچھ کو اگر آپ درمیان میں پیتے تو اچھا تھا بولا کہ اچھا اپنے لڑکے کو پکارا ارے جا چار روٹ اور لے آ اس کا کہنا بھی کرلوں چار روٹ اور منگا کر کھالئے اور کہنے لگا اب تو بیچ میں ہوگئی تو ایسے لوگوں کو کچھ ضرر نہیں ہوتا اس لئے کہ بلا وہم و تکلف کھاتے ہیں اور پھر محنت خوب کرتے ہیں پس خوب محنت کرو۔ ذکر کی ضربیں لگاؤ اور خوب کھاؤ۔ آج کل یہ حالت ہے کہ کسی کو یہ خبط ہوگیا ہے کہ میں

اگر کھاؤں گا تو میری بزرگی چھن جائے گی کسی کو یہ خبط ہے اور ایسے لوگ زیادہ ہیں کہ اگر فلاں شی کھاؤں گا تو تندرستی جاتی رہے گی۔ ترک لذات کا میں انکار نہیں کرتا کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے بزرگوں نے کیا ہے اور کرایا بھی ہے مگر اس کی ایک حد ہے۔ ایک بڑھیا نے اپنے بیٹے کو حضرت غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کر دیا کہ حضرت اس کو بھی تعلیم فرمایئے حضرت نے اس کو خانقاہ میں بھیج دیا وہاں اس کو سوکھے ٹکڑے کھانے پڑے ایک مدت کے بعد وہ بڑھیا آئی دیکھا کہ بیٹا بہت دبلا ہو رہا ہے بڑا غصہ آیا اور پہنچی حضرت کی خدمت میں۔ دیکھا کہ حضرت مرغ نوش جاں فرما رہے ہیں اور بھی زیادہ بیتاب ہوئی اور کہا کہ حضرت آپ تو مرغ کھاتے ہیں اور میرا بیٹا سوکھ کر کانٹا ہو گیا فرمایا کہ میں اس کو مرغ کھانے کے قابل بنا رہا ہوں۔ مرغ کی ہڈیاں پڑی تھیں فرمایا کہ دیکھ اس طرف ان ہڈیوں کو فرمایا قم باذن الله (اللہ کے حکم سے کھڑا ہو) وہ ہڈیاں آپس میں ایک دوسرے سے مل کر اچھا خاصہ مرغ بن کر کھڑا ہو گیا فرمایا کہ جب تیرا بیٹا ایسا ہو جائے گا وہ بھی مرغ کھائے گا ابھی اس کو اسی کی ضرورت ہے مولانا فرماتے ہیں۔

لقمہ و نکتہ است کامل را حلال　　تو نہ کامل مخور بے باش لام

یعنی تصوف کے نکتہ بیان کرنا اور تر لقمے کھانا کامل کو حلال ہے یعنی اس کو مضر نہیں۔

اختلاف ریاضت

اور جو کامل نہیں ہے اس کو کمال کی حد تک خاموش اور تارک لذات رہنا چاہیے لیکن وہ زمانہ دوسرا تھا اس وقت کا مطلب بھی جدا تھا زمانہ کے اختلاف سے مطلب ہمیشہ بدل جایا کرتا ہے اس وقت کے لوگ شائق تھے اور حق تعالیٰ سے ان کا علاقہ قوی تھا ایسے مجاہدات وریاضیات سے ان کے تعلق میں کوئی فرق نہ آتا تھا اب لوگوں کی دوسری حالت ہے اب وہ وقت کہ لوگوں کی ہمتیں ضعیف اور شوق کم اور قویٰ کمزور ہو گئے ہیں اور خدا تعالیٰ کی محبت بھی بہت کم ہے اگر خدا تعالیٰ کھانے پینے کو دے تو کچھ کر لیتے ہیں ورنہ اللہ میاں سے بھی کدورت ہو جاتی ہے۔ اب خوب گھی کھاؤ اور دودھ پیو قوت آوے گی تو خدا تعالیٰ کی محبت کا بھی کچھ سرسراہٹ ہوگا اور تیز آجکل عقل بھی کم ہے کھانا پینا ترک کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم نے بڑا کام کیا ہے پھر اس پر منتظر ہوں گے ثمرات کے اور اپنے کو حقدار سمجھیں گے پھر اس کے بعد دو صورتیں ہوں گی کہ وہ ثمرات مزعومہ اگر حاصل نہ ہوئے تو سمجھیں کہ جب اتنی محنت سے کچھ نہ ہوا تو بس جی اب کچھ حاصل نہ ہوگا جو کرتے تھے اس کو بھی چھوڑ بیٹھیں گے اور اگر حاصل ہو گئے تو اپنی

محنت کا ثمرہ سمجھیں اور عجب میں مبتلا ہونگے اس لئے اب یہ مجاہدہ متروک ہو گیا ہے اب مجاہدہ صرف خلوت کا ہے لیکن خلوت کا بھی ہر شخص کو وقت طویل نہیں ملتا اس لئے حق تعالیٰ نے شریعت مقدسہ میں ایک خاص خلوت مقدر فرمائی ہے اور ایک بڑے زمانہ میں چھوٹا سا زمانہ اس خلوت کے لئے مشروع فرمایا ہے یعنی رمضان المبارک کے عشرہ اخیرہ کو اس لئے منتخب فرمایا ہے۔

لفظ اعتکاف کی حکمت

اور اس خلوت کا نام اعتکاف رکھا ہے خلوت نام نہیں رکھا' اس لئے کہ یہ فلاسفہ اور حکماء کا نام ہے اس لئے اس کو چھوڑ دیا گیا اس لئے اس کو خلوت سے تعبیر نہ کرنا چاہیے اسی واسطے حدیث شریف میں آیا ہے کہ عشاء کو عتمہ نہ کہو اس لئے کہ یہ جاہلیت میں اس وقت کا نام عتمہ ہے۔ آج کل یہ عام غلطی ہو رہی ہے اور منشاء اس غلطی کا مؤرخین یورپ کی تقلید ہے وہ یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بانی اسلام کہتے ہیں وہ لوگ آپ کو بانی اسلام اس بناء پر کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک اسلام نعوذ باللہ حضورؐ کا بنایا ہوا اور گھڑا ہوا ہے۔ آسمانی مذہب نہیں ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی ہمارے بھائی بھی کہنے لگے اگر اس میں تاویل نہ کی جائے تو بہت سخت لفظ ہے اور سخت بے ادبی ہے۔ حضورؐ کے القاب جو حدیث وقرآن میں آئے ہیں ان سے تعبیر کرنا چاہیے قرآن میں **یا ایھا الرسول** **یا ایھا النبی** فرمایا ہے۔ اور حضورؐ فرماتے ہیں انا حبیب اللہ ان القاب سے زیادہ باوقعت کون سے القاب ہوں گے جو آپ ان کو چھوڑ کر غیر قوموں کے مخترعہ القاب کو اختیار کرتے ہیں ایسے ہی لفظ خلوت کا قدیم لفظ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم کو بجائے اس کے اعتکاف سکھلایا ہے ارشاد ہے۔

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِى الْمَسٰجِدِ (اور ان بیبیوں سے اپنے بدن بھی مت ملنے دو جس زمانہ میں تم اعتکاف والے ہو مسجدوں میں)

اور فرماتے ہیں وَطَهِّرْ بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ (اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنیوالوں کے واسطے پاک رکھنا) گو لفظ خلوت کا استعمال بھی جائز ہے بزرگوں کے کلام میں بھی ہے مگر جس خلوت کا لقب اعتکاف فرمایا ہے وہاں یہ لفظ اختیار کرنا چاہیے۔

خلوۃ از اغیار

یہ کلام تو عنوان میں تھا اور ان کی اور ہماری خلوت میں بدرجہ معنون بھی فرق ہے ہماری خلوت بوجہ رعایت حدود محمود ہے اور ان کی خلوت کی اللہ تعالیٰ نے مذمت فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد

ہے فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (پس انہوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی) وجہ یہ ہے کہ جب حدود کی رعایت نہ ہو تو کیسی ہی اچھی چیز ہو وہ بھی مذموم ہو جاتی ہے اوران کی خلوت میں چند نوع کی کمی تھی اول تو بوجہ طویل ہونے کے ہر شخص اس سے منتفع نہیں ہو سکتا تھا اس لئے مدت العمر تمام تعلقات چھوڑ کر کیسے کوئی شخص محبوس رہ سکتا ہے۔

حق تعالیٰ نے ایسا مختصر زمانہ اس کے لئے مقرر فرمایا ہے کہ ہر شخص کو آسان ہے اور پھر اس سے زیادہ منافع کما سنبین مفصلاً۔ دوسرے وہ خلوت ایسی جگہ کرتے تھے جہاں پرندہ پر نہ مار سکے یعنی وہ پہاڑوں کے غاروں اور جنگل کے گوشوں میں جا کر بیٹھتے تھے کہ خواہ مخواہ وحشت ہو کر آدمی آدمیت سے نکل کر وحوش میں شامل ہو جاوے اللہ تعالیٰ نے اس کی عجیب وغریب اصلاح فرمائی وہ یہ کہ اعتکاف کو مساجد میں مشروع فرمایا کہ جن سے خلوت مقصود تھی ان سے یکسوئی ہو گئی یعنی ناجنسوں سے اور جن سے یکسوئی مقصود نہ تھی یعنی اپنے ہم جنس ان سے خلوت نہیں ہوئی مجھے قصہ یاد آیا کہ ایک مرتبہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تنہا بیٹھے تھے میں وہاں جا پہنچا جب میں نے دیکھا کہ تنہا تھے میں نے عرض کیا کہ حضرت میں مخل وقت ہوا فرمانے لگے کہ نہیں خلوت از اغیار نہ از یار تم تو اپنے ہم جنس ہو اور اسی مضمون کی مؤید حدیث یاد آئی ارشاد ہے:

الوحدة خير من الجليس السوء والجليس الصالح خير من الوحدة (مستدرک حاکم ۳: ۳۴۳، الدر المنثرة: ۱۷۰) یعنی تنہائی برے ہمنشیں سے بہتر ہے اور اچھا ہمنشیں تنہائی سے بہتر ہے سبحان اللہ! شریعت نے کیا اعتدال سکھایا ہے۔ اور راز اس میں یہ ہے کہ خلوت کا مقصود تو یہ ہے کہ مشغولی بحق بڑھے لیکن جب اچھا جلیس کوئی ملے تو اس سے مشغولی مع اللہ بہ نسبت خلوت کے زیادہ ہوتی ہے میں بقسم کہتا ہوں کہ یار موافق سے جس قدر حضور اور مشغولی بڑھتی ہے اس قدر خلوت سے نہیں بڑھتی چنانچہ مجھ کو اس وقت جس قدر لطف بوجہ جلوت کے اس بیان میں آ رہا ہے اس قدر خلوت میں نہیں آتا۔ جب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تو حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ ایسے الفاظ حسرت سے فرمایا کرتے تھے کہ اکیلے ہی رہ گئے۔

مولانا فرماتے ہیں

ہر کہ اور ہم ز بانے شد جدا بے نواشد گرچہ دارد صد نوا

چونکہ گل رفت و گلستاں درگزشت نشنوی زیں پس زبلبل سرگزشت

(جو محبوب کا ہمزبان ہو جاتا ہے وہ دنیا سے جدا ہو جاتا ہے وہ اس ساز و سامان کے

باوجود بالکل بے نوا ہو جاتا ہے۔ جب گلستاں سے گل چلا جاتا ہے تو وہاں بلبل کی سرگزشت بھی سننے میں نہیں آتی)

حقیقت میں یہ لوگ سمجھدار تھے۔ پس اگر جلیس صالح میسر ہوتو خلوت پر اس کو ترجیح ہے آج کل تو اکثر صحبت بری ہی ہے اس لئے خلوت ہی بہتر ہے۔

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است   صراحی مئی ناب و سفینہ غزل است

(اس زمانہ میں اگر کوئی دوست بغیر مکروفریب کے ہے وہ صرف شراب کی صراحی اور غزل کا سفینہ ہے مقام امین بغیر شوروغل کے اور مہربان دوست ہمیشہ کیلئے میسر ہو جائیں)

اور کوئی جلیس موافق میسر ہوتو اس کی نسبت ہی بہتر ہے۔

مقام امن ولی بے غش و رفیق شفیق   گرمدام میسر شودزہے توفیق

لیکن اس زمانہ میں جلیس صالح کہاں ہے اگر ہوتو سبحان اللہ اس سے مستفیض ہوورنہ خلوت سب سے بہتر ہے۔

اور اگر صحبت ہی کو دل چاہے تو مردوں کی صحبت میں بیٹھے کہ ان کے پاس بیٹھ کر آخرت تو یاد آوے گی۔ وہ مردے ان زندوں سے بہتر ہیں یہ زندے تم کو ہلاک کرتے ہیں۔ وہ مردے تم کو حیات بخش ہیں۔ غرض فی المساجد سے اس طرف اشارہ فرمادیا ہے کہ خلوت بے نمازیوں سے مقصود ہے اور نمازیوں سے خلوت مقصود نہیں ان سے تو جلوت مقصود ہے۔ اسی واسطے حکم ہے کہ ایسی مسجد میں اعتکاف کرو جہاں جماعت ہوتی ہو ایسی مسجد نہ ہو جہاں آدمی کا نام ونشان نہ ہو۔ الو بولتے ہوں اس سے بھی صاف معلوم ہو گیا کہ جماعت مقصود ہے چنانچہ فقہا بے تکلف سمجھ گئے کہ اعتکاف سے انتظار جماعت کا ثواب اور ادراک جماعت مقصود ہے۔ کہاں گئے وہ غالی جو خلوت ہی کو مقصود ٹھہراتے ہیں اور خلوت کی تحصیل کے واسطے بہت سے حقوق واجبہ ضائع کرتے ہیں دیکھئے فقہاء کے اس لکھنے سے معلوم ہو گیا کہ خلوت بانتظار جلوت مقصود ہے پس خلوت ایک انڈہ ہے اور جلوت ایک بچہ ہے جب انڈے سے ایک بچہ نکل آوے تو انڈا بیکار ہے بہر حال فی المساجد کی قید نے صاف بتلا دیا کہ خلوت فی نفسہ مقصود نہیں ہے سبحان اللہ کیا اعتدال ہے نہ ایسی خلوت ہے کہ توحش تک نوبت آ جائے اور نہ ایسی ہے کہ مقصود حاصل نہ ہو بالکل مذاق اور طبائع کے موافق شریعت کی اسی حسن و جمال ہی پر نظر کر کے تو میں کہا کرتا ہوں۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم   کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

(تیرے سر سے پیر تک جہاں بھی نظر ڈالتا ہوں دامن دل دل کھینچ لیتی ہیں)

ہر ہر ناز دلربا اور ہر ہر ادا نرالی اور سادہ اور پھر دقیق۔

دلفریباں نباتی ہمہ زیور بستند

یہ حالت تو حکماء کے مجاہدوں اور ریاضت کی ہے۔(اے سرو تجھے مبارک ہو کہ تو ہر قید سے آزاد ہے)

شریعت کی آزادی

اور شریعت کی کیا حالت ہے۔

اے خوشامرو کہ از بندغم آزاد آمد

اور جولوگ اس آزادی کو قید اور ایسے آزادوں کو مقید سمجھتے ہیں تو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ یہ قید وہ ہے۔

اسیرش نخواہد رہائی زبند شکارش نجوید خلاصی بند

(جو اس کا اسیر ہے وہ قید سے رہائی نہیں چاہتا جو اس کا شکار ہے وہ قید سے چھٹکارا نہیں چاہتا)

اگر تم کسی پر عاشق ہو جاؤ اور وہ مدت کے بعد تم کو ملے اور لپٹ جائے اور خوب تم کو دبا دے اور پھر کہے کہ چھوڑ دوں تو ہرگز تم اس پر راضی نہ ہو گے بلکہ غنیمت سمجھو گے کہ مدت کے بعد تو یہ ملا ہے اچھا ہے جس قدر اس سے قرب ہو تو جناب آپ جس آزادی کو آزادی کہتے ہیں لعنت ہے ایسی آزادی پر جو خدا اور رسول سے آزادی ہو۔ ہمارے نزدیک جو اس قسم کا آزاد ہے ہم تو اس سے بے تکلف کہیں گے۔

مبادا دل آں فرومایہ شاد کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد

(اس کمینے کا دل کبھی خوش نہ ہو جو دنیا کی خاطر دین برباد کر لیتا ہے)

اور کیا آزادی ہے اپنے نزدیک آزاد ہوں گے سینکڑوں بلاؤں میں مقید ہیں۔ کوئی بوٹ کا مقید ہے کوئی سوٹ کا کوئی کانٹے کا کوئی چھری کا۔ آزاد ہم ہیں ان کی عزت اگر جوتہ اور بوٹ سوٹ سے ہے ہماری عزت دولت ایمان سے ہے وہ اگر عبدالفیشن ہیں تو ہم عبداللہ ہیں بہرحال خلوت کو ان حکمتوں کی وجہ سے مشروع فرمایا۔

حجرۂ خلوت

لیکن اس پر بھی مخاطبین میں بعض ایسے تھے کہ یہ سن کر دس روز تک مسجد میں رہیں گے نفس کو مزہ آیا کہ آہا خوب باتیں گھڑیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا اس طرح انسداد فرمایا کہ مسجد میں ایک چٹائی کا حجرہ بنایا اور اس میں رہے اس سے یہ بتلایا کہ مسجد میں رہو تو اس طرح رہو۔ صوفیہ نے یہاں سے ایک ایسا حجرہ خلوت کے لئے اختیار کیا ہے کہ اس میں سوائے چٹائی کے اور کچھ نہ ہوتا

تھا ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دو حجرے تھے ایک میں تو حاجت کی اشیاء رکھی تھیں اور ایک مخصوص تھا اس میں سوائے چٹائی کے اور کچھ نہ تھا اور یہ بھی صوفیہ نے فرمایا ہے کہ خلوت کا حجرہ بہت چھوٹا ہونا چاہیے۔ الحاصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں چٹائی کا حجرہ بنا کر تعلیم فرمایا کہ مسجد میں اس طرح رہنا چاہیے اور یہی ماخذ ہے اس عادت کا کہ پردہ وغیرہ اعتکاف میں باندھ لیتے ہیں۔

لیکن اس میں بھی شاید کوئی غلو کرتا اس لئے کہ یہ ایک امتیاز کی شان ہے کہ حجرہ میں خود بیٹھے ہیں اور باہر مریدین و معتقدین جمع ہیں کہ شاہ صاحب نکلیں گے تو زیارت کریں گے اور باتیں کریں گے اس لئے حضورؐ نے اس کا یہ انتظام فرمایا کہ نماز کے وقت کہ وہی وقت اجتماع کا ہے خود بخود باہر رونق افروز ہو گئے اسی بناء پر اہل اعتکاف کا طریقہ ہے کہ نماز کے وقت پردہ وغیرہ سب اٹھا دیتے ہیں تا کہ کوئی امتیاز کی شان پیدا ہو کر عجب نہ ہو۔ واللہ اگر تمام جہان کے عقلاء چاہتے کہ ان مصالح کی رعایت کریں تو ہرگز نہ کر سکتے۔ یہ نور وحی ہے کہ جو ایسے دقیق دقیق مصالح کی رعایت فرمائی کہ من وجہ قید من وجہ اطلاق خلوت بھی محفوظ اجتماع بھی محفوظ۔

کم سے کم اعتکاف

علاوہ اس کے ایک اور دقیق رعایت کی وہ یہ ہے کہ اس پر نظر فرمائی کہ رات کو کام زیادہ کرنا چاہیے لیکن رات آرام کا وقت ہے اگر دس کی دس راتیں کام کریں تو بیمار ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لئے ان راتوں کی حق تعالیٰ نے عجیب طریقہ سے تقسیم فرمائی کہ طاق راتوں کو شب قدر بنا کر بتلا دیا کہ ایک رات سوؤ اور ایک رات جاگو اور ان راتوں میں ایسی برکات رکھ دیں کہ **الف شهر** کی خلوت سے وہ بات نصیب نہیں جو ان راتوں سے ہوتی ہے۔ اگر حکماء اپنی عقل سے ہزار تدبیریں کرتے اور تدبیریں کرتے کرتے مر رہتے تو یہاں تک ہرگز رسائی نہ ہوتی۔ اس لئے کہ اس کا ادراک کیسے ہوتا۔ کون سے زمانہ میں کتنی برکت رکھی ہوئی ہے اور اسی طرح کسی زمانہ کے اندر کوئی برکت پیدا کرنے کی بھی قدرت نہ تھی یہ تو خالق الزماں کے تصرف سے برکت پیدا ہو گئی اور انہی کے بتلانے سے معلوم ہوا صاحبو! یہ برکات تم کو مفت ملتی ہیں۔ گو اب دس دن باقی نہیں رہے۔ لیکن جو باقی ہیں ان کو بھی ہاتھ سے نہ دو کم از کم تین ہی دن دنیا کے بکھیڑے چھوڑ کر مسجد میں بیٹھ جاؤ۔ تین دن نہ سہی ایک ہی دن سہی میں نے ایک جگہ دیکھا ہے کہ حضورؐ نے ابو طالب سے فرمایا تھا کہ میرے کان ہی میں کلمہ کہہ لو۔

گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ وفریاد ہم بس ہے اپنا ایک بھی نالہ اگر پہنچے وہاں

اوراس سے زیادہ سنئے علماء نے لکھا ہے کہ ایک گھنٹہ کا اعتکاف بھی مشروع ہے اللہ اللہ اگر اب بھی کوئی محروم رہے تو بہت ہی خسران کی بات ہے۔

تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر

ان کی طرف سے کچھ تو کمی نہیں ہے لیکن آپ بھی تو کچھ حرکت کیجئے ہماری اور حق تعالیٰ کی ایسی مثال ہے جیسے بچہ اور آپ کہ بچہ چل نہیں سکتا لیکن تم منتظر اس کے ہو کہ یہ کچھ حرکت کرے۔ جب یہ کچھ حرکت کرے تو میں اس کو گود میں اٹھا لوں گا سنبھال لوں گا اسی طرح حق تعالیٰ دیکھتے ہیں کہ بندہ کچھ تو کرے جب یہ کچھ حرکت کرتا ہے تو ادھر سے رحمت ہوتی ہے جذب ہوتا ہے ورنہ اگر ادھر سے جذب نہ ہوتا تو یہ مسافت آپ کے قطع کرنے سے قطع نہ ہوتی۔

کہ می بالد بہ خود ایں راہ چوں تاک از بریدن ہا نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدن ہا

ترجمہ: عشق کا راستہ دوڑنے سے قطع نہیں ہوتا جیسے انگور کی بیل کاٹنے سے اور بڑھتی ہے۔

چونکہ رمضان المبارک کا اخیر ہے اس لئے اس کو غنیمت سمجھو خدا جانے پھر نصیب ہو یا نہیں اور جمعہ گذشتہ کو حقوق بیان کئے گئے تھے اس کو بھی تازہ کر لو۔ خلاصہ یہ ہے کہ اعتکاف روزہ، تراویح ان ایام کے عبادات ہیں ان کے حقوق ادا کرو اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ توفیق عطا فرماویں آمین۔

الوعظ المسمی بہ

مثلث رمضان

۱۳۳۶ھ کے رمضان المبارک کے تیسرے جمعہ کو وعظ ہذا ارشاد فرمایا۔ جو ۲ گھنٹے تک جاری رہا۔ ناسازی طبع کی بناء پر بیان میں اختصار رہا۔ بایں ہمہ جملہ ضروری مضامین ارشاد فرما دیئے۔

حکیم محمد یوسف صاحب بجنوری مرحوم نے قلمبند فرمایا۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

احوال واقعی (از جامع)

حضرت حکیم الامت علیہ الرحمۃ نے اس مجموعی وعظ کے تین جز وقرار دیئے اور ہر ایک کا نام جدا جدا تجویز فرمایا پہلا الریان من رمضان دوسرا القرآن فی رمضان تیسرا الیقظان فی رمضان اور مجموعہ کا نام مثلث رمضان تجویز فرمایا۔ اور وجہ تین جز وقرار دینے کی یہ ہوئی کہ حضرتؒ والا کا قصد یہ تھا کہ اس رمضان شریف میں چار جمعہ واقع ہوں گے اور چاروں میں چار مضامین علیحدہ علیحدہ بیان کر دیئے جاویں گے۔ مگر اتفاق سے حضرت کی طبیعت ناساز ہوگئی حتیٰ کہ چند روزے بھی قضا ہوئے اور ضعف اس قدر ہو گیا تھا کہ بیان پر قدرت ہونا مشکل تھی چنانچہ دو جمعہ میں وعظ نہیں ہوا اور تیسرے جمعہ میں وعظ فرمایا جس میں مختصراً پہلے جمعوں کے بھی مضامین آ گئے (یعنی جن مضامین کا پہلے دو جمعوں میں بیان کیا جاتا) چنانچہ ایک مضمون پہلے جمعہ کے متعلق ہے اور ایک دوسرے کے اور ایک تیسرے کے۔ اور حضرتؒ نے گذشتہ دو جمعہ میں وعظ نہ ہونے کے عذر کا اظہار بھی شروع وعظ میں فرمایا اور چوتھے کے متعلق وعدہ کر لیا گیا جیسا کہ معلوم ہو جائے گا۔

خطبہ ماثورہ

قال النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم کمارواہ الشیخان عن سهل بن سعد ان للجنة ثمانية ابواب منها باب يسمى باب الريان لا يدخله الا الصائمون (السنن الكبرى للبيهقی ۴:۳۰۵، فتح الباری ۴:۱۱۲، اتحاف السادة المتقين ۱۰:۵۹۵)

تمہید

یہ ایک حدیث ہے جس کو شیخین یعنی امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے سہل بن سعد صحابی سے روایت کیا ہے۔ ترجمہ: یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں جس میں سے ایک دروازہ کا نام باب الریان ہے سوائے روزہ داروں کے اور کوئی اس میں سے داخل نہ ہوگا۔

یہ تو ترجمہ ہے اس حدیث کا میرا مقصود بعض فضائل رمضان شریف کا بیان کرنا ہے اور یہ مضمون منجملہ چند مضامین وقتیہ کے ایک مضمون ہے پہلے سے یہ خیال تھا کہ اس ماہ کے چار جمعہ ہوں گے اور ہر جمعہ میں ایک ایک مضمون ان مضامین میں سے بیان کر دیا جاوے گا مگر اسباب ایسے ہو گئے کہ میں اس سے پہلے جمعوں میں بیان پر قادر نہیں تھا چنانچہ اب تک ضعف باقی ہے اس لئے آج ایک ضروری مضمون بیان کر دیا جاوے گا جس میں مختصراً پہلے جمعوں کے مضامین بھی آ جاویں گے اور اخیر جمعہ باقی ہے۔ چوتھا مضمون بشرط خیریت (ان شاء اللہ) اس میں بیان کر دیا جاوے گا اگر سب جمعوں میں قدرت ہوتی تو آج کے حصہ میں تیسرا مضمون آتا اتفاق بات ہے کہ ایک بھی بیان نہیں ہوا اور یہ غیر اختیاری امر تھا اب بھی پوری قدرت نہیں مگر میں نے خیال کیا کہ اگر زیادہ بیان نہ ہوگا تو تھوڑا ہی سہی اس کے قبل تو اتنی بھی قدرت نہ تھی وہ چاروں مضمون ضروری اور قابل تفصیل تھے اگر عوارض پیش نہ آتے تو بالاستقلال ایک ایک جمعہ میں ان کا بیان ہوتا اب اگر تینوں مضمون مفصلاً آج ہی بیان ہوں تو اس کے لئے وقت بہت چاہیے اس واسطے قصد یہ ہے کہ تینوں کا مختصراً بیان کر دیا جائے اور زیادہ وقت تو اکثر توابع میں صرف ہوتا ہے اصل مضمون طویل نہیں ہوتا اس لئے توابع کا حذف کرنا مناسب معلوم ہوا۔ ضروری افادہ پر نظر کر کے آج تینوں کا بیان مختصراً کر دیا جائے گا۔

باب الریان

سو ایک تقریر کا مضمون تو حدیث سے شروع کر دیا ہے جس کا پھر ترجمہ کرتا ہوں کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں جن میں سے ایک کا نام باب الریان ہے سوائے روزہ داروں کے اس میں سے اور کوئی داخل نہ ہوگا یہ حق تعالیٰ کی حکمت ہے کہ جنت کے آٹھ دروازے رکھے ہیں اور جہنم کے سات لوگ اس کی حکمت سبقت رحمتی علی غضبی (مسند الحمیدی: ۱۱۲۶، اتحاف السادة ۸: ۵۵٦، الدرر المنتثرة: ۹٦) بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت غضب پر سبقت لے گئی۔ اس لئے جنت کے دروازوں کی تعداد جہنم سے زیادہ ہے۔ گویا اجازت دی کہ اگر کثرت سے داخل ہونے والے ہوں تو آسانی سے داخل ہو سکیں کیونکہ تعداد دروازوں کی زیادہ ہے اور اس میں ترغیب بھی ہے کہ جنت میں زیادہ جانے والے ہونے چاہیں اور جہنم میں جانے والے کم ہوں

اور کوشش کرنی چاہیے کہ اس میں نہ جائیں گو وقوع اس کے خلاف ہے یعنی جنت میں کم جائیں گے اور جہنم میں زیادہ اور یہ لوگوں کی سوء تدبیر کی وجہ سے ہے ورنہ ان کے کرم میں کمی نہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ دروازے اس مکان میں زیادہ رکھے جاتے ہیں جس میں وسعت ہو اس سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں وسعت زیادہ ہے اگرچہ سوء تدبیر کی وجہ سے جہنم والوں کی تعداد زیادہ ہوگی اور جہنم بھی کوئی چھوٹی سی چیز نہیں گو جنت سے وسعت میں کم ہو چنانچہ جہنم کی وسعت اس سے ثابت ہے کہ باوجود اس کے جہنم میں جہنمی کثرت سے داخل ہو چکیں گے پھر بھی پکارے گی هل من مزید کہ اور ہو تو دے دو جیسے بھوکے سے دریافت کرتے ہیں کہ اور کچھ چاہیے تو وہ کہتا ہے کہ اور ہو تو دے دو اور یہی حال جنت کا ہوگا۔ مگر اللہ میاں اتنے رحیم و کریم ہیں کہ دوزخ کو تو اپنے حکم سے شکم سیر کر دیں گے کسی کو بلا عمل داخل نہ کریں گے اور جنت کے لئے ایک نئی مخلوق پیدا کریں گے جن کو بلا عمل محض اپنے فضل سے جنت مرحمت فرمائیں گے۔ غرض اس کو اتنی وسعت اس لئے دے دی ہے کہ اس کے دروازوں کی تعداد جہنم سے زیادہ رکھی ہے اور جہنم کے بھرنے کے نئی مخلوق پیدا نہ ہوگی بلکہ اسی کے اجزاء کو سمیٹ کر تنگ کر دیں گے ورنہ حاکمیت کا مقتضا تو یہ تھا کہ اگر اہل جنت کو دوزخ میں داخل فرما دیتے تو کسی کو بھی چوں و چرا کی گنجائش نہ تھی۔

ہست سلطانی مسلم مردرا نیست کہ راز ہرۂ چون و چرا

(بادشاہت صرف اس ہی کے لئے مسلم مسلم ہے کسی کو چون و چرا کی طاقت نہیں)

مگر وہ صرف حاکمیت سے کام نہیں لیتے بلکہ حکمت سے کام لیتے ہیں چنانچہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اس میں حکمت ہی ہوتی ہے گو ہمیں معلوم نہ ہو۔ پھر ایک طریقہ تو دوزخ کے پر کرنے کا یہ تھا کہ اہل جنت کو دوزخ میں بھیجتے اور ان کو معذب فرماتے اور دوسرا یہ تھا کہ ان کو دوزخ میں بھیجتے اور معذب نہ فرماتے وہ اس پر بھی قادر ہیں۔

حقیقی انعام

اور ایسا واقع بھی ہے کہ کوئی دوزخ میں ہو اور معذب نہ ہو۔ چنانچہ حدیث میں ہے الوائدة والموؤدة كلتا هما فی النار کہ زندہ در گور کرنے والی اور زندہ در گور کی گئی دونوں آگ میں ہیں۔ ہندوستان میں بھی لڑکیوں کے مارنے کی عادت تھی مگر سلطنت نے اس کا انتظام کر دیا۔ عرب میں یہاں سے زیادہ آفت تھی کہ لڑکی کو زندہ در گور کر دیتے تھے کہ وہ خود ہی گھٹ کر مر جاتی تھی یہاں تو مار کر دفن کر دیتے تھے مگر عرب کا طریقہ یہاں سے اشد تھا شاید اس صورت سے مارنے میں عرب کا یہ خیال ہو کہ مارنے کے فعل کو اپنے ذمہ کیوں رکھیں یا معلوم نہیں کہ عرب کے نزدیک اس کا کوئی اور اختراعی سبب تھا

غرض کہ یہ رواج تھا اور یہ حدیث اس کے متعلق ہے۔ **الوائدة والموؤدة كلتا هما في النار (سنن ابی داؤد: ۴۷۱۷، مسند احمد ۳: ۴۷۸، کنز العمال: ۲۸۱، الدر المنثور ۳: ۲۸۴)**
اس میں ظاہراً یہ شبہ ہوتا ہے کہ بچی نے کیا خطا کی ہے جس کی وجہ سے وہ دوزخ میں ڈالی گئی۔ علماء نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں سب سے اچھا جواب یہ ہے کہ بچی دوزخ میں تو ہوگی مگر معذب نہ ہوگی جیسے جہنم میں فرشتے بھی ہوں گے مگر معذب نہ ہوں گے چنانچہ خزنہ جہنم دوزخ ہی میں ہوں گے مگر وہاں بھی ویسے ہی مقرب ہیں جیسے جنت کے فرشتے جنت میں کیونکہ اصل انعام تو بندہ پر یہ ہے کہ اس کو حق تعالیٰ کی معیت نصیب ہو خواہ دوزخ میں ہو یا جنت میں اگر دوزخ میں معیت ہے تو پھر تکلیف کا کیا ذکر ہے وہی جنت ہے اور اگر جنت میں معیت نہ ہوتی وہ دوزخ سے بدتر ہوتی۔

باتو دوزخ جنت است اے جان فزا بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

(اے میری جان تیرا ساتھ ہو تو دوزخ بھی جنت ہے اے دل ربا تیرے بغیر جنت بھی دوزخ ہے)
خزنہ جہنم کے ساتھ خدا تعالیٰ کی معیت ہوگی اس لئے وہ فرشتے آرام ہی میں ہونگے۔

حقیقت تعذیب

اس کی واضح مثال دنیا میں موجود ہے دیکھئے جیل خانہ میں ایک تو مجرم ہوتے ہیں اور ایک وہ جو وہاں ملازم ہیں۔ مجرمین کو تکلیف ہوتی ہے کہ ایک ایک دن کا ٹنا مشکل ہوتا ہے اور ملازمین جیسے اور جگہ خوش ہیں اسی طرح وہاں بھی وجہ یہی ہے کہ مجرمین کے ساتھ حکومت کی معیت نہیں ہوتی بلکہ عتاب متعلق ہوتا ہے اور ملازمین کے ساتھ معیت ہوتی ہے۔

البتہ ایک شبہ یہاں یہ واقع ہوتا ہے کہ پھر موؤدہ کو جہنم میں رکھنے سے فائدہ کیا جبکہ وہ معذب نہیں کیا اس کے لئے جہنم ہی میں ٹھکانا تھا جواب یہ ہے کہ اول تو ہمیں مصلحت دریافت کرنے کی مجال نہیں خیر میں مصلحت بھی بتاتا ہوں وہ یہ کہ بچی جس کو زندہ درگور کیا تھا وہ ماں کے پیش نظر رہے اس سے ماں کے لئے زیادتی عذاب کی مقصود ہے کہ اس کو دیکھ دیکھ کر اپنا فعل یاد کر کے خوب کڑھے اور رنج ہو کہ ہائے میں کیسی سنگدل تھی کہ میں نے اپنی بیٹی کے ساتھ یہ حرکت کی جس کی وجہ سے آج عذاب بھگت رہی ہوں نیز ممکن ہے کہ اس پر حقیقت بھی منکشف نہ ہو اور وہ یہی سمجھتی رہے کہ میری بچی پر بھی عذاب ہو رہا ہے۔ حالانکہ وہ معذب نہیں اور حقیقت منکشف نہ ہونے سے اس کا حسرت اور رنج اور زیادہ ہو جاوے جو کہ باعث زیادتی عذاب کا ہے اور یہ ضرور نہیں کہ وہاں سب ہی کو ایسا انکشاف عام ہو جاوے کہ کوئی چیز مخفی ہی نہ رہے ہاں دنیا سے زیادہ وہاں انکشاف ہوگا۔
وجہ یہ ہے کہ ممکنات کے علوم متناہی ہیں اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ بعض علوم مخفی بھی ہوں

بس ماں یہ سمجھے گی کہ مجھ پر عذاب ہے اور میری وجہ سے بچی پر بھی عذاب ہے اس سے عذاب میں زیادتی ہوگی اور اولاد سے تعلق فطری ہے وہاں بھی یہ تعلق بالکلیہ منقطع نہ ہوگا کیونکہ فطریات عادۃً بدلا نہیں کرتے تو جب ماں یہ سمجھے گی کہ میری وجہ سے یہ بھی عذاب میں ہے اس سے اس کی کلفت بڑھے گی اگر اس محمل پر حدیث کو محمول کرلیا جاوے تو کیا قباحت ہے۔

تعذیب شمس وقمر

اس سے بھی اوضح واقرب الی الفہم ایک اور نظیر ہے وہ یہ کہ حدیث میں ہے **الشمس والقمر مکوران فی النار یوم القیمة (مجمع الزوائد ۱۰: ۳۹۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۵۶۹۲، مشکل الآثار ۱: ۶۷)** کہ آفتاب اور چاند بے نور کرکے جہنم میں ڈالے جاویں گے یہاں بھی وہی شبہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کیا خطا کی ہے کہ جس کی وجہ سے جہنم میں ہوں گے جواب یہ ہے کہ خطا کی تحقیق کی ضرورت اس وقت ہے جبکہ وہ معذب بھی ہوں سو وہ معذب نہ ہوں گے اور ان کو دوزخ میں ڈالنے سے مشرکین کو دکھانا ہوگا کہ یہ خود کو تو دوزخ سے بچا ہی نہ سکے تم کو تو کیا بچا سکتے۔ اس کو اقرب اس لئے کہا گیا کہ ذی روح کا معذب ہونا اتنا مستبعد نہیں جتنا غیر ذی روح کا معذب ہونا (اس موقعہ پر ذی روح وہ لڑکی ہے جس کو زندہ درگور کیا تھا اور غیر ذی روح شمس وقمر ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ لڑکی معذب تو نہ ہوگی مگر اس کا معذب ہونا اتنا بعید نہ تھا جتنا کہ شمس وقمر کا معذب ہونا بعید ہے کیونکہ لڑکی ذی حیات ہے اور ذی حیات کو عادۃً تکلیف ہونا بعید نہیں اور شمس وقمر غیر ذی حیات ہیں اور غیر ذی روح کو عادۃً تعذیب نہیں ہوتی چنانچہ لکڑیوں کو آگ میں جلاتے ہیں مگر بوجہ غیر ذی روح ہونے کے ان کو تکلیف ہونا مستبعد ہے بخلاف اس کے کہ کسی جاندار کو آگ میں ڈال دیں کہ اس کو تکلیف ہونا کچھ بھی بعید نہیں اگرچہ حق تعالیٰ کو اس پر بھی قدرت ہے کہ غیر ذی روح کو بھی معذب فرماویں۔ پس شمس وقمر ہوں گے تو وہ دوزخ میں مگر معذب نہ ہوں گے کیونکہ ذی روح نہیں اور اسی لئے مکلّف نہیں بلکہ بعض ذی روح بھی مکلّف نہیں جیسے حیوانات وبہائم بلکہ بعض ذوی العقول بھی بواسطہ انبیاء کے مکلّف نہیں یعنی ان کی طرف انبیاء کی بعثت نہیں ہوئی گو بعض اہل لطائف اس کے بھی قائل ہوئے ہیں کہ ملائکہ بھی اس طرح مکلّف ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت ان کی طرف بھی ہے۔ بلکہ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ بعثت جمادات کی طرف بھی ہے اور وہ بھی مکلّف ہیں اور بعثت الی کافۃ الخلق سے استدلال کیا ہے مگر میرے نزدیک یہ ایک لطیفہ ہے اور اگر اس کو مان بھی لیا جاوے تو کہا جاوے گا کہ یہ مکلّف تو ہیں مگر ان چیزوں

سے عصیان کا ظہور نہیں ہوا اس لئے معذب نہ ہوں گے چنانچہ کلام اللہ سے ان کا مطیع ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَکَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ (اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیا تجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ کے سامنے عاجزی کرتے ہیں جو کہ آسمانوں میں زمین اور سورج اور چانداور چوپایوں اور بہت سے آدمی اور وہ سجدہ کرتے ہیں) اگر ان سے عصیان ہوتا بوجہ اس کے کہ اس قول میں ان کی طرف بھی بعثت ہے اور یہ مکلف ہیں اس لئے ضرور تھا کہ یہ معذب بھی ہوں مگر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں عصیان نہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے **سموات وارض و شمس و قمر ودواب** (آسمان، زمین سورج، چانداور چوپائے) سب کے متعلق بلا استثناء کے یسجد لہ فرمایا ہے اور ناس کے لئے کثیر کی قید بڑھائی ہے اس سے معلوم ہوا کہ ناس میں تو بعض مطیع اور بعض عاصی ہیں مگر اور مخلوقات میں سب مطیع ہیں اور آیت میں ناس سے مراد انس وجن دونوں ہیں کیونکہ ناس کا ترجمہ ہے لوگ جن کو بھی کہتے ہیں مگر ایک طالب علم تھے وہ جانوروں کو بھی لوگ کہا کرتے تھے ایک دفعہ کہنے لگے کہ بندر لوگ بڑے شریر ہیں مگر محاورہ میں لوگ صرف انس وجن کو کہتے ہیں۔ غرض انس وجن میں تو دو قسمیں ہیں بعض فرمانبردار بعض نافرمان اور جوان کے سوا ہیں وہ سب فرمانبردار ہیں۔ لہذا شمس وقمر کا غیر معذب ہونا واضح ہو گیا اس کے خلاف کا احتمال ہی نہیں گو طالب علمی کے زمانہ میں ایک شخص مجھ سے جھگڑ رہے تھے کہ یہ بھی معذب ہوں گے اور سبب یہ بتلاتے تھے جو چیزیں سبب معصیت ہوئی ہیں وہ بھی معذب ہونے چاہیں۔

جواب اس کا یہ ہے کہ سبب معصیت ہونا جو بالاختیار ہو وہ معذب ہونے کو مستلزم ہے نہ وہ جو کہ سبب بلا اختیار ہو چنانچہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ تسبب بلا اختیار معصیت نہیں ہے فقہاء اور صوفیہ ہی شریعت کو خوب سمجھنے والے ہیں ان ہی دونوں گروہ نے شریعت کے اسرار کو خوب سمجھا ہے گو بعضے فقہاء اور صوفیہ میں لڑائی بھی رہی ہے مگر جو حضرات جامع شریعت وطریقت ہوئے ہیں وہ کبھی نہیں لڑے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ محقق وہ ہے جس میں تین وصف ہوں، فقیہ ہو محدث ہو، صوفی ہو محققین میں لڑائی نہیں ہوئی ہاں غیر محققین میں ہوئی ہے۔

؎ چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند (جب حقیقت معلوم نہ ہوتی تو افسانے بنانے شروع کر دیئے)

غرض فقہاً نے یہ مسئلہ سمجھا ہے کہ مطلق سبب بننا معصیت نہیں اس لئے جو چیزیں بلا اختیار سبب معصیت ہوئی ہیں وہ معذب نہ ہوں گی۔

صورۃ تعذیب

البتہ اس میں کلام ہے کہ شمس وقمر آیا اپنی جگہ رہ کر جہنم میں ہوں گے یا ان کو اپنی جگہ سے ہٹا کر

جہنم میں ڈالا جائے گا۔ جمہور کی رائے ہے کہ دونوں کو ہٹا کر جہنم میں ڈالا جائے گا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم بھی بہت بڑی ہے اس لئے کہ یہ اجرام یعنی شمس وقمر کوئی چھوٹی سی چیز نہیں ہیں شمس زمین سے ہزاروں حصہ بڑا ہے ایسے ہی قمر کو سمجھنا چاہیے بایں ہمہ مثل گولے کے جہنم میں پھینک دیئے جاویں گے مگر شیخ اکبرؒ کا کشف ہے کہ شمس وقمر اپنی جگہ رہیں گے۔ اور جہنم میں بھی ہوں گے اور وہ اس طرح کہ جہنم کو ان کی مستقر تک بلکہ اس سے بھی آگے بسط دیا جاویگا یعنی جہنم کی آگ میں بسط ہوگا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسی ہانڈی ڈھکی ہوئی پک رہی ہو اور پھر اس کو کھول دیا جاوے تو اس کی گرمی پھیل جاتی ہے اسی طرح جب جہنم کو کھول دیا جاوے گا تو اس کی حرارت پھیل جائے گی جس سے سمندر و ہوا سب آگ بن جاویں گے حتیٰ کہ آسمان تک حرارت پہنچے گی جو آفتاب وقمر کو بھی محیط ہو جاوے گی اور آفتاب وقمر دونوں اس میں داخل ہوں گے یہ صورت ہوگی شمس وقمر کے اپنی جگہ رہنے کی اور جہنم میں بھی ہونے کی اور پھر جہنم کی آگ متجاوز ہو کر ساتویں آسمان کے مقعر تک پہنچے گی اور وہاں بہت ہی لطیف ہو جائے گی کہ اس کی لطافت میں لذت ہوگی اور جنت کے میوے اسی لطیف گرمی سے پکیں گے اور جنت ساتویں آسمان کے محدب پر ہوگی اس کشف کی قرآن وحدیث نہ تائید ہی کرتا ہے اور نہ تکذیب ہی کرتا ہے۔ کشفیات میں ہم شیخ اکبرؒ کے تابع نہیں ہیں لیکن اگر کوئی اس کا قائل بھی ہو مگر جزماً نہیں تو کچھ حرج بھی نہیں کیونکہ جیسے تائید نہیں ویسے تکذیب بھی نہیں یہ فائدہ کے طور پر بیان کر دیا۔ بہر حال یہ اشکال وارد نہیں ہوتا کہ لڑکی جہنم میں ہو اور معذب نہ ہو۔ تو اس بناء پر ممکن تھا کہ اہل جنت دوزخ میں بھیج دیئے جاتے اور معذب نہ ہوتے مگر حق تعالیٰ کی رحمت کو دیئے یہ احادیث میں آتا ہے کہ جب جنت میں اہل جنت داخل ہو چکیں گے پھر اس میں جگہ باقی رہ جائے گی تو حق سبحانہ تعالیٰ ایک مخلوق کو پیدا کریں گے کہ وہ اس میں رہا کرے گی اسی طرح جب جہنم باوجود اہل جہنم کے داخل ہونے کے هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ کہتی رہے گی پھر اس کے لئے حق تعالیٰ یہ نہ کریں گے کہ کسی مخلوق کو پیدا کر کے اس میں داخل کریں اور اس کا پیٹ بھر دیں گو وہ باوجود جہنم میں ہونے کے معذب بھی نہ ہوتے۔ بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ بلاوجہ عذاب کی صورت کو بھی گوارا نہیں فرماتے کہ کسی کو پیدا کر کے اس میں صورۃً بھی داخل فرمائیں۔ یہ عین رحمت ہے حدیث میں آتا ہے کہ دوزخ کے پکارتے رہنے پر حق تعالیٰ اپنا قدم اس پر رکھ دیں گے تو وہ کہے گی بس بس۔ اس حدیث کے معنی اول تو واللہ اعلم کہلائیں اور اگر کوئی بات بھی سمجھ میں آوے مگر وہ بات مجلس عام میں

کہنے کے قابل نہیں۔ اسلم طریق یہی ہے کہ زبان کو بند رکھا جاوے۔

باغ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم

اہل ظاہر کو تو جہان اطمینان ہو جاتا ہے تو بولتے بھی ہیں مگر صوفیہ تو بولتے بھی نہیں وہ تو ایسے اسرار کے ظاہر کرنے والوں سے ناراض ہیں۔ اسی کو مولاناؒ فرماتے ہیں۔

ظالم آں قومے کہ چشماں دوختند　　　وزسخنہا عالمے را سوختند

ترجمہ: وہ قوم بڑی ظالم ہے جنہوں نے آنکھیں موند لیں اور باتوں سے دنیا کو جلا دیا۔ البتہ کبھی رمز میں کہہ بھی جاتے ہیں جیسے۔

دربشر روپوش گشتہ آفتاب　　　دم مزن واللہ اعلم بالصواب

ترجمہ: آدمی میں سورج پوشیدہ ہیں، دم نہ مار اللہ بہتر جانتا ہے۔

چنانچہ وحدۃ الوجود کے موقعہ پر کہہ بھی دیا اور پھر اظہار سے منع بھی کر دیا بات یہ ہے کہ ایسے اسرار کے ظاہر کرنے میں امثلہ اور الفاظ کافی نہیں ہیں ان کی تو یہ حالت ہے۔

اے بروں از وہم و قال و قیل من　　　خاک برفرق من و تمثیل من

(اے وہ خرات جو میرے وہم وگمان سے باہر ہے آپ کے بارے میں میرا بیان کرنا اور مثالیں دینا فضول ہے)

پھر کبھی کسی مثال کے بیان کرنے کا عذر بھی ظاہر کرتے ہیں کہ بدون بولے صبر نہیں آتا۔

بندہ نشکیبد ز تصور خوشت　　　ہردمت گوید کہ جانم مفرست

مستی کے غلبہ میں ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں مگر پھر کہتے ہیں۔

خاک برفرق من و تمثیل من

(میرے الفاظ اور مثالوں پر خاک)

مطلب یہ ہے کہ میں امثال میں اسرار بیان کر دیتا مگر وہ کافی نہیں مگر ان حضرات کو کبھی صحو ہوتا ہے اور کبھی سکر۔ سکر کی حالت میں کہہ جاتے ہیں یہ ان کی حالت ہے جن پر حال غالب ہو جاتا ہے اور جو حال پر غالب ہیں ان کی زبان سے تو کبھی ایسی باتیں نکلتی ہی نہیں۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام کی زبان سے کبھی ایسی باتیں نکلیں ہی نہیں کیونکہ وہ حال پر غالب ہوتے ہیں۔ صحابہؓ میں بھی

جو مغلوب الحال تھے وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ (اور وہ ان میں سے کم ہیں) ان کی زبان سے ایسی باتیں تو نہیں نکلی ہیں مگر بعض حالات ظاہر ہو گئے اور جو حال پر غالب تھے جیسے ابوبکرؓ عمرؓ وغیرہ ان سے کبھی نہ ایسی باتیں صادر ہوئیں نہ ایسے حالات ظاہر ہوئے۔ بات یہ ہے کہ امت ایک باغ ہے۔ اس میں ہر قسم کے درخت ہیں۔ سرد بھی ہے جس پر مختلف ہواؤں کا اثر نہیں ہوتا اس میں چھوئی موئی کے درخت ہیں کہ ہاتھ لگانے سے کملا جاتا ہے۔ جس کو شرمندہ بھی کہتے ہیں۔ باغ میں سب چیزوں کی ضرورت ہے پھر اس باغ میں بچے بھی ہیں بڑے بھی ہیں۔ دیوانے بھی ہیں مجذوب بھی ہیں ہر طرح کے لوگ ہیں یہ باغ محمدی ہرا بھرا ہے اور ہرا بھرا رہے گا۔ صوفیہ مغلوب الحال بھی ہیں اور ان میں ایسے بھی ہیں جو حال پر غالب ہیں۔ غرض حدیث میں ہے۔ یضع قدمہ' مگر میں اس کے متعلق زیادہ نقل نہیں کرتا یہ تو دوزخ کی حالت ہوئی اسی طرح جنت بھی پکارے گی کہ اے اللہ مجھ کو بھر دیجئے فوراً حق سبحانہ تعالیٰ ایک مخلوق پیدا کر کے اس میں داخل فرمادیں گے کہ وہ اس میں رہا کریں گے۔

لطف افطاری

میں نے اپنے استاد مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے عرض کیا کہ ہم بھی انہی میں سے ہو جاتے تو کیا اچھا ہوتا فرمانے لگے کہ خدا نہ کرے وہ کیا جانیں جنت کا مزہ جنہوں نے کبھی تکلیف نہیں اٹھائی۔ مزہ ان کو ہی آوے گا جو یوں کہیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ہمیں چین ہو گا انہیں کیا چین جس نے روزہ نہ رکھا ہو تو اس کو شام کے وقت کیا مزہ استطر ادا یاد آ گیا کہ بعض ایسے لوگ بھی ہیں کہ شام کے وقت روزہ داروں میں بیٹھ کر کہتے ہیں لاؤ ہم بھی روزہ افطار کر لیں مگر جب روزہ نہیں تو جانے کس چیز کو افطار کرتے ہیں۔ یہ بھلے مانس روزہ دار تو ہوتے نہیں مگر افطاری میں سب سے پہلے آ موجود ہو جاتے ہیں مگر انہیں کیا مزہ۔ مزہ تو شام کے وقت سوختہ افروختہ لوگوں کو ہوتا ہے کہ پانی کا نام لینے سے ان میں جان آتی ہے استلذ اذ کے لئے پوچھا کرتے ہیں کہ یہ پانی کہاں ہے۔ ایک شخص کہنے لگے کہ میں تو رمضان شریف میں اسٹیشن پر رہتا کہ وہاں کے کنوئیں کا پانی عجیب ہے اسی طرح جنت کا مزہ بھی اہل مصیبت کو ہو گا۔ یہ ایک مضمون اپنے اساتذہ سے سنا ہوا بیان کر دیا۔

زمین کی روٹی

اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جماعت ہمارے مشائخ کی کتنی ممتاز ہے ان حضرات کی

زبان سے کیسی محقق بات نکلتی ہے اسی طرح ایک محققانہ مضمون اور لیجئے حدیث میں ہے کہ اہل جنت کوایک خاص غذا عطا ہوگی اور غذا اس زمین کی روٹی ہوگی اس میں اشکال یہ ہے کہ کیا ڈھیلے اور پتھر کھائیں گے کیونکہ زمین میں تو یہی چیزیں ہیں۔ دوسرے اس میں حکمت کیا ہے کہ اس زمین کی روٹی ملے کیا کوئی دوسری چیز جنت کی نہ تھی۔

ہمارے اساتذہ نے اس کوحل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے اور بات بھی نہایت لطیف ہے۔ گو درجہ ظن میں ہے اشکال کا جواب تو یہ ہے کہ حدیث میں یہ کہاں ہے کہ ڈھیلے اور پتھر کھائیں گے وہاں تو روٹی کا ذکر ہے کہ حق تعالیٰ زمین کی روٹی دیں گے اور سب اس میں سے کھائیں گے یہاں بھی تو ہم زمین کے اجزاء کھاتے ہیں۔ دیکھئے ایک من گیہوں بوتے ہیں اور بیس من پیدا ہوتے ہیں جو ایک من سے زائد ہیں وہ زمین ہی کے تو اجزاء ہیں۔ عناصر کے امتزاج سے ایک خاص ترکیب سے مٹی کی شکل گیہوں کی بن گئی۔ پس تم یہاں بھی تو زمین ہی کے اجزا کھا رہے ہو پھر جیسے یہاں چھننے کے بعد کھاتے ہو اسی طرح اللہ میاں وہاں بھی لطیف اجزاء کو چھان کر کھلائیں گے۔ زمین سے جتنے پھل وغیرہ پیدا ہوتے ہیں سب زمین ہی کے تو اجزاء ہیں اجزاء لطیف ان شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں تو ایک سوال تو اس سے حل ہوگیا۔ باقی رہا حکمت کا سوال تو میں اپنے اساتذہ ہی سے اس کو نقل کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ بہت سے اللہ کے بندے وہ ہیں جنہوں نے دنیا کی چیزوں کو چکھا تک نہیں۔ خواہ اضطراراً کہ میسر نہیں ہوئی یا اختیاراً بمصلحت مجاہدہ و معالجہ میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو پان کا مزہ نہیں جانتے تو بعضوں نے میوے نہ کھائے ہوں گے بعض نے گوشت نہ کھایا ہوگا تو اگر ان کو صرف جنت ہی کی نعمتیں دیتے تو ان کو دنیا اور جنت کی نعمتوں میں تفاوت نہ معلوم ہوتا اور بدون تفاوت کی پوری لذت اور قدر نہ ہوتی اس لئے ان کو اس شکل میں دنیا کی نعمتیں بھی عطا فرمائیں گے اور وہ نعمت دیں گے کہ جس میں ہزار ہا قسم کے مزے ہوں گے کیونکہ جتنے مزے دنیا میں ہیں زمین ہی سے نکلے ہوئے ہیں تا کہ موازنہ کر کے لذت زائد ہو پھر اصل میں تو صرف ان زاہدوں کو حکمت مذکورہ کے سبب کھلانا منظور ہوگا مگر کرم کی عادت پر زاہدوں کے ساتھ ہم شکم پروروں کو بھی کھلا دیں گے۔ پس جیسا اس موازنہ سے نعم جنت کا مزہ بڑھے گا اسی طرح ایسے ہی موازنہ سے جنت کا مزہ ایسے ہی لوگوں کو ہوگا جو دنیا میں مشقتیں اور مصائب اٹھا کر راحت کے موقعہ پر پہنچیں گے بخلاف ان کے جنہوں نے دنیا دیکھی ہی نہیں پیدا ہوتے ہی جنت

میں داخل کر دیئے گئے۔ بہرحال اتنا معلوم ہوا کہ جنت اور دوزخ دونوں کے پر کرنے کے طریق میں رحمت کا ظہور ہوگا اسی ظہور کی فرع یہ بھی ہے کہ جنت کے آٹھ دروازے مقرر فرمائے۔

جنت کا نقشہ

جنت کے متعلق ایک اور لطیف مضمون یاد آیا اس کو بھی بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض حضرات کو جنت کا جو نقشہ مکشوف ہوا ہے اس سے یہ معلوم ہوا ہے کہ جنت کے طبقات الگ الگ نہ ہوں گے کہ ایک پورب میں تو دوسرا دکھن میں ہو۔ وعلیٰ ہذا بلکہ اوپر نیچے ہوں گے کہ نیچے مثلاً ادنیٰ درجہ ہے اس سے اوپر اعلیٰ پھر اس سے اوپر اور اعلیٰ ہذا چنانچہ فردوس سب سے بلند ہوگا۔

اس پر ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ اس صورت میں سب سے اوپر کے درجہ کا چھوٹا ہونا لازم آتا ہے حالانکہ وہ سب سے بڑا ہوگا۔ جواب یہ ہے کہ اگر کوئی مکان نیچے سے چھوٹا ہو اور اوپر جا کر پھیلاؤ ہو جائے یہاں تک کہ تمام جنات سے باہر نکل جاوے تو اس میں کیا استبعاد ہے جیسے درخت کہ اس کا تنا عرض میں کتنا مختصر ہوتا ہے اور اوپر جا کر کتنا پھیلاؤ ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہاں بھی ممکن ہے۔ ایک سوال حدیث کے متعلق اور ہے وہ یہ کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں اور جس شخص کا عمل جس دروازہ کے مناسب ہوگا اسی دروازہ سے پکارا جائے گا مثلاً کسی نے نماز زیادہ پڑھی ہوگی تو وہ باب الصلوٰۃ سے بلایا جاوے گا اور جس نے روزے زیادہ رکھے ہوں گے تو وہ باب الریان سے بلایا جاوے گا۔ اب فرض کیجئے کہ کوئی شخص ایسا ہو کہ جس نے ہر قسم کے عمل بکثرت کئے ہوں تو وہ مستحق اس کا ہوگا کہ وہ شخص ہر دروازے سے بلایا جاوے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت صدیق اکبرؓ نے عرض کیا کہ کوئی شخص ایسا بھی ہوگا کہ سب دروازوں سے بلایا جاوے گا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ **ارجوا ان تکون منهم** کہ مجھ کو امید ہے کہ ان لوگوں میں تم ہو گے۔ اس صورت میں لازم آتا ہے کہ ایک شخص مختلف دروازوں کی طرف کھنچا کھنچا پھرے نیز مختلف دروازوں سے داخل ہونے کی صورت کیا ہے کیونکہ ایک شخص ایک ہی دروازہ سے داخل ہوسکتا ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ جو تقریر پہلے کی گئی کہ جنت کے طبقات الگ الگ نہ ہوں گے اس پر یہ اعتراض پڑتا ہی نہیں مثلاً فرض کیجئے کہ باب الصلوٰۃ پہلا دروازہ ہے اور کسی نے نمازیں زیادہ پڑھی ہیں وہ اس دروازہ سے بلایا گیا۔ اور داخل ہو کر جنت میں پہنچ گیا اور وہیں ہی رہ گیا ایک وہ شخص ہے جس نے نماز روزے دونوں عمل بکثرت کئے تو وہ باب الصلوٰۃ سے گزر کر دوسرے دروازہ باب الریان میں گیا اور جنت

میں داخل ہو کر وہیں رہ پڑا اب ایک شخص وہ ہے کہ اس نے ہر قسم کے اعمال بکثرت کئے ہیں تو وہ باب الصلوٰۃ میں اول داخل ہوا اور پھر باب الریان میں پہنچا پھر تمام دروازوں کو طے کرتا ہوا اعلیٰ جنت میں پہنچ گیا ہاں اگر جنت کے طبقات الگ الگ ہوتے تو اعتراض بظاہر لازم آتا گو اس میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلایا جاوے سب دروازوں سے مگر داخل ہوا ایک ہی سے اس طور سے بلانے میں اس کا اکرام زیادہ ہے لیکن نقشہ مذکورہ کے بعد تو کوئی اعتراض ہی نہیں۔

مزہ دار فضیلت

باقی جو امور کشف کے متعلق بیان ہوئے ہیں یہ تخمینیات اور مظنونات درجہ میں ہیں کوئی دلیل شرعی ان پر نہیں اور نہ ان کی تکذیب پر کوئی نص ہے اگر چاہو اپنے دل کو سمجھا لو۔ غرض جنت کے آٹھ دروازوں میں سے ایک کا نام باب الریان ہے اس حدیث میں روزہ کی فضیلت بیان فرماتے ہیں کہ روزہ دار ہی اس دروازہ سے داخل ہوں گے اور اطلاق لفظ سے روزہ سے مراد عام ہے نفل ہو یا فرض پھر جب نفل کی بھی اتنی فضیلت ہے تو فرض کی تو کیا کچھ فضیلت ہوگی اور روزہ کے فضائل تو بہت ہیں مگر یہ ایک فضیلت نہایت مزہ دار ہے کیونکہ پیاسے کو پانی کا نام سننے سے مزہ آتا ہے اسی واسطے نام بھی وہ لیا گیا کہ جس کے سننے سے فرحت ہو وہ کیا باب الریان یعنی تر و تازہ دروازہ جو پانی سے سیراب ہوا اور روزہ دار کو جیسی پانی سے فرحت ہوتی ہے اور کسی چیز سے کم ہوتی ہے اور پانی جیسا محبوب ہے دوسری چیز نہیں اور قاعدہ ہے کہ محبوب کا نام لینے سے بھی مزہ آتا ہے اگر مزہ نہ آتا تو ایک عاشق یہ شعر نہ کہتا اگرچہ وہ شراب ہی کو کہہ رہا ہے

الا فاسقنی خمراً و قل لی ہی الخمر ولا تسقنی سراً متیٰ امکن الجہر

ترجمہ: تو مجھے شراب پلا اور یہ کہہ کر پلا کہ یہ شراب ہے۔ جب تک علی الاعلان پلائی جا سکے چھپے ہوئے مت پلا۔

کہ شراب پلاتا جا اور اس کے ساتھ یوں کہتا جا کہ شراب ہے شراب ہے۔ یہ محبوب کے نام سے لطف حاصل کر رہا ہے اور یہ چاہ رہا ہے کہ پلانے والا زبان سے اس کا نام بھی لیتا جاوے اس میں بھی مزہ ہے کوئی عاشق مزاج کبھی نہ کہے گا کہ محبوب کا نام لینا بے مزہ ہے۔ غرض روزہ میں سب سے زیادہ محبوب ہے پانی اسی واسطے میں نے ایسی حدیث چھانٹی جس میں پانی کا ذکر ہے اور پانی بھی اللہ

میاں کے یہاں کا جس کی یہ صفت ہے لَا لَغْوٌ فِیْهَا وَلَا تَاْثِیْمٌ ایک ہمارے دوست ہیں اور ضابطہ سے ملازم وہ پانی پر بڑے دلدادہ ہیں ایک روز انہوں نے پانی بہت پی رکھا تھا کسی نے کہا کہ کہیں تمہارا پیٹ نہ پھٹ جائے کہنے لگے کہ اگر محبوب کے وصل میں جان بھی جاتی رہے تو کیا حرج ہے۔

مجھے اس کے متعلق ایک لطیفہ یاد آیا وہ یہ کہ ان کے گاؤں میں قحط تھا ان بیچاروں کو روٹی پیٹ بھر نہیں ملتی تھی ایک روز انہوں نے دیکھا کہ ایک دوسرے گاؤں میں سے لوگ بھاگے جا رہے ہیں اس کا سبب دریافت کیا معلوم ہوا کہ وہاں مرض ہیضہ کا پھیل رہا ہے اس لئے بھاگ رہے ہیں گاؤں والوں نے پوچھا کہ یہ مرض کیسے ہوتا ہے کسی نے کہا کہ بہت سی روٹی کھا جانے سے ہوتا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ مبارک مرض کبھی ہمیں نہ ہوا۔ محبوب کے وصل میں مرنا قبول چاہے جان جاتی رہے مگر محبوب مل جاوے پھر یہ حالت یہاں ہی کی غذاؤں کی ہے کہ زیادہ کھاؤ تو مرنے کی نوبت آ جائے اور حق تعالیٰ کے یہاں تو کتنا ہی کھالیں گے کچھ بھی نہ ہوگا اور پتہ بھی نہ چلے گا البتہ پسینہ نکلے گا جس میں مشک کی خوشبو نکلے گی۔

جنت کی غذائیں

یہ خبر علاوہ ہماری تفریح کے بددینوں کا منہ بند کرنے کو بھی دے دی ہے کیونکہ بعض اہل سائنس اعتراض کرتے ہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ غذا کھائیں اور پتہ بھی نہ چلے نہ اجابت کے ذریعہ سے دفع ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا منہ بند کرنے کے لئے فرما دیا کہ جو فضلہ ہوگا بھی وہ پسینہ کے راستہ سے دفع ہوگا جس میں خوشبو مشک کی سی ہوگی اور غور کیا جاوے تو یہ اعتراض ہی فضول ہے جنت کی غذاؤں میں اتنا فضلہ ہی نہیں جو اجابت کی حاجت ہو دنیا کے اندر اس کی نظائر بہت ملیں گی بعض غذائیں تو ایسی ہیں کہ ان کو کھا کر فضلہ بہت ہی خارج ہوتا ہے اور بہت سی ایسی غذائیں ہیں کہ ان کا فضلہ بہت ہی کم نکلتا ہے جنت میں اللہ میاں نے اپنی قدرت کی مشین سے غذاؤں کو فضلات سے ایسا صاف کیا ہے کہ ان میں رہا ہی نہیں اور کچھ غبار ہو بھی وہ اسی قدر ہے کہ صرف پسینہ آنے سے نکل سکتا ہے اور کسی چیز کی ضرورت نہ ہو مگر افسوس ہے کہ معترضین روزمرہ ایسی نظائر اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں مگر تامل وفہم سے کام نہیں لیتے یہ کلام استطراداً آ گیا تھا۔

سیرابی کی نعمت

اب مضمون سابق کی طرف عود کرتا ہوں جو باب الریان کے متعلق ہے یعنی دنیا میں ایسا پانی

کہاں باب الریان کے معنی ہیں دروازہ پانی سے سیراب ہونے والا دروازہ کا نام لینے ہی سے روئیں روئیں میں جان آ گئی یہ دروازہ کا نام ہے جو صائمین کیلئے بہت ہی مناسب ہے چنانچہ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعا افطار کی تعلیم فرمائی ہے اس میں بھی ایسی ہی مناسبت ہے یعنی اس میں بھی پانی کا ذکر ہے۔ حکیم ایسے ہی ہوتے ہیں دعا یہ ہے ذهب الظماء وابتلت العروق و ثبت الاجر ان شاء الله (كنز العمال: ١٨٠٥٥، مشكوة المصابيح:١٩٩٤، كنز العمال ١٨٠٥٦) اور ایک یہ دعا بھی ہے اللّٰهم لك صمت وبك آمنت و عليك توكلت و علىٰ رزقك افطرت. (سنن ابی داؤد: ٢٣٩٨، مشكوة المصابيح:١٩٩٣، شرح السنة ٦:٢٦٥)(اے اللہ میں نے آپ کے لئے روزہ رکھا آپ پر ایمان لایا اور آپ کے رزق پر افطار کیا) ذهب الظماء الخ کے معنی یہ ہیں کہ پیاس جاتی رہی اور رگیں تر ہو گئیں اور خدا نے چاہا تو ثواب ثابت ہو گیا۔ رہا یہ شبہ کہ سناتے کس کو ہیں بات یہ ہے کہ کسی کو نہیں سناتے بلکہ اللہ میاں کی نعمت کو یاد کرتے ہیں زبان سے کہہ کر مزہ لے رہے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدہ بھی کرایا تو ایسا جس میں لطف ہے دن بھر تو انتظار کا لطف اٹھایا اور شام کو روزہ افطار کرنے بیٹھے تو سیرابی کی نعمت بھی حاصل ہو گئی۔ زبان سے اس کا تذکرہ بھی ہوا واللہ عجیب لطف ہے۔

ادب افطار

نہ معلوم رمضان میں لوگ کیونکر بے روزہ رہتے ہیں میرے چار روزے بیماری کی وجہ سے قضا ہوئے تھے دن میں کھاتے پیتے یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے میں نے چوری کی ہے حالانکہ میں نے کوئی کام برا نہیں کیا کیونکہ طبیب صاحب نے افطار کی اجازت دیدی تھی چار روزوں کے بعد پھر افطار کو جی نہ چاہا اگر چہ ان ناغہ کے ایام میں کھانا پینا بوجہ خوف ضعف کے تھا کہ نہ کھانے سے کہیں ضعف نہ بڑھ جائے مگر صاحب واللہ اس کھانے پینے میں ہرگز وہ لطف نہ تھا جو افطار کر کے کھانے پینے میں آتا ہے پانچویں روز دوا میں کچھ بے انتظامی ہو گئی میں نے کہا کہ جاؤ اب میں پیتا ہی نہیں اور روزہ رکھ لیا میں تعجب کرتا ہوں ان لوگوں سے جو بلا عذر روزہ نہیں رکھتے کیسے ان کا دل گوارا کرتا ہے۔ بعض اسلامی ریاستوں میں سنا ہے کہ روزہ نہ رکھنے پر جرمانہ وغیرہ ہوا ہے۔ یہاں تو یہ حالت ہے کہ بعضے کھلم کھلا کھاتے پھرتے ہیں اور جو ان کو ٹوکے ان سے صاف کہہ دیتے ہیں کہ جب اللہ کی چوری نہیں تو بندوں کی کیا چوری میں کہتا ہوں کہ ایسے لوگ بازار میں اپنی بی بی سے ہم بستر کیوں نہیں ہوتے کیونکہ جب اللہ میاں کی چوری نہیں تو بندوں کی کیا چوری اگر بازار

والے دیکھ لیں گے تو کیا حرج ہے۔ بلا عذر لوگوں کے سامنے کھاتے پیتے ہوئے پھرنا اس کا تو کیا ذکر ہے ادب یہ ہے کہ صاحب عذر بھی سب کے سامنے افطار نہ کرے۔ غرض روزہ داروں کو کئی طرح کے لطف حاصل ہوتے ہیں روحانی لطف تو ہے ہی ہم جیسے پیٹ کے کتوں کو بھی لطف ہے دیکھو انتظار میں اس وقت کیسا لطف ہے کسی غیر محقق کا قول ہے۔

جو مزہ انتظار میں دیکھا پھر نہ وہ وصل یار میں دیکھا

غیر محقق اس لئے کہا کہ یہ کلام علی الاطلاق صحیح نہیں ہے کیونکہ دنیا کے محبوبین کا لطف تو بیشک وصل ہونے پر ختم ہو جاتا ہے لیکن محبوب حقیقی کے قرب کا لطف غیر متناہی ہے کبھی ختم نہیں ہوتا وہاں تو یہ کیفیت ہے۔

دلا رام دربر دلا رام جو لب از تشنگی خشک و برطرف جو
نگویم کہ بر آب قادر نیند کہ برساحل نیل مستسقیند

ترجمہ: محبوب بغل میں ہے اور وہ محبوب کو ڈھونڈ رہے ہیں لب پیاس سے خشک ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ پانی پر قادر نہیں کہ ساحل نیل پر پیاسے بیٹھے ہیں اور نہر کے کنارے پر بیٹھے ہیں۔

ایک اور شعر ہے۔

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار گل چیں بہار تو زداماں گلہ دار

ترجمہ:۔ نگاہ کا دامن تنگ ہے اور تیرے حسن کے پھول زیادہ ہیں تیری بہار کا گلچیں دامن تنگ سے گلہ رکھتا ہے۔

جن کی یہ شان ہے ان کی طلب بھی غیر متناہی ہے ایک شاعر طلب کے غیر متناہی ہونے کو بیان کرتا ہے۔

قلم بہ شکن سیاہی ریز د کاغذ سوز دم درکش حسن ایں قصہ عشق ست در دفتر نمی گنجد

ترجمہ: قلم توڑ دو سیاہی گرا دو کاغذ جلا دو اور چپ رہو حسن و عشق کا قصہ ہر کاپی میں نہیں سماتا۔ عشق کا بھی کہیں پتہ نہیں حسن و جمال کا بھی کہیں پتہ نہیں مگر باایں ہمہ جنت میں سیری ہوگی اور لذت میں بھی ترقی ہوگی۔

تجلیات ربانی

اور یہ جو بعض اہل حال کا مقولہ ہے کہ جنت میں ایک درجہ ہے بعض عشاق اس میں ہونگے کہ وہ ہر وقت ارنی ارنی پکاریں گے اور یہ ان کا پکارنا ختم نہ ہوگا اور اس درجہ میں حور و قصور وغیرہ نہ ہوں گے تو یہ کشف مؤول ہے۔ تاویل یہ ہے کہ شاید کسی ساعت قلیلہ کے لئے ایسا ہو مگر پھر سیری

ہو جاوے گی۔ اور اس حد کے بعد اور چیزیں بھی ہوں گی جیسے میدان حشر میں بعض تجلیات کی نسبت لوگ کہیں گے کہ آپ ہمارے رب نہیں ہیں ہم اپنے رب کو پہچانتے ہیں پھر دوسری صورت سے تجلی ہوگی اور ہونگی دونوں تجلیاں حق تعالی کی مگر پہلی تجلی سے قناعت نہ ہوگی اس کے بعد جو تجلی ہوگی اس سے قناعت ہو جاوے گی چونکہ یہ کسی درویش کا قول ہے اس لئے میں نے تاویل کی ہے اگر اس تاویل کو کوئی نہ مانے بلکہ ظاہر ہی پر محمول رکھے تو جائیے ہم دوسرا جواب دیں گے کہ ہم قرآن وحدیث کے خلاف اس کشف کو نہیں مانتے کیونکہ جنت میں ایسا کوئی درجہ ہی نہیں کہ جہاں حور وقصور نہ ہوں جنت میں سب کچھ ہوگا اور سیری بھی ہوگی سیری نہ ہونا غلط ہے وہاں تو وہ کیفیت ہوگی جس کو یاد کر کے اب یہ کہنا زیبا ہے کہ۔

اگرچہ دور افتادم بایں امید خورسندم ۔۔۔ کہ شاید دست من بار دگر جانا من گیرد

ترجمہ: اگرچہ دور ہوں مگر اس امید سے خوش ہوں کہ شاید میرا ہاتھ دامن محبوب کو چھولے۔

یوں نہ کہا کہ دست جاناں خود گیرم کیونکہ جان من گیرد میں اور ہی لطف ہے آپ کو بشارت ہے کہ جنت میں آپ کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہوگا۔ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیۡءٍ مُّحِیۡطٌ کی لذت عشاق کو اب بھی ہے وہاں اور بھی اتم ہوگی مزہ ہے چین ہے وہ آغوش میں لئے ہوئے ہیں۔ پوری سیری اسی سے ہوتی ہے لہذا جنت میں پوری سیری ہوگی وہاں تجلی تام ہے اور محیط ہے پھر احاطہ بھی بلا حجاب محبّ اور محبوب میں اگر کپڑا حائل ہو تو سیری نہیں ہوتی اللہ میاں کپڑوں سے پاک ہیں البتہ حجابات درمیان میں ہیں جنت میں سارے حجابات مرتفع ہو جاویں گے سوائے رداء کبریا کے کوئی حجاب نہ ہوگا جس کی حقیقت ادراک کنہ کا امتناع ہے نیز جنت میں سیری اس لئے بھی ہوگی کہ جنت تعب و بے کلی سے خالی ہے وہاں انتظار واشتیاق بعد کا نہ ہوگا پس یہ کسی غیر محقق کا قول ہے کہ جو مزہ انتظار میں دیکھا پھر نہ وہ وصل یار میں دیکھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وصل یار میں اور زیادہ لطف ہے۔ پس روزہ کا لطف کیا پوچھتے ہو پانی کے انتظار میں ایک لطف پھر پیتے وقت اس سے زیادہ لطف پھر رگیں بھی تر ہو گئیں یہ تیسرا لطف پھر آخرت کے لطف کی خبر دی کہ باب یسمی ریان یعنی وہ دروازہ تر بتر ہوگا جو اس میں داخل ہوگا وہ تر بتر و سیراب ہو جائے گا۔

اگر کسی کو خیال ہو کہ ہم باب الریان کو کیا سمجھیں گے عربی تو جانتے ہی نہیں پھر یہ نام سن کر وہاں کیا مزہ آوے گا تو خوب سمجھئے کہ اہل جنت کی زبان عربی ہوگی وہاں سارے عربی دان ہو جاویں

گے۔ باب الریان کو بھی سمجھو گے اور اس کا نام بھی ریان ہوگا دیکھنے میں بھی ریان ہوگا یعنی تر بتر۔

حیات جنت و دوزخ

بعض نے کہا ہے کہ ریان کی اسناد باب کی طرف حقیقی ہے یعنی وہ دروازہ خود بھی تروتازہ ہوگا کہ اس میں نہریں ہوں گی فوارے ہوں گے وہ بھیگا ہوا ہوگا مگر یہ نہیں کہ اس میں کیچڑ ہوگی بعض نے کہا ہے کہ اسناد مجازی ہے یعنی دروازہ کو ریان کہنا باعتبار ان لوگوں کے ہے جو اس میں وارد ہوں گے یعنی وہ تروتازہ ہو کر جاویں گے۔ اس کے بعد ایک گفتگو اس میں ہے کہ جنت کی چیزیں جس حالت پر ہوں گی آیا وہ چیزیں خود بھی اس حالت کا ادراک کریں گی یا نہیں بعض نے کہا ہے کہ ان کو بھی ادراک ہوگا۔ مثلاً دروازہ تر بتر ہوگا تو وہ اپنے تر بتر ہونے کا ادراک بھی کرے گا اسی طرح اور چیزوں کا حال ہے اور اِنَّ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ بظاہر یہی مفہوم ہوتا ہے کہ آخرت سراپا حیواۃ ہے کیونکہ زیادہ مستعمل حیوان بمعنی مصدر ہے یہ ایسا ہے کہ جیسے زید عدل اور اگر صفت بھی ہو تو بمعنی ذی حیات ہوگی پس وہاں کی در و دیوار میں بھی زندگی ہوگی دیواریں گائیں گی نغمات پیدا ہوں گے درخت گائیں گے اور بظاہر اس لئے کہا کہ کلام میں یہ بھی احتمال ہے کہ الدار کا مضاف مقدر ہو یعنی حیوۃ الدار الاخرۃ ھی الحیوۃ باقی جنت کا بولنا خود حدیث میں آیا ہی ہے اور وہ بظاہر حقیقت پر محمول ہے۔ یہی صوفیہ کا مسلک ہے بعض اہل ظاہر خشک ہیں وہ کہتے ہیں کہ جنت مثل بولنے والے کی ہوگی جیسے بے جان تصویر کو کہہ دیتے ہیں کہ ایسی جیسے اب بول پڑے گی یہ حیات کے قائل نہیں مگر یہ محض تاویل ہے۔ صوفیہ کا قول ظواہر نصوص سے متاید ہے ان کے نزدیک دوزخ بھی ذی حیات ہو گی دلیل یہ ہے کہ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ پکارے گی نیز اس میں اور بھی آثار حیات کے پائے جاتے ہیں نیز بعض اہل کشف نے جہنم کی شکل کے بارہ میں کہا ہے کہ اس کی شکل اژدھے کی سی ہے اس کے پیٹ میں سانپ بچھو کنکھجورے وغیرہ ہیں سارا جہنم اژدھے کی صورت ہے اس سے ایک حدیث کے معنی بلا تاویل کے سمجھ میں آجاویں گے کہ حدیث میں آتا ہے کہ جہنم میدان قیامت میں لائی جاوے گی جس کو ستر ہزار باگیں ہوں گی اور ہر باگ کو ستر ہزار فرشتے پکڑے ہوں گے مگر پھر بھی قابو سے نکلی جاتی ہوگی اور کڑکتی ہوگی اور هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ پکارتی ہوگی اس کے معنی صوفیہ کے قول پر اس طرح سمجھ میں آتے ہیں کہ چونکہ وہ ذی حیات ہے اس لئے اس قسم کے آثار اس سے پائے جاویں گے بات یہ ہے کہ قرآن و حدیث کو جس سہولت سے اہل باطن سمجھتے ہیں اور لوگ نہیں سمجھتے اور

جاندار ہونے کی صورت میں اس کا اثر فرحت میں زیادہ ہوتا ہے اس لئے اہل باطن کے مسلک پر سیرابی کی فرحت صائمین کو بہت زیادہ حاصل ہوگی کیونکہ جب سنیں گے کہ باب الریان ذی حیات ہوگا تو یہ سمجھیں گے کہ دروازہ میں داخل ہونے والے تو خوش ہی ہوں گے مگر وہ دروازہ بھی بوجہ ذی حیات ہونے کے خوش ہوگا اور پھاٹک کے جاندار ہونے پر خلاف عادت ہونے کے خیال سے تعجب نہ کیا جاوے کیونکہ خلاف عادت بھی نہیں جیسے دنیا میں بچے کے لئے اماں جان پھاٹک بن جاتی ہیں کہ لڑکا اس کے طریق خاص سے نکلتا ہے ایسی ہی وہ دروازہ ہوگا اور یہ تعجب ایسا ہی ہے جیسے ایک ملحد نے اعتراض کیا تھا کہ جنت میں دودھ کی نہروں کے واسطے اتنی گائیں کہاں سے آئیں گی جواب یہ ہے کہ دنیا میں دودھ تھن میں سے نکلتا ہے اور خدا ہی پیدا کرتا ہے اگر وہاں وہ نہر ہی خاصیت میں ایک بڑا تھن ہو اور اس میں دودھ پیدا کر دیا جاوے تو کیا تعجب کی بات ہے اسی طرح جیسے یہاں جاندار پھاٹک پیدا کئے ہیں وہاں بھی پیدا کر دیں تو کیا محل تعجب ہے۔

سیرابی وسیری

قرآن سے بھی روزہ دار کے لئے دو نعمتیں ثابت ہوتی ہیں سیراب کی بھی اشربوا سے اور سیری کی بھی کلوا سے چنانچہ ارشاد ہے۔ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ (کھاؤ اور پیو اس صلہ میں جو تم نے ایام ماضیہ میں نیکیاں کی ہیں) پس روزہ دار ریان بھی بنائے جائیں گے اور شبعان بھی اور حدیث میں گو شبعان صراحۃً مذکور نہیں مگر ریان خود شبعان پر دلالت کرتا ہے کیونکہ پانی پینے کا لطف پیٹ بھرنے ہی پر آتا ہے دوسرے کریموں کی عادت ہے کہ کھانا کھلا کر پانی پلایا کرتے ہیں خالی پیٹ پر نہیں پلاتے۔ ہاں بعض بخیلوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ پانی سے مہمان کا پیٹ بھرنا چاہا کرتے ہیں تاکہ کھانا کم کھاوے کریموں کی عادت یہ ہے کہ کھانے کے بعد پانی دیتے ہیں قبل نہیں دیتے تاکہ کھانا خوب کھایا جاوے لہٰذا ریان عادۃً شبعان کو مستلزم ہے باقی ریان کے عنوان میں صرف پانی کی بشارت اس لئے دی کہ صائم کو زیادہ مرغوب یہی ہے۔ اسی کی بشارت میں ارشاد ہوا ہے کہ **لایدخله الاالصائمون (السنن الکبری للبیهقی ۴:۳۰۵، فتح الباری ۴:۱۱۲، اتحاف السادة المتقین ۱۰:۵۹۵)** یعنی اس میں روزہ دار ہی جائیں گے اور میں نے جو اوپر جنت کے نقشہ کے ذکر میں ایک مثال درخت کی بیان کی ہے کہ جڑ عرض میں کم ہوتی ہے اور شاخیں زیادہ ہوتی ہیں اس پر جنت کے درختوں کے متعلق ایک مضمون

یاد آ گیا اس کو بھی عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ جنت کے درخت کی جڑ اوپر اور شاخیں نیچی ہوں گی مگر اس کا ظاہری مطلب مراد نہیں کہ جڑ تو آسمان کی طرف ہو اور شاخیں زمین کی طرف جیسے کوئی چھوٹے سے درخت کو الٹا جما دے کہ اس کی جڑ اوپر کو شاخیں نیچے کو ہو جاویں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جڑ تو اونچی سطح پر ہوگی اور اسی سطح کے گرداگرد اس سے نشیب میں خلا ہوگا اس میں شاخیں جڑ کی سطح سے بھی نیچے لٹکی ہوں گی جیسے کوئی پھلواری گملہ میں رکھ کر وہ گملہ کسی اونچی ستون پر رکھ دیا جاوے اور اس کی شاخیں گملہ سے بھی نیچے پہنچ جاویں اور حکمت اس میں یہ ہوگی کہ اہل جنت لیٹ کر بیٹھ کر سب طرح پھل توڑ سکیں۔ مثلاً جڑ زمین سے دس فٹ اونچی ہو اور شاخیں زمین سے دو فٹ بلند ہوں۔ جیسا دنیا میں اونچے چبوترہ پر درخت ہوتے ہیں جن کی شاخیں زمین کے متصل ہوتی ہیں یہاں تک منجملہ تین تقریروں کے ایک تقریر ہے جو بیان ہوئی اس تقریر کا نام الریان من رمضان مناسب ہے یعنی ریان کے حصول کی بشارت رمضان کی وجہ سے۔

فضیلت رمضان

اور جو مضمون اس سے پہلے جمعہ میں بیان کرتا اگر طبیعت اچھی ہوتی وہ اس آیت کے متعلق ہوتا جو آئندہ ذکر کرتا ہوں یعنی شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (ماہ رمضان ہے جس میں قران بھیجا گیا ہے جس کا وصف یہ ہے کہ لوگوں کیلئے ہدایت ہے اور واضح الدلالت ہے اور فیصلہ کرنے والی ہے) میں تنوین تعظیم کی ہے یعنی بڑی ہدایت ہے لوگوں کے لئے اور دلائل واضحہ میں یہ عطف تفسیری ہے۔ من الہدی میں من تبعیضیہ اور الف لام جنس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن بڑی ہدایت ہے لوگوں کے لئے اور دلائل واضحہ ہیں ان شرائع سماویہ میں سے جن کی شان ہدایت ہے یعنی شرائع سماویہ تو متعدد ہیں ان سے ایک قرآن بھی ہے اب من کا تبعیضیہ ہونا واضح ہو گیا اور یہ تخصیص بعد تعمیم ہے یوں تو تمام کتب سماویہ اور تمام شرائع کی شان ہدایت ہے مگر اس تخصیص سے قرآن کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے اور فرقان لوازم ہدی سے ہے کیونکہ وضوح حقیقت کے بعد امتیاز بین الحق والباطل لازم ہے۔

یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ موقع تو ہے رمضان کی فضیلت بیان کرنے کا چنانچہ اوپر سے صوم ہی کا ذکر چلا آ رہا ہے اور بیان کی گئی قرآن کی فضیلت اس کی کیا وجہ ہے جواب یہ ہے کہ فضیلت بیان کرنے کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں ایک تو یہ کہ خود اس چیز کی فضیلت بیان کریں اور

ایک یہ فضیلت تو بیان کریں دوسری شئے کی اور اس کی فضیلت اس سے لازم آ جاوے اور یہ احسن طریق ہے کیونکہ اس میں دعویٰ کے ساتھ دلیل بھی ہے اسی کو کہتے ہیں۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

(ایسے اسراروں کا دوسروں کی حکایات وتمثیلات میں بیان کرنا مناسب ہے)

مثلاً ہم کو حضرت حاجی صاحبؒ کی فضیلت بیان کرنا ہوتو اس کا ایک طریق تو یہ ہے کہ خود ان کی فضیلت بیان کریں اور دوسرا طریق یہ ہے کہ یوں کہیں کہ حضرت حاجی صاحب کے خلیفہ حضرت مولانا گنگوہیؒ جیسے شخص ہیں اور یہ احسن طریق ہے پس اسی طریق سے رمضان کی فضیلت اس طرح لازم آ گئی کہ ماہ رمضان وہ ہے جس میں ایسا اور ایسا کلام نازل ہوا ہے۔ جس ماہ کو اتنی بڑی چیز سے ملابست ہوگی تو وہ ماہ کتنی فضیلت رکھتا ہوگا ظاہر ہے کہ بڑی فضیلت والا ماہ ہوگا۔

اہتمام تلاوۃ

اب ماہ رمضان میں نزول قرآن سے برکت ہونے کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ برکت اس کو قرآن کے نازل ہونے سے حاصل ہوئی ایک یہ کہ برکت اس ماہ میں پہلے سے تھی اور قرآن کے ہونے سے یہ ماہ نور علیٰ نور ہو گیا ہو۔ اسی کے مناسب نعت کا یہ شعر ہے۔

نبی خود نور اور قرآن ملا نور نہ ہو پھر مل کے کیوں نور علیٰ نور

اسی طرح یہاں ہوگا کہ رمضان خود نور پھر قرآن دوسرا نور بس اس سے مل کر یہ نور علیٰ نور ہو گیا اور اس کی فضیلت کے بیان میں قرآن شریف کا نازل ہونا ہی کافی ہے اور کسی فضیلت کے بیان کی حاجت نہیں اور چونکہ رمضان اور قرآن میں مناسبت ہے اس لئے اعلیٰ درجہ کی عبادت اس ماہ میں تلاوت قرآن تجویز کی جاتی ہے اور تلاوت قرآن کی طرف اس ماہ میں میلان بھی زیادہ ہوتا ہے اسی لئے میں اپنے احباب کو مشورہ دیا کرتا ہوں کہ قرآن کی تلاوت کو اس ماہ میں دوسری عبادات پر غالب رکھیں اور اسی لئے میں نئے طالبین کو اس ماہ میں کچھ بتلاتا نہیں جی یوں چاہتا ہے کہ اس ماہ میں تلاوت کو غالب رکھیں اور اس تجویز کی اس سے تقویت ہوتی ہے چنانچہ جبرئیل علیہ السلام حضورؐ کے ساتھ رمضان میں قرآن کا دور کرتے تھے اور وفات کے سال دو دفعہ دور ہوا ہے صحابہؓ کا اور امت کا یہی عمل رہا ہے کہ رمضان میں ختمات قرآن کا خاص اہتمام کیا ہے علماء کا بھی یہی قول ہے کہ اس ماہ میں تراویح میں ایک دفعہ کلام اللہ کے ختم کو سنت موکدہ کہا ہے لیکن سنت اس

وقت ہے کہ اس میں کوئی مفسدہ نہ ہو اور اگر مفسدہ ہو تو اس کو ترک کر دیں گے۔ مثلاً ٹھیکہ دار حافظ کے سوا اور کوئی نہیں ملتا ہو چونکہ بعض جگہ اس سنت پر عمل کرنے سے یہ خرابی پیدا ہوتی ہے اس لئے وہاں اس سنت کو ترک کر دیں گے۔

آج کل حافظ دو قسم کے ہیں ایک تو بشرط شئی کے مرتبہ میں یعنی کلام اللہ سنانے پر شرط کر لیں۔ یہ صورت تو جائز نہیں کیونکہ سنانے پر اجرت لینا حرام ہے۔ اس موقع پر سنت پر عمل چھوڑ دیں گے اور دوسری شرط لاشے کے مرتبہ میں یوں کہیں کہ ہم جب پڑھیں گے کہ تم ہمیں کچھ نہ دو۔ اور گو ایک احتمال لابشرط شئے کا بھی ہے لیکن تتبع عرف سے اس کا مرجع بھی ان ہی دو قسم سے ایک قسم ہے اس لئے تقسیم واقعی ثنائی ہی رہی گو عقلی ثلاثی ہے بہرحال اگر حافظ بشرط لاشئے مل جاوے تو کلام اللہ سننے میں کاہلی نہ کرے بلکہ سننے کے لئے مستعد ہونا چاہیے خیال کرنے کی بات ہے کہ لوگ دنیا کے واسطے کتنی محنت کرتے ہیں اس کے مقابلہ میں یہاں تو کچھ بھی نہیں

مگر بے رغبتی کی یہ حالت ہے کہ بعض کو تراویح ہی میں نیند آتی ہے سو اس کا علاج کرنا چاہیے آسان علاج ایک تو یہ ہے کہ سیاہ مرچ کھالو اس سے نیند جاتی رہے گی اور سیاہ مرچ نافع بھی ہے البتہ لال مرچ مضر ہے اس کے مضر ہونے پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک بزرگ دماغ سے معذور تھے جب ان کے سامنے مسلمانوں کی کسی قسم کی خرابیوں کا ذکر ہوتا تو یوں فرماتے کہ یہ سب فساد مرچوں کا ہے جو بات بھی ہوتی یہی فرما دیتے ایک شخص کہنے لگے کہ کیا بے جوڑ بات ہے میں نے ہنس کر کہا کہ بڑی جوڑ دار ہے۔ اس طرح سے کہ مرچوں سے کھانا مزہ دار ہو جاتا ہے اور بوجہ مزہ دار ہونے کے کھایا بہت جاتا ہے اور زیادہ کھانے سے قوت بہیمیہ میں ترقی ہوتی ہے اور وہ باعث ہوتی ہے فساد کا ہم تو بزرگوں کے قول کی تاویل کریں گے گو وہ بزرگ کیسے ہی ہوں خیر یہ تو ہنسی کی بات تھی باقی نیند کا اصل علاج یہ ہے کہ پانی کم پیو۔ ستر اہل مجاہدہ کا قول ہے کہ نیند کا مادہ پانی سے ہے اس کو امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ پھر بھی اگر نیند زیادہ آوے تو سیاہ مرچ چبالو آخر خدا تعالیٰ سے کچھ لینا بھی ہے یا نہیں حق سبحانہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ۙ كَلَّا ۭ کیا ہر شخص اس کی طمع رکھتا ہے کہ نعمتوں والی جنت میں داخل کیا

ے حضرت کی عادت شریفہ ہے کہ رمضان میں تعلیم و تلقین خاص کو بند کر دیتے ہیں ہاں افادات عامہ پہلے سے زیادہ ہو جاتے ہیں۔ ۱۲ ظ پھر بعد میں اس میں بھی باقتضائے وقت کچھ ترمیمیں ہوتی رہیں ۱۲ منہ

جاوے ایسا ہرگز نہیں۔ یعنی بدون کئے کچھ نہ ملے گا۔ پہلے اعمال کے ذریعہ سے جنت کے قابل تو بنو بدون اعمال کئے کیا منہ ہے جنت کے لینے کا۔ پس رمضان میں ہمت کر کے ایک قرآن تو سن ہی لو بہر حال سنت ہے۔ آثار سے بزرگوں کے معمولات سے ذوق سے ثابت ہوتا ہے اس ماہ میں قرآن کی تلاوت خاص درجہ میں مطلوب ہے۔

شفاعت روزہ

یہ دوسری تقریر ہے اس کا نام القرآن فی رمضان رکھنا مناسب ہے۔ دونوں تقریروں میں مناسبت بھی ہے کہ پہلی تقریر میں رمضان کی فضیلت کا بیان تھا اور اس میں قرآن کا بیان ہے جس میں ایک وجہ تو مناسبت کی یہ ہے کہ قرآن کا نزول رمضان شریف میں ہوا ہے دوسرے بنص حدیث قرآن شریف اور روزہ دونوں قیامت کے دن شفاعت کریں گے۔ رمضان کہے گا میں نے اس کو پیاسا رکھا تھا اس واسطے اس شخص کو بخش دیجئے اور قرآن کہے گا کہ میں نے اس کو جگایا تھا اس لئے میری شفاعت قبول فرمایئے۔ پھر لفظ رمضان کو ان ایام صیام سے لفظی مناسبت بھی ہے کہ رمض سخت گرمی کو کہتے ہیں اصل وجہ تو اس کی یہ ہوئی تھی کہ جب مہینوں کے نام تجویز ہوئے تھے تو ان ایام میں سخت گرمی تھی اس لئے اس کا رمضان رکھا پھر خدا تعالیٰ نے ان ایام میں عبادت ایسی مقرر کی کہ اگرچہ سردی ہی ہو تب بھی بہ نسبت اور ایام کے اس میں کچھ تو تپش ہوتی ہی ہے یعنی بھوک کی یا پیاس کی تپش یہاں دوسری تقریر ختم ہوئی۔

عبادت شب قدر

اب تیسری تقریر رہ گئی اس میں شب قدر کا بیان ہے اس کو تقریر بالا سے مناسبت یہ ہے کہ جیسے رمضان شریف میں قرآن نازل ہوا اسی طرح لیلۃ القدر میں نازل ہوا ہے چنانچہ ایک جگہ تو یہ ارشاد ہے شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (ماہ رمضان المبارک وہ ہے جس میں قران حکیم نازل ہوا) اور دوسری جگہ یہ ارشاد ہے اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ (بے شک ہم نے اس کو شب قدر میں نازل کیا) اور لیلۃ القدر کا رمضان میں ہونا نصوص حدیث سے ثابت ہے۔ لہذا پس دوسری اور تیسری تقریر میں بھی پوری مناسبت ہوگئی اب شب قدر کے متعلق بعض ضروری باتیں بیان کرتا ہوں ایک یہ کہ آج کل اکثر لوگ یہ پوچھا کرتے ہیں کہ شب قدر میں کیا عبادت کریں اس کا

جواب یہ ہے کہ دن کو تو زیادہ تلاوت میں صرف کرے تدبر سے تلاوت کرے اور اگر تجوید نہ آتی ہو تو کم از کم بقدر ضرورت اس کو سیکھ لے اور رات کو بھی حق تلاوت ادا کرے اور لیلۃ القدر میں زیادہ جاگے کچھ تلاوت کچھ نوافل میں مشغول رہے اور دس دن اعتکاف کی مشروعیت میں یہ بھی حکمت معلوم ہوتی ہے کہ شب قدر کا جاگنا نصیب ہو کیونکہ اعتکاف مسجد میں ہوگا اور جب یہ مسجد میں پڑا رہے گا تو کوئی تو اٹھے ہی گا اس کو بھی توفیق ہو جاوے گی۔ پھر یہ ایک لطیفہ رحمت دیکھئے کہ اللہ میاں نے اعتکاف کے دس دن معین کئے اور لیلۃ القدر کی پانچ راتیں جن میں ایک ایک دن کا ہر دو رات کے بیچ میں فاصلہ بھی کر دیا تا کہ آسانی ہو جائے میں کہ جو تکان ایک رات کے جاگنے سے ہو گیا ہے وہ ایک دن آرام کرنے سے جاتا رہے آج اٹھارہ تاریخ ہے اور کوئی خبر اس کے خلاف اب تک نہیں ملی پس جس مسجد میں جماعت ہوتی ہو اس میں بیس تاریخ یعنی پرسوں کو غروب آفتاب سے پہلے اعتکاف کی نیت کر کے جا بیٹھے اور چاند رات کو نکل آوے اگر تیس کا چاند ہو تو دس دن پورے ہو جائیں گے اور اگر انتیس کا ہوا تو گو تعداد میں نو دن ہوں گے مگر ثواب دس دن کا ملے گا اس اعتکاف میں علاوہ اور حکمتوں کے ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ ان دنوں میں شب قدر نصیب ہو جاتی ہے جس میں عبادت کرنا ایک ہزار ماہ کی عبادت سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے جو اسی سال سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اتنی تو عمر بھی شاذ و نادر ہوتی ہے پس اسی بناء پر ایک شب قدر میں جاگنا ایسا ہے گویا ساری عمر سے بھی زیادہ عبادت کی جس کا مطلب دوسرے عنوان سے یہ ہوا کہ ساری عمر بھی عبادت کی اور مرنے کے بعد بھی کچھ دنوں عبادت کی۔ اتنا ثواب ہے۔ اس رات میں عبادت کا کہ ایک رات کی عبادت تمام عمر کی عبادت سے بڑھ جاتی ہے تو ضرور اس کی کوشش کرے۔

نیند کا علاج

اگر ساری رات نہ جاگ سکے اور نیند کا غلبہ ہو اور اکثر حصہ جاگ سکے تو بھی شب قدر کی فضیلت ملے گی پس سستی نہ کرے اور نیند نہ آنے کی تدابیر کرے مثلاً یہ کہ رات کو کھانے پینے میں قدرے کمی کرے اگر پھر بھی ضرورت ہو تو کالی مرچ چباوے اور جو بھی تدبیریں نیند نہ آنے کی ہوں سب کرے اور اگر باوجود تدبیریں کرنے کے پھر بھی نیند غالب ہو تو وہ نیند معتبر ہے یعنی پھر سو رہے لیکن یہ نہیں کہ ذرا سی نیند آئی اور پڑ کر سو رہے اور نیند کے غلبہ کی صورت کو اس طرح سمجھو کہ ایک بڈھے کی حکایت ہے کہ وہ پڑھ رہے تھے ''کریما بہ بخشائے برحال ما'' اور نیند میں نکل رہا تھا اری ماں جب

یہ نوبت آ جاوے تو سو رہے۔ کیا لطف ورحمت ہے کہ ایک رات کی عبادت کو ہزار ماہ کی برابر قرار دیدیا اور پھر نیند کے غلبہ کا بھی اعتبار فرمایا اور نیند کے غلبہ کی صورت میں اکثر حصہ رات کے جاگنے کو بھی فضیلت شب قدر کی مرحمت فرمائی۔ **طوبیٰ لنا معشر الاسلام ان لناء من العنایة رکنا غیر منھم**

مقام ناز

ہمارے لئے بڑی بشارت ہے ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم عنایت الٰہی کے رکن ہیں آپ نے فرمایا ہے کہ میں ایک رحمت ہوں کہ تحفہ بنا کر مجھ کو بھیجا ہے۔ انا رحمۃ مہداۃ'' مگر ہماری وہ حالت ہے کہ کھائیں اور غرائیں اور پھر کہیں کہ لایئے ثواب' البتہ جن کا مقام ناز کا ہو اگر وہ کچھ کہہ دیں تو زیبا ہے مگر ہر ایک کو ان کی نقل کرنے کا حق نہیں۔

ناز را روئے بباید ہمچو ورد چوں نداری گرد بد خوئی مگرد

(ناز کیلئے گلاب جیسے چہرے کی ضرورت ہے اگر تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے تو ناز کے قریب مت پھٹکو)

اس مقام کو اصلاح میں ادلال کہتے ہیں جو ہر ایک کا مقام نہیں جن کا مقام ادلال ہے ایسی باتیں کہنا ان کا مرتبہ ہے نہ کہ اہل اضلال کا۔ حضرت رابعہ بصریہ جن کا مرتبہ ناز کا تھا وہ حج کو گئیں جب حج کر چکیں تو کہتی ہیں کہ میں ثواب کی ہر حالت میں مستحق ہو گئی اگر حج قبول ہوا تب تو ظاہر ہے اور جو قبول نہیں ہوا تب بھی ثواب کی مستحق ہوں کیونکہ یہ عاشق کے لئے بڑی سخت مصیبت ہے کہ وہ محبوب کی درگاہ میں آوے اور محروم واپس جائے۔

از در دوست چہ گویم بچہ عنوان رفتم ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ[1] حرماں رفتم

(دوست کے دروازے سے کہا کیوں میں کیسے گیا ہمہ تن امید کہ ساتھ آیا تھا اور اب ہمہ تن محروم ہو کر واپس جاتا ہوں)

تو اس صورت میں تو میں مصیبت زدہ ہوں گی کہ میرا حج مردود ہو گیا اور آپ نے مصیبت پر بھی اجر کا وعدہ فرمایا ہے بہرحال ثواب دینا پڑے گا۔ میں ٹلوں گی نہیں۔ اور جو اہل ناز نہ ہو تو اس کو تنبیہ کرتے ہیں۔

ناز را روئے بباید ہمچو ورد چوں نداری گردبد خوئی مگرد

---

[1] دوست کے دروازے سے کیا کہوں میں کیسے گیا ہمہ تن امید ہو کے آیا تھا اور اب ہمہ تن محرومی ہو کر واپس جاتا ہوں۔

پیش یوسف نازش و خوبی مکن جز نیاز و آہ یعقوبی مکن
چوں تو یوسف نیستی یعقوب باش ہمچو رو باگریۂ و آشوب باش

(ناز کیلئے گلاب جیسے چہرے کی ضرورت ہے اگر تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے تو ناز کے قریب مت جاؤ۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے ناز و حسن کی تعریف نہ کرو بلکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرح آہ و گریہ اختیار کرو جب تم یوسف نہیں تو یعقوب بن جاؤ اور رونے والوں کی صورت بناؤ)

ایک درویش نے حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کو دیکھ کر ناز کیا تھا حالانکہ اس کا مرتبہ ایسا نہ تھا پھر دیکھئے اس کا کیا حشر ہوا۔ قصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ سلطنت کو ترک کر کے ایک جنگل میں پہنچے وہاں ایک درویش رہتا تھا کہ اس کو غیب سے کھانا آتا تھا اس نے خیال کیا کہ اگر یہ شخص یہاں ٹھہر گیا تو میرے کھانے میں کمی ہوگی اس نے کہا یہاں ٹھہرنے کا حکم نہیں ہے۔ جیسے موذنین کی اکثر عادت ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم جہاز میں عدن پہنچے سیر کو جی چاہا اس لئے وہاں اترے شب کو ہم ایک مسجد کے حجرہ کی چھت پر جا کر پڑے۔ مؤذن صاحب آئے اور کہا کہ نکلو یہاں سے میں تو بولا نہیں اس خیال سے کہ بحث کی یہاں گنجائش نہیں اور یہ خیال کیا کہ بے حیا بنے پڑے رہو کوئی نکالے گا نکل جائیں گے۔ ایک سندی سوداگر بھی ہمراہ تھے جو عرب میں تجارت کرتے تھے وہ بولے ہم عرب ہیں اور ہمیشہ یہاں ٹھہرتے ہیں۔ مؤذن ہم کو عرب ہی سمجھا پھر تو کہنے لگا کہ یہاں لیٹے ہو مسجد کے اندر قالین بچھے ہیں ہوا سے حفاظت کا انتظام ہے وہاں چلو چنانچہ وہاں لے گیا اور خوب خاطر کی اسی طرح وہ درویش چھپری والا گھبرایا وہ بھی صاحب کرامت تھا اس کو غیب سے روٹی ملتی تھی مگر وہ حالت غربت سے فقیر ہوا تھا اس کا وہی حوصلہ تھا۔ وہ بڑبڑایا اور کہا کہ یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم ابن ادھمؒ نے فرمایا کہ میں روٹی نہیں مانگتا تب اس کو تسلی ہوئی۔ مجھ کو روٹی سے تسلی ہونے پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک سچے بزرگ سے ایک گاؤں کے لوگ مرید ہو گئے ان کے پہلے پیر جو آئے اور یہ قصہ معلوم ہوا تو ان بزرگ کی قوم کا نام لے کر کہنے لگے کہ فلانی قوم میں بھی کہیں بزرگ ہوئے ہیں۔ ایک دانشمند دیہاتی بولا کہ یہ بات تو بزرگ جانتے ہوں گے کہ کس قوم کے بزرگ ہوتے ہیں کس قوم کے نہیں ہوتے مگر ایک بات تو وہ ہم سے فرما گئے ہیں کہ پہلے پیر کا بھی حق سمجھنا۔ اس پر پیر صاحب کہنے لگے کہ خیر وہ بھی بزرگ آدمی ہیں مجھ کو ایک جگہ جانے کا اتفاق ہوا وہاں قریب مقام میں ان لوگوں کے ایک پیر تھے ان کو

خیال ہوا کہ شاید واعظ یہ میری جڑ کاٹیں گے وہ خود بھی وہاں آئے۔ اور ایک مولوی صاحب کو بھی اپنے ساتھ لائے کہ شاید بحث کی نوبت آئے تو ان کو مقابل بنا دیں گے۔ آخر وعظ ہوا تو میں نے بیان کیا کہ میں ایک کام کی بات بتاتا ہوں کہ دین کی باتیں تو اہل علم سے پوچھو اور ان کو کوئی نذرانہ وغیرہ مت دو اور مالی خدمت پیروں کی کرو مگر دین کی باتیں پوچھنے کی تکلیف ان بزرگوں کو مت دیا کرو پس مسائل کے لئے تو مولویوں کو رکھو اور خدمت کے لئے فقیروں کو۔ ان کو پریشان مت کرو ہاں ان کی خدمت کرو اور مولویوں کو ایک پیسہ مت دو پیر صاحب خوش ہو گئے اور میرے خوب ہاتھ چومے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ یہ جتنے بدعتی ہیں اگر ہم لوگ ان کی تنخواہ مقرر کر دیں تو سب ہماری سی کہنے لگیں کیونکہ ان کی سب بدعات کھانے کے لئے ہیں ورنہ اگر اس طرف سے یکسوئی ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائیں۔ بطور نمونہ کے ایک واقعہ لکھنؤ کا عرض کرتا ہوں وہاں دستور ہے کہ الگ الگ کھانا رکھ کر اور مردوں کے ساتھ نامزد کر کے جدا جدا فاتحہ دلواتے ہیں کہ اس کا ثواب فلاں کو پہنچے اور اس کا فلاں کو بعض نے مجھ سے کہا کہ علماء نہ معلوم جدی جدی فاتحہ کو کیوں منع کرتے ہیں میں نے کہا نہیں تم الگ الگ ہی دلواؤ مگر فاتحہ دینے والے پیر جیون کو کچھ مت دو جب دیکھیں گے کہ فاتحہ تو بیس بار دینی پڑی اور ملا کچھ بھی نہیں۔ ان شاء اللہ پہلے ہی دن وہ بھی کہنے لگیں گے کہ الگ الگ کی ضرورت نہیں۔ اور ان قیدوں کی ضرورت نہیں یہ تو ساری روٹیوں کی باتیں ہیں۔

ایک مسجد کا قصہ ہے کہ وہاں ایک ملا رہتے تھے ایک روز ایک بڑھیا عورت روٹی لائی وہ وہاں اس وقت نہ تھے ایک مسافر تھا وہ روٹی اس کو دے دی ملا جی آئے اور ان کو قصہ معلوم ہوا انہوں نے سوچا کہ یہ تو برا راہ نکلا اس کی بندش اگر نہ ہو گی تو آئندہ جانے کیا ہو۔

سرچشمہ شاید گرفتن بہ میل   چو پرشد نشاید گذشتن بہ پیل

(جب چشمہ پھوٹنا شروع ہو تو سوئی سے بھی بند ہو سکتا ہے اور جب وہ بڑا ہو جائے تو ہاتھی بھی اس کو بند نہیں کر سکتا)

بس لاٹھی لے کر مسجد میں دوڑنا اور ادھر ادھر لاٹھیاں مارنا شروع کیا بڑھیا نے بھی سنا اور تمام لوگ جمع ہو گئے۔ یہاں تک کہ اخیر میں ملا جی بیہوش ہو کر گر گئے لوگ کہنے لگے ملا جی کو کیا ہو گیا وہ بولے کہ میرے پاس مت آؤ میرا اس مسجد میں گزر نہیں ہو گا لوگوں نے کہا آخر بات تو بتلاؤ کہنے لگے بات کیا بتلاؤں بات یہ ہے کہ میں تو یہاں کے سب مردوں کو جانتا ہوں میرے پاس جو کچھ آتا

تھا سب کو مناسب طور پر ثواب بانٹ کر کھالیتا تھا وہ حصہ لیکر چلے جاتے تھے آج اجنبی شخص کو کھانا پہنچنے پر مردوں کو کچھ ملا نہیں وہ سب مردے میرے سر ہو گئے میں ہٹاتے ہٹاتے تھک گیا تو ہر روز کہاں تک ان کا مقابلہ کروں گا لوگوں نے کہا کہ بھائی تجھ کو ہی دیا کریں گے کہیں مت جا پڑا رہ صاحبو! لوگ ایسی استادیاں کرتے ہیں مولویوں نے سب کی جڑ کاٹ دی ہے اس لئے سب ان سے ناخوش ہیں خیر تو وہ درویش یہ سن کر میری روٹیوں میں سے نہ بانٹیں گے خوش ہو گیا اور حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کو اس جگہ ٹھہرنے کی دے دی کھانے کے وقت اس کے پاس معمولی روٹی سالن اور مٹی کا پیالہ میں پانی آیا اور ان کے پاس غیب سے ایک خوان لگا ہوا آیا جس میں رنگا رنگ کے کھانے تمام جنگل اس کی خوشبو سے مہک گیا وہ درویش جانتا تھا کہ یہ ابراہیم ہیں جو ابھی سلطنت کو چھوڑ کر فقیر ہوئے ہیں تو وہ حق تعالیٰ سے کہنے لگا کہ کیا یہی انصاف ہے، ہم تو اتنے دنوں کے خادم ہیں اتنی مدت مجاہدات میں گزری ہمیں تو معمولی روٹی اور سالن دیا جائے اور اس نے نہ ابھی زیادہ عبادت کی نہ مجاہدہ اور پھر یہ خاطر داری وہاں سے حکم ہوا کہ بکومت اپنی حیثیت یاد کر کہ تو کون تھا ایک گھس کھدا تھا۔ اور اس کی حیثیت کو دیکھ کہ بادشاہت چھوڑ کر آیا ہے اگر منظور نہیں تو فلاں درخت کی جڑ میں کھرپا جالی رکھا ہوا ہے اس کو سنبھال وہ درویش جوتیاں لگ کر سیدھے ہو گئے۔ غرض یہ ہے کہ ہر ایک کا منہ ناز کا نہیں حضرت رابعہؒ کا منہ ناز کا تھا مگر جن کا منہ ناز کا نہیں وہ بھی بزبان حال ناز کر رہا ہے کہ سوئیں یا جاگیں اجر لینے کو تیار البتہ اگر نیت جاگنے کی ہو اور عذر سے سو گئے تو پھر ہر حالت میں اجر ہے پھر تو وہی بات ہے جیسے بعض ہندوؤں کا مقولہ ہے کہ مسلمان سب طرح مزہ میں ہیں بڑھ جائیں تو امیر، گھٹ جائیں تو فقیر۔ مر گئے تو پیر، مسلمان ہر حال میں اچھا ہے۔ جاگتے اجر، سوتے اجر، سو یہ نیت کی برکت ہے مکرر ارادہ تو جاگنے کا کرو ایک تدبیر رات کے جاگنے کی اور یاد آئی کہ دن کو سو رہا کرو اگر باوجود ان تدابیر کرنے کے پھر سو گئے تو اجر ملے گا۔ غرض اپنی طرف سے کوشش کرو اور سمجھ لو کہ بدون کئے کچھ نہیں ملتا اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں یہ تین تقریریں ہیں اگر تین دفعہ بیان کرتا تو مبسوط ہوتیں۔ مگر مختصراً سب کچھ بیان کر دیا۔ اللہ میاں عمل کی توفیق دیں۔

اس اخیر تقریر کا نام یقصان فی رمضان مناسب معلوم ہوتا ہے

اور مجموعہ کا نام مثلث رمضان

فقط: اشرف علی: ۱۸ شوال ۱۳۵۲ھ۔

اکمال العدۃ

وعظ ہذا اہل کیرانہ (ضلع مظفر نگر) کی درخواست پر ۲ رمضان المبارک ۱۳۳۴ھ بروز بدھ کو اڑھائی گھنٹے تک جامع مسجد میں کھڑے ہوکر ارشاد فرمایا۔ حضرت مولانا محمد احمد صاحب عثمانی مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

الحمد لله نحمده ' و نستعينه' و نستغفره و نؤمن به و نتوكل عليه و نعوذ بالله من شرور انفسنا و من سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له و من يضلله فلا هادى له و نشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريک له' و نشهد ان سيدنا و مولانا محمداً عبده' و رسوله صلى الله عليه وعلىٰ اله واصحابه وبارک وسلم' امابعد......فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم .

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ○ (البقرہ:۱۸۵)

اللہ تعالیٰ کوتمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں اور تاکہ تم لوگ شمار کی تکمیل کرلیا کرو اور تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بزرگی بیان کرو اس امر پر کہ تم کو طریقہ بتایا اور تاکہ تم لوگ شکر ادا کرو (پ۲ ع ۷) اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو میں قریب ہی ہوں درخواست کرنے والے کی درخواست منظور کرلیتا ہوں جبکہ وہ میرے حضور میں درخواست دے سو ان کو چاہیے کہ میرے احکام کو قبول کریں اور مجھ پر یقین رکھیں تاکہ بھلائی حاصل کرسکیں۔

تمہید

ان آیات کا پہلا حصہ یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے اس میں حق تعالیٰ نے روزہ کے احکام کے مصالح ارشاد فرمائے ہیں اور دوسری آیت کو پہلی آیت کے تقویت کے لئے ارشاد فرمایا ہے یہ حاصل ہے دونوں آیتوں کا مگر اس وقت جو جزو مقصود ہے وہ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ (اور تاکہ تم لوگ شمار کی تکمیل کر لیا کرو) ہے اور مضامین چونکہ اسی کے سیاق و اسباق میں ہیں اس لئے سب کی تلاوت کردی گئی۔

حاصل ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ تمہاری تکلیفوں کو گوارا نہیں فرماتا بلکہ تم کو آسانی پہچانا چاہتے ہیں پس روزہ میں دشواری کا اندیشہ نہ کرو مثلاً گرمی کے موسم میں بعض لوگوں کو دشواری کا

خیال ہوتا ہے مگراس سے اندیشہ نہ کرنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ روزہ میں تم کوآسانی پہچانا چاہتے ہیں اگرتم گرمی میں روزہ کی ہمت کروگے اللہ تعالیٰ آسان کردیں گے۔

روحانی سہولت

اب سمجھنا چاہیے کہ وہ آسانی کون سی ہے جو یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ (اور اللہ تعالیٰ کوتمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے) سے حقیقتاً مراد ہے سوحقیقت میں آسانی معنوی اورروحانی ہے جس کا اثر یہ بھی ہے کہ جسمانی آسانی اس پر مرتب ہوجاتی ہے روحانی سہولت کا حاصل یہ ہے کہ روزہ سے تم کو دلچسپی عطا کردی گئی اور دلچسپی سے جیسا روح کوآسانی ہوتی ہے جسمانی سہولت بھی اس پر مرتب ہوجاتی ہے۔ کیونکہ دنیا کے کاموں میں مشاہدہ ہے کہ دلچسپی کے بعد دشوار سے دشوار کام بھی آسان ہوجاتا ہے،ہم نے تقریبات شادی میں دیکھا ہے کہ نفیس المزاج لوگوں کوبعض دفعہ بارات کے انتظام میں پسینہ آجاتا ہے بھوکے مرتے ہیں مگرکچھ تکلیف نہیں ہوتی بلکہ اس پرفخر کرتے ہیں اوراگرکبھی شکایت بھی کرتے ہیں تو ان کے ہرلہجہ سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اندر سے ان کا دل خوش اورشاداں ہے محض شکایت ہے تو وہ شکایت ایسی ہوتی ہے جس کے متعلق مولانا فرماتے ہیں۔

دل ہمی گوید از و رنجیدہ ام   وز نفاق ست او کہ من خندیدہ ام

ترجمہ: دل کہتا ہے کہ میں اس سے ناراض ہوں اور یہ میرا ہنسا محض بناوٹی ہے۔ بعض دفعہ اہل اللہ کے کلمات میں بھی شکایت ہوتی ہے،جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شکایت کررہے ہیں مثلاً ایک عاشق کا شعر ہے۔

کیا ہی لطف خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال
سو جگا کے شور ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا

مگران کے دل سے کوئی پوچھے کہ کیا وہ خدا سے رنجیدہ ہیں یا ان کو کچھ تکلیف ہے ہرگزنہیں مولانا فرماتے ہیں۔

گہ چنیں بنماید وگہ ضد ایں   جز کہ حیرانی نباشد کار دیں

ترجمہ: کبھی ایسا معلوم ہوتا ہےاورکبھی اس کی ضد دکھائی دیتا ہے دین کا کام حیرانی کے سوانہیں چلتا۔

اب کیا ان کو اس سے پریشانی ہرگزنہیں وہ اس کے عوض سلطنت کا لینا بھی پسند نہیں کرتے مولانا اسی کوفرماتے ہیں۔

ناخوش تو خوش بود برجان من   دل فدائے یار دل رنجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناخوش ہی کیوں مگر وہ میری جان پر خوش ہے جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اس میں اپنی جان کو قربان کرتا ہوں)

غرض قاعدہ یہ ہے کہ جس چیز سے دلچسپی ہوتی ہے اس میں روحانی تکلیف نہیں ہوتی گو جسمانی تکلیف ہو پھر وہ بھی زیادہ محسوس نہیں ہوتی اس لئے بعض دفعہ دنیا والے خوش ہو کر ایسی تکالیف کو بیان کیا کرتے ہیں حالانکہ تکلیف میں خوشی کیسی؟ مگر اس کا راز وہی ہے کہ روح کو دلچسپی کی وجہ سے راحت ہوئی اس لئے جسمانی کلفت کی پرواہ نہیں کی گئی۔

نور ذکر اللہ

پھر عادۃ اللہ یہ ہے کہ اس کے بعد ظاہری اور جسمانی سہولت بھی ہو جاتی ہے چنانچہ ذاکرین کو ذکر کے بعد بھوک نہیں لگتی۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ذکر سے پہلے بھوک لگی ہوئی تھی جس کی وجہ سے ذکر کرنا دشوار معلوم ہوتا تھا مگر ذکر شروع کیا گیا تو بھوک جاتی رہی علامہ ابن القیم جو صوفی مشہور ہیں بلکہ ظاہری عالم سمجھے جاتے ہیں وہ بھی اس کو تسلیم کر کے کہتے ہیں کہ نور ذکر بمنزلہ غذا کے ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ذکر سے بھوک جاتے رہنے کا یہ سبب ہے کہ نور ذکر غذا کا کام دینے لگا ایک شاعر اسی مضمون کو بیان کرتا ہے۔

وذکرک للمشتاق خیر شراب　　　وکل شراب دونہ کسراب

ترجمہ: آپ کا ذکر ہی عاشق کے لئے بہترین مشروب ہے اور اس کے سوا سب شرابیں سراب (ریتے) کے برابر ہیں۔

صوفیہ کے واقعات تقلیل غذا کے بارہ میں ایسے عجیب ہیں جن کو دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ ذکر بمنزلہ غذا کے ہو جاتا ہے چنانچہ کوئی بزرگ چلہ میں غذا کم کرتے جاتے تھے یہاں تک کہ بعض دفعہ چالیس دن میں صرف ایک بادام کھاتے تھے۔ اگر آپ اطباء سے دریافت کریں تو وہ ہرگز اس کو تسلیم نہ کریں گے کہ چالیس دن میں ایک بادام کافی ہو سکتا ہے بس یہی کہنا پڑے گا کہ ذکر اللہ نے غذا کا کام دیا اور اس میں تعجب کی کیا بات ہے اگر عاشق کو بھوک لگی ہو اور وہ کھانا کھانے بیٹھا ہو اس وقت اس کا محبوب آ جائے تو عاشق کو بھوک جاتی رہتی ہے اس کی وہی حقیقت ہے کہ محبوب کو دیکھ کر ایسی فرحت ہوئی جس نے غذا کا کام دیا۔

اصلی غذا و دوا

بلکہ سچ پوچھو تو اصلی غذا یہی ہے یعنی فرحت اور جن کو تم غذا کہتے ہو وہ بھی اسی وقت غذا بنتی ہیں

جب فرحت موجود ہو چنانچہ اگر کوئی شخص محزون ہو اس کو جتنے چاہو مال کھلا دو اس کے بدن کو کچھ لگتا ہی نہیں اور فرحت ونشاط کی حالت میں معمولی غذا بھی پلاؤ قورمہ کا کام دیتی ہے پس معلوم ہوا کہ اصلی غذا فرحت اور بےفکری ہے بلکہ اصلی دوا یہی ہے کیونکہ اطباء کہتے ہیں کہ فاعل صحت ومزیل مرض دوا نہیں بلکہ طبیعت ہے اور طبیعت اس وقت فاعل ہوگی جب کہ اس میں قوت ہو بس دوا کا کام صرف اتنا ہے کہ طبیعت کو قوت دی پھر کسی کی طبیعت کو دوا دارو کرنے سے قوت حاصل ہوتی ہے اور بعض طبائع کو ترک دوا سے قوت حاصل ہوتی ہے تو یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص دوا نہیں کرتا یہ غلط ہے وہ بھی حقیقت میں دوا کرتا ہے کیونکہ دوا کی حقیقت یعنی قوت طبیعت کا سامان وہاں بھی غلط ہے یہ اور بات ہے کہ اس کی تقویت طبع کا سامان ترک دوا ہے اور دوسروں کے لئے دوا ہے تو یہ محض ظاہری فرق ہے ورنہ حقیقی دوا سے کوئی خالی نہیں غرض یہ دعویٰ محقق ہوگیا کہ اصلی غذا اور اصلی دوا فرحت ونشاط ہے خواہ دوا سے ہو یا اور چیز سے ہو۔ سو ذاکرین کو ذکر اللہ سے بیحد نشاط فرحت حاصل ہوتا ہے اس لئے وہ ان کو غذا اور دوا کا کام دے جاتا ہے اور کسی کو اپنے محبوب کے دیکھنے سے نشاط ہوتا ہے اس کو محبوب کا دیکھ لینا دوا سے بڑھ کر نافع ہو جاتا ہے چنانچہ اگر کوئی عاشق بیمار ہوا اور مشرف بہلاک ہو اس حالت میں اس کا محبوب چلا آوے تو عاشق محبوب کو دیکھ کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ مجھے اپنا واقعہ یاد ہے کہ ایک بار میرے والد صاحب مرحوم الہ آباد میں بیمار ہوگئے میں کانپور سے دیکھنے گیا تو مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھے اور کھڑے ہوگئے اور مجھ کو لے کر مارکیٹ گئے حالانکہ اس سے پہلے کروٹ لینے میں بھی تکلف ہوتا تھا تو محبوب کا دیکھنا دوا سے بھی زیادہ نافع ہوتا ہے۔ ایک دفعہ میں مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ دیوبند کی عیادت کو گیا کیونکہ وہ سخت بیمار تھے مولانا کو مجھ سے بہت محبت تھی تو مجھ سے مل کر فرمانے لگے کہ تجھے دیکھ کر تو میری بیماری جاتی رہی پہلا واقعہ دنیوی بزرگ کا ہے اور دوسرا واقعہ دینی بزرگ کا ہے معلوم ہوا کہ اصل قوت کی چیز فرحت ہے یہی تمام غذاؤں کی جڑ ہے۔ اور یہ جب کہ خود بھی غذا کا کام دیتی ہے ورنہ اقل درجہ یہ ہے کہ تو ضروری ہے کہ بدون اس کے کوئی غذا غذا نہیں بنتی جب یہ مقدمہ سمجھ گئے تو اب بزرگان دین کی تقلیل غذا پر کوئی وجہ حیرت نہیں کیونکہ ان حضرات کو ذکر اللہ سے ایسا نشاط حاصل ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی مفرح یا قوتی اور خمیرہ ایسا نشاط نہیں پیدا کر سکتا تو وہ ایک بادام پر چالیس دن تک کفایت کر سکتے ہیں کیونکہ ظاہر میں تو انہوں نے ایک بادام کھایا مگر حقیقت میں کثرت ذکر کی وجہ سے وہ تو سیروں بادام کھا گئے بلکہ بادام سے بھی بڑھ کر مقوی غذا کھا گئے۔ پس روزہ میں حقیقی یسر تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس سے دلچسپی عطا فرمائی ہے اور دلچسپی کی چیز سے فرحت ہوتی ہے چنانچہ مشاہد ہے کہ روزہ سے طبیعت کو ایسی تازگی ہوتی ہے کہ باوجود ضعف بدن کے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی پھر عادۃ اللہ یہ ہے روزہ میں تمام طاعات میں روحانی

یسر کے ساتھ جسمانی یسر کے اسباب بھی عطا فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ اس سال باوجودیکہ رمضان سخت گرمیوں میں ہے مگر رمضان کے آتے ہی بادل اور بارش کا سامان ہو گیا جس سے جسمانی راحت بھی حاصل ہوئی شعبان میں روزہ رکھا تھا تو سخت تکلیف ہوئی تھی مگر بحمد اللہ طبیعت کو اس سے بھی فرحت ہوئی اسی لئے باوجود جسمانی کلفت کے روزہ گراں نہیں ہوا اور خوبی کے ساتھ پورا ہو گیا۔

صوم شعبان کی حکمت

رمضان سے پہلے نصف شعبان کا روزہ مشروع ہونے کی یہ بھی ایک حکمت ہے کہ روزہ سے گونہ مناسبت ہو جائے اس کے بعد جب رمضان آئے گا تو روزہ کا اثر زیادہ نہ ہوگا بلکہ دل یوں کہے گا کہ جیسا شعبان کا روزہ تھا ویسا ہی رمضان کا ہوگا اس سے زیادہ کیا ہوگا چنانچہ بحمد اللہ اب رمضان کے روزہ کا اثر زیادہ نہیں ہوا گو کسی قدر ضرور ہوا اور اگر بالکل بھی اثر نہ ہوتا تو آپ خود اس تجویز کو بدلتے اور اسکی تمنا کرتے کہ کچھ تو اثر ہوتا چنانچہ جاڑوں کے روزہ میں لوگ کہا کرتے تھے۔ کہ روزہ کا مزہ نہ آیا روزہ کا مزا تو گرمی کے روزہ میں ہے کہ افطار سے پہلے چھڑکاؤ ہو رہا ہے ٹھنڈے پانی کا اہتمام ہو رہا ہے۔ کوئی شربت بنا رہا ہے کوئی برف لا رہا ہے جاڑوں میں تو یہ خیالات تھے کہ اب گرمی کے روزوں سے کیوں گھبراتے ہو یہ تو تمہارا ہی تجویز کردہ ہے۔

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ (اور تم تو مرنے کی تمنا کر رہے تھے موت کے سامنے آنے سے پہلے سے پس تم نے اس کو کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا)

بعض حضرات صحابہ نے جو غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے کیونکہ غزوۂ بدر دفعۃً ہو گیا جس کا کسی کو گمان بھی نہ تھا جہاد کا شوق ظاہر کیا تھا کہ اگر غزوۂ بدر کے بعد کبھی جہاد کا موقعہ ہوا تو سب دیکھ لیں گے کہ ہم اس کے راستہ میں کسی طرح جانبازی کرتے ہیں اس کے ایک سال بعد ہی غزوۂ احد ہو گیا جس میں اول تو مسلمان غالب ہو گئے تھے پھر ان کے قدم اکھڑ گئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ تم تو موت کی تمنا کرتے تھے لو اب تو اس کو اچھی طرح دیکھ لیا یہی حالت روزہ کے متعلق ہماری ہے کہ جاڑوں میں تو گرمیوں کے روزہ کی تمنا کرتے تھے جب گرمیوں میں رمضان آیا تو بہت سے گھبرا گئے۔ اب اگر رمضان میں سختی بھی رہتی تو کیا حرج تھا کیونکہ وہ تو منہ مانگی مراد تھی مگر اللہ تعالیٰ نے آپ پر سختی نہیں کی بلکہ لطف فرمایا کہ گرمی کی تکلیف بھی رفع فرما دی بارش کا سامان کر دیا چنانچہ سارا رمضان بادل و بارش میں گزر گیا اگرچہ اس وقت رمضان کے دن لمبے تو ہیں خصوصاً مجھے اس سال زیادہ لمبے اس لئے معلوم ہوتے ہیں کہ اس سال میں نے رمضان میں

سوائے جوابات ڈاک کے اور تلاوت قرآن کے اور سب کام چھوڑ دیئے تعلیم وتلقین بھی بند کر دی تالیف وتصنیف بھی ملتوی کر دی اور ایسی حالت میں قاعدہ ہے کہ دن زیادہ لمبا معلوم ہوتا ہے اگر آدمی ہر وقت کسی نہ کسی کام میں لگا رہے تو دن لمبا نہیں معلوم ہوتا۔ مگر الحمد للہ کہ دن لمبے ہوتے ہوئے بھی تکلیف کچھ نہیں معلوم ہوئی۔ کیونکہ گرمی کم ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ اپنے بندوں کی مدد کام میں بھی کرتے ہیں۔ اسباب میں بھی کرتے ہیں حالانکہ اہل دنیا کا قاعدہ یہ ہے کہ صرف اسباب میں مدد کرتے ہیں کام میں مدد نہیں کرتے آپ اگر کسی معمار کو اپنے کام پر لگائیں تو کام میں آپ اس کی مدد نہیں کیا کرتے مثلاً جس وقت وہ کام کرنے بیٹھے اس وقت آپ اس کا کام بٹوادیں صرف اسباب میں امداد کرتے ہیں مگر حق تعالیٰ کا لطف یہ ہے کہ اسباب میں بھی مدد کرتے ہیں اور کام میں بھی حقیقت میں جو کچھ تھوڑا بہت کام ہم سے ہوجاتا ہے اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہوجاتا ہے بس ہمارے کام کی ایسی مثال ہے جیسے آپ قلم ہاتھ میں لے کر بچہ کا ہاتھ بھی اس پر رکھ لیں اور ایک خوشخط تحریر لکھ دیں اور بچہ کی تعریف کریں کہ شاباش

تم نے خوب لکھا اور وہ بچہ نادان بھی یہ سمجھ کر کہ میں نے لکھا ہے خوش ہوتا ہے حالانکہ اس کا تو نام ہی نام ہے۔ کام تو اور کسی کا تھا یہی حالت ہمارے کام کی ہے۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے برآ ہوئے چیں بستہ اند

ترجمہ: مشک افشانی آپ کی زلفوں کا کام ہے مگر عاشقوں نے کسی مصلحت کی بناء پر آ ہوئے چین کو مشک پیدا کرنے کا ذریعہ مان لیا۔

لوگوں نے یہ تو دیکھ لیا کہ روزہ ہمارے منہ میں ہے مگر یہ خبر نہیں کہ منہ کس کے ہاتھ میں ہے مولانا فرماتے ہیں۔

دو دہاں داریم گویا ہمچونے یک دہاں پنہاں ست درلب ہائے وے
یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما ہائے و ہوئے درفگندہ در سماء

ترجمہ: بانسری کی طرح ہمارے بھی دو منہ ہیں۔ ایک منہ اس کی لبوں میں پوشیدہ ہے ایک منہ تمہاری طرف کا رو رہا ہے اور آسمان وزمین میں ہاؤ ہو ڈال رہا ہے۔

یہی حال ہمارا ہے کہ ہم کو اس کا خیال نہیں کہ ہمارا منہ کس کے ہاتھ میں ہے کیونکہ اصل میں منہ سے کھانا قلب کے قبضہ میں ہے اگر دل میں تقاضا نہ ہوتا تو کھانا محال ہوجاتا اور دل خدا کے قبضہ ہے تو یہ خدا تعالیٰ کی اعانت ہے کہ انہوں نے روزہ کے اندر آپ کے دل سے کھانے پینے کا تقاضا نکال دیا اگر وہ

یہ تقاضا نہ نکالتے تو آپ کی مجال تھی کہ روزہ رکھ لیتے بس ہماری مثال ایسی ہے جیسے قلم ناز کرنے لگے کہ میں نے ایسا لکھا اور میں ایسا خوش تحریر ہوں اور نادان یہ نہیں دیکھتا کہ وہ خود کس کے قبضہ میں ہے ۔

اے قلم بنگر گراجلا نیستی درمیان اصبعین کیستی

ترجمہ: اے قلم دیکھ کہ تو کس کی انگلیوں کے درمیان میں ہے۔

یہ خدا کی رحمت ہے کہ دل کے واسطے لغت بھی ملہم ہے دل کو قلب اسی واسطے کہتے ہیں کہ وہ الٹ پلٹ ہوتا رہتا ہے ایک تنکا ہمارے ہاتھ میں ہو اور آندھی میں ثابت قدم رہے اور اس ثبات پر نازاں ہو تو اس کی حماقت ہے کیونکہ چھوڑ دینے کے بعد وہ کہیں سے کہیں ہوگا۔ پس اب جو لوگ اپنی ثابت قدمی پر نازاں ہیں وہ گریباں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ یہ ثابت قدمی اور استقلال اور پابندیٔ اوقات اور ضبط معمولات کس کی بدولت ہے یہ محض خدا کا لطف ہے کہ انہوں نے آپ کے دل میں تقاضا پیدا کر دیا ہے ورنہ کچھ بھی نہ ہو سکتا اسی لئے حق تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ کے دل کو تقویت دی ہم نے آپ کو ثابت قدم رکھا اور یہ بھی ایک دلیل ہے قرآن کی حقانیت کی ورنہ بشر اپنے کلام میں ضرور لچتا ہے (یعنی وہ کسی نہ کسی سے ضرور دیتا اور متاثر ہوتا ہے) اور قرآن کریم کو دیکھ کر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس کا متکلم کسی سے نہیں دبتا۔ اس پر کسی کا اثر نہیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے دھڑک ارشاد ہے وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا (اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ بنایا ہوتا تو آپ ان کی طرف کچھ کچھ جھکنے کے قریب جا پہنچتے ۱۲) اور یہ بات اگرچہ بہت ہی ڈر کی بات ہے کہ قلوب خدا کے قبضہ میں ہیں معلوم نہیں کدھر پھیر دیں مگر غور کرنے سے اس میں ایک لطیف بات نکلتی ہے وہ یہ کہ حقیقت میں یہی بڑی رحمت ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہم کو اپنے ہی قبضہ میں رکھا ہمارے قبضہ میں نہیں دیا کیا بچہ کے لئے ماں کی گود میں رہنا رحمت نہیں بیشک رحمت ہے ورنہ معلوم نہیں کہاں پہنچ کر ہلاک ہو اسی طرح ہمارے اندر علم کامل نہیں ہم کو اپنی جان کے ساتھ رحمت کامل نہیں اگر ہم کو ہمارے اختیار پر چھوڑ دیا جاتا تو نہ معلوم ہم اپنے کو کہاں لے جا کر برباد کرتے اگر تین چار برس کا بچہ یہ تمنا کرے کہ میں آزاد ہوتا تو خوب کھاتا پیتا یہ اس کی جہالت ہے اگر باپ اس کو آزاد کر دے تو حقیقت معلوم ہو جائے۔

صاحبو! دوسرے کے قبضہ میں ہونا جب مضر ہے جب کہ قبضہ والا رحیم وشفیق نہ ہو اگر قابض رحیم وشفیق ہو تو پھر دوسرے ہی کے قبضہ میں رہنا مفید ہوتا ہے۔

صاحبو! اگر قلوب خدا کے قبضہ میں نہ ہوتے اور وہ روزہ کی حالت میں دل سے کھانے پینے کا تقاضا نہ نکال لیتے تو روزہ رکھنا دشوار ہو جاتا۔ یہ خدا کی رحمت ہے کہ اس نے کھانے پینے کی خواہش ہمارے دل سے نکال دے پس متقی ناز نہ کرے کہ میں متقی ہوں صاحب تم متقی بنائے گئے ہو ورنہ کیا مجال تھی غرض یہ محض خدا کا فضل ہے کہ اس نے قلوب اپنے قبضہ میں رکھے جس سے ہمارے تقویٰ کا نام روشن ہے۔ اب اس حقیقت پر نظر کر کے معلوم ہوگا کہ سارا کام اللہ تعالیٰ ہی کرتے ہیں۔

ادائیگی فرض پر انعام

صاحبو! ایسی مثال آپ کو مخلوق میں نہیں مل سکتی کہ کوئی سارے کام میں اول سے آخیر تک آپ کی امداد کرے پھر اس پر انعام بھی دے یوں تو ہر کام میں ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی مدد سے انجام پاتا ہے مگر روزہ میں اللہ تعالیٰ نے خاص اطور پر اپنی امداد و اعانت کو ظاہر فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (اللہ تعالیٰ کو تم سے آسانی مطلوب ہے اور تنگی مطلوب نہیں) دوسرے جملہ کے معنی یہ ہیں کہ یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (تم سے تنگی چاہتے ہیں) کیونکہ یُرِیْدُ بِکُمُ الْیُسْرَ (تم سے آسانی چاہتے ہیں) کے بعد اس کا آنا اسی بات کو چاہتا ہے کہ یہ بمنزلہ تاکید کے ہے اور تاکید یسر یہی ہے کہ عسر رفع ہو جائے کیونکہ ہر وجودی شے کا تحقیق ثبوت شرائط پر جس طرح موقوف ہے اسی طرح رفع موانع پر بھی موقوف ہے اسی وجہ سے یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ میں امر وجودی کو بیان کیا گیا اور لَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (تم سے تنگی نہیں چاہئے) میں امر عدمی یعنی ارتفاع اضداد و موانع کو بیان کیا گیا پس لَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ سے یرید بکم عدم العسر (تم سے عدم تنگی چاہتے ہیں) کا مفہوم ہونا ایسا ہے جیسا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ۝ (اللہ تعالیٰ کو تمہارے لئے آسانی منظور ہے) سے یبغض الکافرین کا مراد ہونا ترجمہ ان دو جملوں کا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ روزہ میں تم کو آسانی دینا اور تنگی کا رفع کرنا چاہتے ہیں اس کے بعد ارشاد ہے وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ (اور تاکہ تم شمار پورا کرو) اس جملہ میں ایک عجیب بات غور کرنے کی ہے وہ یہ کہ اس میں واؤ عطف کا ہے اور لام غایت کا ہے واؤ عطف معطوف علیہ کو چاہتا ہے اور لام غایت عامل کو چاہتا ہے پس یہاں دو تقدیریں ہیں ایک لِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ کا عامل دوسرا اس عامل کا معطوف علیہ پس عامل یہ ہے کہ یسر بکم جو یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ (اللہ تعالیٰ کو تمہارے لئے آسانی منظور ہے) سے مفہوم ہوتا ہے اور معطوف علیہ یہ ہے کہ شرع بکم الاحکام المذکورۃ جو اوپر کی آیتوں سے مفہوم ہے مشہور توجیہ یہی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

تمہارے لئے روزہ کو مشروع کیا اور اس کے احکام میں سہولت کی رعایت کی تا کہ تم ایک مہینہ کی شمار پوری کرلو کیونکہ اس شمار کے پورا کرنے میں تمہارے واسطے منافع ہیں اس سے یہ لازم آیا کہ اکمال عدت مقصود ہے کیونکہ اس پر لام غایت داخل ہوا ہے اور ہر کام میں غایت زیادہ مطمع نظر ہوتی ہے کیونکہ وہ مقصود ہے مگر اس تقدیر مشہور میں صرف اکمال عدت کی مقصودیت ثابت ہوئی یسر کی مقصودیت ثابت نہ ہوئی حالانکہ ظاہراً اثبات یسر زیادہ مہتم بالشان معلوم ہوتا ہے اس لئے دوسری توجیہ یہ ہے کہ یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ کو قوت میں اسی جملہ کے کیا جاوے کہ **یرید بکم الیسر** اور اس کا عامل شرح الخ کو کہا جاوے پس کلام کا حاصل یہ ہوگا کہ **شرع الله لکم ماذکر لیرید بکم الیسر والیرفع عنکم العسر والتکملوا العدة** کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کے احکام مذکورہ کو اس لئے مشروع کیا کہ وہ تم کو آسانی دینا اور تنگی رفع کرنا چاہتے ہیں اور اس لئے مشروع کیا تا کہ تم شعار کو پورا کرلو اس صورت میں دو مقصود ہوئے ایک یسر کہ اول مذکور ہونے کے سبب اصلی مقصود ہوا اور دوسرا اکمال عدت کہ تاخر فی الذکر دوسرے درجہ میں مقصود ہوا کیونکہ عادۃ یہی ہے کہ اگر کوئی عارض نہ ہو تو اہم کو ذکر میں مقدم رکھتے ہیں۔ پس آسانی اسی توجیہ پر غایت درجہ کی آیت کی مدلول ہوگی کیونکہ مدخول لام ہونے کا سبب وہ خود بھی مقصود ہوگی اگرچہ ثواب وقرب ورضا مقصود المقصود ہے مگر آسانی بھی فی نفسہ مقصود ہوگی اس تقدیر پر صرف عامل مقدر ہوگا باقی معطوف علیہ ظاہر ہوگا اس لئے یہی اولیٰ ہے اور ہر حال میں یسر ثابت ہے۔

نتائج یسر

اب اس ثبات یسر پر جو نتائج مرتب ہوتے ہیں ان کو بیان کرتا ہوں اول یہ کہ بے روزوں کو شرم کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تو صاف وعدہ فرماتے ہیں کہ ہم روزوں میں تم کو آسانی دینا چاہتے ہیں تنگی کو رفع کرنا چاہتے ہیں اور یہ لوگ روزہ میں دشواری ظاہر کر کے ناحقیقت شناس مخالفین کو فرمان خداوندی پر ظاہراً اعتراض کا موقع دیتے ہیں ارے ظالمو! تم نے روزہ رکھ کر تو دیکھا ہوتا اس کے بعد ہی اس کو دشوار کہا ہوتا سب سے اول تو روزہ میں روحانی یسر آپ کو عطا ہوتا کہ اس سے دلچسپی ہوجاتی پھر جسمانی یسر بھی حاصل ہوتا غرض اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتے ہیں کہ ہم روزہ کو آسان کردیں گے اور مراد کا ارادہ الٰہیہ تخلف ہو نہیں سکتا تو یہ مراد یقیناً محقق ہوگی۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کانپور میں ایک شخص نے چالیس سال تک روزہ نہیں رکھا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ تو بہت آسان چیز ہے تم رکھ کر تو دیکھو پھر چاہے رکھنے کے بعد درمیان میں دشواری معلوم ہوگی توڑ دینا انہوں نے رکھا اور روزہ پورا ہوگیا تو بعد میں اقرار کیا کہ واقعی بہت آسان چیز ہے پھر رکھنے لگے یہ روزہ کی

خاصیت ہے کہ اس میں ترک طعام وشرب آسان ہو جاتا ہے اگر کوئی بدون نیت صوم کے دن بھر بھوکا پیاسا رہنا چاہے تو بہت دشوار ہے مگر نیت کے بعد آسان ہو جاتا ہے۔

ان دونوں صورتوں میں وجہ فرق صرف یہی ہے کہ پہلی صورت میں صوم نہیں اور دوسری صورت میں صوم ہے شاید کسی کو یہاں یہ شبہ ہو کہ روزہ میں تو پاس ہو گیا کہ اب شام تک کھا پی نہیں سکتے اس لئے آسان ہو گیا اور بدون نیت کے امساک عن الطعام اختیاری ہوتا ہے۔ اس لئے صبر نہیں آتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات صحیح ہے مگر ایک دوسرا طبعی قاعدہ اس کے معارض ہے وہ یہ کہ امر کے بعد کام دشوار ہو جاتا ہے اور آزادی میں تکلیف نہیں ہوتی دوسرے وہاں بھی یہ فرض کر لیا جائے کہ کھانے پینے سے کوئی مانع قوی موجود ہو مثلاً طبیب نے کھانے پینے سے منع کر دیا ہو تو باوجود صبر آ جانے کے پھر بھی روزہ کے برابر فاقہ میں سہولت نہیں ہوتی اس پر شاید یوں کہا جائے کہ مخلوق کا منع کرنا خالق کے منع کرنے کے برابر تھوڑا ہی ہے اس لئے وہاں صبر نہیں آتا اور یہاں آ جاتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ فرض خدا ہی کے امر کی وجہ سے تو ہوا پس ہمارا مدعا ثابت ہو گیا کہ روزہ کو اللہ تعالیٰ آسان کر دیتے ہیں گو اس کی یہی صورت ہوئی کہ روزہ دار کے دل میں روزہ کی عظمت پیدا کر کے اس کو صبر دے دیا بہرحال روزہ بہت آسان ہے اب جو لوگ روزہ نہیں رکھتے ان کی کم ہمتی پر افسوس ہے کہ ایسا کام بھی ان سے نہیں ہوتا جس کے آسان کر دینے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرما لیا ہے اور مشاہدہ بھی کرا دیا اب آیت کا مطلب سنئے۔ حاصل آیت کا یہ ہوا **شرع الله لكم الصوم لليسر واكمال العدة ولتكبروا الله على ما هدٰكم** جس میں متعدد غایات ہیں اور ایک غایت پر دوسری غایت مرتب چلی آتی ہے اس میں خدا تعالیٰ کی ایک نعمت تو یہ ہے کہ روزہ کو مشروع کیا ورنہ ہم کیسے رکھتے۔ دوسرے یہ کہ اس کو آسان کر دیا تیسرے یہ کہ احکام میں ایسی رعایت فرمائی جس سے شمار کا پورا کرنا آسان ہو گیا اس کے بعد خدا تعالیٰ کی عظمت دل میں آتی ہے تو اس پر خدا کی تکبیر کہو گے یہ چوتھی نعمت ہے۔

گناہ کی نحوست

اب اس کا دشوار ہونا ایسا ہے جیسا ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میاں لا الہ الا اللہ سے زیادہ کیا چیز آسان ہو گی مگر کفار کے لئے یہ سب سے زیادہ دشوار ہے تو اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جن لوگوں کو آسان ہے وہ خدا تعالیٰ کا فضل ہی ہے ورنہ ہم لوگ اپنی قوت سے کوئی کام نہیں کر سکتے۔ جب تک اللہ تعالیٰ اس کو آسان نہ کر دیں۔ عوارف میں ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ کسی زمانہ میں ان کی زبان سے کوئی کلمہ نہ نکلا اور سب باتیں کر سکتے مگر لا الہ الا اللہ نہ کہہ سکتے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر لرز گئے جناب باری میں دعا کی کہ یہ میرے کس گناہ کی سزا

ہے مجھے بتلایا جائے الہام ہوا کہ فلاں زمانہ میں تم نے فلاں کلمہ کہا تھا اور اب تک اس سے استغفار نہیں کیا اس لئے آج اتنے برس کے بعد ہم نے اس کی سزا دی یہ فوراً سجدہ میں گر پڑے اور توبہ کی تو فوراً زبان کھل گئی اسی واقعہ سے سمجھنا چاہیے کہ کبھی طاعت کی دشواری کا سبب دوسرے معاصی بھی ہو جاتے ہیں اس کا علاج توبہ استغفار ہے کبھی دشواری کا سبب وحشت بھی ہوتی ہے کہ ذکر اللہ سے وحشت ہو۔ وحشت کی وجہ سے اللہ اللہ نہ کہہ سکے آپ بہت لوگوں کو دیکھیں گے کہ وہ بہت وقت بیکار ضائع کرتے ہیں مگر ذکر اللہ کے لئے ان کی زبان نہیں اٹھتی اس سبب کا سبب بھی وہی معصیت ہے کہ اس کی وجہ سے ان کے دل کو ذکر اللہ سے وحشت ہوتی ہے اسی کو ایک شاعر کہتا ہے ۔

احب مناجاة الحبیب باوجه ولکن لسان المذنبین کلیل

ترجمہ: دوست سے سرگوشی کرنے کے کئی طریقے ہیں لیکن نافرمانوں کی زبان نہیں چلتی۔

قبولیت توبہ کی علامت

اسی واسطے بے ضرورت گناہوں کو یاد کرنا اپنے ہاتھوں وحشت کا سامان کرنا ہے اسی کے متعلق شیخ ابن عربی نے لکھا ہے کہ گناہ معاف ہو جانے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ گناہ دل سے مٹ جائے اور جب تک وہ مٹے گا نہیں قلب پر وحشت سوار رہے گی جو اس گناہ کی سزا ہے اس کی شرح میں مشائخ طریق کا ارشاد ہے کہ گناہ کے بعد جی بھر کے توبہ کر کے پھر اس کو جان جان کر یاد نہ کرے اس سے بندہ اور خدا کے درمیان ایک حجاب سا معلوم ہونے لگتا ہے جو محبت اور ترقی سے مانع ہے۔ ایسی ہی دو دوستوں میں کچھ رنجش ہو جائے پھر صفائی کے بعد اس کو بار بار یاد نہ کرے۔ غرض توبہ کے لئے تو گناہ کو یاد کرے مگر توبہ کے بعد پھر اس کو یاد نہ کرے بلکہ دل سے نکال دے ورنہ اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے ایک شخص کو تحصیلداری مل جائے اور وہ روز روز اپنے افسر سے یوں کہے آپ مجھے برخاست تو نہیں کریں گے ظاہر ہے کہ اس حرکت سے افسر کا دل ضرور افسردہ ہوگا اور پہلے خود اس کا دل افسردہ ہوگا جب ہی تو اس کی زبان سے بار بار یہ کلمہ نکلتا ہے پس حق تعالیٰ تو تاثر سے بری ہیں مگر تم تو متاثر ہو گے جب تم بار بار گناہ کو یاد کر کے دل کو افسردہ کر لو گے اور محبت میں ترقی نہ کر سکو گے تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ وہاں سے بھی عطا میں کمی ہوگی کیونکہ جزا و ثمرات کا ترتب عمل پر ہوتا ہے خواہ عمل جوارح ہو یا عمل قلب ہو خوب سمجھ لو۔

گناہوں کے یاد کرنے پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا حاجی عبدالرحیم صاحب سہارنپوری ایک قصہ فرماتے تھے کہ حج کے موسم میں ایک شخص جمرہ عقبہ پر بجائے کنکریوں کے جوتے مار رہا تھا اور

کہتا جا رہا تھا کہ مردود شیطان تو نے مجھ سے فلاں دن یہ گناہ کرایا یہ کہتا جاتا اور جوتے مارتا جاتا تھا۔ یہ حرکت بہت بری تھی ایک تو گناہوں کا یاد کرنا پھران کو ظاہر کرنا۔ بعض لوگ توبہ کر کے ڈرتے رہتے ہیں کہ مبادا توبہ ٹوٹ جائے۔ یہ فکر بھی اچھا نہیں مولانا اس کو بھی حجاب فرماتے ہیں۔

ماضی و مستقبلت پردہ خداست

ترجمہ: تیرا ماضی و مستقبل خدا کے پردے میں ہے۔

یہ خوف بھی چھوڑ دینا چاہیے۔ صفائی کے وقت کدورتوں کو یاد نہ کرنا چاہیے اس سے کبھی ایسی وحشت سوار ہوتی ہے کہ ذکر اللہ بھی نہیں کر سکتے لیکن اگر از خود یہ چیزیں یاد آ جائیں تو پھر تجدید استغفار و دعا ضروری ہے۔ یہ تو ذکر نہ کر سکنے کا وہ سبب تھا جو اکثری ہے۔

آثار غایت قرب

اور کبھی ذکر نہ کر سکنے کا سبب کسی حالت محمودہ کا غلبہ بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ جس زمانہ میں وہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کی خدمت میں ذکر و شغل کے لئے مقیم تھے اس وقت اور سب حضرات اپنا اپنا حال حضرت حاجی صاحب سے عرض کرتے تھے مگر مولانا کچھ عرض نہ کرتے تھے تو ایک دن حاجی صاحب نے خود فرمایا کہ مولانا سب لوگ اپنی اپنی حالت بیان کرتے ہیں آپ کچھ نہیں کہتے۔ اس پر مولانا نے آبدیدہ ہو کر عرض کیا کہ حضرت میں کیا حال عرض کروں مجھ سے تو وہ کام بھی پورا نہیں ہوتا جو حضرت نے بتلا رکھا ہے۔ بس ذکر کرنے بیٹھتا ہوں ایسا بوجھ طاری ہوتا ہے کہ زبان و قلب دونوں بند ہو جاتے ہیں حضرت کے فیض میں تو کمی نہیں مگر میری کم نصیبی ہے۔

تہیدستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

ترجمہ: قسمت کے بروں کو کامل رہنما سے بھی فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ خضر سکندر کو آب حیات کے چشمہ سے بھی خالی واپس لایا تھا۔

حاجی صاحب نے اس حال کو سنتے ہی فرمایا کہ مولانا مبارک ہو یہ علوم نبوت کا ثقل ہے جو آپ کو عطا ہونے والے ہیں اور یہ اسی ثقل کا نمونہ ہے جو نزول وحی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوتا تھا اس وقت و زبان کا ذکر سے بند ہو جانا غایت قرب کی وجہ سے ہے جس کو شاعر کہتا ہے۔

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آ جائے ہے تھامتا ہوں دل کو پر ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

اور جب دل کی یہ حالت ہوتی ہے تو زبان بھی نہیں اٹھتی۔ اس واقعہ سے حضرت حاجی صاحب کا شیخ و مجتہد اور مجدد فن ہونا ظاہر ہوتا ہے حضرت حاجی صاحب نے یہ تشخیص ایسے وقت فرمائی جبکہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے علوم کا ظہور بھی نہ ہوا تھا بعد میں حاجی صاحب کے ارشاد کی تصدیق ظاہر ہوئی اور اگر حاجی صاحب یہ تشخیص نہ فرماتے تو مولانا تو اس حالت کو بعد ہی سے ناشی سمجھتے رہتے حاجی صاحب ہی کا کام تھا کہ ایسے ایسے جلیل القدر علماء کو سنبھالتے تھے۔

دوسرا قصہ حضرت شیر خاں صاحبؒ کا ہے جو میاں جی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں تھے جب ان کا انتقال ہونے لگا نزع کی حالت شروع ہوئی تو لوگوں نے ان کو کلمہ طیبہ تلقین کیا وہ اس سے منہ پھیر لیتے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر لوگ گھبرا گئے اور میاں جی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بلایا میاں جی صاحب نے پوچھا کہ شیر خاں کیا حالت ہے۔ فرمایا الحمد اللہ اچھا ہوں۔ اس کے بعد فرمایا کہ ان لوگوں کو منع کر دیجئے کہ مجھے مسمی سے اسم کی طرف متوجہ نہ کریں۔ حضرت میاں جی صاحب نے لوگوں سے کہا کہ ان کو پریشان نہ کرو یہ مشاہدہ مسمی میں مستغرق ہیں تم ان کو مسمی سے اسم کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہو سچ ہے ؎

درنیابد حال پختہ ہیچ خام   پس سخن کوتاہ باید والسلام

ترجمہ:۔ اگر ایک خام کسی پختہ حال معلوم نہ کر سکے تو بات کم کر دینی چاہیے۔ کامل کی حالت کا ناقص کو علم نہیں ہوسکتا۔ انبھیٹہ میں حضرت حاجی صاحب کے ایک مرید تھے اور ان کے بڑے بھائی خاندان نقشبندیہ کے شیخ تھے وہ ان سے کہا کرتے تھے کہ تم مجھ سے بھی کچھ حاصل کر لو ورنہ پچھتاؤ گے وہ جواب دے دیا کرتے میرے شیخ مجھے کافی ہیں مجھے کسی سے رجوع کی حاجت نہیں اتفاق سے ان چھوٹے بھائی کا انتقال ہونے لگا تو ان کی بھی یہی حالت ہوئی جو شیر خاں صاحب کی حالت تھی کہ لوگ ان کو کلمہ پڑھانا چاہتے تھے اور یہ نہیں پڑھتے تھے اس کی اطلاع بڑے بھائی کو ہوئی وہ آئے اور ان سے کہنے لگے کہ میں تم سے نہ کہتا تھا کہ مجھ سے بھی کچھ حاصل کر لو مگر تم نے نہ مانا دیکھا اب کیا حالت ہے کہ کلمہ بھی نہیں پڑھ سکتے اس پر انہوں نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور بڑے جوش میں یہ آیت پڑھی۔ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۙ بِمَا غَفَرَلِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ حالانکہ یہ شخص ترجمہ قرآن سے واقف نہ تھے اس وقت اس کی زبان سے اس آیت کا نکلنا صاف اس کی دلیل تھی کہ غیب سے اس کی زبان پر یہ آیت جاری کی گئی ہے۔ یہ جواب سن کر وہ شیخ شرمندہ ہو گئے اور حاجی صاحب کے سلسلہ والوں کو خاص مسرت ہوئی۔ بہر حال کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ

غایت قرب کی وجہ سے زبان ذکر سے بند ہو جاتی ہے اس لئے نزع کی حالت میں کوئی مسلمان اگر کلمہ نہ پڑھے تو اس سے بدگمان نہ ہونا چاہیے ممکن ہے اس کی وجہ غایت قرب ہو۔

طاعت پدری

اور کبھی گناہ کی وجہ سے بھی طاعات بند ہو جاتی ہیں چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ اور جیسے گناہوں میں یہ اثر ہے کہ طاعات کو بند کر دیتے ہیں ایسے یہ طاعات میں یہ بھی اثر ہے کہ ان کی وجہ سے دوسری طاعات ہونے لگتی ہیں۔ بلکہ اس کا اثر اولاد میں بھی پہنچتا ہے باپ کی طاعات سے اولاد کو بھی طاعات کی توفیق ہوتی ہے مگر گناہ کا اثر اولاد میں نہیں پہنچتا ہاں دنیوی تکلیف کچھ پہنچ جاتی ہے طاعات کا یہ بھی اثر ہے کہ ان کی برکت سے گناہ کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے بلکہ بعض دفعہ گناہ مقدر (بتقدیر معلق) بھی ٹل جاتا ہے چنانچہ حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید تھا بہت نماز تہجد گزار پابند ذکر و شغل اس کو ایک رات میں ستر بار احتلام ہوا وہ بڑا پریشان ہوا کہ یہ کیا مصیبت ہے ساری رات غسل ہی میں گزر گئی نہ تہجد رہا نہ ذکر و شغل صبح کو شیخ سے حالت عرض کی فرمایا کہ تم اس حالت سے مغموم مت ہو مجھے معلوم ہوا تھا کہ تیری تقدیر میں ستر دفعہ زنا کرنا لکھا ہوا ہے میں نے دعا کی تھی کہ اے اللہ اس بلا سے نجات دیجئے اللہ تعالیٰ نے میری دعا سے بیداری کے زنا کو خواب کے زنا کی طرف منتقل فرما دیا ہے جس میں گناہ ہی نہیں ہوا اب تم بے فکر رہو بڑی بلا ٹل گئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ جو کچھ ہم ذکر وغیرہ کر رہے ہیں اور آسانی سے کر لیتے ہیں یہ آسانی خدا تعالیٰ کی عطا ہے ورنہ بہت سی مخلوق ایسی بھی ہے جس کو ذکر کی توفیق نہیں اور ان کے لئے یہ کام سب سے زیادہ دشوار ہے اس پر میں نے استطراداً یہ بھی بتلا دیا تھا کہ بعض دفعہ ذکر سے زبان بند ہونے کا سبب غایت قرب بھی ہوتا ہے، بہرحال آپ کو جو کلمہ شریف پڑھنا آسان ہے یہ خدا کی بہت بڑی نعمت ہے ورنہ کبھی یہ بھی بند ہو جاتا ہے۔

توفیق ذکر

اس لئے حضرت حاجی صاحب سے جب کوئی ذاکر یہ عرض کرتا کہ ذکر سے نفع نہیں معلوم ہوتا تو حضرت یہ جواب دیا کرتے کہ یہ تھوڑا ہے کہ خدا کا نام زبان سے نکل رہا ہے اور یہ شعر پڑھتے۔

یا بم اورا یا نیابم جستجوئے می کنم حاصل آید یا نیاید آرزوئی می کنم

ترجمہ: اس کو پاؤں یا نہ پاسکوں جستجو کرتا ہوں حاصل ہو یا نہ ہو آرزو تو کرتا ہوں ذاکرین

اس جواب کی قدر کریں کیونکہ شیطان ان کو اس قسم کے دھوکے بہت دیا کرتا ہے چنانچہ مثنوی میں ایک ذاکر کا قصہ لکھا ہے کہ ایک رات اس کو شیطان نے بہکایا کہ تم کو ذکر کرتے تہجد پڑھتے برس گزر گئے مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ پیام ہے نہ سلام ہے جب وہ پوچھتے ہی نہیں تو کیوں سر مارا یہ وسوسہ نہ آتا تھا کہ اس نے اس رات کا تہجد وذکر موقوف کر دیا مگر چونکہ خدا کا محبوب بن چکا تھا گو خود اسے اپنی حالت کی خبر نہ تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے دستگیری فرمائی کہ خواب میں ایک لطیفہ غیبی نے آ کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سوال کیا آج تم نے ہم کو کیوں بھلا دیا اس نے وہی جواب دیا جو شیطان نے پڑھایا تھا کہ آپ کو یاد کرتے کرتے برس گزر گئے جب آپ نے خبر ہی نہ لی تو میں نے سوچا کہ مجھے ہی سر مارنے کی کیا ضرورت ہے لطیفہ غیبی نے جواب دیا۔

گفت آں اللہ تو لبیک ماست　　　　دیں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

کہ میاں ایک بار اللہ کہہ کر جو تم کو دوبارہ اللہ کہنے کی توفیق ہوگئی تو یہی ہمارا جواب ہے اگر پہلا ذکر قبول نہ ہوتا تو ہم زبان کو ذکر سے بند کر دیتے حضرت حاجی صاحب نے اس کو خوب روشن کر کے بیان فرمایا اگر ایک حاضری میں بادشاہ ناراض ہو جائے تو کیا دوسری بار وہ دربار میں گھسنے دے گا ہرگز نہیں پس جب تم ایک مرتبہ نماز کے لئے مسجد میں آ گئے اس کے بعد پھر توفیق ہوئی تو سمجھ لو کہ پہلی نماز قبول ہوگئی اور تم مقبول ہو مردود ہوتے تو دوبارہ مسجد میں گھسنے نہ دیتے کیونکہ ایسی بھی خدا کی مخلوق بہت ہے جو مسجد سے روک دی گئی ہے چنانچہ ایک قصائی کا بچھڑا مسجد میں گھس گیا تھا مسجد کا ملا جھلانے لگا کہ لوگ جانوروں کو مسجد میں چھوڑ دیتے ہیں تو وہ قصائی کہنے لگا ارے ملا اتنا خفا کیوں ہوتا ہے یہ تو بیوقوف جانور تھا جو مسجد میں چلا آیا کبھی تو ہمیں بھی مسجد میں آتا ہوا دیکھا ہے۔

ایک اور واقعہ کتاب میں دیکھا ہے کہ ایک آقا بے نماز تھا اور غلام نمازی تھا دونوں بازار میں جا رہے تھے کہ نماز کا وقت آ گیا غلام نے آقا سے اجازت مانگی کہ میں ذرا نماز پڑھ آؤں آپ تھوڑی دیر ٹھہریں آقا صاحب مسجد کے باہر بیٹھ گئے وہ اندر جا کر نماز میں مشغول ہوا پھر وظیفہ پڑھنے لگا جب سب نمازی چلے گئے اور بہت دیر ہوگئی تو آقا نے باہر ہی سے آواز دی کہ میاں کہاں رہ گئے آتے کیوں نہیں غلام نے جواب دیا کہ آنے نہیں دیتا آقا نے کہا کون نہیں آنے دیتا کہا جو تم کو اندر نہیں آنے دیتا وہ مجھ کو باہر نہیں آنے دیتا۔

عبدیت وتفویض

حضرت جو کچھ آپ سے نماز روزہ ہو جاتا ہے یہ سب انہیں کا کرایا ہوا ہے اگر وہ توفیق نہ

دیں تو سب کام رہ جائے قرآن میں ارشاد ہے وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ (اور اگر وہ لوگ چلنے کا ارادہ کرتے تو اس کا کچھ سامان تو درست کرتے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے جانے کو پسند نہیں کیا اس لئے ان کو توفیق نہیں دی اور یوں کہہ دیا گیا کہ اپاہج لوگوں کے ساتھ تم بھی یہاں ہی بیٹھ رہو پ۱۰ ع ۱۳) کہ اللہ تعالیٰ نے غزوہ تبوک میں منافقین کا جانا نہ چاہا تو وہ اس کا سامان بھی نہ کر سکے بلکہ ارادہ بھی نہ کر سکے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو وہ ارادہ کر لیتے اور سامان بھی کرتے پس تم اپنی سعی پر ناز نہ کرو بلکہ تفویض سے کام لو مگر تقدیر کے مسئلہ میں زیادہ غور وخوض بھی نہ کرو اور میں نے جتنا بھی اس کے متعلق بیان کیا ہے محض اس ضرورت سے بیان کیا ہے کہ اپنے علم وعمل پر ناز نہ ہو کہ بندہ کے کسب واختیار کی نفی کرنے کے لئے حضرات صحابہ جب ایسے واقعات سے گھبرائے تو حضور ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم کیا کریں حضور نے فرمایا۔ قولوا حسبنا الله و نعم الوكيل (کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ ہم کو کافی ہے وہی بہت اچھا محافظ ہے) بس خدا پر نظر رکھو اور تفویض سے کام لو۔

بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست آنجا جزایں کہ جاں بسپارند چارہ نیست

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا تھا کہ اگر آسمان کمان ہو اور حوادث تیر ہوں اور اللہ تعالیٰ تیر چلانے والے ہوں تو اس سے کیوں کر بچا جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ تیر چلانے والے کے پاس کھڑا ہو جائے بچا رہے گا کیونکہ تیر دور والے پر چلتا ہے نہ کہ پاس والے پر افلاطون اسی جواب سے دنگ رہ گیا اور کہا یہ جواب نبی کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔ پس اس میں غور وخوض نہ کرو غور کرنے سے یہ مسئلہ اور پیچیدہ ہو گیا۔

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ جز شکستہ مے نہ گیرد فضل شاہ

ترجمہ: عقل کو تیز کرنے سے کچھ نہیں بنتا شکستہ دل خدا کے فضل سے بہرہ یاب ہوتے ہیں۔

اگر اس مسئلہ میں شفا چاہتے ہو تو عبدیت اور تفویض اختیار کرو اسی سے ان شاء اللہ تسلی ہو جائے گی عقل کو تو بہت آزما لیا اب خدا کے حوالہ کر کے دیکھو مولانا فرماتے ہیں

آزمودہ عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

ترجمہ: میں نے اپنی دور اندیش عقل کو آزما لیا ہے اور اسی وجہ سے اپنے آپ کو دیوانہ بنا لیا ہے۔

حضرت بہت سے واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ تمام تدبیریں ختم ہو جاتی ہیں اور کام نہیں چلتا پس گرہ اس وقت کھلتی ہے جب بندہ یوں کہتا ہے کہ اے اللہ آپ ہی اس کام کو پورا کریں گے میں

عاجز ودرماندہ ہوں۔ پس خوب سمجھ لو یہ تیسیر بھی بڑی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کام کو ہمارے لئے آسان کردیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ میں ہم کو اس نعمت پر متنبہ فرمایا ہے کہ یہ احکام اس واسطے مشروع کئے ہیں کہ ان کو تمہارے واسطے آسان کردیں اور گنتی پورا کرنے کی توفیق دیں پس تم اس کو دشوار نہ سمجھو اور نہ اس کی فکر کرو کہ تیس دن کیوں کر پورے ہوں گے اس کے بعد ارشاد ہے وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَاھَدٰکُمْ یعنی اور تاکہ ان نعمتوں پر تم خدا کی بڑائی ظاہر کرو یہاں اللہ تعالیٰ نے ھدکم فرمایا ہے۔ شرع لکم نہیں فرمایا کیونکہ ھدکم سب نعمتوں کو شامل ہے تشریعی نعمتوں کو بھی اور تکوینی نعمتوں کو بھی اور یہاں دونوں قسم کی نعمتیں مذکور ہوئی ہیں کیونکہ تیسیر والکمال عدۃ تکوینی نعمتیں ہیں تو ان سب نعمتوں پر جن کا میزان الکل ھدٰکم ہے خدا کی تکبیر کہو پھر یہاں لتحمد و اللہ (اور تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرو) نہیں بلکہ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ فرمایا کیونکہ اس سے حادثہ کی وقعت معلوم ہوتی ہے اور حادثہ عظیمہ پر ہمارے اندر تکبیر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے نہ کہ حمد کا۔

بروقت امداد

اور قرآن شریف میں ہمارے محاورات وجذبات کی بہت رعایت کی گئی ہے میں نے اسی قاعدہ سے ایک لڑکی کے سوال کا جواب دیا تھا۔ ایک مرتبہ جب میں گھر کی لڑکیوں کو تفسیر قرآن پڑھا رہا تھا یہ آیت آئی قَاتَلَھُمُ اللّٰہُ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ خدا ان مدعیان اتخاذ ولد کو برباد کرے کہاں بہکے جارہے ہیں تو ایک لڑکی نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کو کوسنے کی کیا ضرورت ہے وہ تو عملاً سب کچھ کرسکتے ہیں کوسے تو وہ جو عملاً کچھ نہ کرسکے میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کو تو کوسنے کی ضرورت نہیں مگر اس جگہ کفار کی جیسی حالت وشرارت مذکور ہے اس کو سن کر خود ہماری طبیعت میں کوسنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے ہمارے جذبات کو دبانا نہیں چاہا بلکہ اس کی رعایت فرما کر خود ہی فرمادیا قَاتَلَھُمُ اللّٰہُ اگر وہ نہ فرماتے تو ہم قرآن میں خود اس کو نہ بڑھا سکتے تو ہمارا جذبہ دبا رہتا اللہ تعالیٰ نے ہمارے جذبات کو پامال کرنا گوارا نہیں فرمایا بلکہ جو بات ہم کہتے خود ہی ہماری طرف سے فرمادی تاکہ اس کی تلاوت کرنے سے ہمارا جذبہ پورا ہوجائے یہ جواب اسی وقت قلب میں القا ہوا اس سے پہلے میں نے کسی جگہ یہ جواب منقول نہیں دیکھا تھا۔

اس جواب کی قدر مجھے بعد میں معلوم ہوئی کیونکہ اس سے اور بہت سے اشکالات رفع ہوئے بعض دفعہ اللہ تعالیٰ وقت پر ایسی امداد فرماتے ہیں کہ جس کا پہلے سے گمان بھی نہیں ہوتا چنانچہ ایک بڑی بی نے طاعون کے زمانہ میں ایک بچہ کی زبانی مجھ سے سوال کیا کہ عزرائیل تو ایک ہیں وہ ایک وقت

میں اتنی روحیں کیونکر قبض کر لیتے ہیں میں نے سوچا بچہ جواب کیا سمجھے گا مگر اللہ تعالیٰ نے ایک مثال میرے قلب میں ڈال دی جس کو بچہ بھی سمجھ کر نقل کر سکتا تھا میں نے کہا اس سے کہنا کبھی تم نے چاول بھی کھائے ہیں دیکھو ایک لقمہ میں ایک دم سے کتنے چاول آ جاتے ہیں ایک دفعہ منہ میں رکھی لیتی ہو وہ بچہ بھی ہنسنے لگا اور سائلہ کی بھی تسلی ہو گئی۔ غرض اس مقام پر لِتُكَبِّرُوا اللهَ ہمارے جذبات کی رعایت سے فرمایا گیا ہے کہ یہ نعمتیں بڑی ہیں اور بڑی نعمت کو دیکھ کر ہم کو اللہ اکبر کا تقاضا ہوتا ہے نہ الحمد للہ کا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس جذبہ کی ایسی رعایت فرمائی کہ تکبیر کو ہماری رائے پر نہیں چھوڑا بلکہ خود مشروع کر کے دکھلا دیا چنانچہ عید کے روز تکبیر کہنا ضروری کر دیا گیا نماز عید کی ہر رکعت میں تین تکبیریں زیادہ کہی جاتی ہیں یہ تو واجب ہیں اور راستہ میں بھی عیدگاہ کو جاتے ہوئے تکبیر کہنا سنت ہے بعض آئمہ کے نزدیک جہراً اور ہمارے امام کے نزدیک سراً اور عجب نہیں کہ صلوٰۃ عید میں تین تکبیریں اس لئے ہوں کہ ایک بمقابلہ یسر کے ہے دوسری بمقابلہ رفع عسر کے تیسری بمقابلہ اکمال عدۃ کے۔

مقام شکر

اس کے بعد ارشاد ہے وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ اور یہ نعمتیں اس لئے تم کو عطا کیں تا کہ تم ان پر شکر کرو اور یہ عجیب نعمت کا بیان ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ **یسر و عدم عسر و اکمال عدۃ و تکبیر** ان سب پر شکر کرو اور شکر دوسری عبادات کے اعتبار سے تو ان عبادات کے متعلق ہے مگر فی نفسہ یہ خود بھی مستقل عبادت ہے اس لئے یہ خود بھی مطلوب اور مقصود ہے اس اعتبار سے یہ بھی ایک غایت ہے جس کے لئے **یسر و اکمال عدۃ** وغیرہ کو عطا کیا گیا۔ پھر چونکہ منعم کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے نعمتوں کا استحضار ہو کر منعم کی محبت دل میں پیدا ہوتی ہے اور محبت کے بعد محبوب سے قرب کا تقاضا ہوتا ہے تو اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے قرب کو بیان فرماتے ہیں وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اس تقریر سے تمام آیات و اجزاء آیات کا ربط بخوبی ظاہر ہو گیا اور جس طرح ان آیات کی تفسیر آج ذہن میں آئی ہے۔ اس سے پہلے کبھی نہیں آئی۔ آیت وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ کا ربط پہلی آیت سے مشہور یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہم کو صوم اور تکبیر و شکر وغیرہ کا امر کیا ہے تو ممکن ہے کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ نہ معلوم خدا تعالیٰ کو ہمارے ان افعال کی بھی خبر ہوتی ہے یا نہیں خصوصاً شکر قلب کی کیونکہ افعال قلبیہ مستور رہتے ہیں جن کی اطلاع دنیا میں تو کسی کو نہیں ہوتی اور چونکہ طبیعت انسانیہ قیاس الغائب علی الشاہد کی عادی ہے اس لئے بعض لوگوں نے سوال بھی کیا **اقریب ربنا فنناجیہ ام بعید فننادیہ** کیا ہمارا پروردگار ہم سے قریب ہے کہ

ہم اس سے خفیہ طور پر مناجات کرلیا کریں یا بعید ہے کہ پکارا کریں اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی یہ ربط بھی عمدہ ہے مگر ربط اول احسن ہے اور ربط مشہور تر اس آیت کا پہلی آیت کے متصل آنا امام ابوحنیفہ کے اس قول کی تائید کرتا ہے کہ تکبیر عیدالفطر راستہ میں سراً ہونا چاہیے جہر کی ضرورت نہیں رہی تکبیر صلوٰۃ تو وہ چونکہ قراءت کے متصل ہے اور قراءت جہری ہے اس لئے اتصال جہری کی وجہ سے اس میں بھی جہر ہوگیا دوسرے اس میں جہر کی یہ بھی وجہ ہے کہ مقتدیوں کو اعلام کی ضرورت ہے کہ اس وقت تکبیر کہہ رہا ہے تو وہ بھی اس کی اقتدا کریں اور تکبیر طریق میں ہر شخص مستقل ہے وہاں اعلام کی ضرورت نہیں اور تکبیر تشریق کا جہر خلاف قیاس نص سے ثابت ہے **لقوله صلى الله عليه وسلم الحج والعج والثج و في تكبير التشريق تشبيهه تلبية الحاج فافهم ۱۲ظ**)(سنن الترمذی: ۸۲۷، سنن الدارمی ۳۱:۲،مستدرک حاکم ۱:۴۵۰، المصنف لابن ابی شیبۃ ۴:۹۰) اور وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ کی بلاغت عجیب قابل دید ہے کہ نقل انی قریب یا فانہ قریب نہیں فرمایا بلکہ بلاواسطہ فانی قریب فرمایا ہے یہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص کسی سے سوال کرے کہ فلاں شخص کہاں ہے اور وہ بول پڑے کہ میں تو موجود ہوں اور یہ جب ہی ہوگا جبکہ مجیب کو سائل کے ساتھ خاص تعلق ہو اور اگر خاص تعلق نہ ہو تو وہ قریب ہوتے ہوئے بھی خود نہ بولے گا بلکہ جن سے سوال کیا گیا ہے ان سے کہے گا کہ اس سے کہہ دو وہ یہاں موجود ہے اور تعلق کی صورت میں ایسا نہ کرے گا خود بول پڑے گا کہ میں تو موجود ہوں اسی طرح یہاں حق تعالیٰ نے خود بلاواسطہ جواب دیا ہے کہ میں تو قریب ہوں حضورؐ سے نہیں فرمایا کہ ان سے کہہ دیجئے کہ میں قریب ہوں اس میں جس خاص تعلق کو ظاہر کیا گیا ہے اور وہ تعلق ایسی نعمت ہے کہ اس پر ہزار جانیں قربان کردیجائیں تو تھوڑا ہے۔

لسان حق

پھر اس جواب کا حضور کی زبان سے ادا ہونا بتلاتا ہے کہ رسول کا بولنا خدا ہی کا بولنا ہے۔

گرچہ قرآں از لب پیغمبر است ہرکہ گوید حق نگفت او کافراست
گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

ترجمہ: قرآن پاک اگرچہ پیغمبر کی زبان سے ادا ہوا مگر اس کا کہا خدا کا کہا ہے بظاہر اگرچہ اللہ کی بجائے اللہ کے بندے کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک شان تو مبلغ ہونے کی ہے اور دوسری شان لسان حق ہونے

کی ہے کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے لئے بمنزلہ لسان یعنی ترجمان کے ہیں اس عنوان سے گھبرایئے نہیں کیونکہ جب شجرہ طور لسان حق ہوگیا اور اس سے ندا آئی اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ (میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں تم میری ہی عبادت کرو) تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لسان حق ہونا تعجب خیز کیوں ہے پھر حدیث میں اہل قرب کے لئے آیا ہے **کنت بصره الذی یبصر به وسمعه الذی یسمع به ورجله الذی یمشی به** (میں اس کی آنکھ ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے کان ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کا پاؤں جس سے وہ چلتا ہے) اور ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مقرب کون ہوگا تو آپ کی یہ شان سب سے زیادہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مقرب کون ہوگا تو آپ کی یہ شان سب سے زیادہ ہے جو اس حدیث میں مذکور ہے خلاصہ ان اجزاء مرتبہ کا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو دیکھ کر خود بخود آپ کے دل پر شکر کا تقاضا ہوگا کہ آپ کی ہی مصلحت ونفع کے لئے صوم کو مشروع فرمایا پھر اس میں تشریعاً وتکویناً یسر وعدم عسر کی رعایت فرمائی تاکہ روزہ کی تکمیل ہوجائے اور تکمیل کے بعد اس نعمت پر تکبیر کہو اور شکر کرو پھر شکر سے محبت پیدا ہوگی اور محبت سے قرب حق کا تقاضا ہوگا تو اس آیت میں تسلی فرمادی کہ میں تم سے قریب ہوں مجھے تمہارے سب اعمال واقوال کی خبر ہے۔

حقیقت عبادت

اور اسی پر بس نہیں بلکہ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ میں ہر دعا کرنے والے کی دعا کو قبول کرلیتا ہوں۔

یہاں دعا سے مراد عبادت ہے دعائے ظاہری مراد نہیں جیسا آیۃ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ میں بقرینہ (جو لوگ میری عبادت کرنے سے تکبر کرتے ہیں ۱۲ پارہ ۲۴ رکوع ۷) اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ یہی عبادت مراد ہے اور عبادت دعا سے تعبیر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ بتلا دیا گیا کہ تمہاری عبادت کی حقیقت محض دعا والتجا ہے جیسے کوئی شخص ڈوبتا ہو تو وہ دوسروں کو پکارتا ہے پس آپ کی عبادت کا صرف یہ درجہ ہے اس کے بعد جو کچھ ہے حق تعالیٰ کی عطا وفضل ہے اگر ہم اپنی عبادت پر ناز کرنے لگیں تو اس کی مثال ایسی ہوگی ڈوبنے والے کی پکار سن کر کسی نے اس کو بچالیا ہو اور وہ ڈوبنے والا اس کے بعد فخر کرنے لگے کہ میں شناور ہوں ارے تجھے خبر بھی ہے کہ دوسرے نے تجھ کو بچالیا ورنہ محض پکارنے سے تو کہاں بچ سکتا تھا اور حقیقت میں ہمارا تو پکارنا بھی ان ہی کی عطا ہے اگر

وہ طلب دل میں پیدا نہ کریں تو ہم سے پکارنا بھی نہ ہوسکتا۔ مولانا فرماتے ہیں۔

ہم دعا از تو اجابت ہم زتو ایمنی از تو مہابت ہم زتو

ترجمہ: دعا بھی آپ کی طرف سے ہے عبادت بھی بے غمی بھی آپ کی طرف سے ہے ہیبت بھی۔

تصدیق وتعمیل

اس کے بعد فرماتے ہیں فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي کہ جب ہم تمہارا کام کردیتے ہیں اب تم بھی ہمارا کہنا مانو کہ میری باتوں کی تصدیق کرو اور عملاً اس کی تعمیل کرو لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ تاکہ تم کو رشد وفلاح حاصل ہو اور ہدایت میں ترقی ہو (یہ ترجمہ لفظی نہیں حاصل ہوا) اس میں بتلادیا کہ ہم جو تم سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارا کہنا مانو اس میں ہمارا کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس کا نفع بھی تمہارے ہی لئے ہے اب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ میرا کہنا مانو ایسا ہے جیسا ہم بچہ سے کہا کرتے ہیں کہ میاں ہماری ایک بات مان لو اور وہ یہ ہے کہ کھانا کھالو اس عنوان سے اس پر گرانی نہ ہوگی اور وہ اپنے کام تمہاری خاطر سے کرلے گا اسی طرح یہاں اللہ تعالیٰ نے جو کام بتلایا ہے وہ ہمارا ہی کام ہے ہمارے ہی فائدہ کا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا کیا ٹھکانا ہے کہ اس کا اپنا کام قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہمارا کہنا مان لو یہ تو مختصر طور پر سے آیت کی تفسیر تھی اور اصل مقصود اکمال کا بیان کرنا تھا۔

حقیقی روزہ

اب میں اصل مقصود کو مختصر طور پر بیان کرتا ہوں پس سنئے کہ اللہ تعالیٰ نے اکمال عدت کی مقصودیت کو بیان فرمایا ہے کہ ہم نے احکام صوم میں آسانی کی رعایت اس لئے کی ہے تاکہ اس مدت کو جو روزہ کے لئے مقرر کی گئی ہے پورا کرلو ہر چند کہ اس عنوان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکمال عدت خود مقصود ہے مگر درحقیقت خود اسی مقصود سے بھی مقصود دوسری چیز ہے جس کے لئے اکمال عدت ذریعہ ہے مگر اللہ تعالیٰ کی تعلیم کا طریقہ یہ ہے کہ ذرائع کو بھی مقصود بنا کر سکھلاتے ہیں تاکہ مخاطب ذریعہ کا پورا اہتمام کرے تو نتیجہ اس پر خود مرتب ہو جائے گا اور یہی اصول صوفیہ نے قرآن سے سیکھا ہے چنانچہ وہ طالبین کو یہی تعلیم کرتے ہیں کہ مقصود عمل ہے وصول مطلوب نہیں کیونکہ عمل اختیاری ہے اور وصول غیر اختیاری ہے تم عمل کے مکلف ہو اسی کو مقصود سمجھ کر بجالاتے رہو اس پر وصول خود مرتب ہو جائے گا اب سمجھئے کہ وہ مقصود کیا ہے جس کے لئے اکمال عدت اصل میں ذریعہ ہے وہ تقویٰ جس کو اللہ تعالیٰ نے صوم کے ذکر میں ابتداً ہی فرمایا ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ أَيَّامًا مَّعْدُودَٰتٍ
(اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا (اس توقع پر کہ تم پرہیز گاری کرو۔ تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو۔ پ۲ ع ۷) اور تقویٰ کی حقیقت ہے دنیا میں گناہوں سے بچنا اور آخرت میں عذاب سے نجات پانا یہ نفع ہے اکمال کا اس کے بعد یہ بھی سمجھئے کہ اکمال عدت کے دو درجے ہیں ایک اکمال ظاہری کہ رمضان کا پورا مہینہ روزہ میں تمام ہو جائے ایک اکمال معنوی کہ اس پر یہ غایت مرتب ہو جو اکمال سے مطلوب ہے پس روزہ کا حقیقی پورا کرنا یہ ہے کہ ہم ہر دن یہ دیکھتے رہیں کہ گناہوں سے کس قدر بچے اور آئندہ کے لئے کس قدر اہتمام کیا۔ اگر یہ غایت مرتب نہ ہوئی تو اکمال عدت محض ظاہری ہوگی حقیقی اکمال حاصل نہ ہوگا اسی لئے حدیث میں ہے **من لم یدع قول الزور والعمل به فلیس لله حاجةٌ ان یدع شرابه و طعامه (سنن ابی داؤد: ۲۳۶۲، سنن الترمذی: ۷۰۷، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۹۹۹)** جو شخص روزہ میں بیہودہ باتیں اور بیہودہ کام نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے بھوکا پیاسا رہنے کی کچھ پرواہ نہیں اس سے صاف معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو اکمال عدت کا یہ درجہ مطلوب ہے جس پر تقویٰ مرتب ہو پس ہم کو اپنی حالت کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ ہم رمضان میں گناہوں سے کس قدر بچے اور کتنا اس کا اہتمام کیا افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ ہم لوگوں کو روزہ میں گناہوں سے بچنے کا ذرا بھی اہتمام نہیں۔

اندیشہ ناقدری

ہماری حالت وہی ہے جو پہلے تھی بلکہ بعضوں کے تو رمضان میں گناہ پہلے سے بھی بڑھ گئے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کا مذاق یہ ہے

ہر گناہ ہے کہ کنی در شب ادینہ کن   تا کہ از صدر نشیناں جہنم باشی

ترجمہ: جو گناہ کرنا ہے شب جمعہ میں کر و تا کہ جہنم میں صدر نشین تو بن سکو۔

یہ وہ بے باک لوگ ہیں جن کو متبرک زمانہ میں بھی تنبہ نہیں ہوتا کہ اس زمانہ میں گناہ کرنے کا وبال اور دنوں سے زیادہ ہے، قاعدہ سے تو یہ چاہیے تھا کہ جن لوگوں نے ان متبرک دنوں کو یوں برباد کیا ہے ان کے لئے ان ایام کی مکافات کا کوئی طریقہ نہ ہوتا مگر خدا تعالیٰ کی رحمت بے انتہا ہے وہ اب بھی رحمت کرنے کو موجود ہیں اگر ان بقیہ دنوں کی درستی کر لی جائے اور اب تک کے گناہوں سے توبہ کر لی جائے۔ صاحبو! ہمیں اس رحمت کی قدر کرنا چاہیے ورنہ پھر یہ وقت شاید نہ

ملے۔ اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو ایک اور اندیشہ ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا نہ لگ جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو بددعا دی ہے جس نے رمضان میں بھی اپنے گناہوں کی مغفرت نہ کرائی ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین شخصوں کو بددعا دی ہے ایک وہ جس نے اپنے باپ ماں دونوں کو یا ایک کو ان کے بڑھاپے میں پایا اور ان کو خدمت وغیرہ سے راضی کر کے جنتی نہ بنا دوسرے وہ جس کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا گیا اور اس نے حضورؐ پر درود و سلام نہیں بھیجا تیسرے وہ جس نے رمضان کو ختم کر دیا اور اپنے گناہوں کی مغفرت نہیں کرائی۔ کیا حضورؐ کی بددعا سے بچنا ضرور نہیں اس لئے اس کا اہتمام کیا جائے اور پچھلے گناہوں سے توبہ کی جائے مگر قربان جایئے حضورؐ کے کہ گو آپؐ نے بظاہر ان لوگوں کو بددعا دی ہے مگر بددعا بھی ایسے عنوان سے ہے جس میں دعا کی بھی جھلک ہے کیونکہ آپ نے **رغم انفه رغم انفه (الصحیح لمسلم کتاب البر و الصلة:۱۰، مشکوٰة المصابیح:۴۹۱۲، کنز العمال: ۴۵۴۷۸)** فرمایا ہے کہ اس کی ناک خاک میں ملے یہ ایسی بددعا ہے جیسے قدسیہ بیگم والیہ بھوپال اپنی باندیوں کو غصہ میں کہا کرتی تھی کہ تمہاری چوٹی کٹواؤں گی تم کو گدھے پر سوار کراؤں گی پھر سب کو حج میں ساتھ لے گئیں اور وہاں احرام کھولتے ہوئے سب کی چوٹیاں کٹیں اور عمرہ لانے کے لئے گدھے پر بھی سوار ہونے کا موقعہ ہوا ہوگا۔ اسی طرح **رغم انفه** کے معنی یہ ہیں کہ اس کو سجدہ کی توفیق ہو اور یہ اس موقعہ کے مناسب بھی ہے کیونکہ گناہ بعد کا سبب ہے اور سجدہ قرب کا سبب ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ رمضان کا روزہ کے ساتھ پورا ہو جانا بڑی نعمت ہے کیونکہ اس سے ہم کو گناہوں سے بچنے کی توفیق ہوتی ہے اور آخرت میں جہنم سے نجات ہوگی پس ہم کو خوش اسلوبی کے ساتھ رمضان کو پورا کرنا چاہیے اور خوش اسلوبی یہی ہے کہ گناہوں سے بچنے کا پورا اہتمام کیا جائے۔

بلاغت قرآن

اب میں ختم کرنا چاہتا ہوں اور آخیر میں اتنی بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ آج میں نے جس طرح ان آیات کی تفسیر بیان کی ہے اس سے آپ کو معانی قرآن اور بلاغت قرآن کا اندازہ ہو گیا کہ قرآن کی تعلیم کیسی پاکیزہ ہے اس کا طرز بیان کیسا بلیغ ہے اس کی آیات واجزا آیات میں کیسا عجیب ربط ہے اس میں ہمارے جذبات کی کیسی رعایت ہے بس آج قرآن کا کچھ نمونہ آپ کے سامنے بیان کر کے میں یہ عرض کروں گا کہ میرا یہ بیان پہلے بیان سے مرتبط ہے جو شعبان میں ہوا تھا کہ اس میں الفاظ قرآن کے حسن کا بیان تھا آج معانی قرآن کے حسن کا بیان تھا حالانکہ میں

پوری طرح اس کے حسن کو بیان نہیں کر سکا مگر ان شاء اللہ کچھ نمونہ تو آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا جس کے بعد آپ یہ ضرور کہیں گے کہ قرآن کی شان یہ ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ می دارد   برنگ اصحاب صورت رابوار باب معنی را

ترجمہ: اس کے حسن کی بہار جان کو تازہ رکھتی ہے ظاہر پسندوں کو ظاہری حسن سے اور معنی شناسوں کو باطنی خوشبو سے۔

اور اس کی یہ شان ہے۔

مخدرات سرا پردہ ہائے قرآنی   چہ دلبر ندکہ دی می برند پنہانی

ترجمہ:۔قرآن کے اسرار ایسے ہیں کہ محبوبوں کی طرح چھپے ہوئے دل لے جاتے ہیں۔ واقعی کسی نے سچ کہا ہے۔

چیست قرآن اے کلام حق شناس   رونمائے رب ناس آمد بہ ناس
حرف حرفش راست در معنے معنۓ   در معنۓ در معنۓ

ترجمہ: اے حق شناس قرآن جانتے ہو کیا ہے؟ لوگوں کو خدا کا چہرہ دکھانے والا ہے اس کے حرف حرف میں کئی معانی اور مطالب پوشیدہ ہیں۔

واللہ قرآن کے حسن کی حالت یہ ہے کہ۔

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

ترجمہ: سر سے قدم تک جہاں بھی دیکھتا ہوں وہیں خوبصورتی ہی خوبصورتی نظر پڑتی ہے اور آنکھ ٹک کر رہ جاتی ہے۔

مقصود بیان

بس اب میں مقصود عرض کر چکا ہوں مکرر پھر عرض کرتا ہوں کہ ان بقیہ ایام رمضان کی ہم کو قدر کرنا چاہیے اس میں نماز کا اور خصوصاً تراویح کا اہتمام کرنا چاہیے مگر جو حافظ اجرت لے کر قرآن سنائے اس کے پیچھے تراویح نہ پڑھیں اس سے افضل یہ ہے کہ الم ترکیف سے تراویح پڑھ لی جائے اور اگر ہمت ہو تو رمضان کے بقیہ ایام میں اعتکاف کا بھی اہتمام کیا جائے۔

اعتکاف بڑی اچھی عبادت ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اپنے کو خدا کے دروازہ پر ڈال کر زبان حال سے یوں عرض کرتا ہے کہ۔

خسرو غریب است و گدا افتادہ در کوئے شما   باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

ترجمہ: خسرو ایک مسافر و گدا ہے جو آپ کے کوچہ میں آ گیا خدا کے لئے کب مسافر نوازی ہوگی۔
کہ اے اللہ ہم چاہے اچھے ہیں یا برے ہیں آپ ہی کے ہیں اور آپ ہی کے در کے سوا ہمارے لئے کوئی دوسرا در نہیں اس کا جو اثر ہوتا ہے اس کو ایک مثال سے سنئے ایک غلام اپنے آقا سے یوں کہہ رہا تھا۔

ترا بندہ چوں من بیفتد بسے مرا چوں تو خواجہ نباشد کسے

ترجمہ: آپ کو میرے جیسے بہت غلام مل جائیں گے مگر مجھے آپ جیسا آقا نہیں مل سکے گا۔
کہ آپ کو تو مجھ جیسے غلام اور بھی مل سکتے ہیں مگر مجھے آپ سے بہتر آقا نہیں مل سکتا اس کا اثر جو کچھ ہوا ہوگا دل کو معلوم ہے۔

بے کسی پر رحم

ایک اور حکایت شیخ نے لکھی ہے کہ ایک بزرگ رات کو تہجد میں اٹھے غیب سے ندا آئی کہ جو چاہے کر یہاں کچھ قبول نہیں اور یہ آواز اس طور سے آئی کہ ایک مرید نے بھی سن لی پیر کے لئے وہ حالت بہت سخت ہے جس میں مرید بھی اس سے پھرنے لگیں مگر عارف اس کی پرواہ نہیں کرتا اس کے معمولات میں ذرا فرق نہیں آیا کرتا چنانچہ وہ بزرگ تہجد میں مشغول ہو گئے اور اگلی رات آئی تو معمول کے موافق پھر تہجد کو اٹھے ایک عاشق مرید کو پیر کی اس حالت پر ترس آیا اور اس نے کہا کہ جب وہاں کچھ قبول ہی نہیں تو آپ کیوں مشقت برداشت کرتے ہیں پڑے سو بھی رہیے۔ شیخ آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا۔

توانی ازاں دل پرداختن کہ نادانی کہ بے او تواں ساختن[1]

کہ بیٹا یہ تو صحیح ہے کہ ان کے یہاں میرا عمل مقبول نہیں مگر ان کو چھوڑ کر کیسے بیٹھ رہوں کہ دوسرا در بھی تو کوئی نہیں بس یہ کہنا تھا کہ رحمت کو جوش آیا اور غیب سے دوسری آواز آئی۔

قبول ست گرچہ ہنر نیستت کہ جز ما پناہے دگر نیستت[2]

کہ جاؤ تمہاری اس بے کسی پر رحم کر کے تمہارے کے لئے دوسرا کوئی دروازہ نہیں ہم نے تم کو قبول کر لیا پس اعتکاف کی حقیقت یہی ہے کہ بندہ یہ کہہ کر اپنے کو کریم کے دروازہ پر لا ڈالے کہ آپ کے سوا میرا کوئی نہیں۔

میفگن کہ دستم نگیرد کسے[3]

---

[1] اگر اس کے بغیر رہ سکتے ہو تو اس سے دل اٹھالو۔
[2] اگر ہنر نہیں مگر بے ہنری بھی قبول ہے کیونکہ تمہاری میرے سوا کوئی پناہ نہیں
[3] مجھے نظر انداز نہ کرنا کیونکہ آپ نے نظر انداز کر دیا تو میرا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں۔

ان شاء اللہ یہ عبادت ضرور رنگ لائے گی۔

ایک عبادت رمضان میں قابل اہتمام یہ ہے کہ **لیلۃ القدر** کی تلاش کی جائے حدیث میں آتا ہے کہ عشرۂ اخیرہ کی طاق راتوں میں اس کو تلاش کرو۔ اگر کسی کو شب میں جاگنے کی ہمت نہ ہو تو کم از کم ستائیسویں رات میں تو ضرور جاگ لے یعنی اور راتوں سے کچھ زیادہ جاگ لے تمام رات جاگنا شرط نہیں اور اس میں جس قدر ہو سکے نمازیں پڑھتا رہے۔ جب اس سے تھک جائے تلاوت قرآن یا ذکر اللہ میں مشغول ہو جائے ستائیسویں رات کے متعلق بہت سے حضرات صحابہؓ کا جزم ہے کہ **لیلۃ القدر** یہی ہے۔

اختلاف تاریخ میں تلاش شب قدر

مگر اس کے متعلق بعض لوگوں کو شاید ایک فلسفی شبہ پیدا ہوگا وہ یہ کہ چاند میں آج کل اختلاف ہے تو جو رات یہاں ستائیسویں ہوگی وہ بعض جگہ اٹھائیسویں ہوگی تو کیا لیلۃ القدر دو ہوں گی اور ایک ہوئی تو کس کی رؤیت کا اعتبار ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کو خبر بھی ہے کہ وہاں رات دن نہیں ہیں اور یہ تو خود سائنس والے بھی تسلیم کرتے ہیں کہ لیل و نہار کرۃ النسیم سے نیچے ہی نیچے ہیں کرۃ النسیم کے اوپر رات دن نہیں بلکہ یکساں حالت ہے یہ جواب میرے دل میں آیا بڑی خوشی ہوئی اور اس سے ایک بات ابھی اور دل میں آئی ہے وہ یہ کہ معراج کے ذکر میں اللہ تعالیٰ نے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر بیان فرمائی ہے سیر سمٰوٰات کا ذکر نہیں فرمایا جس سے بعض اہل باطل نے سیر سموات کی نفی پر استدلال کیا ہے تو وہاں تو سیر سموات کا ذکر اس واسطے نہیں کیا گیا کہ وہاں لیلا کی قید بھی مذکور ہے پس ضروری ہوا کہ اسی قدر سیر بیان کی جائے جو لیل کے اندر واقع ہوئی اور ظاہر ہے کہ سیر سموات لیل و نہار سے باہر ہوئی ہے سمٰوات میں لیل و نہار کا تحقق ہی نہیں تو اس سے سیر سموات کی نفی پر استدلال محض لغو ہے ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیر سموات رات میں نہیں ہوئی سو یہ مسلم ہے کہ بلکہ ہم تو یوں کہتے ہیں کہ وہ تو نہ دن میں ہوئی نہ رات میں وہ تو ایسے ایسے مقام پر ہوئی جہاں رات ہے نہ دن بہر حال وہاں لیل و نہار ہے اس واسطے **لیلۃ القدر** کی جو شان و برکات ہیں وہ لیل و نہار کے ساتھ مقید بلکہ نہیں بلکہ ارادۂ حق کے تابع ہیں تو اس کی مثال بارش کی طرح ہے کہ یہاں کے کرۃ النسیم کے نیچے آج بارش ہے اور کلکتہ کے کرۃ النسیم کے نیچے کل بارش ہے اگر شب قدر بھی ایسی ہو کہ یہاں آج ہے اور کلکتہ میں کل ہے تو اس میں اشکال کی کیا بات ہے آخر بارش میں کیا ایسا اختلاف نہیں ہوتا پھر معنوی بارش برکات میں ایسا اختلاف ہو تو کیا تعجب ہے اس لئے بے فکر ہو کر آپ اپنی ہی تاریخوں کے حساب سے کام کیجئے اللہ تعالیٰ تو سب کی نیتوں کو اور کام کو

دیکھتے ہیں۔ وہ سب کو ان کے حساب کے موافق لیلة القدر کی برکات عطا فرماویں گے۔

وداع رمضان

پس رمضان کو اس طرح خوش اسلوبی سے گزاریئے کہ جو دن رہ گئے ہیں ان میں طاعات کا اہتمام کیجئے اور گناہوں سے دور رہیے تاکہ وہ خوش ہو کر آپ سے رخصت ہو کر جناب باری میں شفاعت کرے کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ قرآن اور صوم دونوں قیامت میں روزہ داروں کی شفاعت کریں گے قرآن کہے گا خداوندا میں نے اس کو نیند سے اور آرام سے روکا تھا میری شفاعت اس کے حق میں قبول کی جائے۔ روزہ کہے گا کہ میں نے اس کو کھانے پینے اور شہوت پورا کرنے سے روکا تھا میری شفاعت اس کے حق میں قبول کیجئے یہ ہے حقیقی وداع رمضان اور وہ جو آخری جمعہ میں الوداع الوداع یا شہر رمضان پڑھا جاتا ہے وہ تو بدعت ہے شریعت میں اس کا کہیں ثبوت نہیں اور ہمارے ایک فارسی کے استاد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جیسے رمضان کے جانے کا غم ہوتا ہے اس کے آنے کی خوشی بھی ہونی چاہیے تو اگر جانے پر خطبہ الوداع پڑھتے ہو تو اس کے آنے پر بھی ایک مرحبا کا پڑھنا چاہیے کہ مرحبا مرحبا یا شہر رمضان خصوصاً جب کہ یہ دیکھا جائے کہ اظہار سرور کی تو شریعت میں اصل بھی ہے اور اظہار غم کی کوئی اصل نہیں نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے آنے سے پہلے تو مسلمانوں کو رمضان کے لئے مستعد ہو جانے کا ارشاد فرمایا ہے جانے کے وقت کوئی حسرت و رنج ظاہر نہیں فرمایا۔

مکمل صوم

الحمدللہ کہ ضرورت کے موافق اکمال رمضان کے متعلق کافی بیان ہو چکا صرف ایک جز و رہ گیا ہے کہ عید کے دن صدقۂ فطر ادا کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے کیونکہ وہ بھی صوم رمضان ہی کا مکمل ہے حدیث میں ہے کہ روزہ کے حقوق و آداب میں جو کچھ کوتاہی ہو جاتی ہے صدقۂ فطر سے اس کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق عمل دے اور فہم سلیم عطا فرمائے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقه سیدنا
و مولانا محمد و علیٰ آله و اصحابه اجمعین
و اٰخر دعوٰنا ان الحمد للّٰه رب العلمین

اشرف علی

وعظ ملقب بہ

اکمال الصوم والعید

۲۸ رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر
تین گھنٹے تک مندرجہ بالا عنوان پر وعظ ارشاد فرمایا۔
جسے مولوی سعید احمد صاحب مرحوم نے قلمبند کیا۔
سامعین کی تعداد تقریباً ۲۵۰ تھی۔

خطبہ ماثورہ

الحمد لله نحمدهٗ و نستعینه‘ و نستغفره و نؤمن به و نتوكل علیه و نعوذ بالله من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یهده الله فلا مضل له و من یضلله فلا هادی له و نشهد ان لا اله الا الله وحده لا شریک لهٗ و نشهد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدهٗ و رسوله صلی الله علیه وعلیٰ اله واصحابه وبارک وسلم ‘ امابعد...... فقد قال النبی صلی الله علیه وسلم لشهر رمضان هو شهر اوله رحمة واوسطه مغفرة و آخره عتق من النیران (الترغیب والترهیب للمنذری ۲:۹۵)

(ارشادفرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک کے بارے میں اس کا اوّل (دھاکا) رحمت، درمیانی (دھاکا) مغفرت اور آخری (دھاکا) دوزخ سے آزادی کا ہے)

تمہید

فضائل رمضان کے متعلق گذشتہ جمعہ میں مبسوط مضمون بیان ہو چکا ہے آج صرف دو مضمونوں کا بیان کرنا مقصود ہے ایک بقیہ رمضان المبارک کے متعلق اور دوسرا عید کے متعلق۔ اس حدیث شریف کو اس لئے اختیار کیا گیا کہ اس میں دونوں مضمونوں کے متعلق ذکر ہے۔

خطبہ شعبان

یہ حدیث شریف ایک بڑی حدیث کا جزو ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان المعظم کے آخری جمعہ کے دن خطبہ میں پڑھا تھا اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے آخری جمعہ میں ایک خاص خطبہ پڑھا جو کہ اور جمعوں میں نہ پڑھتے تھے مسلمانوں سے تعجب ہے کہ انہوں نے اس منصوص پر تو توجہ نہ کی اور شعبان کے آخری جمعہ کے لئے کوئی خاص خطبہ تجویز نہ کیا جس سے وہ عامل بالسنّت ہوتے اس کے بجائے رمضان کے آخری جمعہ کے لئے ایک خاص خطبۃ الوداع اختراع کیا جس کا کہیں حدیث میں پتہ نہیں اور پھر اس کے ساتھ ایسا شغف ہوا کہ بغیر اس خاص خطبہ کے پڑھے یہ سمجھا جاتا ہے کہ گویا جمعہ ہی نہیں ہوا اگر چہ

بحمد اللہ اس وقت لوگوں کو اس کے نہ پڑھنے سے وہ وحشت جو کہ اس کے قبل ہوتی تھی نہیں ہوتی لیکن تاہم اب بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جو کہ اس خاص الوداعی خطبہ کو آخری جمعہ رمضان کا لازمی عمل سمجھتے ہیں اور بڑا تعجب تو یہ ہے کہ بعض اہل علم کو بھی دھوکا ہو گیا اور وہ سخت غلطی میں مبتلا ہو گئے کہتے ہیں کہ اگرچہ آخری جمعہ کے لئے کوئی خاص خطبہ تجویز کرنا بدعت ہے لیکن چونکہ اس کی وجہ سے لوگ اکثر جمع ہو جاتے ہیں اس لئے اس کو اجتماع کے لئے معین اور اداء صلوٰۃ کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے باقی رکھنا چاہیے حالانکہ یہ سخت غلطی اور من وجہ خدا اور رسول پر اعتراض کرنا ہے۔

ترک مصالح

غلطی تو اس لئے کہ شریعت کا مشہور حکم ہے کہ اگر کسی کام کے کرنے میں کچھ مصلحتیں بھی ہوں اور کچھ مفاسد بھی ہوں اور وہ کام بالذات یا بالغیر مطلوب شرعی نہ ہو تو ان مفاسد پر نظر کر کے اس کام کو ترک کر دیں گے اور مفاسد سے بچیں گے۔ مصالح کا اعتبار نہ کریں گے۔ اور یہ ایک کلیہ قاعدہ ہے جس کو اہل علم بخوبی سمجھ گئے ہوں گے لیکن عوام کے سمجھانے کے لئے میں اس کو ایک مثال میں بیان کرتا ہوں۔

مثلاً ایک شخص مجلس رقص منعقد کرے اور کہے کہ اگرچہ رقص فی نفسہ ممنوع اور حرام ہے لیکن میری غرض اس مجلس سے لوگوں کو جمع کرنا ہے تاکہ جمع ہو جانے کے بعد میں اپنی وجاہت سے کام لے کر ان کو نماز پڑھنے پر مجبور کروں اور اس طرح ان کو نماز پڑھنے کی عادت ہو جاوے تو دیکھئے بظاہر اس مجلس کی غایت کس قدر خوبصورت ہے کہ اس کے ذریعے سے لوگوں کو نماز پڑھنے کی عادت ڈالی جاتی ہے لیکن چونکہ اس مجلس میں ایک مصلحت کے ساتھ بہت سے مفاسد بھی ہمدوش ہیں اور مجلس رقص بالذات یا بالغیر مطلوب نہیں جیسا کہ ظاہر ہے اس لئے شریعت اس مصلحت مذکورہ کی وجہ سے اس کی اجازت نہ دے گی بلکہ اس کے مفاسد پر نظر کر کے اس مجلس کے انعقاد سے باز رکھے گی۔

ہاں اگر کوئی کام بالذات یا بالغیر مطلوب ہو اور اس میں مصالح کے ساتھ مفاسد بھی ہوں تو اس کام کو ان مفاسد کی وجہ سے ترک نہ کیا جاوے گا بلکہ اس کو باقی رکھ کر مفاسد کی اصلاح کرنے کی کوشش کی جاوے گی۔ مثلاً عیدگاہ کا اجتماع ادائے صلوٰۃ کے لئے شرعاً مطلوب ہے پھر اگر لوگ اپنی بدتمیزی کی وجہ سے اس میں کچھ خرابیاں آمیز کر لیں جیسا کہ مثلاً آج کل عام طور سے بچوں کو

عیدگاہ میں لے جانے کا رواج ہو گیا ہے جس کو دیکھو وہ اپنے ساتھ ایک دم چھلا ضرور لئے ہے۔ اور حیرت تو یہ ہے کہ باوجود ہر سال تکلیف اٹھانے کے پھر بھی لوگوں کو اس کی ذرا حس اور تمیز نہیں ہوتی شاید کوئی سال ایسا ہوتا ہو کہ بچے عیدگاہ میں جا کر عین نماز کے وقت رونا بسورنا نہ شروع کرتے ہوں بلکہ ایک دو تو ان میں سے ہگ موت بھی دیتا ہے۔

خود میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ میرے ایام تعلم میں ایک میرا اعزیز کم عمر میرٹھ کی عیدگاہ میں والد صاحب کے ساتھ گیا اور اس نے نماز کے وقت قضاء حاجت کی فرمائش کی اس کی فرمائش سن کر سخت پریشانی ہوئی اول تو عین نماز کا وقت دوسرے میرٹھ کی عیدگاہ میں جس میں ہزاروں کا مجمع کہیں قریب ایسا جنگل بھی نہیں جس میں اس کو بٹھلا دیا جاتا پھر نماز کھڑے ہونے کا وقت بالکل قریب آخر یہ تجویز ہوئی کہ ایک حلوائی کو چار آنہ دیئے گئے اس نے اپنے تخت کے نیچے ان کو بٹھلا لیا چاروں طرف سے کپڑا لٹکا ہوا تھا او پر رنگ برنگ کی مٹھائی اور اندر یہ تحفہ بھرا ہوا تھا۔

یہاں ایک عبرتناک مضمون خیال میں آیا کہ یہی حالت ہم لوگوں کی ہے کہ اس مٹھائی کی طرح ہمارا ظاہر تو نئے نئے انداز سے پر رونق اور چکنا چپڑا رہتا ہے لیکن ہمارے باطن کی یہ حالت ہے کہ گودر گو مرغی کا گو۔ ہوائے نفسانی سے لبریز بیہودہ خیالات سے پر۔ خدا سے دور شیطان سے قریب۔ ایک محقق نے خوب فرمایا ہے۔

از بروں چوں گور کافر پر حلل   واندروں قہر خدائے عزوجل
از بروں طعنہ زنی بربا یزید   داز درونت ننگ میدارد یزید

ترجمہ: باہر سے کافر کی قبر کی طرح پرشان وشوکت اور اندر کا حال خدا تعالیٰ کا قہر کہ ظاہر میں بایزید اور اندر میں یزید کے بھی چچا۔

صورت تو ایسی مقطع کہ معلوم ہو کہ اگر وحی منقطع نہ ہو چکی ہوتی تو حضرت جبرئیل انہیں کی خدمت میں آتے۔ اور دل کی یہ حالت کہ شیطان کے بھی شیطان۔ جیسا حدیث میں ہے۔

السنتهم احلى من السكر و قلوبهم امر من الذياب يلبسون جلود الضان ترجمہ: زبانیں شکر سے بھی میٹھی اور دل بھیڑیوں سے زیادہ کڑوے۔ بھیڑوں کی کھال میں بھیڑیئے۔

عیدگاہ کی حاضری

غرض عیدگاہ کی حاضری میں مصلحت بھی ہے اور مفسدہ بھی ہے تو اگر کوئی عاقل پہلے کلیہ کی بنا پر یہ کہے کہ ان مفاسد کی وجہ سے عیدگاہ کا اجتماع بھی چھوڑ دینا چاہیے۔ جس طرح رقص کی مجلس باوجود ایک مصلحت کے کثرت مفاسد کی وجہ سے واجب ترک ہوئی تو اس سے کہا جاوے گا کہ چونکہ عیدگاہ کا اجتماع شریعت میں مطلوب ہے اس لئے اس موقع پر وہ قاعدہ نہ برتا جاوے گا۔ اور عیدگاہ کا جانا ترک نہ کیا جاوے گا بلکہ بجائے اس کے ان مفاسد کیا صلاح کی کوشش کی جاوے گی۔ یعنی مثلاً لوگوں سے کہا جاوے گا کہ بچوں کو عیدگاہ میں لے کر نہ آیا کریں اور اگر کسی کو اس اجتماع کی مطلوبیت میں کلام ہو جیسا اس وقت بعض نام کے مشائخ بجائے عیدگاہ کے اپنی مساجد ہی میں بلاضرورت صرف امتیاز کے لئے عیدین پڑھتے ہیں تو میں اس کا ثبوت حدیث سے دیتا ہوں دیکھئے مسجد نبوی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) میں نماز پڑھنے سے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ملتا ہے لیکن باوجود اس کثرت ثواب کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اس موقع پر عیدگاہ میں تشریف لے گئے اور مسجد نبوی میں نماز نہیں پڑھی پس معلوم ہوا کہ عیدگاہ کا اجتماع ایک مہتم بالشان مطلوب ہے اور ممکن ہے کہ عیدگاہ کے ثواب میں بجائے کثرت کمی کے کیفاً کثرت ہو جاتی ہو یعنی وہ ایک ثواب ہی ان پچاس ہزار ثواب سے زیادہ ہوتا ہو اور اسی کثرت کیفی کی وجہ سے نبی کریم مسجد کو چھوڑ کر عیدگاہ جاتے ہوں اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک بچے کے سامنے ایک گنی اور دس روپیہ پیش کئے جاویں تو بچہ دس روپیوں کو عدد میں زیادہ دیکھ کر انہیں کو اٹھا لے گا لیکن اگر کسی بڑے آدمی کے سامنے ان دونوں کو پیش کیا جاوے تو وہ روپوں کو چھوڑ دے گا اور گنی اٹھا لے گا۔ کیونکہ گنتی میں گو ایک اور دس کا فرق ہے لیکن کیفاً وہ ایک ان دس سے زیادہ ہے پس اسی طرح ممکن ہے کہ عیدگاہ کے اجتماع میں کیفاً اس قدر ثواب ہو کہ مسجد نبوی کے اجتماع میں وہ نہ ہو اور ہرچند کہ یہ تضاعف ثواب مسجد نبوی کا مخصوص ہے فرائض کے ساتھ اور اس وجہ سے ممکن ہے کہ کسی کو استدلال مذکور میں خدشہ ہو کہ صلوٰۃ عیدین میں یہ تضاعف مسجد نبوی میں نہ ہوتا۔

پس استدلال تام نہیں سو جواب یہ ہے کہ واجب بھی ملحق ہوتا ہے فرض کے ساتھ پس دونوں کا یکساں حکم ہوگا اور عیدگاہ کے اجتماع میں بالخصوص یہ بھی بھید ہے کہ مسلمان مختلف اطراف سے سمٹے ہوئے ایک میدان میں جمع ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں تو ان کا اجتماع ان کے بدخواہوں کے قلب پر مؤثر ہوتا ہے اور اسلامی شوکت ظاہر ہوتی ہے اور یہ اعظم مقاصد ملت سے ہے۔

اور اس خاص اجتماع میں مطلق اجتماع جو محقق ہے وہ خود بھی اسرار مہمہ پر مشتمل ہے چنانچہ ایک ادنیٰ راز یہ ہے کہ سب کی عبادات مجتمع ہوکر جو سرکار میں پیش ہوں گی اگر بعض بھی قابل قبول ہوئیں تو اس کی برکت سے بقیہ بھی مقبول ہوں گی اور انہیں حکمتوں سے شرع میں جماعت کا بہت اہتمام ہے حتیٰ کہ جماعت کی نماز اگر وسوسوں کے ساتھ بھی ہو تب بھی تنہا نماز سے بدر جہا بڑھ کر ہے اس لئے کہ وہ شرعاً مطلوب ہے اور قطع وساوس اس درجہ مطلوب نہیں۔

چوں طمع خواہد ز من سلطان دیں خاک برفرق قناعت بعد ازیں

ترجمہ: اگر شاہ دین پناہ مجھ سے طمع کی خواہش کریں تو اس کے بعد قناعت پر مٹی ڈالو۔

افسوس ہے کہ بعض اکابر کو یہ دھوکا ہوگیا کہ اگر جماعت کی نماز میں وسوسہ آویں اور تنہائی میں اجتماع قلب ہو تو تنہا پڑھنا بہتر ہے۔ جماعت کو چھوڑ دینا چاہیے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اور اس کو ہم اپنی رائے سے غلط نہیں کہتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی تغلیط فرمائی ہے ہم صرف ان کی غلطی کا اظہار کرتے ہیں غرض چونکہ شریعت میں اجتماعی مصالح کی زیادہ رعایت ہے اور ظاہر ہے کہ جو اجتماع عیدگاہ میں ہوگا مسجد میں نہ ہوگا لہٰذا گو کماً عیدگاہ کا ثواب زیادہ نہ ہو لیکن کیفاً زیادہ ہے۔

اصلاح مفسدہ

اس لئے باوجود کسی مفسدہ کے اس میں جمع ہونا ترک نہ کریں گے بلکہ اس میں جو مفسدہ بچوں کے اجتماع کا ہے اس کی اصلاح کریں گے اور ہم خود کیا اصلاح کریں گے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود اس کی اصلاح فرما گئے ہیں ارشاد ہے **جنبوا مساجد کم صبیانکم** (**سنن ابن ماجة: ۷۵۰، مجمع الزوائد ۲:۲۵، کنز العمال: ۸۲۲**) کہ اپنی مسجدوں سے اپنے بچوں کو علیحدہ رکھو لیکن ممکن ہے کہ کوئی صاحب عیدگاہ کو مساجد کم میں داخل نہ کریں۔ اس لئے استدلال مذکور کو کافی نہ سمجھیں تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ مساجد کم میں دو احتمال ہیں یا تو اس کو عام لیا جاوے کہ مطلق مقام صلوٰۃ مراد ہو تب تو عیدگاہ کا اس حکم میں داخل ہونا ظاہری ہے اور اگر اس کو عام نہ لیا جاوے تو گو ان الفاظ میں عیدگاہ داخل نہ ہوگی لیکن یہ دیکھنا چاہیے کہ آخر علت اس حکم کی کیا ہے سو ظاہر ہے کہ علت اس حکم کی یہی ہے کہ چونکہ بچے پاک صاف نہیں ہوتے ان کی آمد و رفت سے ایسی جگہ کے ملوث[1] ہونے کا اندیشہ ہے جہاں نماز ہوگی۔ اور اس سے نماز میں خلل پڑے گا۔ اور یہ علت جیسے کہ مسجد

---

[1] گندہ ہونا

میں پائی جاتی ہے عیدگاہ میں بھی پائی جاتی ہے لہذا وہاں بھی یہ حکم جاری ہوگا چنانچہ خود عیدگاہ کے باب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے **ولیعتزلن الحیض المصلی** (البتہ حائضہ عورتیں عیدگاہ سے الگ رہیں) پس اس مثال سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ وہ کلیہ اس وقت ہے جب کہ وہ امر مطلوب نہ ہو ورنہ مفسدہ کی اصلاح کریں گے اور اس کام کو ترک نہ کریں گے یہ تو دعویٰ غلطی کی دلیل میں تھا۔

بدعت خطبۃ الوداع

رہا دوسرا دعویٰ کہ خطبۃ الوداع میں مصلحتیں بیان کرنا من وجہ خدا اور رسول پر اعتراض ہے سو اس کا بیان یہ ہے کہ جب بعض بدعتیں بوجہ مصالح مطلوب ہوئیں تو گویا اس شخص کے نزدیک کتاب وسنت کی تعلیم ناتمام ہوئی کہ بعض مصالح ضروریہ کی تعلیم میں فروگزاشت ہوگئی کیا کوئی اس کا قائل ہوسکتا ہے اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بدعت کو ضلالت فرمایا ہے اور بعض بدعت کے حسنہ ہونے سے اگر شبہ ہو تو در حقیقت وہ بدعت ہی نہیں اور اس قسم کا احتمال خطبۃ الوداع میں نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اگر یہ معنی سنت ہوتا تو سلف میں اس کی نظیر ضرور ہوتی پھر بعد عرق ریزی کے اگر کوئی دور کی نظیر نکال بھی لے جاوے تو دوسرے مانع کا کیا جواب ہوگا کہ عوام کے التزام سے بدعت ہوگیا اور بدعت بھی بدعت ضلالت جس پر حضور نار کی وعید فرما رہے ہیں اور حضور کا ارشاد عین ارشاد حق ہے تو ایسے امر کا التزام اور اس میں مصلحتیں نکالنا خدا اور رسول پر اعتراض بھی ہے اور خدا اور رسول سے مزاح بھی ہے۔

شرط اجتہاد

لیکن ہمارے اس قول سے کہ حضور کا ارشاد ارشاد خداوندی ہے' کوئی یہ نہ سمجھ جاوے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد نہ فرماتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد ضرور فرماتے تھے لیکن آپ کا اجتہاد موقوف رہتا تھا اگر وحی میں اس پر نکیر نہ ہوا تب تو وہ حجت رہتا تھا کیونکہ سکوت اس کی تقریر پر دلالت کرتا ہے ورنہ وحی سے اس کی اصلاح ہو جاتی تھی غرض ہر حال میں وہ اجتہاد بھی حکماً وحی ہو جاتا تھا لہذا باوجود اجتہاد کے بھی یہ کہنا صحیح ہے کہ ۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اللہ کا فرمان ہے اگرچہ وہ اللہ کے بندے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے ادا ہوا)

اہل علم کی ایسی ہی لغزشوں کی وجہ سے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ بعضے لوگ بدعات میں مصالح

بیان کرتے ہیں اوراس کی حقیقت کونہیں سمجھتے یہ کہا جاتا ہے کہ تربیت اورارشاد خصوص حکمت فہمی اور اجتہاد ہر شخص کا کام نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے چند اصطلاحات یاد کر کے مسند ارشاد پر متمکن ہو جاوے بلکہ یہ اس شخص کا کام ہے کہ ظاہری ضروری علم کے ساتھ مدد خداوندی بھی اس کے ساتھ ہو اوراس کی علامت یہ ہے کہ علماء امت نے اس کے اقوال کو قبول کرلیا ہواور علماء کا گروہ اس کی طرف متوجہ ہو چنانچہ اس قسم کی لغزش یہ ہے کہ بعضے لوگ جمعہ کی نسبت کہتے ہیں کہ دیہات میں گونہ ہو لیکن اگر پڑھ ہی لیا جاوے تو نہ پڑھنے سے تو بہتر صورت پڑھنا ہے۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ اسی طرح ایک شخص کہتا ہے کہ بمبئی میں گو حج نہیں ہوتا لیکن اگر پھر بھی کرلیا جاوے تو کیا حرج ہے نہ کرنے سے تو اچھا ہی ہے اس کا کیا جواب ہے آخر یہی کہو گے کہ بمبئی میں حج کا محل نہیں میں کہوں گا دیہات جمعہ کا محل نہیں غرض فہم دین کے لئے عقل کامل کی ضرورت ہے اس میں ظاہر بینی اور بھولا بھالا ہونے سے کام نہیں چلتا اور یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء کامل العقل ہوئے ہیں کوئی نبی بھولا نہیں ہوا اکثر لوگ بزرگوں کی تعریف میں کہا کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ بہت بھولے ہیں۔

لیکن یادرکھو بھولے ہونے سے اگرچہ بعض اوقات انسان بہت سی برائیوں سے بچ جاتا ہے اوراس لئے بھولا ہونا بھی گونہ فضیلت ہے لیکن فی نفسہ بھولا ہونا کوئی کمال نہیں ہے کیونکہ اس سے آدمی بہت سے فضائل سے محروم رہتا ہے۔ اسی لئے کوئی نبی بھولا نہیں ہوا تمام انبیاء کرام کامل العقل ہوئے ہیں اور واقع میں عقل ہے بھی بڑی نعمت۔

عزت عقل

ایک صوفی سے میرے سامنے ایک شخص نے سوال کیا کہ سالک کا مرتبہ بڑا ہے یا مجذوب کا۔ انہوں نے اس کا عجیب جواب دیا مجھے وہ جواب بہت ہی پسند آیا فرمانے لگے کہ اتنا تو ہم جانتے ہیں کہ عقل اتنی بڑی نعمت ہے کہ شریعت نے شرب خمر کو حرام کردیا جس سے وہ زائل ہوتی تھی اور ظاہر ہے کہ سالک کی عقل ٹھکانے رہتی ہے اور مجذوب عقل سے باہر ہوتا ہے اب تم خود سمجھ لو کہ سالک کا درجہ بڑا ہے یا مجذوب کا۔ شرح الصدور علامہ سیوطیؒ کی ایک کتاب ہے وہ اس میں ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ اے عمر اس وقت تمہاری کیا حالت ہوگی کہ جب تم قبر میں تن تنہا رکھے جاؤ گے اور دو نہایت عجیب الخلقت فرشتے تم سے آکر توحید و نبوت کے بارے میں سوال کریں گے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا اور کس قدر پیارا جواب عرض کیا اور اگر وہ بھی جواب نہ دیتے تو کون دیتا عرض کیا یا رسول اللہ یہ

فرمائیے کہ اس وقت ہماری عقل رہے گی یا نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ہاں عقل باقی رہے گی بلکہ عقل میں اور ترقی ہو جاوے گی (کیونکہ ہیولانی حجاب اس وقت باقی نہ رہیں گے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ اگر عقل باقی رہے گی تو کوئی خوف کی بات نہیں ان شاء اللہ تعالیٰ سب معاملہ درست ہوگا۔ دیکھئے یہ حضرات صحابہ عقل کی کس قدر عزت کرتے تھے اور اس کو کتنی بڑی نعمت سمجھتے تھے ایک ہم ہیں کہ ذہاب عقل کو امارات بزرگی سے سمجھتے ہیں ایک قصہ اس مقام پر یاد آیا گو میں نے کسی کتاب میں نہیں دیکھا اور اس لئے ممکن ہے کہ غلط ہو لیکن اس کے غلط ہونے سے ہمارا ضرر نہیں کیونکہ ہم تو اپنے مضمون کو حدیث سے مؤید کر چکے ہیں وہ قصہ یہ ہے کہ حضرت رابعہؒ کو جب وقت دفن حسب قاعدہ فرشتوں نے آ کر سوال کیا تو حضرت رابعہ نہایت اطمینان سے جواب دیتی ہیں کہ کیا اس خدا کو جس کو عمر بھر یاد رکھا گز بھر زمین کے نیچے آ کر بھول جاؤں گی تم اپنی خیر لو کہ بڑی مسافت طے کر کے آئے ہو تم کو بھی یاد ہے کہ نہیں۔ سبحان اللہ ان حضرات کا بھی کیا اطمینان ہے اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

گر نکیر آید و پرسد کہ بگو رب تو کیست گویم آں کس کہ ربود ایں دل دیوانۂ ما

(اگر منکر نکیر آ کر پوچھیں گے کہ تمہارا رب کون ہے تو کہوں گا کہ وہی ہے جو ہمارے اس دیوانہ دل کو لے گیا)

کیسے اطمینان سے فرماتے ہیں کہ میں تو یہ جواب دے دوں گا کہ آنکس کہ ربود ایں دل دیوانۂ ما (ہمارے اس دیوانہ دل کو لے گیا)

تو سارا اطمینان بقاء عقل ہی کے ساتھ ہو سکتا ہے اس لئے اس صوفی نے یہ کہا کہ بھائی سالک کا رتبہ بڑا ہے کیونکہ اس کی عقل باقی رہتی ہے جس کی بدولت اس کو سینکڑوں مصیبتوں سے نجات ہو جاتی ہے۔

صوفیہ کی دو اقسام

لیکن اب یہ سمجھنا چاہیے کہ انبیاء تو سب کے سب کامل العقل ہوئے اور صوفیہ میں جو کہ انبیاء ہی کے نائب ہیں کچھ سالک یعنی کامل العقل اور کچھ مجذوب یعنی جن کی عقل غلبہ حالات سے مغلوب ہو گئی ان میں یہ دو قسمیں کیوں ہوئیں۔

سو اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تو سب کے سب ارشاد و تربیت کی غرض سے بھیجے گئے تھے اس لئے ان کا کامل العقل ہونا ضروری تھا کیونکہ اس کے بغیر تربیت نہیں کر سکتے تھے اور اولیاء بعضے تو ارشاد خلق کی غرض سے پیدا ہوتے ہیں ان کو تو سلوک کا مرتبہ عطا ہوتا ہے تا کہ بقاء عقل

کے ساتھ تربیت کا کام انجام دے سکیں اور یہی لوگ ہیں جن کو ورثۃ الانبیاء کہا جاتا ہے اور بعضے محض اپنے ہی کام کے لئے پیدا ہوتے ہیں ان کے متعلق تربیت نہیں ہوتی مجذوبین ان ہی میں ہوتے ہیں گو بعض غیر مجذوبین بھی ایسے ہوتے ہیں ان کی یہ شان ہوتی ہے کہ۔

احمد تو عاشقی بہ مشیخت تراچہ کار دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

ترجمہ: اے احمد جام تو عاشق ہے تجھے پیری سے کیا حاصل۔ دیوان ہو کر مست رہو سلسلہ ہوا ہوا نہ ہوا نہ ہوا۔

بخلاف سالکین کے کہ ان کی حالت کے بالکل خلاف ہے ان کی یہ حالت ہے کہ

خاص کند بندہ مصلحت عام را (عام مصلحت کی بناء پر بندہ کو عام کرتے ہیں)

ہاں مجذوبین سے بھی ایک قسم کا فیض ہوتا ہے جو بلا ان کے اختیار کے محض وجود باوجود کی بدولت ہے سواس کے لئے بھی عقل کی ضرورت نہیں۔ عقل کی ضرورت اس فیض کے لئے ہے جو بااختیار ہو غیر اختیاری فیض کی مثال آفتاب کا نور ہے کہ گو آفتاب قصد نہ کرے لیکن اس کا نور عالم کو پرنور ضرور کرے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نیک بندے جہاں کہیں ہوتے ہیں ان کی برکات عالم کو منور ضرور کرتی ہیں اسی برکت کی نسبت ارشاد خداوندی ہے۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ (اور اللہ تعالیٰ ان کو عذاب نہیں دے گا جبکہ آپ اُن میں موجود ہیں) جیسا کبھی اس کا عکس بھی ہوتا ہے کہ بدکاروں کی بدولت اچھے لوگ تباہ وہلاک ہو جاتے ہیں لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس سے پہلا قاعدہ ٹوٹ گیا کیونکہ وہ اچھے لوگ جو کہ ان بدکاروں کی وجہ سے تباہ و برباد ہوئے یا تو وہ صورۃً اچھے ہوتے ہیں یا واقع میں اچھے ہی نہیں ہوتے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ فلاں شہر کو الٹ دو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا اے اللہ تعالیٰ اس شہر میں فلاں شخص رہتا ہے جس نے کبھی آپ کی نافرمانی نہیں کی کیا اس کو بھی سب کے ساتھ الٹ دوں ارشاد ہوا کہ گو ظاہراً اس نے نافرمانی نہیں کی مگر دوسروں کی نافرمانی دیکھ کر اس میں کبھی تغیر پیدا نہیں ہوا لہٰذا اس کو بھی الٹ دو۔

دیکھئے یہ شخص ظاہری حالت میں ایسا بزرگ تھا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھی دھوکہ ہو گیا لیکن واقع میں ایک بہت بڑے گناہ میں مبتلا تھا کہ اس کو خدا تعالیٰ اور اس کے احکام کے ساتھ محبت کا جوش ذرا نہیں تھا۔ ورنہ یہ ممکن نہیں کہ خدا اور رسول کی محبت ہو اور ان کی مخالفت و نافرمانی دیکھ کر یا شریعت کا استخفاف سن کر اس کے دل میں مخالفین سے غیظ نہ پیدا ہو یا اس کو ان کی حرکات ناگوار نہ ہوں۔

حمیت دینی

اگر کسی دین دار کو ایسے امور ناگوار ہوتے ہیں تو اس کو متعصب اور بدمزاج کہا جاتا ہے اور یہ رائے دی جاتی ہے کہ صاحب نرمی سے جواب دینا چاہیے تھا مگر میں کہتا ہوں کہ کسی شخص سے یہ کہا جاوے کہ ہم نے تمہاری ماں کو بازار میں بیٹھے ہوئے اور بازاری عورتوں کی حرکات میں مبتلا پایا ہے تو کیا یہ شخص اپنی ماں

کی نسبت ٹھنڈے دل سے یہ الفاظ سن لے گا اور کہنے والے پر حملہ کرنے کو آمادہ نہ ہو جاوے گا کیا اس کے جوش کو تعصب کہا جاوے گا اس کو بھی ایسی رائے دی جاوے گی مگر مولویوں پر الزام ہے کہ یہ بہت جلد خفا ہو جاتے ہیں اور ان کی ناک پر غصہ دھرا رہتا ہے یہ بڑے متعصب ہیں۔ لیکن صاحبو! ذرا غور کیجئے اور انصاف سے کام لیجئے کوئی مولوی بھی سیدھی بات پر خفا نہیں ہوتا نہ کسی مولوی کی ناک پر غصہ دھرا رہتا ہے اگر پوچھنے کی طرح ان سے پوچھا جاوے اور بات کرنے کی طرح ان سے بات کی جاوے تو کوئی وجہ نہیں کہ مولوی غصہ کریں اور خفا ہوں ہاں جب ان کے ساتھ استہزاء اور خدا و رسول کے احکام پر اعتراض بطور عناد کیا جاتا ہے تو ضرور وہ بیتاب ہو جاتے ہیں اور یہ غصہ یا بے تابی تعصب نہیں ہے یہ دین کی حمیت ہے۔

صاحبو! کیا شریعت کے احکام کی وہ عظمت اور محبت بھی دل میں نہ ہونا چاہیے جو کہ اپنی ماں کی ہے کہ ماں کی نسبت ناگوار کلمات سن کر تو انسان قابو سے باہر ہو جائے اور اپنے آپے میں نہ رہے اور شریعت کی ہتک ہوتے ہوئے دیکھ کر اس کو غصہ بھی نہ آ جاوے۔ اور جن کو غصہ نہیں آتا وہ ناحقیقت شناس ہیں اس لئے ان کو غیرت نہیں آتی کچھ دنوں اس رنگ میں اپنے قلب کو رنگو اور پھر بھی اگر یہ حالت رہے تو جانیں۔ صاحبو محض الفاظ کے سننے سے پوری طرح سمجھ میں نہیں آ سکتا کہ یہ کیفیت کیونکر ہو جاتی ہے وجہ یہ ہے کہ اپنے اوپر یہ حالت گزری نہیں کسی نے خوب کہا ہے۔

پرسید یکے کہ عاشقی چیست — گفتم کہ چوں ماشوی بدانی

ترجمہ: اس نے پوچھا عاشقی کیا ہے میں نے کہا میری طرح جب ہو جاؤ گے تو خود بخود جان لو گے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تقلیداً ہی کہہ رہا ہوں لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جن حضرات کی تقلید اختیار کی ہے ان کو سچا سمجھتا ہوں صاحبو! ان حضرات کی غیرت کی یہ حالت تھی کہ خدا اور رسولؐ سے دور کرنے والی چیزوں کو گو وہ چیزیں ان کی کیسی مرغوب و محبوب ہوں طاغوت سمجھتے ہیں۔

حضرت طلحہؓ کی غیرت

حضرت طلحہؓ کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک پرندہ اس میں اڑ کر آ گیا اور چونکہ باغ نہایت گنجان تھا باہر نکل جانے کے لئے اس کو کوئی راستہ نہ ملا۔ پریشان ادھر ادھر اڑتا پھرنے لگا اس پرندہ کی یہ حالت دیکھ کر حضرت طلحہؓ کے دل میں باغ کے گنجان ہونے پر گونہ مسرت پیدا ہوئی اور یہ خیال ہوا کہ ماشاء اللہ میرا باغ کس قدر گنجان اور اس کے درخت ایک دوسرے سے کیسے پیوستہ ہیں کہ کسی پرندہ کو بھی باآسانی نکل جانے کی جگہ نہیں ملتی۔ یہ خیال آ تو گیا چونکہ دل میں عظمت و محبت خداوندی معراج کمال پر تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پر برکت سے فیض یاب تھے اس لئے فوراً ہی متنبہ ہوا اور دل میں سوچا کہ اے طلحہ تیرے دل میں مال کی یہ محبت کہ حالت نماز میں تو ادھر متوجہ ہو۔ آخر نماز کے بعد بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ میرے

باغ نے آج مجھے عین نماز کی حالت میں خدا سے مشغول کر کے اپنی طرف متوجہ کر لیا لہٰذا اس کو میں اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا۔ اور اس شغل عن الحق کے کفارہ میں میں اس کو وقف کرتا ہوں آخر اس کو وقف کر دیا۔ جب دل کو اطمینان ہوا ان حضرات کی یہ شان ہے کہ اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ کہ اگر شیطان کے وسوسہ سے کسی ضعیف درجہ میں بھی ان کے قلب کو میلان الی الدنیا ہو جاتا ہے تو فوراً متنبہ ہوتے ہیں اور ایسا قلق ہوتا ہے کہ گویا ہفت اقلیم کی سلطنت ان کے قبضہ سے نکل گئی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہفت اقلیم کی سلطنت نکل جانے سے بھی اتنا صدمہ نہیں ہوتا جو ان حضرات کے قلب پر اس میلان سے ہوتا ہے کسی نے خوب کہا ہے۔

بہر چہ از دوست داماندی چہ کفر آں حرف چہ ایماں ‎ ‎ ‎ بہر چہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش و چہ زیبا

(جس چیز کی وجہ سے محبوب سے دوری ہو وہ قابل ترک ہے خواہ وہ کچھ ہی ہو)

خاصیت محبت و غیرت

شاید لوگوں کو یہ تعجب ہو کہ ذرا سا خیال آ جانے سے ان کے دل پر ایسا صدمہ کیسے گزرا تو سمجھ لینا چاہیے کہ ان لوگوں کے نزدیک تمام دنیا بھی شغل بحق کے مقابلہ میں کوئی قیمت نہیں رکھتی ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ۔

بردل سالک ہزاراں غم بود ‎ ‎ ‎ گرز باغ دل خلالے کم بود

ترجمہ:۔ اگر باغ دل میں سے ایک تنکا کم ہو تو سالک کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں۔

عالم آخرت کی طرف بھی ان حضرات کی توجہ صرف اس لئے ہے کہ وہ ان کے مطلوب یعنی رضائے حق کا محل ہے ورنہ ان کی یہ شان ہے کہ۔

باتو دوزخ جنت است اے جانفزا ‎ ‎ ‎ بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

ترجمہ: تیرے ساتھ دوزخ بھی جنت ہے اور تیرے بغیر جنت بھی دوزخ۔

اور مولانا یہ بھی فرماتے ہیں۔

گفت معشوقے بعاشق کالے فتا ‎ ‎ ‎ تو بغربت دیدہ بس شہر ہا

پس کدامی شہر از انہا خوشتر ست ‎ ‎ ‎ گفت آں شہرے کہ دروئے دلبر ست

ترجمہ: ایک عاشق نے ایک معشوق سے پوچھا تم نے بہت سے شہر دیکھے ہیں ان میں سے سب سے اچھا کون سا شہر ہے اس نے کہا جس میں محبوب بستا ہے وہ سب سے اچھا ہے۔

جنگل میں اگر محبوب کا ساتھ ہو جاوے تو ہزار آبادی سے بڑھ کر ہے شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ یہ اقوال غلبہ حالات و ولولہ محبت کے ہیں کوئی واقعی تحقیق نہیں ہے تو یاد رکھو کہ اس کے بارہ میں نص موجود ہے۔

حدیث میں ایک صحابی حضرت ثوبان ؓ کا واقعہ آیا ہے کہ وہ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ

وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ اگر ہم جنت میں گئے بھی تو ہم کو وہ درجہ تو نصیب نہیں ہوسکتا جو درجہ آپ کا ہوگا اور جب ہم اس درجہ میں نہ پہنچ سکیں گے تو آپ کے دیدار سے محروم رہیں گے اور جب آپ کا دیدار نصیب نہ ہوگا تو ہم جنت کو لے کر کیا کریں گے۔

حضور نے یہ سن کر سکوت فرمایا آخروحی نازل ہوئی کہ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ الآیہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تسلی فرمائی۔ یعنی یہ ضرورت نہیں کہ اس درجہ میں عارضی[1] طور پر پہنچنے کے لئے اسی درجہ کے اعمال کی ضرورت ہو صرف اتباع اور محبت نبی کافی ہے جیسے دربار شاہی میں خدمت گاہ محض طبیعت و خدمت شاہ کی وجہ سے دیگر روٴسا سے پہلے پہنچتا ہے اس لئے مَعَ الَّذِيْنَ فرمایا آگے ذٰلِكَ الْفَضْلُ میں تصریح بھی فرمادی ہے کہ اس کو اپنے اعمال کا اثر مت سمجھنا یہ محض فضل ہے اور واقع میں اگر غور کیا جاوے تو صاف معلوم ہوگا کہ ہمارا دین اور ایمان ہماری دنیا اور سب سامان ہماری نماز ہمارا روزہ ہمارا ثواب درجات جو کچھ بھی ہے سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی طفیل ہے چنانچہ ان آیات کے شان نزول کے انضمام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جن میں ارشاد ہوتا ہے ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا اس کا یا تو یہ مطلب ہے کہ اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں یہ محض فضل خداوندی ہے کہ تم کو ایک بہانہ محبت سے باریابی کی دولت نصیب ہوگئی اور یا مطلب ہے کہ ذٰلِكَ الْفَضْلُ سے بعض مغلوب الیاس لوگوں کی ناامیدی دور کرنا ہے کہ شاید کسی کو یہ خیال ہو جاوے کہ ہمارے ایسے نصیب کہاں کہ ہم اس درجہ تک پہنچ سکیں تو اس کی نسبت ارشاد ہوتا ہے کہ اگرچہ تم اس قابل نہیں لیکن نعمت تمہارے اعمال کی جزا نہیں ہے کہ تم ان پر نظر کر کے اس نعمت سے مایوس ہو جاؤ یہ تو محض خدا تعالیٰ کا فضل وجود ہے جس کے لئے تمہارے اعمال کامل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

سبحان اللہ قرآن پاک بھی کیا عجیب چیز ہے کہ دو متعارض شبہے ایک عجب دوسرا یاس اور ایک جملہ میں دونوں کا جواب خواہ یوں کہہ لو خواہ یوں کہہ لو۔

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ میدارد　　　برنگ اصحاب صورت رابہ بوار باب معنی را

(اس کے عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جان کو بو سے تازہ رکھتی ہے)

---

[1] اور عارضی طور پر اس لئے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ میں استقراراً مقاماً کون جا سکتا ہے البتہ زیارت کے لئے رسائی ہوا کرے گی جس طرح دنیا میں مسکن ہر ایک کا جدا ہوتا ہے لیکن ملاقات کے لئے دوسرا بھی آ جاتا ہے ۱۲ منہ

ہر مذاق ہر طبیعت ہر رنگ کا علاج قرآن شریف میں موجود ہے پس روایت ثوبان رضی اللہ عنہ سے بھی یہ بات بالکل صاف معلوم ہوگئی کہ۔

باتوں دوزخ جنت است اے جان فزا   بے تو جنت دوزخ است اے دل ربا

(اپنی قیمت دونوں جہان کے برابر بتائی نرخ بڑھاؤ کہ ابھی ارزانی ہے)

کیونکہ ان کے اس خیال پر انکار نہیں فرمایا گیا بلکہ تسلیم کر کے تسلی کی گئی غرض یہ مضمون بالکل سنت کے موافق ہے نرا نکتہ تصوف یا شاعرانہ نہیں۔

سو یہ ہے ان حضرات کی شان کہ دونوں عالم بھی ان کے نزدیک خدا تعالیٰ کی رضا یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لقاء کے برابر نہیں خوب کہا ہے۔

قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ   نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(ایک ساعت ایک لمحہ محبوب کو اطمینان سے دیکھنا دن پھر کی دار و گیر شاہی سے بہتر ہے)

محبت اور غیرت کی تو خاصیت ہی ہے کہ جب یہ بڑھ جاتی ہے تو سب کچھ چھوٹ جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے غیرت ہی میں سلطنت چھوڑ دی تھی اور وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ ایک حالت میں دو طرف توجہ کرنی پڑتی ہے اور یہ ممکن نہیں اس واسطے مجبوراً ایک طرف کی توجہ کو ترک کر دینا پڑے گا اب رہی یہ بات کہ کس جانب کو ترک کیا جاوے تو ظاہر ہے کہ توجہ الی اللہ کی دولت تو قابل ترک نہیں لہذا دنیا ہی پر لات مار دیتے ہیں خوب کہا ہے۔

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے   بہ ازانکہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوئے

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے اسی کی تحصیل کے لئے سلطنت پر لات ماردی لیکن انبیاء علیہم السلام پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ جب دو طرف کامل توجہ نہیں ہو سکتی اور یہ حضرات علی سبیل الیقین جیسا کہ حکمت بعثت شاہد ہے متوجہ الی الخلائق تھے اور جب متوجہ الی الخلق تھے تو توجہ الی اللہ یقیناً کم ہو گی اور جب یہ کم ہوگی تو نقص ہوگا اور نقص اس لئے منافی نبوت ہے کہ مرتبہ نبوت مراتب کمال کے اعلیٰ پایہ کا نام ہے کہ بشر کو اس سے بڑھ کر مرتبہ عطا ہو ہی نہیں سکتا۔ پس اگر ان کو بھی مانا جاوے اور اس کی وجہ سے کامل فرض کیا جاوے تو کیا وجہ کہ ان میں انقطاع عن الخلق جو لازمہ کمال ہے نہیں پایا جاتا۔ وجہ اس شبہ کی گنجائش نہ ہونے کی یہ ہے انبیاء علیہم السلام کی جو توجہ الی الخلق ہوتی ہے وہ چونکہ بامر خداوندی ہے لہذا اس امتثال کی وجہ سے اس توجہ الی الخلق میں خود توجہ الی اللہ موجود ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام امت کی طرف جو متوجہ ہوتے اور ان کو پیغام حق پہنچاتے ہیں سو اسی لئے

کہ اس توجہ اور تبلیغ کا ان کو حکم ہے اور اس کا امتثال ان پر واجب ہے حضرت انبیاء کی اس توجہ الی الخلق کے ساتھ توجہ الی اللہ کی مثال یہ ہے کہ اگر تم کسی آئینہ کی طرف اس لئے متوجہ ہو کہ اس میں تمہارے محبوب کا عکس نظر آ رہا ہے جبکہ کسی وجہ سے خود اس کے عین کو نہ دیکھ سکو تو گو ظاہراً تمہاری توجہ آئینہ کی طرف ہے لیکن عین یہ توجہ عین محبوب کی طرف توجہ ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے لئے تمام خلائق مرات[1] ہیں جس کی طرف متوجہ ہونے سے مقصود ان کا توجہ الی الحق ہے پس ان کے لئے توجہ الی الحق سے مانع نہیں غرض محبان حق غیر حق کی طرف متوجہ ہونے سے غیرت کرتے ہیں اور اسی صفت غیرت سے ان میں جوش دین پیدا ہوتا ہے جس کو لوگ تعصب کا غصہ سمجھتے ہیں اور وہ ایسا مطلوب ہے جس کے نہ ہونے سے وہ شخص الٹ دیا گیا پس یہ شخص ظاہر میں نیک تھا اور واقع میں نیک نہ تھا پس وہ قاعدہ نہ ٹوٹا یا اگر وہ واقع میں بھی نیک ہوں تو وہ صورتاً ہلاک ہوتا ہے اور معنی رحمت۔

بہرحال یہ بات ثابت رہی کہ نیکوں کی بعض برکات اضطراری بھی ہوتی ہیں جس میں قصد اختیار کی ضرورت نہیں لیکن جو برکت اختیاری ہوگی اس کے لئے عقل کامل وافر کی احتیاج ہے سو ایسے ہی لوگ جو کامل العقل ہیں اہل ارشاد ہوئے ہیں اور بعض اولیاء اللہ جن سے کوئی تربیت عام کا کام متعلق نہیں ہوتا ایسے لوگ البتہ بھولے بھالے ہوتے ہیں کیونکہ ان کے سپرد صرف اپنی ذات کا معاملہ ہے اور اس میں وہ اسی قدر کے مکلف ہیں جس قدر ان کو عقل دی گئی ہے کسی دوسرے شخص کی تربیت ان کے متعلق نہیں۔ سو حاصل یہ ہوا کہ جن لوگوں کے متعلق تربیت عام ہے جیسے انبیاء امت جو مسند ارشاد پر متمکن ہیں ایسے لوگ بھولے بھالے نہیں یہ لوگ بڑے فطین پورے عاقل ہوتے ہیں اور یہی کامل ہیں اور جن لوگوں کے متعلق کسی دوسرے کی تربیت نہیں ہوتی بلکہ محض اپنے ہی نفس کے لئے پیدا ہوتے ہیں یہ لوگ البتہ بھولے بھالے ہوتے ہیں۔

اقسام انسان

اس لئے بعض نے یہ تقسیم کی ہے کہ انسان چار قسم کے ہیں ایک وہ جن کو دین کی عقل بھی ہے اور دنیا کی بھی جیسے انبیاء اور ورثۃ الانبیاء یعنی وہ علماء مسند ارشاد پر متمکن ہیں دوسرے وہ جن کو دین کی عقل ہے اور دنیا کی نہیں۔ جیسے بھولے بھالے صلحاء و اولیاء امت۔ تیسرے وہ جن کو دین کی عقل نہیں ہے اور دنیا کی عقل ہے جیسے عاقل کفار، چوتھے وہ جن کو نہ دنیا کی عقل نہ دین کی عقل جیسے بیوقوف کفار۔

---

[1] اور یہ شبہ کہ دونوں کے اجتماع میں کس کا اثر ظاہر ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ غالب یا کثیر کا اول جیسا وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ اور ثانی جیسا حدیث ہے قلنا یا رسول اللہ اھلک و فینا الصالحون قال نعم اذا کثر الخبیث ۱۲ منہ نمبر ا آئینہ ۱۲

غرض انبیاء اور علماء محققین کامل العقل ہوتے ہیں گو تجربہ میں اس لئے کمی ہو کہ وہ دنیاوی امور میں منہمک نہیں ہیں۔

عقل اور تجربہ میں فرق

بعض لوگوں نے اس میں عجب خلط کر دیا ہے کہ عقل اور تجربہ کو ایک چیز سمجھتے ہیں ان میں فرق نہیں کرتے اور چونکہ علماء کو تجربہ کار نہیں پاتے اس لئے علماء کو کم عقل اور بے وقوف کہتے ہیں حالانکہ تجربہ دوسری چیز ہے اور عقل دوسری چیز ہے تجربہ تکرار مشاہدہ جزئیات کا نام ہے۔ مثلاً سقمونیا کو دس مرتبہ آزمایا گیا اس نے اسہال کا فائدہ دیا تو اس تکرار مشاہدہ سے کہیں گے کہ سقمونیا مسہل ہے اور عقل ایک قوت جو خدا تعالیٰ نے انسان میں ودیعت کی ہے جس سے کلیات کا ادراک کرتا ہے مولوی محمد حسین عظیم آبادی سے جو کہ میرے ایک دوست تھے ان کے طالب علمی کے زمانہ میں ایک کالج کے طالب علم نے سوال کیا کہ آسمان پر کل کس قدر ستارے ہیں۔ انہوں نے فرمایا مرصودہ تو معلوم ہیں مگر غیر مرصودہ معلوم نہیں اس طالب علم نے کہا کہ مولوی صاحب تعجب ہے کہ سائنس کا اتنا ضروری مسئلہ اور آپ کو اس کی اطلاع نہیں مولوی صاحب نے فرمایا کہ اچھا بتلایئے سمندر میں کس قدر مچھلیاں ہیں اس طالب علم نے کہا مجھے تو علم نہیں تو مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ افسوس ہے آپ اس قدر سائنس کے دل دادہ ہیں اور آپ کو زمین کی چیزوں کی بھی اطلاع نہیں پھر جب آپ کو ہنوز زمین کی بھی پوری اطلاع نہیں ہے تو مجھ کو آسمان کے ستاروں کی اطلاع نہ ہونا کیا تعجب ہے یہ جواب سن کر ان طالب علم صاحب کی آنکھ کھلی اور ہوش آیا اس طرح لوگ صناع قوموں کو کہتے ہیں کہ یہ بڑے عاقل ہیں حالانکہ وہ صرف ایک صنعت کے تجربہ کار ہیں لہذا ان کو صناع کہنا چاہیے نہ کہ عاقل صناعی دوسری چیز ہے عاقل ہونا دوسری بات ہے اگر ہم ایک بڑے فلسفی مثلاً افلاطون کو ایک جلاہے کے گھر لے جاویں اور اس کی کارگاہ میں بٹھلا دیں اور کہیں کہ ایک مہین تن زیب بنو تو یقیناً وہ اس پر قادر نہ ہوگا اور جلاہا عمدہ سے عمدہ بن دے گا۔

اس فرق کی وجہ سے یہ کہہ دیں گے کہ یہ جلاہا اس فلسفی سے زیادہ عاقل ہے ہرگز نہیں۔ ہاں یہ کہیں گے کہ یہ فلسفی اس صفت کو اس قدر نہیں جانتا جس قدر یہ جلاہا جانتا ہے۔ پس علماء محققین خواہ تجربہ کار نہ ہوں مگر کامل العقل ہوتے ہیں اور یہی ورثۃ الانبیاء ہیں انہی کے متعلق ارشاد و تربیت کا کام ہوتا ہے پس ان کے ساتھ احکام و حکم دینیہ میں کسی کو حق مزاحمت نہیں ہے جیسا کہ اس قاعدہ شرعیہ کو کہ مفسدہ کی وجہ سے مصلحت غیر ضروریہ کو چھوڑ دیتے ہیں نہ سمجھنے سے بعض کو غلطی ہوگئی کہ وہ علماء سے مزاحمت کرنے لگے غرض جو چیز مطلوب نہ ہو اور اس کے ارتکاب میں مفسدہ بھی ہو تو اس کو ترک کر دیں گے۔ جب یہ قاعدہ کلیہ معلوم ہو گیا تو اب سمجھنا چاہیے کہ الوداع کا خطبہ کسی دلیل سے شرعاً

مطلوب نہیں ہے اور اس کے پڑھنے میں بہت سے مفاسد ہیں لہذا اس کو ضرور ترک کیا جاوے گا۔

استغناء اسلاف

رہی یہ بات ہے کہ لوگ اس بہانہ سے آ جاتے ہیں اگر یہ نہ ہوگا تو لوگ نماز میں آنا چھوڑ دیں گے سو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو لوگ خدا کے لئے نماز پڑھتے ہیں وہ تو ہر حالت میں آویں گے خطبہ وداع پڑھا جاوے یا کوئی دوسرا خطبہ اور جو لوگ محض پابندی رسم کے لئے آتے ہیں وہ اگر اس کے ترک سے آنا چھوڑ بھی دیں تو ان کے اس خیال سے ہم ایک مقدمہ قبائح کے کیوں مرتکب ہوں خواہ وہ آویں یا نہ آویں ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ اگر نکاح بیوگان کا ذکر نہ کرو تو میں وعظ میں آؤں میں نے کہا تو آج ضرور ہی بیان کروں گا تمہارا جی چاہے آؤ نہ جی چاہے نہ آؤ دین کسی کے آنے کا محتاج نہیں۔

زعشق ناتمام ما جمال یار مستغنی ست باب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبارا

جس کا حسن ذاتی حسن ہے اس کو تکلفات کی اور کسی کے دیکھنے نہ دیکھنے کی کیا پرواہ ہے خواہ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے وہ بالکل مستغنی ہے اسی طرح ہم کسی کے آنے نہ آنے کی پرواہ نہ کریں گے اور شرع کو محض اس مصلحت سے نہ چھوڑیں گے ہمارے اکابر سلف کا اس استغناء مذکور پر پورا عمل تھا۔ حضرت عمر بن الخطاب کے زمانہ خلافت میں جبلہ ابن ایہم غسانی جو کہ ملوک غسان میں سے تھا مسلمان ہوا موسم حج میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا ایک دوسرا غریب آدمی بھی ساتھ ساتھ طواف کرتا تھا اتفاق سے اس غریب آدمی کے پاؤں تلے اس کی آزار کا کنارہ دب گیا جبلہ جب آگے بڑھا تو اس کی لنگی کھل گئی اور برہنہ رہ گیا چونکہ وہ اپنے کو بہت بڑا آدمی سمجھتا تھا اور یہ دوسرا شخص نہایت غریب آدمی تھا لہذا اس کو بہت غصہ آیا اور اس نے ایک طمانچہ اس زور سے مارا کہ اس بیچارے کا دانت ٹوٹ گیا وہ شخص اس حالت کو لئے ہوئے حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا کہ امیر المومنین جبلہ نے میرا دانت توڑ دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جبلہ کو ہمارے پاس بلا لاؤ۔ صاحبو غور کیجئے یہ امتحان کا مقام ہے کہ ایک بادشاہ کو ایک غریب آدمی کے معاملہ میں پکڑ کر بلایا جاتا ہے چنانچہ جبلہ کو لایا گیا۔ حضرت عمرؓ نے واقعہ دریافت فرمایا کہ اس غریب شخص کو اجازت دی کہ جبلہ سے اپنا بدلہ لے لے۔ جبلہ نے جب یہ سنا تو طیش میں آ کر کہا کہ امیر المومنین مجھ کو اور ایک معمولی بازاری غریب آدمی کو کس چیز نے برابر کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اسلام نے اور اس میں امیر غریب سب برابر ہیں تم نے اس کا دانت توڑا تمہارا دانت ضرور توڑا جائے گا۔

دیکھئے یہ ہے اخوت اسلامی ایک آج وقت ہے کہ امراء و روساء کا عالم ہی اس عالم سے جدا اور نرالا ہے غرباء کو وہ گویا انسانیت ہی سے خارج سمجھتے ہیں لیکن اس گئے گزرے وقت میں اگر اس کا کچھ اثر باقی

ہے تو اللہ والوں میں ہے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے ہاں ایک بڑے عہدہ دار کوئی شخص مہمان آئے جب کھانے کا وقت ہوا تو حضرت نے اپنے ساتھ ان کو بٹھلایا کیونکہ وہ بڑے آدمی سمجھے جاتے تھے ان کو ساتھ بیٹھا دیکھ کر دوسرے غریب طلبہ مہمان پیچھے کو ہٹے۔ حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ صاحبو آپ لوگ کیوں ہٹ گئے کیا اس وجہ سے کہ ایک عہدہ دار میرے سامنے بیٹھا ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ آپ لوگ میرے عزیز ہیں میں جس قدر آپ کو معزز سمجھتا ہوں اس کے سامنے ان کی کچھ بھی وقعت نہیں چنانچہ سب غریب طلبہ کو بھی ساتھ بٹھلا کر کھلایا شاید اس سے کسی کو یہ شبہ ہو کہ مولاناؒ نے اپنی شان جتلانے کو ایسا کہہ دیا ہوگا خوب سمجھ لینا چاہیے کہ وہاں شان اور بڑائی کا نام بھی نہ تھا۔ جن صاحبوں نے مولاناؒ کو دیکھا ہے وہ تو خوب جانتے ہیں مگر جن لوگوں نے نہیں دیکھا ہے ان کے لئے ایک قصہ بیان کرتا ہوں اس سے اندازہ ہوگا کہ وہاں شان اور بڑائی کتنی تھی ایک مرتبہ حضرت مولاناؒ حدیث شریف کا درس دے رہے تھے ابر ہو رہا تھا کہ اچانک بوندیں پڑنا شروع ہوگئیں جس قدر طالب علم شریک درس تھے سب کتاب کی حفاظت کے لئے کتابیں اٹھا کر بھاگے اور سہ دری میں پناہ لی اور کتابیں رکھ کر جوتے اٹھانے چلے صحن کی طرف جو رخ کیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت مولاناؒ سب کے جوتے سمیٹ کر جمع کر رہے ہیں اس واقعہ سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ وہاں کس قدر شان کو جتلایا جاتا تھا۔ شان نہ تھی بلکہ محض محبت دینی تھی کہ غرباء کو امراء سے کچھ کم نہیں سمجھا۔ یہی لوگ ہیں جن کی بدولت دنیا کا کارخانہ قائم اور نظام عالم مسلسل ہے جس دن یہ حضرات نہ رہیں گے قیامت قائم ہو جائے گی۔

غرض یہ تو حضرت عمرؓ کا امتحان تھا جس میں وہ پورے اترے آگے جبلہ کا امتحان ہے کہ دیکھیں کیا سمجھ کر ایمان لایا ہے آیا کوئی دنیاوی غرض عز و جاہ کی ہے کہ مسلمان ذی عزت ہوتے چلے جا رہے ہیں ان کے ہمرنگ ہو جائیں گے تو ہم کو بھی عزت نصیب ہوگی۔ یا یہ کہ محض طلب آخرت کیلئے ایمان لایا ہے چنانچہ بعض لوگ بزرگوں سے بھی اس لئے ملتے ہیں کہ لوگ ان کی عزت کرتے ہیں ان کو بڑا سمجھتے ہیں اگر ہم ان کے ساتھ رہیں گے ہماری بھی عزت ہوگی اکثر چھانٹ چھانٹ کر ایسے ہی بزرگوں سے بیعت ہوتے ہیں کی جلا ہے تیلی کے گو وہ کیسا ہی بزرگ اور نیک ہو مرید نہیں ہوتے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ محض مدعی ہیں بس ہم کو نہ طلب صادق ہے نہ محبت واقعی جہاں اپنی دنیاوی غرض پوری ہوتے دیکھتے ہیں چار قدم بڑھا دیتے ہیں یہ نہ ہو تو یہ بھی نہیں ایسے ہی لوگ ہیں جو کہ امتحان کے وقت ادھورے اترتے ہیں عندالامتحان یکرم الرجل او یہان خوب کہا ہے۔

صوفی نہ شود صافی تادر نکشد جامے   بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

ترجمہ: صوفی صاف نہیں ہوتا جب تک جام حقیقت نہ پئے خام کو پختہ ہونے میں کافی دیر لگتی ہے۔

چنانچہ جبلہ کا امتحان ہوا اور وہ اس میں ناکام ثابت ہوا یعنی اس نے کہا کہ اچھا مجھے ایک دن کی مہلت ہو سکتی ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا ہو سکتی ہے اگر یہ شخص مہلت دے صاحب حق سے پوچھا گیا وہ بیچارہ اس قدر نیک دل تھا کہ اس نے اجازت دے دی جبلہ موقع پا کر رات کو اٹھ بھاگا اور رومیوں سے جاملا۔ اور بدستور سابق نصرانی ہو گیا دیکھئے اس کو طلب صادق اور محبت واقعی دین سے نہ تھی کہ ذرا وہمی ذلت کے خوف سے دین چھوڑ دیا جس کا نتیجہ ابدالآباد کی ذلت ہے۔ ادھر حضرت عمرؓ کو دیکھئے کہ ذرا پرواہ نہ کی کہ یہ امیر ہے دوسرا غریب ادھر اس کو دیکھئے کہ ذرا سی تکلیف نفس پر گوارا نہ کر سکا ایسے بہت لوگ ہیں کہ وہ اتباع شریعت محض نفع دنیاوی کے لئے کرتے ہیں لیکن جو خدا کے مخلص بندے ہیں ان کی یہ حالت ہے کہ ان پر کچھ بھی گزر جاوے مگر ان کو حق کے مقابلہ میں سب ہیچ معلوم ہوتا ہے۔

خورند از برائے گلے خار ہا
کشند از برائے دلے بار ہا

ترجمہ: ایک دل کی خاطر سو بار اٹھاتے ہیں اور ایک پھول کی خاطر سو کانٹے کھاتے ہیں۔

طلب صادق

اور پھر چاہے طلب، اور جستجو میں عمر بھی ختم ہو جاوے مگر گھبراتے اکتاتے نہیں کیونکہ ان کی طلب صادق طلب ہوتی ہے اور ان کو معلوم ہوتا ہے کہ محبوب اور مطلوب کون ہے وہ زبان حال سے یوں کہتے ہیں۔

کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول
طلب گار باید صبور و حمول

یعنی فن کیمیا کا طالب اکثر ساری عمر طلب میں برباد کر دیتا ہے اور ہمیشہ ایک تاؤ کی کسر میں رہتا ہے لیکن آپ نے کسی طالب کیمیا کو نہ دیکھا ہوگا کہ وہ ناکامی سے گھبرا کر اکتا گیا ہو اور کیمیا کی فکر چھوڑ دی ہو تو کیا خدا کا طالب کیمیا کے برابر بھی نہ ہو خوب سمجھ لو کہ جو اکتا گیا وہ طالب نہیں صورت طلب کی طلب نہیں کہتے جیسے صورت آدمی کو آدمی نہیں کہتے خوب کہا ہے۔

نیستند آدم غلاف آدم اند
ایں کہ مے بنی خلاف آدم اند

(یہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں آدمی ہونے کے خلاف ہے یہ آدمی نہیں یہ آدمی کے اوپر کا غلاف ہے)

پس جو لوگ الوداع کے خطبہ نہ ہونے سے نہ آویں ان کے نہ آنے کی کچھ پرواہ نہ کی جاوے گی اور ایسے وہمی مصالح سے اس قسم کی بدعات کی اجازت نہ دی جاوے گی البتہ اس سے زیادہ آخری شعبان کا خطبہ بیشک مسنون ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا خطبہ پڑھا جس میں کا یہ ایک ٹکڑا ہے جس کے متعلق یہ بحث خطبہ الوداع کی بطور جملہ معترضہ کے بیان کی گئی۔

عنایت توفیق

اب اصل مقصود مذکور ہوتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مہینہ کے برکات و آثار کے باب میں

ارشاد فرماتے ہیں "هو شهر اوله رحمة و اوسطه مغفرة و اخره عتق من النيران" (الترغيب والترهيب للمنذرى ۲:۹۵) ترجمہ یہ ہے کہ ماہ رمضان ایسا مہینہ ہے کہ اس کا اول حصہ رحمت ہے اور درمیانی حصہ مغفرت ہے اور آخری حصہ آگ سے آزادی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اس حدیث کو دو باتوں کے بیان کے لئے پڑھا ہے مگر اول اس حدیث کی شرح کردوں تو پھر ان کو بیان کروں تو سمجھنا چاہیے کہ یہ جو فرمایا گیا کہ اس کا اول حصہ رحمت ہے تو وجہ اس کی یہ ہے کہ رحمت ایک لطف ہے چونکہ ابتداء حصہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے عمل کرنے کی توفیق عطا ہوتی ہے کہ بدون اس توفیق کے کوئی عمل بھی نہیں ہوسکتا اس لئے اولہ رحمۃ فرمایا گیا اور یہیں سے یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ بعض لوگوں کو جو اپنے تھوڑے سے عمل پر ناز ہوجاتا ہے کہ ہم بہت کچھ کرتے ہیں یہ کوتاہی نظر کی دلیل ہے انسان کوئی کام نہیں کرسکتا جب تک ادھر سے امداد و توفیق نہ ہو خوب کہا ہے۔

بے عنایات حق و خاصان حق   گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

ترجمہ: اللہ کی اور خاصان خدا کی عنایت کے بغیر فرشتے بھی ہوں تو ان کا ورق زندگی سیاہ ہے دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

ایں ہمہ گفتیم و لیک اندر بسیج   بے عنایات خدا ہیچیم و ہیچ

کہ گو ہم نے سب کچھ بتلایا لیکن عنایات خداوندی نہ ہو تو ہم کچھ بھی نہیں پس خدا کی عنایت سے توفیق ہوتی ہے اپنا کوئی کمال نہ سمجھے جب تک کہ دل میں کوئی بات نہیں ہوتی آدمی کچھ بھی نہیں کرسکتا اور یہ خدا کے اختیار میں ہے۔

من چو کلکم درمیان اصبعین

(میں دونوں انگلیوں کے درمیان قلم کی مانند ہوں)

آخر کیا سبب تھا کہ ابوجہل جو کہ نہایت سمجھدار سمجھا جاتا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ میں چچا ہوتا تھا تیرہ برس تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دعوت ایمان فرمائی لیکن اس کو کلمہ پڑھنا نصیب نہ ہوسکا۔ اور حضرت بلالؓ جو کہ حبشہ کے رہنے والے تھے نہ کچھ بڑے زیرک سمجھے جاتے تھے نہ پہلے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میسر تھی کیونکہ مکہ میں آکر ایک کافر کے پھندے میں پھنس گئے کہ آزادی بھی نصیب نہ تھی جس سے تحقیقات کا ہی موقع ملتا پھر تکالیف کا یہ عالم کہ پتھر تپا ہوا سینہ پر رکھ دیا جاتا تھا لیکن باوجود اس کے آپ کی زبان سے احد احد ہی نکلتا تھا۔ بس وجہ یہی تھی کہ ابوجہل کو توفیق نہیں دی گئی اور ان کو توفیق دی گئی۔

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم   ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست

(حضرت حسن بصریؒ کو بصرہ سے اور حضرت بلالؓ کو حبش سے اور حضرت صہیب رومی کو
روم سے جذب فرمایا اور خاک مکہ سے ابوجہل پیدا ہوا کس قدر عجیب قدرت ہے)
حقیقت میں جب تک ادھر سے جذب اور مدد نہ ہو کچھ نہیں ہو سکتا تو یہ کہنا کہ انا کذا و انا
کذا محض جہل ہے ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ وہ چلے جا رہے تھے شاہی محل کے نیچے سے
گزر ہوا بادشاہ نے ان کو اپنے پاس ملنے کے لئے بلایا انہوں نے کہا کہ کیوں کر آؤں کہ دروازہ بڑی
دور پھر وہاں پہرہ چوکی بادشاہ نے کمند لٹکا دی یہ اس کے سہارے سے اوپر پہنچ گئے جب یہ وہاں پہنچے تو
بادشاہ نے ان سے گفتگو شروع کی اثناء گفتگو میں بادشاہ نے پوچھا کہ آپ خدا تعالیٰ تک کیونکر پہنچے
انہوں نے کہا کہ جس طرح آپ تک پہنچا۔ یعنی جس طرح تم نے وہ کمند ڈال دی اور اس کے
ذریعے مجھے کھینچ لیا اس طرح خدا تعالیٰ نے بھی جذب کی کمند ڈال کر مجھے کھینچ لیا خوب کہا ہے۔

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا　　کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

(اس محض دوڑنے سے طریق عشق ہرگز طے نہیں ہوتا ہے اس لئے کہ مثل انگور کے کاٹنے سے خود بخود بڑھتا ہے)
یہ تو اپنے عمل کے بارہ میں ہے اور ایک دوسرے شخص نے جذب کے بارہ میں کہا ہے لیکن
یہ مضمون محبوب مجازی کے باب میں ہے اس لئے الفاظ اچھے نہیں۔

خود بہ خود آں بت عیار بہ برمی آید　　نہ بزور دنہ بزاری نہ بزرمی آید

(وہ خود بخود ہی تو اپنے بندوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں بغیر قوت اور بغیر رونے دھونے کے)
میں نے الفاظ بدل دیئے ہیں کہ محبوب حقیقی کے مناسب ہو جاوے۔
خود بخود مہ دل دار بہ برمی آید الخ (وہ شہنشاہ محبتان خود بخود اپنے بندوں کی طرف متوجہ
ہوتے ہیں) جب محبوبان مجازی کا یہ عالم ہے تو اس محبوب حقیقی کو کون مجبور کر سکتا ہے وہ تو اس کے
شائبہ سے بھی منزہ ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قربان ہو جایئے فرماتے ہیں لاتقل اللھم
ارحمنی ان شئت فانہ لا مکرہ لہ (لم اجد الحدیث فی "موسوعۃ اطراف
الحدیث النبوی شریف") کہ یوں دعا نہ مانگو کہ اے خدا اگر آپ چاہیں تو ہم پر رحم فرمایئے
اس واسطے کہ خدا تعالیٰ پر تو کوئی اکراہ و جبر کرنے والا نہیں ہے۔
صاحبو! دیکھئے ظاہر نظر میں مشیت پر موقوف کر کے دعا مانگنا ادب معلوم ہوتا ہے لیکن واقع
میں سخت بے ادبی ہے لیکن کسی کی نظر اس بے ادبی تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہ نظر نور نبوت اور وحی کی محتاج
ہے اور وجہ اس کی داخل بے ادبی ہونے کی یہ ہے کہ درخواست میں مشیت کی قید لگانے کی ضرورت تو
اسی وقت ہوتی جب کہ خدا تعالیٰ میں مجبور ہونے کا احتمال بھی ہوتا اس لئے یہ قید لگاتے کہ اللہ تعالیٰ پر

دباؤ نہ پڑھے۔ یہاں یہ بات کہاں تم دس ہزار مرتبہ مانگو اور دعا کرو وہ چاہیں گے قبول کرلیں گے یا رد کردیں گے۔ کیونکہ تم قید لگاتے ہو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر دنیا بھر کے عقلاء جمع ہو کر غور کرتے تو اس دقیقہ تک نہ پہنچتے۔ جہاں حضورؐ پہنچے ہیں اور جب خدا تعالیٰ مجبوری سے بالکل پاک ہیں تو اگر تم کو توفیق روزہ رکھنے اور تراویح وقرآن پڑھنے کی نہ دیتے تو تم کیا کرسکتے تھے اسی لئے فرمایا کہ اولہ رحمۃ کیونکہ صوم وغیرہ کی توفیق دینا عبادت کی توفیق دینا بہت بڑی رحمت ہے۔

حقوق روزہ

اور چونکہ ارشاد خداوندی ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ نیکیوں سے برائیاں معاف ہوجاتی ہیں تو جب اول رمضان میں توفیق ہو جانے کی وجہ سے اعمال نیک شروع کئے تو ان سے گناہ معاف ہونے شروع ہوئے جب ان کی بدولت گناہ معاف ہوگئے تو وسط رمضان مغفرت ہوا اسی کو فرماتے ہیں واوسطہ مغفرۃ اور ظاہر ہے کہ گناہوں کا معاف ہوجانا یہی دوزخ سے بچنا ہے تو اس پر متفرع ہو کر یہ ارشاد بھی صحیح ہوا کہ واخرہ عتق من النیران اور یہ تقسیم یا تو مجموعہ شہر کے اعتبار سے لی جاوے تو اس میں رات بھی آجاوے گی اور اس صورت میں روزہ کی تخصیص نہ ہوگی بلکہ اعمال لیل کا بھی اس فضیلت میں داخل ہو اور یا باعتبار اجزاء متفرقہ کے کہ وہ صرف دن کے اوقات ہیں جیسے اس قول میں یہی مراد ہوتا ہے کہ رحمت الشھر کلہ تو ظاہر ہے کہ ضمیر مہینہ کی طرف اجزاء متفرقہ یعنی نہار کے اعتبار سے راجع ہوگی۔

پس اسی طرح حدیث میں بھی احتمال ہے تو اس صورت میں یہ مصلحت خاص ہوجاوے گی روزہ کے ساتھ اور اسی طرح اس تقسیم میں دوسرے اعتبار سے بھی دو احتمال ہیں یعنی ایک یہ ممکن ہے کہ یہ تینوں اثر ہر حصہ میں ہوں لیکن غلبہ اثر کے اعتبار سے تقسیم فرمادیا گیا یعنی چونکہ اول حصہ رمضان میں وصف رحمت کا غلبہ تھا اس کو رحمت کہا گیا گو مغفرت وعتق اس میں بھی ہو اور وسط میں مغفرت غالب تھی اس پر مغفرت کا اطلاق کیا گیا اور اخیر حصہ میں عتق من النار (دوزخ سے آزادی) کا وصف غالب تھا اس لئے اس کو عتق من النیران کہا گیا غرض جس اعتبار سے بھی لیا جاوے آج کا دن حدیث کی آخری جزو کا مصداق ہے ہم کو خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ اس نے ہم کو دوزخ سے نجات بخشی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ حضورؐ نے اس نجات اور آزادی کو رحمت اور مغفرت پر مرتب فرمایا ہے لہذا ہر شخص اپنی حالت کو دیکھ لے اور سوچ لے کہ اس نے رحمت ومغفرت کا کام کیا ہے یا نہیں اور صرف روزہ و تراویح کی ظاہری صورت سے کوئی گمان نہ کرے کہ میں نے رحمت ومغفرت کا کام کیا ہے کیونکہ ہر عمل کی فضیلت اس وقت ثابت ہوتی ہے کہ جب اس عمل کو مع اس کے حقوق کے ادا کیا جاوے۔ اور حدیث

میں روزہ کے باب میں ہے من لم یدع قول الزور والعمل به فلیس لله حاجة فی ان یدع طعامه و شرابه (سنن ابی داؤد: ۲۳۶۲، سنن الترمذی:۷۰۷، مشکوۃ المصابیح:۱۹۹۹)
اب ہر شخص خود دیکھ لے کہ اس نے آج تک کے دن کیونکر گزارے نمازیں پڑھیں یا نہیں پڑھیں اور پڑھیں تو ان کے جملہ حقوق ادا کئے یا نہیں کئے دن میں ہماری کیا حالت رہی رات کو ہم نے کیا کام کئے کسی جگہ نگاہ کو تو آلودہ نہیں ہونے دیا کسی کی غیبت تو نہیں کی جھوٹ تو نہیں بولا پس اگر کسی نے ہمت کی کہ وہ سب گناہوں سے بچا اور سب عبادتوں کو مع اس کے حقوق کے بجالایا تو آج اس کے لئے خوشخبری کا دن ہے اور جس نے ہمت سے کام نہیں لیا اس پر آج حسرت ہے۔

استغناء ورحمت

لیکن جن لوگوں نے آج تک کچھ نہیں کیا ہے ان کو بھی مایوس ہو کر نہ بیٹھ جانا چاہیے ابھی کم و بیش وقت باقی ہے اس میں ہی جو کچھ ہو سکے کر لینا چاہیے ان شاء اللہ اس کو بھی عتق من النار (دوزخ سے آزاد کیا جانا) ہوگا وہ بارگاہ عجیب بارگاہ ہے یہ حالت ہے کہ۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ　　گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست　　صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

(تو جیسا بھی گناہگار ہے اپنے گناہ سے باز آ جا۔ اگر چہ تیسرا گناہ کفر اور آتش پرستی و بت پرستی ہی ہو۔ ہمارا دربار مایوسی اور ناامیدی کا دربار نہیں ہے سو دفعہ بھی اگر تو نے توبہ توڑ دی تو پھر بھی توبہ کر لے)

اور جس طرح وہاں ہر وقت باب رحمت کشادہ ہے کہ کسی کو آنے کی ممانعت اور روک ٹوک نہیں۔ اسی طرح وہاں کسی کے آنے نہ آنے کی پرواہ بھی نہیں۔

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو　　دارو گیر وحاجب ودربان دریں درگاہ نیست

(جو آنا چاہے آجائے جو جانا چاہے چلا جاتے اس دربار میں چوبدار چوکیدار اور دروگیر دربان نہیں ہے)

کہ جس کا جی چاہے جب چاہے چلا آوے۔ اور جس حالت میں چاہے چلا آوے اور ہر کہ خواہد عموم سے یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ بعضے لوگ جو کسی ہندو یا عیسائی کو مسلمان کرنے کے قبل اول غسل دیا کرتے ہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہر کہ کے عموم میں بے غسل والا بھی داخل ہے۔

صاحبو! اسلام میں آنے کے لئے نہ غسل کی ضرورت ہے نہ وضو کی بلکہ اگر استنجا بھی نہ کیا ہو تو اس کے انتظار کی ضرورت نہیں پہلے مسلمان کر لو اور اس کے بعد غسل وغیرہ دو اور ایک یہ بھی تو بات ہے کہ کسی کو کیا خبر ہے کہ چار منٹ کے بعد زندہ رہے گا یا ختم ہو چکے گا بعض لوگ تو یہاں تک

غضب کرتے ہیں کہ مسلمان کرنے کے بعد مسہل دینے کی تجویز کرتے ہیں میں کہتا ہوں کہ اگر طہارت حاصل کرنے کے لئے یہی شرط ہے کہ حالت کفر کی کوئی چیز باقی نہ رہے تو فصد بھی لینا چاہیے بلکہ گوشت پوست بھی نیا ہونا چاہیے الحاصل یہ سب لغو قیود ہیں اس دربار میں جس کا جی چاہے جب چاہے اور جس حالت میں بھی ہو چلا آوے۔ صاحبو کیا آج کوئی بادشاہ ہے کہ وہ ناپاکوں کو بھی اپنے دربار میں حاضری کی اجازت دے اسی کو عارف شیرازی کہتے ہیں۔

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو   دار و گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

(جو آنا چاہے آجائے جو جانا چاہے چلا جاتے اس دربار میں چوبدار چوکیدار اور روگیر دربان نہیں ہے)

غرض جس طرح یہاں کسی کو آنے کی ممانعت اور روک ٹوک نہیں اسی طرح اگر بگڑ جاوے تو رکھنے کی بھی کوئی تمنا نہیں کرتا کسی کو اس طرح سر نہیں چڑھایا گیا کہ وہ ذرا بھی ناز کر سکے پس جب یہ حالت ہے تو ہم لوگوں کو مایوس نہ ہونا چاہیے اور یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اب تو سارا رمضان گزر چکا ہے اب ہماری مغفرت کیونکر ہو سکے گی۔

الطاف و مراحم کی گھڑی

آج اٹھائیسواں روزہ ہے ابھی ایک یا دو دن باقی ہیں میں حسب وعدہ شریعت دعویٰ کرتا ہوں کہ اگر آپ چاہیں گے اور کوشش کریں گے تو آج ہی مغفرت ہو جاوے گی یہ ایک دو دن ہی کافی ہو جائے گا تم اگر گناہوں کی پوٹ لے کر بھی حاضر ہو گئے تو ادھر کے ایک چھینٹے میں سب دھل جاویں گے اس کی ایسی مثال ہے۔

گر جہاں پر برف گردد سر برس   تاب خور بگدازز وش از یک نظر

یعنی اگر سارا عالم بھی برف سے الٹ جاوے تو عالمتاب آفتاب کے نکلتے ہی سب پانی ہو کر بہہ جاوے گی اسی طرح اگر سارا عالم بھی گناہ سے بھر جاوے تو ادھر کی ایک نگاہ کافی ہے۔

سبحان اللہ کس پاکیزہ مثال سے کتنے بڑے مسئلہ کو باآسانی حل کر دیا۔ واقعی بات یہ ہے کہ اہل اللہ پر چونکہ حقائق کا انکشاف ہوتا ہے اس لئے ان سے زیادہ بہتر کوئی مثال بھی پیش نہیں کر سکتا سچ یہ ہے کہ یہی لوگ سچے فلسفی ہیں چنانچہ افلاطون کو کسی نے خواب میں دیکھا اور اس سے ایک ایک حکیم کا نام لے کر پوچھا کہ یہ کیسے تھے سب کی نسبت یہی کہتا رہا کہ کچھ نہیں پھر اس نے حضرت بایزیدؒ حضرت شیخ شہاب سہروردیؒ کی نسبت پوچھا تو اس نے کہا کہ اولئک ھم الفلاسفۃ حقاً غیر مقصود یہ ہے کہ دو دن جو باقی ہیں ان میں تو اپنی کچھ فکر کر لینی چاہیے پھر تو بعد رمضان معلوم ہی ہے کہ آزاد و غافل ہو جاؤ

گے اگر چہ ادھر کے الطاف و مراحم پر نظر کر کے تو ایک دم کی غفلت بھی جائز نہیں ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی ٭ شاید کہ نگاہے کند آگاہ نہ باشی

(محبوب حقیقی سے تھوڑی دیر بھی غفلت میں نہ گزارو شاید وہ کسی وقت بھی نظر کرم کردے اور تو بے خبر ہو)

بخدا جس کا کام بنا ہے ایک ہی لحہ میں بن گیا ہے ایک ہی لحہ کی عنایت کافی ہوگئی مگر بہت دن تک اس لئے لگے رہتے ہیں کہ وہ لحہ معین نہیں یعنی یہ خبر نہیں کہ وہ ایک لحہ کس وقت ہوگا جس میں نگاہ اکسیر اثر پڑ جاوے گی اسی کو مولانا بھی ایک تفسیر پر فرماتے ہیں۔

صحبت نیکاں اگر ایک ساعت است ٭ بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است

یک زمانے صحبت با اولیاء ٭ بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

(نیک بندوں کی ایک ساعت سو سالہ زہد و طاعت سے بہتر ہے اولیاء اللہ کی ایک ساعت کی صحبت سو سالہ بے ریا عبادت سے افضل ہے)

بعض نے اس کی یہی توجیہ کی ہے کہ تمام اوقات میں سے ایک وقت ایسا ہوتا ہے چنانچہ شاہ بھیک صاحبؒ اور شاہ ابوالمعالی صاحبؒ کا قصہ ہے کہ شاہ ابوالمعالی صاحبؒ کسی بات پر شاہ بھیک صاحبؒ سے خفا ہوگئے۔ اور علیحدہ کر دیا یہ جنگلوں میں روتے پھرتے تھے برسات آئی حضرت کا مکان گر پڑا بی بی صاحب نے فرمایا ایک آدمی گنوار سا ان کاموں کے لائق تھا اسی کو آپ نے نکال دیا۔ حضرت نے فرمایا میں نے ہی تو نکالا ہے تم بلالو میں تم کو تو منع نہیں کرتا بی بی صاحبہ نے بلا بھیجا ان کی عید آ گئی آموجود ہوئے بی بی صاحبہ نے مکان کی حالت دکھلائی وہ فوراً جنگل پہنچے اور لکڑی مٹی جمع کر کے مرمت میں لگ گئے حتیٰ کہ مکان کی تکمیل کر کے چھت پر مٹی کوٹ رہے تھے کہ حضرت گھر میں تشریف لائے اور کھانا کھانے بیٹھ گئے اور چھت پر سے مٹی کوٹنے کی آواز سن کر رحمت کا جوش ہوا اور باہر صحن میں تشریف لا کر ان کو ٹکڑا روٹی کا دکھلایا کہ لو۔ وہ وہیں سے کود پڑے حضرت نے لقمہ ان کے منہ میں دیا اور سینہ سے لگایا۔ بس سارا کام ایک لحہ میں بن گیا اس لئے کہتا ہوں کہ ایک لحہ بھی غفلت مت کرو مگر خیر اتنی ہمت نہ ہو تو رمضان رمضان تو بیدار رہو یہ ایک دو دن رہ گیا ہے اس کو ضائع مت کرو۔

حقیقت استغفار

نیز اس مضمون کے متعلق میں وہ حدیث پھر یاد دلاتا ہوں جو کہ جمعہ گذشتہ کو بیان کی گئی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں رغم انفہ رغم انفہ رغم انفہ صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کون شخص فرمایا ایک تو وہ میرا نام اس نے سنا اور مجھ پر درود نہ بھیجا دوسرا وہ شخص کہ اس کے سامنے اس

کے بوڑھے ماں باپ زندہ رہے اوراس نے ان کی خدمت کر کے جنت نہ لے لی تیسرا وہ شخص کہ رمضان شریف آئے بھی اور گزر بھی گئے اور وہ اسی طرح گنہ گار سیہ کار رہا اور نیک عمل کر کے اس نے اپنی مغفرت نہ کرائی۔

صاحبو! غور کرو حضورؐ اس شخص کو کوس رہے ہیں اور حضورؐ کا کوسنا خدا کا کوسنا ہے اور جس شخص کو خدا تعالیٰ کوسیں اس کا ٹھکانا کہاں ہوسکتا ہے۔

چوں خدا از خود سوال و گدکند پس دعائے خویشتن چوں ردکند

(جب حق سبحانہٗ وتعالیٰ خود سوال کرنے کو فرمائیں تو پھر ہماری دعاؤں کو کیسے رد فرمائیں گے)

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ بھی فرماتے ہیں وہ ارشاد خداوندی ہوتا ہے حضؐ کی تو وہ حالت ہے۔

در بس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استاد ازل گفت بگو می گویم

(آئینہ کے پیچھے مجھے طوطی کی طرح رکھا ہے جو کچھ استاد ازل نے کہا تھا کہ وہی اب کہہ رہا ہوں)

تو آپ کا بددعا کرنا خالی نہیں جاسکتا اب فکر کرو اگر مغفرت چاہتے ہو تو خدا تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو اور معاف کرانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ صرف تسبیح ہاتھ میں لے کر استغفر اللہ استغفر اللہ پڑھتے رہو بلکہ یہ بھی کرو اور اس کے ساتھ اہل حقوق کے حقوق بھی ادا کرتے رہو اگر کسی شخص کے پاس دوسرے کی زمین دبی ہو یا موروثی ہو اس کو چھوڑ دو کسی کے ذمہ کسی کا قرض ہو اس کو ادا کر دو۔ اور سبکدوش ہو جاؤ لوگ اپنے جی میں کہتے ہوں گے کہ موروثی زمین چھوڑنے کی بے ڈھب کہی پھر ہم کھاویں گے کہاں سے لیکن صاحبو غور کرو اگر کسی شخص کے موروثی کھیتوں میں سے ریل نکل جاوے اور اس کے سب کھیت ریل میں آ جاویں اور معاوضہ نہ ملے زمین دار کو تو کیا کرے گا اور کہاں سے کھاوے گا افسوس ہے کہ ظاہری حکومت کے سامنے تو کان نہ ہلایا جاوے اور خداوندی حکم کے سامنے چوں وچرا کی گنجائش ہو۔

احسان شناسی کا تقاضا

اصل یہ ہے کہ آپ لوگوں کے دلوں میں اسلام اور اس کے احکام کی چونکہ بلا مشقت مل گئے ہیں باوجود سرتا سر نافع ہونے کے کہ بڑا نفع رضائے حق ہے قدر و قیمت نہیں ہے خوب کہا ہے۔

اے گراں جا خوار دیدستی مرا زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا

(اے شخص تو مجھ کو صرف اس لئے جرنیل سمجھتا ہے کہ تو نے مجھے ارزاں خرید لیا ہے)

ارشاد خداوندی ہے ماقدروا اللہ حق قدرہ۔ (انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر نہ پہچانی جب

کہ قدر کا حق ہے) سبب یہ ہے کہ اسلام کے ملنے میں کچھ زرتو خرچ نہیں ہوا کہ اس کی قدر ہوتی۔

ہر کہ اوارزاں خرد ارزاں دہد گوہرے طفلے بقرص نان دہد

(جو شخص ارزاں چیز خریدتا ہے وہ اسے اونے پونے دوسرے کے ہاتھ فروخت کرتا ہے
جیسے بچہ روٹی کے بدلے موتی فروخت کر دیتا ہے)

حکام کی خوشنودی تو بڑی کوششوں سے زر د جواہر خرچ کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ بخلاف رضائے خداوندی کے لیکن حقیقت میں یہ سخت رذالت ہے کیونکہ جس قدر زیادہ احسان کسی کا ہوتا ہے اسی قدر زیادہ اس کے سامنے پگھلا کرتے ہیں اور شرماتے ہیں نہ کہ الٹی شرارت اور نافرمانی پر کمربستہ ہو جاویں لہذا اپنی اس معمولی تکلیف اور مشقت کی کچھ پرواہ نہ کرنی چاہیے اگر کسی کے پاس موروثی زمین ہے تو اس کو چاہیے کہ فوراً اس کو چھوڑ دے بلکہ میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص موروثی زمین چھوڑ دے تو وہ زیادہ آرام و آسائش میں رہے گا کیونکہ ایسا کرنے سے وہ ایماندار اور خوش معاملہ مشہور ہو جاوے گا پھر ہر زمین دار کوشش کرے گا کہ اس کی زمین اسی کے کاشت میں رہے اگر اب بھی لوگوں کی سمجھ میں نہ آوے اور نہ مانیں تو وہ جانیں۔

دو شخص ضلع سہارنپور کے میرے پاس آئے میں اتفاق سے موضع بھنسانی گیا ہوا تھا وہ میرے پاس وہیں پہنچے کہ ہم کو مرید کرلو میں نے پوچھا تمہارے پاس موروثی زمین تو نہیں معلوم ہوا کہ ہے میں نے کہا کہ اس کو چھوڑ دو کہنے لگے کہ پہلے مرید کرلو پھر چھوڑ دیں گے میں نے کہا کہ پہلے چھوڑ آؤ جب مرید کروں گا یہ سن کر چھوڑ کر آنے کا وعدہ کر گئے اور آج تک واپس نہیں آئے۔ ایک گاؤں کے لوگ مدت سے مجھے بلا رہے ہیں لیکن اس لئے جانے کی نوبت نہیں آئی کہ وہاں سب کے پاس موروثی زمینیں ہیں۔ بس وہ میرے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے کہ مجھ کو روٹی کہاں سے کھلاؤ گے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر ایک درہم حرام اور نو حلال کے ہوں تو اس ایک کے مل جانے سے اس کی سب عبادت غارت ہے اور غضب یہ ہے کہ لوگ حرام کمائی بیوی بچوں کے لئے کماتے ہیں یہ بھی نہیں کہ اپنے لئے ایسا کریں۔

مال حرام اور روزہ

لیکن اسی سے کوئی یہ تجویز نہ کرلے کہ جب ہمارے پاس حلال کی آمدنی نہیں ہے اور حرام کی آمدنی کھانے سے روزہ قبول نہیں ہوتا تو روزہ رکھنے سے کیا فائدہ۔ کیونکہ اب تو صرف ایک گناہ ہے کہ حرام مال سے پیٹ بھرا اگر روزہ نہ رکھو گے تو ایک دوسرے اس سے بھی زیادہ سخت گناہ

میں ماخوذ ہوں گے۔

فرحت عید الفطر

یہ بیان تھا بقایا رمضان کے متعلق اب حسب وعدہ دوسرا مضمون عید کے متعلق بیان کرتا ہوں اور اتفاق سے اس حدیث سے اس کا بھی تعلق ہے وہ یہ ہے کہ حدیث میں رمضان کے آخری حصہ کو عتق من النیران فرمایا گیا ہے اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مطلب اس کا یہ ہے کہ یہ عتق رحمۃ اللہ اور مغفرت پر مرتب ہے جب یہ بات ثابت ہوگئی تو معلوم ہوا کہ آخر رمضان میں رحمت اور مغفرت اور عتق من النیران تینوں کا تحقق ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا اس کے ساتھ ایک دوسرا مقدمہ قرآن سے ملاؤ کہ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا (اے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور اس کی رحمت پر خوشی کا اظہار کرو) ان دونوں مقدموں کے ملانے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اس موقع رحمت پر کوئی فرحت ہونی چاہیے اور اس فرحت کا جزئیاً بھی حدیث سے اثبات کیا جاتا ہے فرماتے ہیں **للصائم فرحتان فرحة عند الافطار وفرحة عند لقاء ربه (سنن النسائی کتاب الصیام باب:۴۱، مسند احمد ۲:۲۵۷، کنز العمال:۲۳۵۹۳)** (روزہ دار کیلئے دو خوشیاں ہیں ایک خوشی افطار کے وقت ہوتی ہے دوسری خوشی حق سبحانہٗ وتعالیٰ سے ملاقات کے وقت ہوگی) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وقت افطار کے وقت فرحت کا ہے اس کے بعد یہ سمجھنا چاہیے کہ افطار دو ہیں ایک افطار صغیر جو کہ روزمرہ ہوتا ہے دوسرے افطار کبیر یعنی وہ افطار کہ ختم رمضان پر ہو جس پر روزے پورے ہو جاتے ہیں جس کی طرف عید کو مضاف کر کے عید الفطر کہتے ہیں پس یہ افطار مجموعہ شہر کا ہے نہ کہ کسی خاص جزو کا جیسا کہ ہمارے ناواقف بھائیوں نے ایک جاہلانہ مسئلہ ایجاد کیا ہے کہ عید کی شب کو بالکل نہیں کھاتے جب صبح ہوچکتی ہے تو کچھ کھالیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ روزہ کھول لو اس رسم کو اپنے ایام طفلی سے میں دیکھتا چلا آتا ہوں تحقیق کرنے سے اس کی اصل یہ معلوم ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ عید کے روز صبح کو کچھ کھالیا کرتے تھے اس کے بعد نماز کو تشریف لے جاتے تھے اور دقیقہ شناسان امت نے اس کی ایک حکمت بالقاء حق بیان کی ہے اور بالقاء حق کی قید میں نے اس لئے لگا دی کہ اسرار حکم میں غور وفکر کرنا مناسب نہیں کیونکہ جو کچھ فکر سے حاصل ہوگا تمہارے ذہن کا اختراع ہوگا نہ کہ حکمت کیونکہ فکر وصول الی الحق کا طریق ہی نہیں۔

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ　　جز شکستہ مے نگیرد　　فضل شاہ

(فہم و خاطر تیز کرنا راہ سلوک نہیں بلکہ شکستگی پیدا کرنا ہے اللہ تعالیٰ کا فضل سوائے شکستگان اور کسی پر نہیں ہوتا)

پس ہم کو بالکل شکستگی اختیار کرنی چاہیے اس سے البتہ ہم پر فیضان ہوسکتا ہے خوب کہا ہے ؎

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود　　ہر کجا مشکل جو آب آنجا رود

ہر کجا دردے دوا آنجا رود　　ہرکجا رنجے شفا آنجا رود

(جہاں پستی ہوتی ہے وہیں پانی آجاتا ہے جہاں اشکال ہوتا ہے وہاں جواب دیا جاتا ہے جہاں درد ہوتا ہے وہاں دوا استعمال کی جاتی ہے جہاں رنج ہوتا ہے وہاں شفاء پہنچتی ہے)

تو جب تم بالکل اپنے کو سپرد کر دو گے تو خدا تعالیٰ خود بخود ان علوم کا القاء تمہارے قلب میں کریں گے اور وہ حالت ہوگی۔

بینی اندر خود علوم انبیاء　　بے کتاب و بے معید و اوستا

(تم اپنے اندر خود علوم انبیاء علیہم السلام بغیر کتاب پڑھے بغیر معاون اور بغیر استاد کے دیکھو گے)

غرض دقیقہ شناسان، امت کو بالقاء حق یہ بات معلوم ہوئی کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اپنے اس فعل سے یہ بات ظاہر فرماتے ہیں کہ آج روزہ نہیں ہے تاکہ لوگ حد شرعی سے آگے نہ بڑھ جاویں تو جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء رمضان کی ایک حد مقرر فرمادی ہے اسی طرح انتہا رمضان کی بھی ایک حد مقرر فرمادی اگر ایسا نہ فرماتے تو یہود و نصاریٰ کی طرح سب لوگ گڑبڑ میں پڑ جاتے اسی واسطے رمضان سے پہلے مستقلاً روزہ رکھنے کو بھی منع فرمایا لیکن اس میں فرق کیا کہ تقدم کو تو حرام نہیں کیا اور تاخر کو حرام کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقدم میں احتمال اس بات کا بھی ہے کہ ممکن ہے آج رمضان ہو کیونکہ بعض دفعہ ایسا ہو جاتا ہے کہ ۲۹ کا چاند دس پانچ جگہ نظر آوے اور دو چار جگہ نظر نہ آوے پس ممانعت خفیف ہوئی تاکہ ممانعت بھی اپنے حد پر رہے اور رمضان کے ختم پر اس وقت تک عید کرنا جائز نہیں جب تک کہ رویت کا تیقن نہ ہو جائے اور جب تیقن ہو جاوے تو اب اس میں احتمال رمضانیت کا نہیں اس لئے رمضان کے بعد متصلاً یعنی عید کے روز روزہ رکھنا حرام ہوا۔ وھذا من المواھب پس باتباع اسی اظہار کے لئے اکثر بزرگ صبح ہوتے ہی کچھ کھا لیتے تھے تاکہ معلوم ہو جاوے کہ آج روزہ نہیں لوگوں نے سمجھا کہ یہ رات کے روزہ کا افطار ہے حالانکہ وہ افطار کبیر تھا اور یہ

سمجھ کر اس رات میں روزہ رکھنا شروع کر دیا جس کا نام شبہ ہونا زیادہ مناسب ہے۔

غرض اس سے معلوم ہوا کہ شرعاً افطار کبیر بھی کوئی چیز ہے اور وہ بھی محل فرحت ہونا چاہیے پس اسی افطار کبیر کی فرحت کا نام عید ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر اس کی نصاً تشریح نہ ہوتی تو اس حکمت کی بناء پر رائے سے تقرر عید کا ہوسکتا حکمت کا رائے سے سمجھنا اور اس پر بناء حکم کرنا یہ کافی نہیں مدار اصلی تشریح ہی پر ہے۔

اگر چہ اس کی حکمت بالکل نا معلوم ہوا لبتہ تشریع کے بھروسہ کچھ حکمت بھی سمجھ میں آ سکتی ہے باقی حکمت کے سمجھنے پر حکم کا ماننا موقوف نہیں ہماری تو وہ حالت ہونی چاہیے۔

زبان تازہ کردن باقرار تو نینگیختن علت از کار تو

(آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپ کے کاموں میں علتیں نکالنے کو مانع ہے)

اور ہمارا وہ مذہب ہے جیسا حضرت استاذی علیہ الرحمۃ کا ارشاد ہے کہ ہر درویشے کہ چوں و چرا کند و ہر طالب علمے کہ چوں و چرا نہ کند ہر دو را در چراگاہ باید فرستاد۔ طالبعلم کو تو چون چرا کا حق اس لئے ہے کہ وہ طالب فن ہوتا ہے لیکن طالب عمل کو اس کی اجازت ہرگز نہیں اور حکمت کی تلاش میں ایک مفسدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ عوام یوں سمجھ جاتے ہیں کہ یہی مصالح بناء حکم ہیں اور جب کسی حکم میں ان کو مصالح نظر نہیں آتے تو اس حکم کے من اللہ ہونے میں ان کو شبہ ہونے لگتا ہے یا اگر کوئی مصلحت اپنے ذہن سے مخترع کی اور اس کو مدار حکمت سمجھا اور مخدوش ہوگئی تو اس کے انہدام سے حکمت کے انہدام کا شبہ ہو جاتا ہے ہاں اگر مصلحت خود بخود بلا تلاش ذہن میں آ جاوے تو اس کے بیان میں مضائقہ نہیں ہے اور وہ بھی ظناً غرض جب ادھر سے بولنے کا اشارہ پاوے جیسا بلا فکر کوئی وارد قلب میں آ جاوے زبان کھولے ورنہ لب بستہ رہے کہ نطق و سکوت میں اسی کا تابع رہنا چاہیے خوب کہا ہے۔

بگوش گل سخن گفتۂ کہ خندان ست بعندلیب چہ فرمودۂ کہ نالاں ست

(پھول کے کان میں کیا کہہ دیا ہے کہ خنداں ہے بلبل سے کیا فرما دیا ہے کہ نالاں ہے)

عید میلاد؟

غرض یہ کہ عید ایک ایسا زمانہ ہے جس میں ہم کو بشاشت کا حکم ہے اور چونکہ یہ دینی خوشی ہے اس لئے اس کے اظہار کا طریقہ بھی دین ہی سے تحقیق کرنا چاہیے تفصیل اس کی یہ ہے کہ خوشی دو قسم کی ہوتی ہے ایک دنیوی خوشی اور ایک دینی خوشی سو دینی خوشی پر کسی خاص ہئیت پر خوشی منانا یہ محتاج وحی کا

ہے۔ یعنی اگر ہم کسی مذہبی خوشی میں کسی خاص طریقہ سے خوشی منانا چاہیں تو ہم کو دیکھنا چاہیے کہ شریعت نے اس موقع پر عید کرنے اور خوشی منانے کی ہم کو اجازت دی ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس میں اپنی رائے سے اختراع کرنا متضمن ہوگا ایک مفسدہ پر یعنی چونکہ اصل بناء اس کی دین ہے اس لئے عوام اس طریق مخترع کو بھی دین سمجھیں گے اور یہ مفسدہ عظیمہ ہے البتہ دنیوی عید جب کہ اس میں کسی مفسدہ کا اندیشہ نہ خود اپنی تجویز سے بھی ہو سکتی ہے آج کل ہمارے چند اخوان زمان[1] نے ایک عظیم الشان مفسدہ کی بنیاد ہندوستان میں ڈالی ہے یعنی یوم ولادت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یوم عید بنانے کی تجویز کی ہے اور یہ خیال ان کے ذہن میں دوسری اقوام کے طرز عمل کو جو اپنے اکابر دین کے ساتھ کرتے ہیں دیکھ کر پیدا ہوا ہے لیکن اس قاعدہ مذکورہ کی بناء پر لوگوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ یوم ولادت کی خوشی دنیوی خوشی نہیں ہے یہ مذہبی خوشی ہے پس اس کے تعین طریق کے لئے وحی کی اجازت ضروری ہے اور اگر کوئی یہ کہے کہ ہم بطور سال گرہ کے دنیوی طرز پر کرتے ہیں تو میں کہوں گا کہ ایسا کرنے والے سخت بے ادبی اور گستاخی جناب نبویؐ میں کر رہے ہیں صاحبو! کیا حضورؐ کو اس جلالت وعظمت پر دنیا کے بادشاہوں پر جن کو حضور سے کچھ بھی نسبت نہیں ہے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس فرحت کے لئے بس ایک دنیوی رذیل سامان اسی طرح کا کرتے ہو جیسا ان سلاطین کے لئے کیا کرتے ہو۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک (زمین کو عالم بالا سے کیا نسبت)

مجھے اس موقعہ پر ایک بزرگ کی حکایت یاد آ گئی کہ وہ جنگل میں رہتے تھے ایک کتیا پال رکھی تھی اتفاق سے ایک مرتبہ کتیا نے بچے دیئے تو آپ نے تمام شہر کے معززین کو مدعو کیا لیکن ایک بزرگ شہر میں رہتے تھے ان کو نہیں بلایا ان بزرگ نے ازراہ بے تکلفی دوستانہ شکایت کی تو ان بزرگ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ حضرت میرے یہاں کتیا نے بچے دیئے تھے اس کی خوشی میں سگان دنیا کی دعوت کر دی سخت گستاخی تھی کہ میں ان دنیا کے کتوں کے ساتھ آپ کو مدعو کرتا جس روز میرے اولاد ہوگی اور مجھ کو خوشی ہوگی اس دن آپ کو مدعو کروں گا ان کتوں میں سے ایک کو بھی نہ پوچھوں گا جب اولیاء کے ساتھ دنیا داروں کا سا برتاؤ بے ادبی ہے تو سید الانبیاءؑ کے ساتھ دنیاداروں کا سا برتاؤ کیسے بے ادبی نہ ہوگی۔

صوم یوم میلاد

اب اس کی دلیل سنئے کہ یوم ولادت مذہبی خوشی ہے دنیوی خوشی نہیں ہے یہ تو سب کو معلوم ہے کہ دنیا کا اطلاق اس خطہ زمین پر یا زیادہ سے زیادہ چند فرسخ اس کے متصل ہوا پر ہوتا ہے پس اگر کوئی دنیوی خوشی ہوگی تو اس کا اثر اسی خطہ زمین تک محدود رہے گا اس سے متجاوز نہ ہوگا اور

[1] یعنی اس زمانہ کے آدمیوں نے ۱۲

ولادت حضور پرنورؐ کے دن نہ صرف زمین کے موجودات بلکہ ملائکہ عرش وکرسی اور باشندگان عالم بالا سب کے سب مسرور اور شادماں تھے وجہ یہ تھی کہ حضور ﷺ کی ولادت شریفہ کفر وضلالت کی ماحی اور توحید حق کی حامی تھی جس کی بدولت عالم کا قیام ہے کیونکہ قیامت اسی وقت قائم ہوگی جب ایک شخص بھی دنیا میں خدا کا نام لینے والا نہ رہے گا اور قیامت کے قائم ہونے سے فرشتے بھی اکثر فنا ہو جاویں گے پس آپ کا ظہور چونکہ سبب تھا تمام عالم کے بقاء کا اس لئے تمام عالم میں یہ خوشی ہوئی جب اس کا اثر دنیا سے متجاوز ہو گیا تو اس خوشی کو دنیوی خوشی نہیں کہہ سکتے جب معلوم ہوا کہ یہ دنیوی خوشی نہیں بلکہ مذہبی خوشی ہے تو اس میں ضرور ہر طرح سے وحی کی احتیاج ہوگی یعنی اس کے وجود میں بھی اور اس کیفیت میں بھی۔ اب مجوزین ہم کو دکھلائیں کہ کس وحی سے یوم ولادت کے یوم العید بنانے کا حکم معلوم ہوتا ہے اور کیا صورت اس کی بتلائی گئی ہے اگر کوئی قل بفضل اللہ سے استدلال کرے تو میں کہوں گا کہ صحابہ کرامؓ جو کہ حضور ﷺ کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے اور تمام عالم سے زیادہ کلام مجید کو سمجھتے تھے ان کی سمجھ میں یہ مسئلہ کیوں نہیں آیا بالخصوص جبکہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی ان کے رگ وریشہ میں سرایت کی ہوئی تھی علیٰ ہذا تابعین رحم اللہ جن میں بڑے بڑے مجتہد ہوئے ہیں ان کی نظر یہاں تک کیوں نہ پہنچی۔ ہاں جن امور کے متعلق حضورؐ سے اجازت ہے اس کو ضرور کرنا چاہیے مثلاً آپ نے اپنی ولادت کے دن روزہ رکھا اور فرمایا **ذلک الیوم الذی ولدت فیہ (الصحیح لمسلم کتاب الصیام باب:۳۶، رقم:۱۹۷، مسند احمد ۵:۲۹۷)** اس لئے ہم کو بھی اس دن روزہ رکھنا مستحب ہو سکتا ہے دوسرے پیر کے دن نامہ اعمال حق تعالیٰ کے روبرو پیش ہوتے ہیں پس یہ مجموعہ وجہ ہوگی اس حکم کی اور اگر منفرداً بھی مانا جاوے تب بھی صحیح ہے لیکن صرف اسی قدر کی اجازت ہوگی جتنا کہ ثابت ہے۔

حقیقت عرس

اور جس طرح یوم ولادت کی خوشی کے اختراعات باطل ہیں اسی طرح کسی کی وفات کی تاریخ کے کہ وہ دن بزرگوں کی خوشی کا دن ہے اختراعات بھی اور یہیں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ آج کل جو لوگوں نے بزرگوں کے عرس کا طریقہ اختراع کیا ہے یہ بھی محض لغو اور تجاوز عن الحد ہے۔ اصل حقیقت اس کی یہ تھی کہ عرس کے معنی لغت میں شادی کے ہیں اور حاصل شادی کا یہ ہے کہ محب کا محبوب سے وصل ہو پس چونکہ ان حضرات کی موت ان کے لئے وصل محبوب ہے اس لئے ان کے

یوم وصال کو یوم العرس کہا جاتا ہے نیز ایک روایت میں بھی آیا ہے کہ جب کسی مقبول بندے کی وفات ہوتی ہے اور فرشتے اس کی قبر میں آ کر سوال کرتے ہیں تو سوال و جواب کے بعد کہتے ہیں نم کنومۃ العروس تو وہ دن ان حضرات کے لئے یوم العرس ہوا اسی کو ایک بزرگ خوب کہتے ہیں۔

خوشا وقتے و خرم روزگارے کہ یارے برخورد از وصل یارے

(اسکے غم میں پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے خواہ اپنے زخموں پر نظر پڑے یا اسکے زخموں پر)

اور گو وصل ان حضرات کو دنیا میں بھی ہوتا ہے تاہم اس وصل میں اور اس وصل میں فرق ہے کہ یہاں بہ حجاب ہے اور وہاں بلا حجاب جیسا مولانا نے فرمایا۔

گفت مکشوف و برہنہ گو کہ من می نہ گنجم باصم در پیرہن

(مکشوف برہنہ ہو کر کہنے لگا کہ میں معشوق کے ساتھ لباس میں نہیں سما سکتا)

اگر چہ خدا تعالیٰ جسم اور لوازم اور عوارض جسم سے پاک ہے لیکن یہ مثال کے لئے کہا جاتا ہے اور جیسا حضرت غوث پاکؒ فرماتے ہیں۔

بے حجابانہ درآ ازدر کاشانہ ما کہ کسے نیست بجز درد تو درخانہ ما

(بے حجابانہ ہمارے کاشانے میں آؤ کہ تمہارے درد کے سوا یہاں کچھ بھی نہیں)

یہ کیفیت تو وہاں کے وصال کی ہے اور دنیا میں بوجہ حجاب اور سیری نہ ہونے کے ان کی یہ حالت ہوتی ہے۔

دل آرام در بر دل آرام جو لب از تشنگی خشک برطرف جو

نگویم کہ برآب قادر نیند کہ برساحل نیل مستسقی اند

(جس دل آرام یعنی محبوب سے تم نے دل لگا رکھا ہے تو پھر تمام دنیا سے آنکھیں بند کر لو میں نہیں کہتا کہ میں پانی پر قادر نہیں بلکہ دریائے نیل کے ساحل پر پیاسا ہوں)

اور چونکہ مرکر ان کو یہ دولت نصیب ہوتی ہے اس لئے وہ اس کی تمنائیں کرتے ہیں اور شدت شوق میں یوں کہتے ہیں کہ۔

خرم آں روزکزیں منزل ویران بروم راحت جاں طلبم روز پئے جاں بروم

(جس دن دنیا سے کوچ کروں وہ دن بہت اچھا ہے جان محبوب حقیقی پر نثار کروں اور خوش وخرم کوچ کروں)

اوران حضرات کو چونکہ مرنے کی خوشی ہوتی ہے اس لئے اس میں نہایت مطمئن ہوتے ہیں چنانچہ ایک نقش بندی بزرگ کی حکایت ہے کہ انہوں نے وصیت کی تھی کہ جب میرا جنازہ لے چلو تو ایک شخص یہ اشعار ساتھ ساتھ پڑھتا چلے۔

مفلسا نیم آمدہ در کوئے تو شیئاً للہ از جمال روئے تو
دست بکشا جانب زنبیل ما آفریں بردست و برباز وئے تو

(آپ کے دربار میں ہم مفلس ہوکر آئے ہیں اپنے جمال کے صدقہ میں کچھ عنایت کیجئے
ہماری زنبیل کی طرف ہاتھ بڑھایئے آپ کے دست وبازو پر آفرین ہے)

کیوں صاحب کیا بے اطمینانی میں کسی کو ایسی فرمائشوں کی سوجھ ہوسکتی ہے یہ غایت فرحت کا اثر تھا حضرت سلطان نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کی حکایت مشہور ہے کہ جب آپ کا انتقال ہوگیا اور جنازہ لے چلے ایک مرید نے شدت غم میں درد کے ساتھ یہ اشعار پڑھے۔

سرو سیمینا بصرا مے روی سخت بے مہری کہ بے ما میروی
اے تماشا گاہ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا میروی

(اے محبوب آپ جنگل جارہے ہیں سخت بے مہری کہ ہمارے بغیر جارہے ہیں۔ اے
محبوب اپ کا رخ انور جہان کا تماشہ گاہ ہے آپ تماشہ کے لئے کہاں جارہے ہیں)

لکھا ہے کہ ہاتھ کفن کے اندر بلند ہوگیا صاحبو! ایک ایسا شخص جس کی یہ حالت ہو کہ

پا بدستے دگراں دست بدست دگراں

کیا اس کو وجد ہوسکتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی بے حد فرحت کا دن ہوتا ہے ایک دوسرے بزرگ انتقال کے وقت منتظرانہ ومشتاقانہ فرماتے ہیں۔

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(وقت آگیا ہے کہ میں بدن کے لباس سے ننگا ہوجاؤں گا جسم کو چھوڑ کر سراسر جان ہوجاؤں گا)

اور یہ حالت کیوں نہ ہو جبکہ وہ جانتے ہیں کہ اب پردہ ہیولانی جو کہ مانع دیدار تھے اٹھتے بیٹھتے ہیں اور کوئی گھڑی ہے کہ محبوب حقیقی کا دیدار نصیب ہوگا صرف یہ نہیں کہ ان کو جنت کی یا حوروں کی ہوس ہوتی ہے حضرت ابن الفارضؒ کا واقعہ لکھا ہے کہ جب ان کا انتقال ہونے لگا تو جنت منکشف ہوئی آپ نے اس طرف سے منہ پھیر لیا اور کہا۔

ان کان منزلتی فی الحب عندکم ماقدرأیت فقد ضیعت ایامی

ترجمہ: اگر محبت میں میرا مرتبہ تمہارے نزدیک یہی ہے جو میں دیکھ رہا ہوں تو گویا میں نے اپنا وقت تو ضائع ہی کیا۔

کہ جان تو آپ کے لئے دے رہا ہوں جنت کو کیا کروں۔ آخر جنت چھپ گئی اور فوراً تجلی ظاہر ہوئی اور جاں بحق ہوئے ان کی بالکل وہی حالت ہوگئی کہ۔

گر بباید ملک الموت کہ جانم ببرد تانہ بینم رخ تو روح رمیدن ندہم
(اگر میری جان نکالنے کیلئے ملک الموت آجائے تو جب تک تیرا پرتو نہ دیکھ لوں جان نہ دونگا)

عرس کی خرابیاں

اکثر لوگ ان حالات کو سن کر تعجب کریں گے لیکن یہ تعجب صرف اس وجہ سے ہے کہ خود اس سے محروم ہیں مگر ایسے لوگوں سے یہ کہا جاتا ہے۔

تو مشو منکر کہ حق بس قادر ست (تو منکر نہ ہو کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ اس پر قادر ہیں)

غرض بزرگوں کے حالات اور حدیث وغیرہ سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان بزرگوں کی وفات کا دن یوم العرس ہے لیکن لوگوں نے اس کے مفہوم و مصداق دونوں کو بالکل خراب کر دیا ہے مصداق کی خرابیاں تو ظاہر ہیں کہ تمام شرک و بدعت اس عرس کا جزو ہوگئی باقی مفہوم کی خرابی یہ کہ اس لفظ کے لغوی معنے لے کر شادی کے لوازم بھی وہاں جمع کر دیئے چنانچہ اکثر جگہ رسم ہے کہ بزرگوں کی قبر پر مہندی چڑھاتے ہیں نوبت نقارہ رکھتے ہیں اسی طرح مزامیر وغیرہ سب لغو حرکتیں جمع کر رکھی ہیں۔ غریب مردہ پر تو بس چلتا نہیں قبر کی گت بنائی جاتی ہے تو حقیقت میں وہ یوم العرس اس اعتبار سے ہے کہ جس کو ذکر کیا گیا وہ ان بزرگوں کی خوشی کا دن ہے اور یہ کوئی دنیوی خوشی نہیں ہے تو اس میں کوئی طریقہ مقرر کرنے کیلئے ضرورت وحی کی ہوگی اور وحی ہے نہیں بلکہ اس کے خلاف پر وحی ہے چنانچہ ظاہر ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **لاتتخذوا قبری عیداً (مسند احمد ۲:۳۶۷، المصنف لابن ابی شیبۃ ۲:۳۷۵، مجمع الزوائد ۳:۴)** کہ میری قبر کو عید نہ بنانا عید میں تین چیزیں ضروری ہیں ایک اجتماع دوسرے تعیین وقت تیسرے فرحت تو ممانعت کا خلاصہ یہ ہوا کہ میری قبر پر کسی یوم معین میں سامان فرحت کے ساتھ اجتماع نہ کرنا ہاں اگر خود بخود کسی وقت میں کسی غرض سے اجتماع ہو جاوے تو اور بات ہے دوسرے حضورؐ کا یہاں سے تشریف لے جانا اگرچہ آپ کے لئے باعث سرور ہے لیکن ہمارے لئے تو باعث حزن ہے اور حضورؐ کی وفات سے جو ہم پر نعمت کامل فرمائی ہے جس کو میں نے نشر الطیب میں لکھا ہے وہ دوسرے اعتبار سے ہے۔ پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر ایسا اجتماع جائز نہیں تو دوسروں کی قبر پر ایسا اجتماع کیونکر جائز ہوگا۔

اور عجیب برکت ہے کہ آج تک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر اجتماع کا کوئی خاص دن معین نہیں ہوا بحمد اللہ اس مسئلہ کی تحقیق کافی ہوگئی۔

عید مطلوب

خلاصہ یہ ہے کہ حدیث سے ہم کو افطار اکبر پر عید کرنے کا حکم ہے اور اس میں یہ باتیں ہونی چاہئیں ملاقات کرو خوش ہو اکثار صدقہ کرو سب مجتمع ہو کر عید گاہ میں دوگانہ ادا کرو۔

صاحبو! غور کیجئے کہ خدا تعالیٰ ہماری خوشی کو بھی کس انداز پر دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس میں نماز کا حکم فرمایا اکثار صدقہ کا حکم فرمایا کہ یہ زکوٰۃ کے مشابہ ہے اور نماز کی بھی ایک خاص ہیئت مقرر فرمائی کہ اس میں چند تکبیریں بڑھادیں کہ امتیاز علامت ہے اہتمام شان کی اور اسی لفظ سے قرآن میں بھی ارشاد ہے ولتکبروا اللہ علیٰ ما ھداکم اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف ہو گیا کہ لتکملوا العدۃ میں تکمیل رمضان مراد ہو اور لتکبروا سے عید اور ایک حکمت دیکھئے مسلمان میں دو چیزیں ہیں ایک دین اور ایک طبیعت اور جس طرح اس کی طبیعت میں بعض امور کا جوش اور تقاضا پیدا ہوتا ہے اسی طرح اس کے دین کو بھی جوش ہوتا ہے اور ان دونوں کی معدل عقل ہوتی ہے۔

پس خدا تعالیٰ نے جوش دین کا تو یہ انتظام فرمایا کہ نماز مقرر فرمائی اور جوش طبیعت کا یہ انتظام فرمایا کہ اس دن اچھے سے اچھا کپڑا پہننے کی اجازت دی۔ سبحان اللہ شریعت کا کیا پاکیزہ انتظام ہے کسی نے خوب کہا ہے کہ گویا جمال شریعت ہی کی شان میں ہے۔

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

احکام عید

افسوس اس شریعت کو لوگوں نے بھیانک صورت میں ظاہر کیا اور لوگوں کو اس سے متوحش بنا دیا۔ ورنہ وہ تو عجیب دلفریب ہے یہ احکام تھے عید کے متعلق لیکن عید کے متعلق فرعی احکام میں نے اس وقت اس لئے بیان نہیں کئے کہ متعدد بار بیان ہو چکے ہیں۔ مثلاً چاند دیکھنے میں کوشش کرنا خبروں کے اعتبار کرنے میں احتیاط کرنا وغیرہ۔ لیکن صدقہ فطر کے متعلق اس وقت اتنا بیان کرتا ہوں کہ جس کے پاس پچاس روپیہ (یہ اس دور کے نصاب کی قیمت ہے، آج کل مہنگائی کا زمانہ ہے ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر زایدانہ ضرورت رقم ہو اس پر فطرانہ واجب ہے اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے۔ احقر قریشی غفرلہ) کی مالیت اپنی حاجت سے زیادہ ہو اس پر واجب ہے کہ اپنی اور اپنے چھوٹے بچوں کی طرف سے پونے دو سیر پختہ گندم مساکین کو دیدو مگر تنخواہ میں دینا درست نہیں کیونکہ تنخواہ دار کی تنخواہ میں دینے سے صدقہ فطر ادا نہیں ہوتا۔

ہاں ایک فضیلت یوم عید کی اور یاد آئی حدیث میں آیا ہے کہ لوگوں کے عیدگاہ میں جمع ہونے کے بعد خدا تعالیٰ فرشتوں کو مخاطب بنا کر فرماتے ہیں ماجزاء اجیر وافی عمله یعنی اس مزدور کو کیا بدلہ دیا جاوے جس نے اپنے عمل کو پوری طرح کیا ہو۔ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ جزاءہ ان یو فی اجره کہ اس کی جزا یہ ہے کہ اسے پوری مزدوری دی جاوے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ و عزتی و جلالی و ارتفاع شانی لا غفرلهم فیرجعون مغفوراً لهم (لم اجد الحدیث فی "موسوعة اطراف الحدیث النبوی شریف") یعنی خدا تعالیٰ فرماویں گے کہ اپنے جلال اور عزت کی قسم آج میں ان کی مغفرت کئے دیتا ہوں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اس گفتگو کو نقل فرما کر ارشاد فرماتے ہیں کہ بس لوگ بخشے بخشائے واپس آتے ہیں تو اس حدیث کے سننے کے بعد اب لوگوں کو غور کرنا چاہیے کہ عیدگاہ میں کیسی ہئیت بنا کر چلنا چاہیے کہ اس کرامت کے اہل تو ہوں۔

افسوس ہے کہ اکثر لوگ نافرمانوں کی صورت بنا کر جاتے ہیں بہتر بلکہ ضروری بات ہے کہ جو لوگ داڑھی منڈاتے ہیں یا ترشواتے ہیں آج سے توبہ کرلیں ہمیشہ کیلئے نہ ہو سکے تو عید بقرعید کے گزرنے تک تو اس سے بچے رہیں کہ ان وقتوں میں بڑی حاضری ہوتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ اگر داڑھی نہ منڈائی جائے تو کوئی نقصان بھی تو نہیں اور منڈانے سے کوئی نفع بھی تو حاصل نہیں ہوتا پھر اس بےلذت گناہ سے کیا نتیجہ کہ خدا کے سامنے ذلیل بھی ہوئے دنیا میں کچھ مزا تک بھی نہ آیا۔

اسی طرح بعض لوگ ریشمی لباس پہن کر عیدگاہ میں جاتے ہیں ان لوگوں کو سمجھنا چاہیے کہ ان کی نماز مقبول نہیں ہوتی۔ نیز اپنے لڑکوں کو بھی ایسا لباس نہ پہناویں۔

صاحبو! کیا کسی بادشاہ کے دربار میں جاتے ہوئے کوئی شخص بغاوت کے تمغے سجا کر جا سکتا ہے پھر کیا خدا کی عظمت شاہان دنیا کے برابر بھی نہیں اس کو سوچو۔ اور خدا تعالیٰ کے عذاب کو پیش نظر رکھ کر ان سب خرافات سے باز آ جاؤ۔

اب خدا تعالیٰ سے دعا کرو کہ توفیق عمل دے۔ آمین۔ یارب العالمین

بالخیر تمت